افلا یتدبرون القرآن

تدبرِ قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

المزمل ۷۳ — الناس ۱۱۴

تدبرِ قرآن

جلد نہم

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ

تدبّرِ قرآن

جلد نہم

تفاسیر

سُورۂ مزّمّل (۷۳) ــــ تا ــــ سُورۂ ناس (۱۱۴)

امین احسن اصلاحی

فاران

فاران فاؤنڈیشن

لاہور ــــ پاکستان

اہتمام — حسن خاور

مطبع — فلک شیر پرنٹرز، ابراہیم روڈ، لاہور

تاریخ اشاعت — نومبر 2009ء — ذیقعد 1430ھ

ادارہ — فاران فاؤنڈیشن

سیکنڈ فلور، علق پریس بلڈنگ، 19-اے،
ایبٹ روڈ، لاہور، پاکستان۔فون: 042-6303244
ای میل: faran@wol.net.pk

فہرس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

(طبع اول)

الحمد للہ ۲۹ رمضان المبارک سنہ ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۲ اگست سنہ ۱۹۸۰ء کو تدبر قرآن کی آٹھویں یعنی آخری جلد کی آخری سطریں سپرد قرطاس ہوئیں۔ اس کتاب کی تحریر کا کام غالباً میں نے سنہ ۱۹۵۸ء میں شروع کیا، اور اب سنہ ۱۹۸۰ء ہے۔ یعنی کم و بیش تیئیس ۲۳ سال کے طویل اور پُر مشقت سفر کے بعد قلم کا مسافر اپنی آخری منزل پر پہنچا ہے۔ اس طویل سفر میں جن مرحلوں سے گزرنا پڑا اور جن آزمائشوں سے سابقہ پیش آیا اور میرے رب نے جن جن طریقوں سے ان تمام مراحل میں میری دست گیری فرمائی ہے یہ ایک نہایت سبق آموز داستان ہے۔ لیکن اس وقت میں اس کے سنانے میں آپ کا وقت صرف کرنا نہیں چاہتا، اس کو میں نے اپنے اور اپنے رب کے درمیان ایک راز ہی رکھا ہے اور راز ہی رکھنا چاہتا ہوں۔ البتہ ہر بُن مُو سے اس کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھ جیسے ہیچمیرز اور بے سرو سامان کو اپنی کتاب عزیز کی ایک ایسی خدمت کی توفیق بخشی جو اس کی عنایت خاص ہی سے کسی کو حاصل ہو سکتی ہے۔

اس کتاب کی تاریخ اس کتاب کی تحریر کا کام تو، جیسا کہ عرض کیا، سنہ ۱۹۵۸ء میں شروع ہوا لیکن اس کے لیے فکری تیاریوں میں سنہ ۱۹۲۵ء ہی سے میں لگ گیا تھا۔ یہی سال ہے جس میں مجھے مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ سے شرف تلمذ حاصل ہوا جس کا سلسلہ پورے پانچ سال قائم رہا۔ اس کے بعد سے قرآن مجید میرے غور و فکر کا مستقل موضوع بن گیا۔ اس پہلو سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ کتاب میری پچپن سال کی کاوشوں کا نچوڑ ہے۔ لیکن اس میں صرف میرا ہی فکر نہیں ہے بلکہ میرے استاذؒ کا فکر بھی ہے۔ اس کتاب کے مقدمے میں ذکر کر چکا ہوں کہ میرا فکر میرے استاذؒ کے فکر سے کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ استاذ مرحوم ہی کے فکر کی توضیح و تکمیل ہے۔ ان کے فکر کے جس حصہ کا تعلق براہ راست قرآن مجید سے ہے میں نے اس کتاب میں اس کو واضح طور پر بیان بھی کیا ہے اور اگر کوئی پہلو مجھے اس کا تشنہ محسوس ہوا ہے تو اس کا خلا پُر کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے اس فکر کی تاریخ، جہاں تک مجھے علم ہے یہ ہے کہ انھوں نے علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں قرآن مجید پر غور کا کام شروع کیا اور زندگی کے آخری لمحات تک یہ پوری باقاعدگی سے جاری

رہا۔ یہ مدت سرسری اندازے کے مطابق کم و بیش تیس پینتیس سالوں پر ممتد ہے۔ جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ تدبرِ قرآن کے کم و بیش چھ ہزار صفحات میں تقریباً ایک صدی کا وہ فکری مواد آپ کے سامنے آیا ہے جس کو آپ فکرِ فراہی سے موسوم کر سکتے ہیں۔

اس کتاب کا نہج — اس کتاب کے نہج سے متعلق مقدمۂ کتاب میں تفصیل سے واضح کر چکا ہوں کہ اس میں قرآن مجید پر غور اور اس کی مشکلات حل کرنے کے لیے براہِ راست غور (DIRECT APPROACH) کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی تفسیر کا اصل ماخذ قرآن کی زبان، اس کی آیات کے نظام اور اس کے اپنے اندرونی نظائر و شواہد کو قرار دیا گیا ہے۔ مروجہ طریقہ کے مطابق صرف تفسیر کی کتابوں سے نقلِ اقوال پر اکتفا نہیں کر لیا گیا ہے۔ الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور نحوی مشکلات میں بھی براہِ راست اصل عربی زبان سے رہنمائی حاصل کی گئی ہے۔ مجرد اہلِ تاویل کے اقوال پر اعتماد نہیں کیا گیا ہے۔ اسی طرح آیات کی تاویل و ترجیح میں بھی قرآن کی زبان، کلام کے نظام اور قرآن کے نظائر و شواہد کو پوری اہمیت دی گئی ہے۔ کسی قول کو مجرد اس دلیل پر نہیں اختیار کر لیا گیا کہ وہ اگلے اصحابِ تاویل سے منسوب ہے۔ چنانچہ اس میں اقوال کی کثرت کے بجائے دلائل کی روشنی میں ہر آیت کی ایک معین تاویل سامنے رکھی گئی ہے۔

قرآن کی منطق اور اس کی حکمت کی بنیادیں بھی اس میں نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ اس کا عقلی استدلال اور اس کی حجت دل نشین انداز میں سامنے آئے اور متکلمین کے فرسودہ اندازِ استدلال اور قرآن کے فطری طرزِ استدلال میں جو فرق ہے، وہ اچھی طرح واضح ہو جائے۔

تفسیر کی کتابوں، قدیم آسمانی صحیفوں، تاریخ کی کتابوں، اور شانِ نزول کی روایتوں سے بھی اس میں پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ لیکن ان کو قرآن کے تحت رکھ کر استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ان کو قرآن پر حاکم بنا دیا گیا ہو اور قرآن کے الفاظ ان کو قبول کریں یا نہ لیکن ان کو قرآن میں گھسانے کی کوشش کی گئی ہو۔

کسی اعلیٰ کلام کا حسن و جمال اس کے نظام اور اس کی ترتیب کے اندر ہی مضمر ہوتا ہے اور اس کی قوتِ استدلال کا انحصار بھی بیشتر اسی چیز پر ہوتا ہے، اس وجہ سے اس کتاب میں قرآن کا یہ پہلو سب سے زیادہ اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ جو لوگ قرآن کے اندر کسی نظم و ترتیب کے قائل نہیں ہیں ان کا یہ سوئے ظن دور ہو۔ اس میں ہر سورہ کے مطالب کا تجزیہ (ANALYSIS) کر کے سورہ کا عمود و موضوع معین کر دیا گیا ہے، جس سے ہر سورہ منتشر باتوں کے مجموعہ کے بجائے ایک معین موضوع پر ایک جامع اور دل نشین خطبہ کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ مطالب کا تجزیہ اس طرح کیا گیا ہے کہ ان کا باہمی منطقی ربط بھی خود بخود واضح ہو جائے اور عمود کے ساتھ ان کا تعلق بھی بے نقاب ہو جائے۔

علاوہ ازیں قرآن مجید میں سورتوں کی زمرہ بندی (GROUPING) جس حکمت پر مبنی ہے اس کا

اصلی حسن و جمال بالکل مخفی تھا۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کا رمز اور فلسفہ اس تفسیر میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے دکھایا ہے کہ یہ سورتیں سات گروپوں (زمرات) میں تقسیم ہیں۔ ان میں مکی اور مدنی کی تقسیم اس طرح ہے کہ مکی سورتیں مقدم ہیں اور مدنی مؤخر۔ نیز ہر سورہ اپنا ایک مثنٰی بھی رکھتی ہے۔ اگر کہیں اس اصول کی خلاف ورزی ہوئی ہے تو کسی خاص حکمت کے تحت ہوئی ہے، جس کی وضاحت میں نے کر دی ہے۔ جس طرح ہر سورہ کا ایک معین عمود ہے اسی طرح ہر گروپ کا بھی ایک جامع عمود ہے جو پورے گروپ پر حاوی ہے۔ میرے نزدیک یہ ترتیب منصوص ہے، جس کے دلائل خود قرآن میں موجود ہیں اور میں نے ان کی وضاحت کی ہے۔

اس تفسیر کی یہ خصوصیات جب میں نے مقدمے میں بیان کی تھیں تو اس وقت اس کی صرف پہلی جلد لوگوں کے سامنے آئی تھی، اس وجہ سے ممکن ہے بہت سے لوگوں کو یہ باتیں انوکھی محسوس ہوئی ہوں، لیکن اب خدا کے فضل سے سورۂ فاتحہ سے لے کر سورۂ ناس تک کی پوری تفسیر آپ کے سامنے ہے۔ اس کو پڑھ کر جانچیے کہ جن اصولوں کا میں نے مقدمہ میں حوالہ دیا ہے، ان پر یہ پوری اترتی ہے یا نہیں اور قرآن پر غور کرنے کے لیے یہ اصول بالکل فطری، عقلی اور سائنٹیفک ہیں یا نہیں۔ پھر اس بات پر بھی غور کیجیے کہ کیا ان اصولوں کو اپنائے بغیر قرآن کے اس خزانۂ حکمت تک رسائی ہو سکتی ہے جس سے بہرہ یاب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب نازل فرمائی ہے!

یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھیے کہ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے امتیاز کے لیے ایک کسوٹی بنا کر ہمارے ہاتھوں میں دیا ہے۔ اگر یہ کسوٹی ہمارے پاس نہ رہے یا ہم اس کے استعمال سے ناآشنا ہو جائیں تو پھر حق و باطل میں امتیاز کے لیے ہمارے پاس کوئی روشنی باقی نہیں رہ جاتی۔ ہم نہایت صدمہ کے ساتھ یہ عرض کرنے پر مجبور ہیں کہ اس وقت یہی صورت حال ہے۔ قرآن تو موجود ہے لیکن اس کا علم ہمارے اندر موجود نہیں ہے۔ اس وقت یہ یا تو حصولِ ثواب اور ایصالِ ثواب کی چیز بن کے رہ گیا ہے یا تجارت کی، اور جو جتنی ہی بلند آہنگی سے اس کا نام لیتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ اس سے محروم و ناآشنا نظر آتا ہے۔ اگر اس امت کو بحیثیت امتِ مسلمہ زندہ رکھنا ہے تو یہ کام، وحدتِ امت کی مالا جپنے سے ہوگا نہ قرآن کا وظیفہ پڑھنے سے، بلکہ اس کے لیے سب سے مقدم شے قرآن کے صحیح علم کو اجاگر کرنا ہے۔ جن کے اندر اس کا صحیح علم ہوگا انہی کے اندر صحیح عمل پیدا ہوگا اور اس امت کی جب بھی اصلاح ہوگی انہی کے مبارک ہاتھوں سے ہوگی۔ لن یصلح اٰخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا (اس امت کے آخر دور کے لوگ بھی اسی چیز سے اصلاح پذیر ہوں جس سے اس کے دورِ اوّل کے لوگ اصلاح پذیر ہوئے)۔

تصنیف کا اصلی محرک

اس امر واقعی کا اظہار بھی غالباً نامناسب نہیں ہوگا کہ یہ کتاب میں نے شوقِ تصنیف کے جذبے کے تحت نہیں بلکہ مجرد ادائے فرض کے احساس سے مجبور ہو کر لکھی ہے۔ میں نے پچھلی جلدوں میں سے کسی جلد کے

دیباچہ میں ذکر کیا ہے کہ اس کا آغاز جب میں نے کیا تو اس وقت میرا احساس یہ تھا کہ گویا ڈوبنے اور تیرنے سے بے نیاز ہو کر ایک سمندر میں چھلانگ لگا دی ہے۔ اس کے لیے قلم اٹھانے سے پہلے میں نے اس کی مشکلوں اور نزاکتوں کا اچھی طرح اندازہ کر لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کیا لکھنا ہے، کس طرح لکھنا ہے اور جن کے لیے لکھنا ہے، ان کی طرف سے اس کی پذیرائی کی کس حد تک مجھے توقع کرنی ہے۔ اس وجہ سے اگرچہ میں اس کام پر اپنے کو مجبور پا رہا تھا لیکن ساتھ ہی دل کے مخفی گوشوں میں یہ خواہش بھی دبی ہوئی تھی کہ اس کے خیر و شر کی ذمہ داریوں سے میں بچا لیا جاؤں۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ میں جب ۱۹۷۰-۱۹۷۲ء میں بیمار پڑا اور معالجوں نے میری اس بیماری کا سبب کثرتِ کار کو قرار دے کر مجھے دماغی محنت سے بالکل روک دیا تو مجھے اس بات کا مطلق افسوس نہیں ہوا کہ میرا کام ناتمام رہ گیا، بلکہ دل پوری طرح مطمئن رہا کہ جتنا میرے رب نے چاہا اتنا ہو گیا، اب آگے کا کام اگر اسے منظور نہیں ہے تو اسی میں حکمت ہے اور مجھے اس کے فیصلہ پر راضی ہونا چاہیے۔ میں دوستوں سے یہ بھی کہتا رہا ہوں کہ اگر سورۂ توبہ تک بھی لکھنے کی فرصت مجھے مل گئی تو میں سمجھوں گا کہ میرا مقصد پورا ہو گیا اس لیے کہ استاذ مرحوم کے اصولوں کی صداقت اور قدر و قیمت واضح کرنے کے لیے اتنی تفسیر بھی کافی ہے۔

بعد میں جب صحت کچھ ٹھیک ہوئی تو مجھے حالات سے مجبور ہو کر لاہور کی سکونت ترک کر کے ضلع شیخوپورہ کے ایک دیہات ——— رحمان آباد ——— میں سکونت اختیار کرنی پڑی۔ دیہات میں قرینہ کا کوئی مکان تھا نہ ابتداء کے چار سالوں میں بجلی وغیرہ کی سہولتیں میسر تھیں، اس وجہ سے شروع شروع میں نہایت صبر آزما حالات سے سابقہ پیش آیا۔ ایسے حالات میں لکھنے پڑھنے کے کسی سرسری کام پر بھی طبیعت کو آمادہ کرنا نہایت مشکل تھا چہ جائیکہ تدبّرِ قرآن کا کام، لیکن میں نے مضبوط ارادہ کر رکھا تھا کہ قلم اٹھاؤں گا تو تدبّرِ قرآن ہی کے لیے اٹھاؤں گا۔ اس کے سوا کسی اور کام پر اپنی قوت کو صرف کرنا اس رب کی ناشکری ہو گی جس نے مجھے از سرِ نو قلم ہاتھ میں لینے کی صلاحیت بخشی ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اس کتاب کی کتنی سورتوں کی تفسیر میں نے کسی سرسے یا شیشم کے نیچے بیٹھ کر اس حال میں لکھی ہے کہ اوپر سے چڑیوں اور بھڑوں کی یورش ہے، نیچے سے مکھیوں نے اپنے نرغے میں لے رکھا ہے، مسودہ پسینہ سے بھیگ رہا ہے لیکن میں کسی آیت کی مشکلات حل کرنے میں اس طرح مستغرق ہوں کہ مجھے اپنے دہنے بائیں کا کچھ ہوش نہیں۔

کوئی مضائقہ نہیں ہو گا اگر یہ راز بھی برملا ظاہر کر دوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے لکھنے کی کچھ صلاحیت تو ضرور بخشی ہے لیکن اپنی لکھی ہوئی چیزوں کی طباعت و اشاعت کا کوئی سلیقہ میرے اندر نہیں ہے اور مجھے اپنی اس بے سلیقگی پر کچھ افسوس بھی نہیں ہے۔ میں مطمئن ہوں کہ میرا کام لکھنا تھا میں نے لکھ دیا۔ اس کو چھاپنا اور بیچنا میرا کام نہیں۔ رہا میری معاش کا مسئلہ تو اس کے لیے نہ میں نے کچھ کیا ہے، نہ اب کر سکتا ہوں

میں دوستوں سے مذاق کے انداز میں کہتا رہا ہوں اور آج سنجیدہ انداز میں لکھ رہا ہوں کہ دین اور دنیا دونوں کے معروف کے خلاف میرے نان و نفقہ کی ذمہ داری میری بیوی پر ہے۔ ان کے پاس ان کے والد مرحوم کے ترکے سے ملی ہوئی کچھ زمین تھی۔ میں اس کی کچھ دیکھ بھال کرتا رہا ہوں۔ اسی کی آمدنی سے اب تک ہمارا گزارا ہوتا رہا ہے اور چونکہ معیارِ زندگی کے فتنوں سے ہماری زندگی محفوظ رہی ہے اس وجہ سے اچھا گزارا ہوا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جس ربِّ کریم نے بچپن میں پالا، جوانی میں کھلایا پہنایا؛ وہ بڑھاپے میں بھی بھوکا ننگا نہیں رکھے گا۔ بس یہ یقین میرا اصل سرمایہ ہے۔

کتاب کے مستقبل سے متعلق — اس کتاب کے مستقبل سے متعلق اگرچہ، جیسا کہ شروع میں عرض کر چکا ہوں، میں کچھ پُرامید نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس دنیا نے امام فراہی علیہ الرحمۃ جیسے محقق کی کیا قدر کی ہے کہ وہ میری چیزوں کی قدر کرے گی، لیکن مجھے بہرحال اپنا فرض ادا کرنا تھا چنانچہ میں نے ستائش اور صلہ کی تمنا سے بے پروا ہو کر کام شروع کر دیا اور اب تیئیس سال کے بعد میرا اندازہ اس سے بالکل مختلف ہے جو پہلے تھا۔ اب میں نہایت واضح اور قابلِ اعتماد معلومات کی بنا پر یہ رائے رکھتا ہوں کہ یہ فکر اس تیزی سے اہلِ علم میں مقبول ہو رہا ہے کہ مجھے نہایت قوی امید ہے کہ یہ تمام ذہین لوگوں کے دلوں کو بہت جلد موہ لے گا۔ مجھے ہر مکتبِ فکر کے علماء سے بھی ملنے کے مواقع ملے ہیں اور جدید تعلیم یافتہ حضرات سے بھی، میں نے سب کو اس کا معترف و مداح پایا ہے۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ یہی راستہ قرآن کو سمجھنے سمجھانے کا سب سے کامیاب راستہ ہے اور دعا کر رہے ہیں کہ یہ مکمل صورت میں ان کے سامنے آ جائے تاکہ وہ درس و تعلیم میں اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ پاکستان اور بھارت میں کتنے دار العلوم اور کتنی مسجدیں ہیں جن میں اس کی روشنی میں درس ہو رہے ہیں۔ یورپ، امریکہ، عرب، افریقہ اور برما میں بھی جن ذہین لوگوں تک اس کا کوئی حصہ پہنچ چکا ہے وہ اس کو مکمل صورت میں حاصل کرنے کے لیے بے چین ہیں اور لکھتے ہیں کہ یہی طریقہ قرآن پر غور کرنے کا سائنٹیفک طریقہ ہے، اس کے سوا کوئی اور طریقہ اس زمانے کے لوگوں کو اپیل نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ اس کو انگریزی اور عربی میں منتقل کرنے پر بھی اصرار کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جن تعلیم یافتہ غیر مسلموں تک اس کا کوئی حصہ پہنچا ہے وہ اس کے گرویدہ ہو گئے ہیں۔ مصر وغیرہ کی بعض یونیورسٹیاں فکرِ فراہی پر ریسرچ کرنے والوں کو ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں دے چکی ہیں۔ پاکستان کے بعض تحقیقاتی اداروں میں بھی فکرِ فراہی پر ریسرچ ہو رہی ہے۔

لوگوں کو یہ شکایت نہیں ہے کہ تدبرِ قرآن میں کوئی چیز مشکل یا فہم سے بالاتر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس تفسیر میں وہی کچھ ہے جو تفسیر میں ہونا چاہیے اور یہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں کے لیے یکساں نافع ہے، خواہ عالم ہو یا عامی۔ میرے پاس اس طرح کی رایوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ لوگ کتاب کو خود اس کی صلاحیتوں کی روشنی میں جانچیں اور پرکھیں، صرف دوسروں سے متاثر ہو کر کوئی

لائے نہ قائم کریں۔ اس وجہ سے میں نے ان کے مخطوطات کی اشاعت کا کوئی اہتمام نہیں کیا۔

مولانا فراہی علیہ الرحمۃ کو میں نے اپنے علوم و افکار کی اشاعت کے باب میں کبھی فکر مند نہیں پایا، یہاں تک کہ انھوں نے کبھی اس بارے میں مجھ سے بھی ایک حرف نہیں کہا، لیکن یہ نصیحت وہ بار بار کرتے تھے کہ آدمی کو ہمیشہ پوری تحقیق اور کامل غور و فکر کے بعد بات کہنی یا لکھنی چاہیے۔ جو بات محکم ہوتی ہے وہ جڑ پکڑتی ہے۔ کمزور باتیں وقتی طور پر چاہے پھیل جائیں لیکن بالآخر وہ ہوا میں اڑ جاتی ہیں۔ مولانا کے اس قول کی صداقت الحمد للہ اب مجھ پر اچھی طرح واضح ہو رہی ہے۔

یہ کتاب ایک فکری انقلاب کی راہ ہموار کرے گی

اگرچہ میں نے اپنی پوری جوانی اور سارا بڑھاپا اسی کتاب کی تیاریوں اور اسی کی تحریر و تسوید پر صرف کیا ہے لیکن میں اس دعوے کے ساتھ اس کو پیش نہیں کر رہا ہوں کہ اس کے ذریعہ میں نے قرآن کو سمجھا دیا ہے یا اس کے سارے علوم اس میں جمع کر دیے ہیں۔ قرآن علم و حکمت کا ایک سمندر ہے، اس کے علوم کا احاطہ اس کے نازل کرنے والے کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ البتہ یہ احساس میرا ضرور ہے کہ اس کتاب میں قرآن پر غور کرنے کی راہ میں نے کھول دی ہے۔ اگر آپ ان اصولوں کو جو اس کتاب میں بیان ہوئے ہیں، رہنما بنا کر قرآن پر غور کریں گے تو مجھے پورا اعتماد ہے کہ حکمت کے ان خزانوں تک پہنچ سکیں گے جو اس میں موجود ہیں۔ اس سے زیادہ میرا کوئی دعویٰ نہیں ہے اور یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ اگر آپ اس طرح قرآن کو سمجھنے کی اہلیت پیدا کر لیں گے تو لاریب آپ کے لیے قرآن مجید ایک ایسی کسوٹی بن جائے گا جس کے ذریعہ سے آپ اپنے تمام علوم و افکار کے حق و باطل اور ان کے غث و سمین میں امتیاز کر سکیں گے۔ آپ کے لیے یہ کام نہایت آسان ہو جائے گا کہ آپ احادیث، فقہ، کلام و فلسفہ اور تصوف و اسرار سب کو پرکھ کر بتا سکیں کہ ان میں کتنا حق ہے اور کتنا باطل۔ یہ چیز اس تقلید جامد کو توڑے گی جس نے اس امت کو فرقوں اور گروہوں میں بانٹ رکھا ہے اور کیا عجب کہ اس طرح اس انقلاب کی راہ ہموار ہو جائے جو اس منتشر بھیڑ کو پھر اس دنیا میں ایک جہانی قوت بنا کر کھڑا کر دے۔ بہرحال میں نے قرآن کو سمجھنے کے لیے صرف راہ ہموار کی ہے، کرنے کا کام ابھی بہت ہے اور وہ آگے آنے والوں کو کرنا ہے۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

قرآن کا صحیح علم آپ کو حاصل ہو جائے تو آپ کے لیے ہر طرف روشنی ہی روشنی ہے۔ نہ کوئی قدیم چیز آپ کو گمراہ کر سکتی نہ کوئی جدید چیز۔ یہی اصل کلید ہے۔ یہ کلید اگر آپ کو نہ مل سکی یا ملی لیکن آپ نے اس کی قدر نہ کی تو اس تاریکی سے آپ کسی طرح نہیں نکل سکتے جس میں اس وقت گھرے ہوئے ہیں۔ میں اس دور کے نوجوانوں اور بوڑھوں دونوں کو دعوت دیتا ہوں کہ اگر ان کو اپنا اور اس امت کا مستقبل عزیز ہے تو وہ

یہ نہ دیکھیں کہ بات کس نے کہی ہے بلکہ صرف یہ دیکھیں کہ کیا بات کہی ہے۔ حق ایک متاعِ مشترک ہے جس پر کسی کا اجارہ نہیں اور کسی حق کی ناقدری کا خسارہ اسی کو ہوتا ہے جو اس کی ناقدری کرتا ہے نہ کہ حق کے پیش کرنے والے کو۔

نیز احساس

۲۹۔ رمضان سنہ ۱۴۰۰ھ کو اس کتاب کی آخری سطریں حوالۂ قرطاس کرتے ہوئے میں نے صرف یہی نہیں محسوس کیا کہ یہ کتاب میں نے پوری کر دی بلکہ یہ بھی محسوس کیا کہ اپنی زندگی کا آخری ورق بھی الٹ دیا۔ ایک بھاری بوجھ جو تینتیس سال اٹھائے لیے پھرا اس سے سبکدوش ہونے پر ایک گہری مسرت کا احساس تو ایک فطری چیز ہے لیکن ساتھ ہی یہ احساس بھی ہے کہ اب کیا کام کرنے کی صلاحیت باقی رہ گئی ہے، جس کے لیے جینے میں لذت ہو۔ میں نے آخری سطریں لکھ کر اپنا سر اپنے رب کے آگے ڈال دیا اور صرف یہ دعا کی کہ اے رب! اگر تو نے اپنی کتاب عزیز کی خدمت کی یہ توفیق بخشی تو اس کو قبول بھی فرما اور اس کو اپنے غلام کی نجات کا ذریعہ بنا، بس اس کے سوا میں کسی چیز کا متمنی نہیں۔ یہ سطریں جن کی نظروں سے بھی گزریں ان سے التماس ہے کہ وہ اس دعا پر آمین کہیں۔

ہمراہانِ سفر کا شکریہ

اس طویل سفر کا بیشتر حصہ میں نے تنہا ہی طے کیا لیکن کبھی کبھی بعض ہم سفر بھی ملتے رہے ہیں، جن کی رفاقت جس حد تک بھی مجھے حاصل ہوئی اس کی مسرت آمیز یاد میرے دل میں باقی ہے اور ان شاء اللہ باقی رہے گی۔ ان میں سے جن دوستوں کا ذکر سابق دیباچوں میں ہو چکا ہے ان کے ناموں کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن بعض دوسرے دوستوں کا شکریہ واجب ہے جن کا ذکر ابھی اس کتاب میں نہیں آیا ہے، حالانکہ خاص اس کتاب کے سلسلہ میں انھوں نے میرا بڑا ہاتھ بٹایا ہے اور میں ان کے اس بے غرضانہ تعاون کا نہایت ممنون ہوں۔ عزیزم غلام صمدانی صاحب سلمہٗ نے جو ان دنوں امریکہ میں زیر تعلیم ہیں، ایک زمانے میں خود میری خدمت بھی میرے بیٹوں سے زیادہ کی ہے اور اس کتاب کے مسودات بھی بڑی محنت اور بڑے سلیقے سے نقل کرتے رہے ہیں۔ برادرم عبداللہ غلام احمد صاحب، واپڈا میں ملازم ہیں، انھوں نے مسودات کی نقل و تبییض میں بھی بڑا حصہ لیا ہے اور بہت سی مشکلات حل کرنے میں بھی ان کی ذہانت سے میں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ کسی خاص مشکل کے حل کے سلسلہ میں حوالوں وغیرہ کی تلاش کا کام تو برادرم خالد مسعود صاحب پہلے سے کرتے رہے ہیں، لیکن ادھر بعض ضروری حوالوں کی تلاش میں عزیزم جاوید احمد صاحب نے بھی مدد کی ہے جس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔

عزیزم ماجد خاور صاحب سلمہٗ کا نام تو اس کتاب کی تاریخ کا اب ایک حصہ بن گیا ہے۔ کتاب کی طباعت و اشاعت کے سابق انتظام سے جب میں غیر مطمئن ہوا تو انھوں نے آگے بڑھ کر مجھے تسلی دی کہ اب آگے کی جلدوں کا انتظام وہ خود کریں گے اور ایک پروگرام کے مطابق کریں گے۔ مجھے ان کے حوصلہ سے

بڑی مسرت ہوئی۔ اگرچہ ان کے تجربہ پر مجھے ابتداء میں اطمینان نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے ارادہ میں برکت دی۔ وہ ٹھیک مقررہ پروگرام کے مطابق اپنا وعدہ پورا کرنے میں کامیاب ہوئے اور نہایت شاندار طریقہ پر کامیاب ہوئے۔

میں ان تمام دوستوں کا دل سے شکرگزار اور ان کے لیے دعاگو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان سے دین کی کوئی ایسی خدمت لے جو دنیا اور آخرت دونوں میں ان کے لیے سرخروئی کا باعث ہو۔

۹۔ نومبر ۱۹۸۰ء
۳۰۔ ذوالحجہ ۱۴۰۰ھ

والسلام
امین احسن اصلاحی
لاہور

تدبرِ قرآن

۷۳

المزّمّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا زمانۂ نزول اور عمود

یہ سورہ اور بعد کی سورہ ــــــ المدّثّر ــــــ دونوں بالکل ہم رنگ وہم مزاج اور توام ہیں۔ عام مفسرین نے ان کو بالکل ابتدائی سورتوں میں سے شمار کیا ہے لیکن ان کے مطالب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس دور میں نازل ہوئی ہیں جب قریش کے امراء و اغنیاء کی طرف سے دعوت کی مخالفت اتنی شدت اختیار کر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس صورتِ حال سے نہایت مغموم و متفکر رہنے لگے ہیں۔

ایک انسان جب اپنے ماحول میں ہر شخص کی مخالفت اور اس کے طعن و طنز کا ہدف بن کر رہ جائے درآنحالیکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ اس ماحول ہی کی اصلاح پر مامور ہو تو اس کے غم دائم کا جو حال ہو گا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اس صورتِ حال سے قدرتاً اس پر خلوت پسندی اور خلق سے بے تعلقی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ اٹھتا ہے تو اپنی چادر لپیٹ کر چلتا ہے تو اس میں لپٹ کر، بیٹھتا ہے تو اس میں گوشہ گیر ہو کر اور لیٹتا ہے تو اس میں چھپ کر۔ اس لیے کہ تنہا اس کی چادر ہی ہوتی ہے جس کے دامن میں فی الجملہ اس کو اپنے باطن میں غوطہ زن ہونے اور اپنے خالق سے تعلق و توسّل کے لیے سکون و اطمینان ملتا ہے۔

اس کا تھوڑا بہت تجربہ تو ہر اس شخص کو ہوتا ہے جو خلق و خالق سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کا احساس رکھنے والا ہو لیکن انبیاء علیہم السلام کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ وہ خلق کے لیے سراپا رحمت و شفقت اور اپنے رب کی ڈالی ہوئی ذمہ داریوں کے معاملے میں نہایت حسّاس ہوتے ہیں۔ وہ اپنی جان توڑ مساعی و اصلاح کے باوجود جب دیکھتے ہیں کہ لوگوں کی مخاصمت بڑھتی جا رہی ہے تو ان کو گمان گزرتا ہے کہ مبادا اس میں انہی کی کسی کوتاہی کو دخل ہو۔ یہ چیز ان کے غم و فکر کو اور زیادہ بڑھا دیتی ہے۔ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کو مطعون کر کے اپنے دل کو تسلی دینے کے بجائے خود اپنے اندر خلوت گزیں ہو کر صورتِ حال کا صحیح حل ڈھونڈھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ذہنی کیفیت میں ان کو اپنی سب سے بڑی غم گسار اپنی چادر ہی محسوس ہوتی ہے جس میں چھپ کر گویا وہ اپنے ماحول سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔

چادر میں لپٹنے والے کو عربی میں "مزّمّل" کہتے ہیں۔ اس لفظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نے آپ کی اسی فکرمندی کا سراغ دیا ہے۔ یہ نہایت پیار کا خطاب ہے۔ اس دلنواز خطاب سے مخاطب کر کے آپ کو

وہ طریقہ بتایا گیا ہے جو اس غم و الم کو دور کر کے آپ کے اندر وہ قوت و عزیمت پیدا کرے گا جو موجودہ اور آئندہ پیش آنے والے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے۔ گویا اس سورہ میں حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے آپ کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی گئی ہے اور ساتھ ہی وہ نسخہ بھی بتایا گیا ہے جو حوصلہ کو بلند اور کمرِ ہمت کو مضبوط رکھنے کے لیے نہایت کیمیا اثر ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱ - ۱۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی تاکید کہ شب میں قیام لیل کا اہتمام کرو جس میں قرآن خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ اس سے دل کو ثبات اور دماغ کو بصیرت حاصل ہو گی جو آگے کی بھاری ذمہ داریوں کے اٹھانے کا اہل بنائے گی۔ اسی طرح دن میں بھی تسبیح و تہلیل کے لیے بڑی گنجائش ہے۔ تو اپنے رب کے ذکر میں مطمئن اور اس کے دامنِ رحمت میں پناہ گیر رہو۔ مشرق اور مغرب کا خداوند وہی ہے تو اپنا معاملہ اسی کے سپرد کرو۔ تمھارے اعدا جو بکواس کر رہے ہیں اس کو صبر کے ساتھ نظر انداز کرو اور ان کا معاملہ ہم پر چھوڑو۔ ہم ان سے نمٹنے کے لیے تنہا کافی ہیں۔

(۱۵ - ۱۹) قریش کے لیڈروں کو تہدید و وعید کہ جس طرح ہم نے اپنے دین کی گواہی دینے کے لیے فرعون کی طرف اپنا رسول بھیجا اسی طرح تمھاری طرف بھی ہم نے اپنا رسول بھیجا ہے تو رسول کی نافرمانی کا جو انجام فرعون اور اس کی قوم کے سامنے آیا اس انجام کو یاد رکھو۔ اگر تم نے اسی کی روش اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں کہ تمھارا انجام اس سے مختلف ہو۔ اس دن کو یاد رکھو جس کا ہول بچوں کو بوڑھا بنا دے گا اور جس کے بوجھ سے آسمان پھٹا پڑ رہا ہے۔ اس سے آگاہ کرنے کے لیے ہم نے یہ یاددہانی اتار دی ہے تو جو سلامتی چاہے وہ اپنے رب کی راہ اختیار کر لے ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہے۔

(۲۰) آخر میں ایک مدنی آیت جس میں حالات کے تبدیل ہو جانے کے سبب سے اس حکم میں کسی قدر تخفیف کر دی گئی ہے، جو ابتدائی آیات میں دیا گیا ہے، اور اس کسر کے جبر کے لیے بعض ایسے بدل بتا دیے گئے جو اصل مقصد کی حفاظت کرنے والے اور بدلے ہوئے حالات کے مناسب ہیں۔

سُورَةُ الْمُزَّمِّلِ

مَكِّيَّةٌ ـــــــــــــــ اٰيات : ۲۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ﴿۱﴾ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۲﴾ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ
۲۰-۱ مِنْهُ قَلِيْلًا ﴿۳﴾ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ﴿۴﴾ اِنَّا
سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ﴿۵﴾ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ
وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ﴿۶﴾ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ﴿۷﴾
وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ﴿۸﴾ رَبُّ الْمَشْرِقِ
وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ﴿۹﴾ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا
يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ﴿۱۰﴾ وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ
اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ﴿۱۱﴾ اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ﴿۱۲﴾
وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۳﴾ يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَ
الْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ﴿۱۴﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ
رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾
فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ﴿۱۶﴾ فَكَيْفَ
تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبَا ﴿۱۷﴾ السَّمَآءُ

مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ؕ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ﴿١٨﴾ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ
ع ١٩/١ ١٣ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿١٩﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ
اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ
الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ
تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ عَلِمَ
اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِى الْاَرْضِ
يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ
فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ
وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ
تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَاسْتَغْفِرُوا
ع ٢٠/١ ١٤ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٠﴾

ترجمۂ آیات ١ — ٢٠

اے چادر میں لپٹنے والے! رات میں قیام کر مگر تھوڑا حصہ۔ آدھی رات یا اس میں سے کچھ کم کر دے یا اس پر کچھ زیادہ کر لے اور قرآن کی تلاوت کر ٹھہر ٹھہر کر۔ ہم تم پر عنقریب ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔ بے شک رات میں اٹھنا دل جمعی اور فہم کلام کے لیے نہایت خوب ہے۔ دن میں بھی تمھارے لیے کافی تسبیح کا موقع ہے اور اپنے رب کے نام کا ذکر کر اور اس کی طرف گوشہ گیر ہو جا۔ وہی مشرق و مغرب کا خداوند ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو اسی کو اپنا کارساز بنا اور یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر کر اور ان کو خوبصورتی سے نظر انداز کر اور ان اہلِ نعم جھٹلانے والوں کا معاملہ مجھ پر چھوڑ اور ان کو کچھ دیر اور

مہلت دے۔ ہمارے پاس ان کے لیے بیڑیاں اور دوزخ کی آگ ہے اور حلق میں پھنسنے والا
کھانا اور نہایت دردناک عذاب۔ اس دن جس دن زمین اور پہاڑ لرز اٹھیں گے اور پہاڑ
بھربھرے ٹیلے بن جائیں گے۔ ۱-۱۴

ہم نے تم لوگوں کی طرف ایک رسول بھیجا ہے تم پر گواہ بنا کر جس طرح ہم نے فرعون کی
طرف ایک رسول بھیجا تو فرعون نے رسول کی نافرمانی کی، پس ہم نے اس کو پکڑا نہایت سخت
پکڑنا تو اگر تم نے بھی کفر کیا تو اس دن کے عذاب سے کیسے بچو گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا!
آسمان اس کے بوجھ سے پھٹا پڑ رہا ہے اور اللہ کا وعدہ شُدنی ہے۔ یہ ایک یاددہانی
ہے تو جو چاہے وہ اپنے رب کی راہ اختیار کرلے۔ ۱۵-۱۹

بے شک تمہارا رب جانتا ہے کہ تم شب میں دو تہائی رات کے قریب یا نصف یا تہائی
رات قیام کرتے ہو اور ایک گروہ تمہارے ساتھیوں میں سے بھی۔ اور اللہ ہی رات اور دن
کا اندازہ ٹھہراتا ہے۔ اس نے جانا کہ تم اس کو نباہ نہ سکو گے تو اس نے تم پر عنایت کی
نظر کی تو قرآن میں سے جتنا میسّر ہو سکے پڑھ لیا کرو۔ اس کے علم میں ہے کہ تم میں مریض
بھی ہوں گے اور ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اللہ کے فضل کی طلب میں سفر کریں گے اور دوسرے
ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے اٹھیں گے تو جتنا میسّر ہو سکے اس
میں سے پڑھ لیا کرو اور نماز کا اہتمام رکھو، زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کو قرض دو قرض اچھا اور
جو کچھ بھی تم اپنے لیے پہلے سے بھیج رکھو گے اس کو اللہ کے پاس اس سے بہتر اور اجر
میں برتر پاؤ گے۔ اور اللہ سے استغفار کرتے رہو۔ بے شک اللہ بڑا ہی غفور رّحیم ہے۔ ۲۰

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ (۱)

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ایسے لفظ سے مخاطب فرمایا گیا ہے جس سے آپ کی وہ تصویر سامنے آتی ہے جو اس اندرونی کیفیت کی غماز ہے جو سورہ کے زمانۂ نزول میں آپ پر بیشتر طاری رہتی تھی۔

'مُزَّمِّل' دراصل 'مُتَزَمِّل' ہے۔ عربیت کے قاعدے کے مطابق 'ت' حرف 'ز' میں مدغم ہو گئی ہے۔ اسی طرح کا تصرف لفظ 'مدثر' میں بھی ہوا ہے۔ اس کے معنی، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر چکے ہیں، اپنے اوپر چادر لپیٹے رکھنے والے کے ہیں۔ یہ حالت بالعموم ایسے شخص کی ہوتی ہے جو سامنے کے حالات سے فکرمند اور گردوپیش کے لوگوں کے رویہ سے بددل ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو ایک ایسے عذاب سے ڈرا رہے تھے جو ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا لیکن لوگوں کی بے گانگی و بےزاری کا یہ حال تھا کہ بات سننا تو درکنار الٹے منہ نوچنے کو دوڑتے اور آپ کی بے قراری و ہمدردی کو خبط و جنون قرار دیتے۔ ایسے حالات میں آپ کا متفکر و مغموم رہنا ایک امر فطری تھا اور فکر و غم کی حالت میں آدمی کی چادر، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اس کی بہترین غمگسار ہوتی ہے۔ وہ اس میں لپیٹ کر جب چاہتا ہے خلق سے منقطع اور خالق سے متصل ہو جاتا ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ چادر اہل عرب کے لباس کا ایک نہایت اہم جزو بھی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ چادر رکھتے بھی تھے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعثت سے پہلے بھی جب آپ جستجوئے حقیقت میں سرگرداں تھے، آپ پر اسی طرح کی خلوت گزینی کی حالت طاری رہی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے، جیسا کہ سورۂ ضحیٰ میں اشارہ ہے، آپ کو راہ دکھائی۔ پھر یہی کیفیت آپ پر مزید شدت کے ساتھ اس وقت طاری ہوئی جب آپ کو اپنی مریض قوم کی دوا بیزاری اور طبیب دشمنی کا ذاتی تجربہ ہوا۔ اس تجربہ سے آپ پر جو کیفیت طاری ہوئی لفظ 'متزمّل' اسی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض مفسرین نے اس خطاب سے یہ مطلب سمجھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چادر اوڑھے سوئے پڑے تھے کہ آپ کو وحی کے ذریعہ ہدایت ہوئی کہ اے چادر تان کر سونے والے اٹھ اور نماز پڑھ۔ یہ مطلب اگرچہ اس پہلو سے دلچسپ ہے کہ بعد کی آیات سے بظاہر اس کا جوڑ مل جاتا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات مبارک کے کسی دور میں بھی چادر تان کر غفلت کی نیند سونے والوں میں سے نہیں تھے۔ آپ ہمیشہ کھٹکے کی نیند سوتے اور دن کی طرح آپ کی شب بھی زیادہ تر ذکر و فکر ہی میں گزرتی۔ قرآن کی کسی آیت سے بھی یہ اشارہ نہیں نکلتا کہ آپ کو کبھی خدا سے غفلت

کی بنا پر کوئی تنبیہ فرمائی گئی ہو بلکہ اس کے برعکس آپ کو بار بار اس بات پر نہایت پُرمحبت انداز میں عتاب ہوا ہے کہ آپ نے اپنے اوپر اس سے زیادہ بوجھ اٹھا رکھا ہے جتنا اللہ تعالیٰ نے آپ پر ڈالا ہے۔ البتہ یہ بات قرآن میں جگہ جگہ ملتی ہے کہ دعوت کی راہ میں جب آپ کو مشکلات و مصائب سے سابقہ پڑا ہے اور آپ اس صورتِ حال سے فکرمند رہنے لگے ہیں تو آپ کے عزم و حوصلہ کو مضبوط اور پریشانی کو دور کرنے کے لیے نماز بالخصوص تہجد کی نماز کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں بھی یہی صورت ہے۔

قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (۲-۴)

قیام لیل کی برکتیں

لفظ 'مُزَّمِّل' میں حضورؐ کی جو فکرمندی اور پریشانی مضمر ہے یہ اس کا علاج بتایا جا رہا ہے اور یہ علاج صرف یہیں نہیں بتایا گیا ہے بلکہ جب جب دعوت کی راہ میں آپ کو پریشانیاں پیش آئی ہیں ان کا یہی علاج آپ کو قرآن نے بتایا ہے اور ہم ہر جگہ اپنے علم کے حد تک اس کی حکمت کی وضاحت کر چکے ہیں۔ یہاں چونکہ اس علاج کی تاثیر اور اس کی قدر و قیمت آگے خود واضح فرما دی گئی ہے اس وجہ سے ہم اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے صرف آیات کی تفسیر پر اکتفا کریں گے جس سے ان شاء اللہ خود یہ بات سامنے آ جائے گی کہ مومن کے لیے اللہ تعالیٰ نے قیام لیل میں کیا برکتیں ودیعت فرمائی ہیں اور وہ کن پہلوؤں سے اس کی صرف شدہ قوتوں کو بحال اور اس کے عزم و ایمان کو مضاعف کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

قیام لیل کا وقت

'قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ': رات سے یہاں ظاہر ہے کہ رات کا نصف آخر ہے جب آدمی کچھ سو چکنے کے بعد اٹھتا ہے۔ اس کی وضاحت آگے 'نَاشِئَةَ الَّيْلِ' کے لفظ سے ہو گئی ہے۔ تہجد کے لیے یہی وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی ثابت ہے اور یہی اصل مقصد کے اعتبار سے سب سے زیادہ بابرکت بھی ہے۔ یہ وقت رات کے نصف کے بقدر بھی ہو سکتا ہے، اس سے کچھ کم بھی ہو سکتا ہے اور اس سے زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ شب کے پچھلے پہر میں اٹھنا ایک کٹھن کام ہے، اس میں دیر سویر کے ہو جانے کا امکان ہے اس وجہ سے وقت کے معاملے میں وسعت رکھی گئی ہے تاکہ زیادہ مشقت کا موجب نہ ہو۔ اگرچہ الفاظِ قرآن سے پوری نصف شب کے قیام کا اولیٰ ہونا نکلتا ہے لیکن کمی بیشی کی گنجائش الفاظ میں موجود ہے۔

قرآن کی تلاوت کا طریقہ

'وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا' یہ قرآن کے پڑھنے کا طریقہ بتایا گیا کہ نماز میں اس کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ چنانچہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ قرآن لحن اور لَے سے پڑھتے، آیت آیت پر وقف فرماتے، کبھی کبھی ایک ہی آیت شدتِ تاثر میں بار بار دہراتے۔ علاوہ ازیں کوئی آیت قہر و غضب کی

ہوتی تو اللہ تعالیٰ کے غضب سے پناہ مانگتے اور جو آیت رحمت کی ہوتی اس پر ادائے شکر فرماتے۔ بعض آیتیں جن میں سجدہ کا حکم یا اشارہ ہے ان کی تلاوت کے وقت، فوری امتثالِ امر کے طور پر آپ سجدہ میں بھی گر جاتے۔

تلاوتِ قرآن کا یہی طریقہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق بھی ہے اور یہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور و منقول بھی ہے۔ قرآن کے مقصدِ نزول کے پہلو سے بھی یہی طریقہ نافع ہو سکتا ہے لیکن مسلمانوں میں یہ طریقہ صرف اس وقت تک باقی رہا جب تک وہ قرآن کو فکر و تدبر کی چیز اور زندگی کی رہنما کتاب سمجھتے رہے۔ بعد میں جب قرآن صرف حصولِ ثواب اور ایصالِ ثواب کی چیز بن کے رہ گیا تو یہ اس طرح پڑھا جانے لگا جس کا مظاہرہ ہمارے حفاظِ کرام تراویح اور شبینوں میں کرتے ہیں۔

إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا (۵)

'قولِ ثقیل' سے مراد

یہ اس مقصدِ عظیم کی طرف اشارہ ہے جس کے لیے قیامِ لیل کی یہ ہدایت فرمائی گئی۔ ارشاد ہے کہ ہم عنقریب تم پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس بھاری بات کے تحمل کے لیے ایک پیشگی ریاضت اور تیاری کے طور پر آپ کو اس کا حکم ہوا۔ اس بھاری بات سے کیا مراد ہے؟ اس کے جواب میں اہلِ تاویل سے مختلف اقوال منقول ہیں لیکن ان کی بنیاد کسی دلیل پر نہیں ہے اس وجہ سے ان کے نقل کرنے میں کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ استاذ امامؒ اس سے اس انذارِ عام کو مراد لیتے ہیں جس کا حکم اگلی سورہ میں 'يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنذِرْ' (المدثر-۷۴: ۱-۲) (اے چادر میں لپٹنے والے اٹھ اور انذار کر) اور اس کے بعد کی آیات میں دیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہی رائے قرینِ قیاس ہے۔ اس لیے کہ اسی انذارِ عام سے بعد میں براءت، ہجرت اور اعلانِ جنگ کے وہ مراحل سامنے آئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارک کے شدید ترین مراحل ہیں جن میں آپؐ بھی اور آپؐ کے ساتھ صحابہؓ بھی ایسے کڑے امتحانوں سے گزرے کہ ان کے تصور سے بھی کلیجہ کانپ اٹھتا ہے۔

اقامتِ دین کی جدوجہد کی امتیازی خصوصیت

اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامِ لیل کا حکم اس جہادِ عظیم کی تیاری کے لیے دیا گیا جس سے آگے آپؐ کو اور آپؐ کے صحابہؓ کو اقامتِ دین کی راہ میں سابقہ پیش آنے والا تھا۔ اقامتِ دین کی جدوجہد کی یہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جو اس کو دوسری تمام تحریکات سے ممتاز کرتی ہے۔ اس کے لیے دوسرے وسائل و ذرائع کے فراہم ہونے سے پہلے صحیح معرفتِ رب، مستحکم ایمان، غیر متزلزل صبر اور اپنے رب پر کامل اعتماد و توکل ضروری ہے۔ ان اوصاف کے حصول کا واحد ذریعہ نماز بالخصوص شب کی نماز ہے بشرطیکہ وہ اس طرح ادا کی جائے جس طرح اس کے ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی چٹان پر اقامتِ دین کی جدوجہد کی بنیاد ہے۔ اس بنیاد کے بغیر اگر دین کی عمارت کھڑی

کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ کھڑی ہونے سے پہلے ہی زمین بوس ہوجائے گی۔

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا (۶)

قیامِ لیل کی حکمت

یہ اللہ تعالیٰ نے حکمت بتائی ہے اس بات کی کہ آپ کو قیامِ لیل کا یہ حکم کیوں دیا گیا۔ فرمایا کہ اس لیے کہ یہ وقت سکونِ قلب و دماغ کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور فہمِ قرآن کے لیے سب سے زیادہ سازگار و مددگار ہے۔

'نَاشِئَةٌ' ہمارے نزدیک 'نشأ' سے، جس کے معنی اٹھنے کے ہیں 'عَاقِبَةٌ' اور 'عَافِيَةٌ' کے وزن پر مصدر یا حاصل مصدر ہے۔ نَاشِئَةُ الَّيْلِ کے معنی ہوں گے قیامِ لیل یا شب خیزی۔ اس لفظ ہی سے یہ بات نکلی کہ تہجد کا وقت درحقیقت شب میں کچھ سو کر اٹھنے کے بعد یعنی پچھلے پہر کا ہے۔ اس وقت اٹھنا اگرچہ اس اعتبار سے ایک مشکل کام ہے کہ اس وقت کی نیند بہت محبوب ہوتی ہے لیکن اس امتحان میں انسان اگر کامیاب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی کتاب کے سمجھنے کے لیے اس سے زیادہ بابرکت وقت اور کوئی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کو اس ساعتِ میمون میں بستر سے اٹھنے کی توفیق دیتا ہے اول تو اس کو اپنے نفس کی خواہشوں پر غلبہ پانے کی ایسی قوت حاصل ہو جاتی ہے جو اس کے لیے اصلاحِ نفس کی راہ میں فتوحات کے بے شمار دروازے کھول دیتی ہے ثانیاً اللہ تعالیٰ نے، جو رات اور دن کو وجود میں لانے والا ہے، اس وقت کو اپنی رحمتوں کے نزول کے لیے مخصوص فرمایا ہے جن کے دروازے اس کے ان بندوں کے لیے کھلتے ہیں جو اس کی قدر و قیمت پہچانتے اور اس وقت اس کے دروازے پر سائل بن کر حاضر ہوتے ہیں۔

شب خیزی کی تاثیر

'اَشَدُّ وَطْاً' یہ اس وقت اٹھنے کی تاثیر بتائی ہے کہ جب آدمی اس وقت بستر سے اٹھ کر، وضو کر کے، نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو اس کے قدم خوب جمتے ہیں۔ قدم خوب جمنا دماغ کی یکسوئی، دل کے اطمینان اور عقل کی بیداری کی تعبیر ہے۔ اگر دماغ پریشان اور قلب بے سکون ہو تو آدمی کے قدم نہیں جمتے، کوئی بڑا کام تو درکنار وہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی دلجمعی سے نہیں کر سکتا۔ گویا یہاں ظاہر سے ان کے باطن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعض مفسرین نے اس کے یہ معنی لیے ہیں کہ اس وقت اٹھنا نفس کو اچھی طرح کچلنے والا ہے۔ اگرچہ الفاظ میں اس معنی کی بھی گنجائش ہے لیکن آگے کے فقرے سے اسے مناسبت نہیں ہے۔ میں نے جو معنی اختیار کیے ہیں وہ دوسرے مفسّرین نے بھی لیے ہیں لیکن انھوں نے اس حقیقت کی طرف اشارہ نہیں کیا کہ ثباتِ قدم درحقیقت قلبی و عقلی یکسوئی و دلجمعی کی تعبیر ہے۔

'وَّاَقْوَمُ قِيْلًا' یعنی یہ وقت چونکہ دماغ کے سکون اور دل کی بیداری کا خاص وقت ہے اس وجہ سے زبان سے جو بات نکلتی ہے تیر بہدف اور 'از دل خیزد بر دل ریزد'، کا مصداق بن کر نکلتی ہے۔ آدمی خود بھی اس کو اپنے دل کی گواہی کی طرح قبول کرتا ہے اور دوسرے سننے والوں کے دلوں پر

بھی اس کی تاثیر بے خطا ہوتی ہے۔ جنات کا جو واقعہ سورۂ جن میں بیان ہوا ہے روایات اور قرائن دونوں سے ثابت ہے کہ انھوں نے تہجّد ہی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھتے سنا اور اس درجہ متاثر ہوئے کہ نہ صرف اس پر ایمان لائے بلکہ اپنی قوم کے اندر اس کے داعی بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے عظیم انسان کے دل کو بھی اسی طرح کے ایک واقعہ نے فتح کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تہجّد میں اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق تلاوتِ قرآن صرف اپنے ہی نفس کے تہذیب و تزکیہ کے لیے نہیں بلکہ بعض اوقات دوسروں کے ارواح و قلوب کو زندہ کر دینے کے لیے بھی ندائے غیب کی حیثیت رکھتی ہے خواہ وہ جنوں میں سے ہوں یا انسانوں میں سے۔

إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا (۷)

'سبحِ طویل' کی تاویل

عام طور پر لوگوں نے اس کے معنی یہ لیے ہیں کہ دن میں تمھارے لیے اور بھی بہت سے کام ہیں یعنی دن میں چونکہ دوسرے بہت سے دھندے گھیرے رہتے ہیں، نماز کے لیے دلجمعی کا وقت مشکل ہی سے میسّر آتا ہے، اس وجہ سے شب میں تم کو تہجّد کے اہتمام کا حکم دیا گیا۔

لفظ 'سبح' کے اندر، از روئے لغت، اس معنی کی گنجائش موجود ہے لیکن ہمارا دل مختلف وجوہ سے اس تاویل پر نہیں جمتا۔

اوّل وجہ یہ ہے کہ قیامِ لیل کے لیے پچھلے پہر کا وقت اللہ تعالیٰ نے صرف اس وجہ سے نہیں منتخب فرمایا ہے کہ دن میں آدمی کے سامنے دوسری بہت سی مشغولیتیں ہیں بلکہ قرآن کے متعدد اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں اپنے مزاج و کیفیات کے اعتبار سے یہی وقت ان مقاصد کے لیے سب سے زیادہ سازگار ہے جو قیامِ شب سے مقصود ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر یہ بات کہنی ہوتی تو اس کے لیے سادہ اسلوبِ بیان یہ ہوتا کہ 'إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ شُغُلًا كَثِيرًا' یا اس کے ہم معنی دوسرے الفاظ ہوتے۔ لفظ 'سبح'، تیرتے، چلنے وغیرہ کے معنی میں آتا تو ہے لیکن شغل اور مصروفیت کے معنی میں یہ ایسا معروف نہیں ہے کہ بغیر واضح قرینہ کے ذہن اس کی طرف منتقل ہو سکے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اگر لفظ 'سبح' یہاں اس معنی میں ہوتا تو اس کی صفت 'طَوِيلًا' کی جگہ 'كَثِيرًا' یا 'كَبِيرًا' زیادہ موزوں ہوتی۔

ان مختلف وجوہ سے اس تاویل پر دل پوری طرح مطمئن نہیں ہوتا۔ ہمارے نزدیک لفظ 'تسبیح' یہاں اپنے معروف معنی یعنی تسبیح کرنے ہی کے معنی میں ہے اور آیت کی تاویل یہ ہے کہ شب میں تمھیں جس اہتمامِ نماز کا حکم دیا جا رہا ہے اس کے علاوہ دن میں بھی تمھارے لیے کافی تسبیح کا موقع ہے جس کا اہتمام رکھو۔ چنانچہ یہ امرِ واقعہ ہے کہ حضورؐ دن میں بھی اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے

اور سوتے جاگتے اللہ تعالیٰ کے ذکر کا اہتمام رکھنے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے آپ سے دعائیں منقول ہیں۔ آدمی ان کا اہتمام رکھے تو اس کا کوئی قدم بھی ذکر کے بغیر نہیں اٹھ سکتا اور ان کی برکت سے آدمی کے وہ کام بھی عبادت بن جاتے ہیں جو بظاہر دنیا کے کام خیال کیے جاتے ہیں۔

دین میں مطلوب ذکر دوام ہے | یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ دین میں مطلوب ذکرِ دوام ہے۔ اس مسئلہ پر اس کے مقام میں بحث ہو چکی ہے۔ جس طرح انسان کی مادی زندگی کے لیے سانس ضروری ہے اسی طرح اس کی روحانی زندگی کے لیے اللہ کی یاد ضروری ہے۔ سانس رک جائے تو جسم مردہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ سے غفلت ہو جائے تو روح پژمردہ ہو جاتی ہے۔ دل ذکر کی جھڑی ہی سے زندہ رہتا ہے اور دل کی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔

آیاتِ آفاق و انفس میں تفکر بھی ذکر ہے | یہاں وہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے جو اس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں بیان ہو چکی ہے کہ اللہ کے دین کی دعوت اور آیاتِ آفاق وانفس میں تدبر و تفکر بھی ذکر ہی میں شامل ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ اس کو افضل الذکر کی حیثیت حاصل ہے اس لیے کہ اس تفکر ہی سے درحقیقت ذکر کے اندر حقیقی معنویت پیدا ہوتی ہے۔ یہ نہ ہو تو ذکر محض ورزشِ زبان بن کے رہ جاتا ہے۔ زندگی پر اس کا کوئی مفید اثر مترتب نہیں ہوتا۔ اس مسئلہ پر اَلَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (آل عمران - ۳: ۱۹۱) کے تحت بحث گزر چکی ہے۔

وَاذۡکُرِ اسۡمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلۡ اِلَیۡہِ تَبۡتِیۡلًا (۸)

رب کے دامنِ رحمت میں پناہ گیر ہونے کا طریقہ | 'تَبَتُّلٌ' اور 'تَبۡتِیۡلٌ' دونوں کے معنی انقطاع الی اللہ کے ہیں یعنی خلق سے کٹ کر رب کے دامنِ رحمت میں پناہ گیر ہو جانا۔ یہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو طریقہ بتایا اس بات کا کہ جب جب لوگوں کی حق بیزاری اور دل آزاری سے دل آزردہ ہو تو تم ان ناقدروں سے کٹ کر اپنے رب کے دامنِ رحمت میں پناہ گیر ہو جایا کرو اور اس کے لیے تمھیں اس کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے کہ تم اس کے نام کو یاد کرو۔ جب تم اس کے نام کے ساتھ اس کو یاد کرو گے تو وہ خود تمھیں اپنی پناہ میں لے لے گا۔

صفاتِ الٰہی کا استحضار | یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام نام اس کی صفات کی تعبیر ہیں اور ان صفات ہی پر تمام دین و شریعت اور سارے ایمان و عقیدہ کی بنیاد ہے۔ ان صفات کا صحیح علم مستحضر رہے تو آدمی کی پشت پر ایک ایسا لشکرِ گراں اس کے محافظ کی حیثیت سے موجود رہتا ہے کہ شیطان کی ساری فوجیں اس کی نگاہ میں پرِکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتیں۔ وہ اپنے آپ کو پہاڑوں سے بھی زیادہ مستحکم محسوس کرتا ہے۔ اور اگر خدا کی صفات کی صحیح یادداشت اس کے اندر باقی نہ رہے یا کمزور ہو جائے تو پھر اس کا عقیدہ بے بنیاد یا کمزور ہو جاتا ہے جس کے سبب سے اس کو منافقین کی طرح ہر بجلی اپنے ہی خرمن

پر گرتی نظر آتی ہے۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا (۹)

یعنی اللہ کی پناہ کسی کمزور کی پناہ نہیں ہے بلکہ تمام مشرق و مغرب کے خداوند کی پناہ ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے جو اس کا شریک و سہیم ہو یا اس کے ارادوں میں مزاحم ہو سکے۔ اس کو وکیل بناؤ گے تو وہ تمھارے لیے کافی ہے۔ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا (النساء - ۴ : ۸۱)

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا (۱۰)

مخالفین کی باتوں پر صبر اور اس صبر کا طریقہ

اپنے جھٹلانے والوں کی بے ہودہ گوئیوں پر صبر کرو اور اپنے موقف پر ڈٹے رہو نہ ان کی باتوں کا غم کرو اور نہ زیادہ ان کے درپے ہو بلکہ ان کو خوبصورتی کے ساتھ چھوڑ دو۔ وہ اپنی اس روش کا خمیازہ خود بھگتیں گے۔

چھوڑنا دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک چھوڑنا تو وہ ہے جو فضیحتا اور لعن طعن کے بعد، عناد و انتقام کے جذبہ کے ساتھ ہو۔ اس طرح کا چھوڑنا عام دنیا داروں کا شیوہ ہے۔ اخیار و صالحین یہ طریقہ نہیں اختیار کرتے۔ وہ خلق کی اصلاح کی کوشش اپنی کسی ذاتی منفعت کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کی ہدایت اور اللہ کی رضا کے لیے کرتے ہیں۔ لوگ ان کی ناقدری اور دل آزاری کرتے ہیں تو انھیں غصہ یا نفرت کے بجائے ان کے حال پر افسوس اور ان کی محرومی و بدانجامی پر صدمہ ہوتا ہے۔ اس صورت میں وہ ان کے رویہ سے مجبور ہو کر ان کو چھوڑتے تو ہیں لیکن یہ چھوڑنا اسی طرح کا ہوتا ہے جس طرح ایک شریف باپ اپنے نالائق بیٹے کے رویہ پر خاموشی اور علیحدگی اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح کے چھوڑنے کو یہاں 'ھجر جمیل' سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس طرح کی علیحدگی بعض اوقات مفید نتائج پیدا کرتی ہے جن کے اندر خیر کی کوئی رمق ہوتی ہے وہ اس شریفانہ طرزِ عمل سے متاثر اور اپنے رویہ کا جائزہ لینے کی طرف مائل ہوتے ہیں ورنہ کم سے کم انھیں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ شخص ان کے باطل پر راضی ہونے والا نہیں ہے خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ جب تک پیغمبر اپنی قوم کے اندر رہتا ہے قوم کی زیادتیوں کا مقابلہ وہ اسی 'ھجر جمیل' سے کرتا ہے۔ البتہ جب قوم کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو وہ اس کو اعلانِ براءت کے ساتھ چھوڑتا ہے اور اس کا یہ چھوڑنا قوم کی موت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا (۱۱)

تکذیب کرنے والوں کو سخت دھمکی

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے جھٹلانے والوں کو اللہ تعالیٰ نے نہایت سخت دھمکی دی ہے کہ تم ان کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو اور تھوڑی سی مہلت ان کو اور دو۔ مطلب یہ ہے کہ پھر دیکھو کہ ان کا حشر کیا ہوتا ہے!

'وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ' کے اسلوب سے یہ بات نکلتی ہے کہ تم الگ ہو کر بیٹھو اور مجھے تنہا ان سرکشوں

سے ممنٹ لینے دو، تمھارے ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ ان جھٹلانے والوں کی تباہی میں کچھ دیر ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی ان کے اندر تم موجود ہو۔ سنت الٰہی یہ ہے کہ جب تک پیغمبر قوم کے اندر موجود رہتا ہے اس وقت تک قوم پر عذاب نہیں آتا۔ تم چھوڑ دو تو چشم زدن میں ان سرکشوں کا تیا پانچا ہوا جاتا ہے۔ یہ ان ظالموں کی بدبختی ہے کہ وہ تمھارے درپے آزار ہیں۔ ان کے لیے عذاب کے مقابل میں امان کی دیوار تمھی ہو۔ اگر اس امان سے انھوں نے اپنے کو محروم کر لیا تو عذاب سے ان کو کون بچائے گا۔

'اُولِي النَّعْمَةِ' کے معنی ارباب تنعم و رفاہیت کے ہیں۔ لفظ 'نَعْمَةٌ' رفاہیت و تنعم کے معنی میں آتا ہے۔ 'مُكَذِّبِيْنَ' کی اس صفت کے حوالہ سے مقصود ان کے سبب تکذیب کا سراغ دینا اور ان کی ناشکری پر ان کو ملامت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو تنعم و رفاہیت سے بہرہ مند فرمایا تھا تو اس کا حق یہ تھا کہ اپنے رب کے شکرگزار رہتے لیکن اللہ کی بخشی ہوئی خوشحالی ان کے لیے استکبار کا سبب ہوئی اور وہ اپنے رب کے حریف بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

إِنَّ لَدَيْنَا أَنكَالًا وَجَحِيمًا ۝ وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا (۱۲-۱۳)

یعنی جب ہماری بخشی ہوئی رفاہیت اس دنیا میں اُن کے لیے استکبار اور رسول کی تکذیب کا سبب ہوئی تو یاد رکھیں کہ ان کے لیے ہمارے پاس آخرت میں بیڑیاں اور جہنم ہے۔ یعنی بیڑیوں اور زنجیروں کے اندر جکڑ کر جہنم کے اندر جھونک دیے جائیں گے۔

'أَنكَالًا' جمع ہے 'نِكْلٌ' کی۔ اس کے معنی بیڑی کے بھی ہیں اور آہنی لگام کے بھی۔ دوسرے مقام میں 'سَلَاسِلَ' اور 'أَغْلَالًا' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

'وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا' یعنی ہم نے ان کو جو تر نوالے بخشے انھوں نے ان کا حق نہیں پہچانا تو یاد رکھیں کہ آخرت میں ان کو وہ کھانا ملے گا جو ان کے حلق میں پھنس کر رہ جائے گا اور اس عیش کی جگہ ان کو ایک دردناک عذاب سے سابقہ پیش آئے گا۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا (۱۴)

یہ اس دن کی یاد دہانی ہے جس دن ان مغروروں کو مذکورہ حالات سے سابقہ پیش آئے گا۔ فرمایا کہ اس دن یہ زمین اور پہاڑ سب لرز اٹھیں گے اور امرا کے ایوان و محل تو درکنار پہاڑوں کا بھی یہ حال ہوگا کہ وہ بھربھرے ریت کے تودوں کے مانند ہو جائیں گے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا ۝ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۝ فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا (۱۵-۱۶)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ضروری ہدایات دینے کے بعد اب یہ قریش کو تنبیہ فرمائی جا رہی ہے کہ

جس طرح ہم نے فرعون کی طرف اپنا ایک رسول بھیجا تھا اسی طرح تمہاری طرف بھی ایک رسول بھیج دیا ہے تاکہ وہ ہمارے خاص شاہد کی حیثیت سے تمہیں بتا دے کہ ہماری پسند اور ہمارے احکام کیا ہیں اور تم نے ان کو قبول کیا تو دنیا اور آخرت میں اس کا کیا صلہ ملے گا اور اگر اس کی نافرمانی کی تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ تم جس شخص کی تکذیب و توہین کر رہے ہو اس کے مرتبہ اور اس کی حیثیت کو اچھی طرح جان اور سمجھ لو کہ اس کی تکذیب کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں۔ وہ کوئی سائل یا محض واعظ نہیں ہے جس کے رد و قبول کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو بلکہ اللہ نے اس کو تمہارے اوپر حق کی گواہی دینے کے لیے بھیجا ہے اس وجہ سے اس کے ذریعہ سے لازماً حق و باطل کے درمیان فیصلہ ہونے والا ہے اور یہ فیصلہ اسی طرح ہوگا جس طرح موسیٰ اور فرعون کے درمیان ہوا۔ جس طرح فرعون نے رسول کی نافرمانی کی تو اللہ نے اس کو پکڑا اور اس طرح پکڑا کہ اس کو کوئی پناہ نہ مل سکی اسی طرح تمہیں بھی وہ اس طرح پکڑے گا کہ کوئی اس کے پنجہ سے تمہیں چھڑا نہ سکے گا۔

'شَاهِدًا عَلَيْكُمْ' کے مفہوم کی پوری وضاحت ہم لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (البقرۃ - ۲: ۱۴۳) کے تحت کر چکے ہیں۔

فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ‎(۱۷)

یعنی ابھی پکڑ نہیں ہو رہی ہے تو یہ نہ سمجھو کہ کبھی نہیں ہو گی۔ اس دنیا میں نہ بھی ہوئی تو آخرت تو بہرحال شُدنی ہے تو سوچ لو کہ اگر تم نے رسول کا انکار کیا تو اس دن کے ہول سے کس طرح بچو گے جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا! 'بچوں کو بوڑھا بنا دے گا' کسی ہول کی شدت اور بے پناہی کی تعبیر ہے۔ ہماری زبان میں بھی بولتے ہیں کہ فلاں صدمہ نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ روایات میں بھی آتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ 'شیبتنی هود واخواتها' مجھے سورۂ ہود اور اس کی ہم جنس سورتوں نے بوڑھا کر دیا۔ عرب شعراء نے بھی مختلف اسلوبوں سے یہ محاورہ استعمال کیا ہے۔ یہ معروف ہے اس وجہ سے شواہد نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صاحب کشاف نے بعض شواہد کا حوالہ دیا ہے جو قابلِ اعتماد ہیں۔

السَّمَاءُ مُنْفَطِرٌ بِهِ ۚ كَانَ وَعْدُهُ مَفْعُولًا ‎(۱۸)

یعنی روزِ قیامت کو کوئی اَن ہونی بات نہ خیال کرو۔ آسمان اس کے بوجھ سے پھٹا پڑ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پھٹ پڑے اور قیامت اس کے اندر سے نمودار ہو جائے اور تم اسی طرح اس سے غفلت ہی میں رہو۔ یہی مضمون سورۂ اعراف میں اس طرح بیان ہوا ہے:

ثَقُلَتْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً ۗ (الاعراف - ۷: ۱۸۷)

آسمان و زمین دونوں اس کے حمل سے بوجھل ہیں، وہ تمہارے اوپر اچانک ہی آدھمکے گی۔

یعنی آخرت کوئی محتاجِ ثبوت چیز نہیں ہے، اس کے ظہور کا وقت اگرچہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے

علم میں نہیں ہے لیکن اس کے شواہد آسمان و زمین میں اس طرح نمایاں ہیں جس طرح آخری دنوں میں حاملہ کا حمل ہوتا ہے۔ اس کے جننے کا صحیح وقت کوئی نہیں بتا سکتا لیکن ہر آنکھ رکھنے والا جانتا ہے کہ وہ جننے گی۔ اسی طرح قیامت کے آثار نمایاں ہیں اور آسمان اس کے بوجھ سے اس طرح پھٹا پڑ رہا ہے کہ ہر لمحہ اس کا ظہور متوقع ہے۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو صرف اس بنا پر اس سے نچنت ہیں کہ ان کو اس کا صحیح وقت نہیں بتایا گیا۔

إِنَّ هَٰذِهِ تَذْكِرَةٌ ۖ فَمَن شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا (۱۹)

'ھٰذِہٖ' سے اشارہ قرآن کی ان آیات کی طرف ہے جو قریش کو آخرت کی تذکیر کے لیے سنائی گئیں۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب سے پہلے تذکیر و تنبیہ ضروری تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بھیج کر حجت تمام کردی۔ اب ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے جس کا جی چاہے اپنے رب کی راہ اختیار کرکے اس کی رحمت و رضوان کا مستحق بن جائے اور جس کا جی چاہے وہ اپنی گمراہی پر اڑا رہے اور اس کا انجام دیکھے۔ اللہ کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ ۚ وَاللَّهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ عَلِمَ أَن لَّن تُحْصُوهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۖ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۚ عَلِمَ أَن سَيَكُونُ مِنكُم مَّرْضَىٰ ۙ وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِن فَضْلِ اللَّهِ ۙ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۚ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ هُوَ خَيْرًا وَأَعْظَمَ أَجْرًا ۚ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۲۰)

ابتدائے سورہ کے بعض احکام سے متعلق وضاحت

یہ اس سورہ کی آخری آیت ہے۔ اس کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہوئی لیکن اس کا تعلق اسی حکم سے ہے جو ابتدائے سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قیام لیل سے متعلق، دیا گیا ہے اس وجہ سے جگہ اس کو اسی سورہ کے آخر میں ملی تاکہ اس باب کے سابق اور لاحق دونوں حکموں کی نوعیت اور ان کا باہمی تعلق سمجھنے میں مدد ملے۔ اس کی متعدد مثالیں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں اور یہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ سورتوں میں آیات کی ترتیب ان کی معنوی مناسبت سے ہے اور یہ کام اللہ تعالیٰ کے حکم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے تحت ہوا ہے۔

'إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ'۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تحسین فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو خوب علم ہے کہ تمھیں شب میں قیام کا جو حکم دیا گیا تم پورے اہتمام کے ساتھ اس کی پابندی کر رہے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تمھاری یہ سرگرمیاں

اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں اور جب اس کے علم میں ہیں تو یہ رائگاں جانے والی نہیں ہیں بلکہ ان کا بھرپور صلہ پاؤ گے۔

'وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تحسین کے بعد یہ ان مسلمانوں کی تحسین ہے جنھوں نے آپ کے اتباع کے شوق میں ازخود اس حکم کی پابندی اپنے اوپر لازم کرلی۔ یہ حکم تھا تو، جیسا کہ الفاظ سے واضح ہے، خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لیے لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم ہر اس کام کے لیے سبقت کرتے جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کاربند دیکھتے۔ اگرچہ ایمان بالرسول کا حقیقی تقاضا یہی ہے کہ رسول کے ہر نقشِ قدم کی پیروی کی جائے لیکن رسول کی قوتِ برداشت اور دوسروں کی قوتِ برداشت میں بڑا فرق ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے عام مسلمانوں کے لیے اس حکم کی نوعیت میں تبدیلی کر دی، جس کی وضاحت آگے کے ٹکڑے میں آرہی ہے، تاکہ ان کے لیے یہ بوجھ ان کی قوتِ برداشت سے زیادہ نہ ہو جائے۔

عام مسلمانوں کے لیے تخفیف

'وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ' فرمایا کہ رات اور دن کو مقدر کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی اچھی طرح جانتا ہے کہ ان کے تقاضے اور مطالبے کیا ہیں، زندگی پر کن کن پہلوؤں سے یہ اثر انداز ہوتے ہیں، انسان ان میں سے کس کا کس حد تک محتاج ہے اور اس کو کن حالات و مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اپنے اسی علم کی روشنی میں اس کا فیصلہ یہ ہے کہ تم نصف شب یا ثلث یا دو ثلث شب کے قیام کی پابندی کا اہتمام نہ کر سکو گے تو جتنا بھی ممکن ہو سکے اتنا قرآن پڑھ لیا کرو۔

'فَتَابَ عَلَيْكُمْ' کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ 'تَابَ' کا صلہ جب 'عَلٰی' کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی عنایت کی نظر کرنے کے ہو جاتے ہیں۔

'فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ' کے الفاظ اگرچہ عام ہیں لیکن یہ بات قیامِ لیل کے سلسلہ میں فرمائی گئی ہے اس وجہ سے مدعا تہجد ہی میں قرآن پڑھنا ہے۔ اگرچہ تلاوتِ قرآن بجائے خود بھی عبادت ہے لیکن تہجد میں، ترتیل کے ساتھ، اس کی تلاوت ہی سے وہ برکتیں ظہور میں آتی ہیں جن کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اہتمام کے ساتھ اس سورہ میں اس کا حکم دیا گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ تخفیف درحقیقت عام مسلمانوں کے لیے اس بنا پر ہوئی کہ وہ اس بھاری بوجھ کو نہیں اٹھا سکتے تھے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بدستور اسی اصل حکم پر آخری لمحاتِ حیات تک قائم رہے جو آپ کو دیا گیا۔ عام اہلِ ایمان کے لیے ایک فضیلت کے درجے میں یہ باقی ہے اور یہ بات ہر ایک کے شوق اور حوصلہ پر چھوڑ دی گئی ہے کہ وہ اس میں کتنا حصہ لیتا ہے۔

'عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ڮ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ'

یہ ان امکانات کی طرف اشارہ ہے جو پیش آسکتے ہیں اور جو اس تخفیف کے متقاضی ہوئے۔ تخفیف کے
فرمایا کہ تم میں مریض بھی ہوں گے، مختلف دینی و دنیاوی ضروریات کے لیے سفر کرنے والے بھی ہوں گے، وجوہ
اللہ کی راہ میں تمھیں جنگ کے لیے بھی اٹھنا ہوگا اس وجہ سے اس سعادت میں حصہ لینے کے لیے یہ
کافی ہے کہ تم جتنا وقت بھی پا جاؤ اور جتنا قرآن بھی پڑھ سکو پڑھ لیا کرو۔

یَضۡرِبُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ یَبۡتَغُوۡنَ مِنۡ فَضۡلِ اللّٰہِ' سے مراد ہر وہ سفر ہے جو کسی نیک اور اعلیٰ مقصد سے ہو، عام اس سے کہ وہ طلبِ علم کے لیے ہو یا حج کے لیے یا تجارت کے لیے۔ تجارتی سفر کے لیے یہ الفاظ قرآن میں جگہ جگہ آئے ہیں۔

'وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَقۡرِضُوا اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا'۔ یہ اس کسر کے جبر کی تدبیر بتائی ہے کہ اگر قیامِ شب کی برکتوں میں تم پورا پورا حصہ نہیں لے سکتے تو اپنے امکان کے حد تک پنج وقتہ نمازوں کا اہتمام رکھو، زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کے کلمہ کو بلند اور دین و ملّت کی ہنگامی ضروریات میں فراخ دلی سے خرچ کرتے رہو۔ اس طرح تم اپنے رب کا قرب اور اس کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہو۔

'وَاَقۡرِضُوا اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا' سے یوں تو ہر وہ انفاق مراد ہو سکتا ہے جو اللہ کی راہ میں فراخ دلی سے کیا جائے لیکن جب اس کا ذکر ایتائے زکوٰۃ کے ساتھ ہو تو اس سے خاص طور پر وہ انفاق مراد ہوتا ہے جو جنگ و جہاد یا کسی اہم ہنگامی ضرورت کے لیے کیا جائے۔

'وَمَا تُقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِکُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ تَجِدُوۡہُ عِنۡدَ اللّٰہِ ہُوَ خَیۡرًا وَّاَعۡظَمَ اَجۡرًا'۔ یہ انفاق کے لیے ترغیب و تشویق ہے کہ اللہ کی راہ میں جو خرچ کرو گے وہ کسی دوسرے کے لیے نہیں بلکہ اپنے ہی لیے کرو گے۔ وہ خدا کے ہاں تمھارے ہی کھاتے میں جمع ہوگا اور اس کو نہایت بہتر اور نافع تر شکل میں اپنے رب کے ہاں پاؤ گے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی خسارے کا سودا نہیں بلکہ سب سے زیادہ نفع بخش تجارت ہے۔

'وَاسۡتَغۡفِرُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ'۔ یعنی اس اہتمام کے علاوہ جو مذکور ہوا، برابر اپنے رب سے اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کی معافی بھی مانگتے رہو اور یہ امید رکھو کہ وہ معاف فرمائے گا۔ وہ بڑا ہی غفور رّحیم ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وہ غلطیوں سے درگزر فرمائے اور اس کی صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے۔ واللہ ھوالموفّق للصواب۔

رحمان آباد

۷۔ نومبر ۱۹۷۸ء

۵۔ ذوالحجہ ۱۳۹۸ھ

تدبّرِ قرآن

٧٤

المدّثّر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــ المزّمّل ـــــ کی توام ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ نام بھی دونوں کے بالکل ہم معنی ہیں۔ سابق سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جس 'قولِ ثقیل' کے تحمل کے لیے تیاری کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے اس میں اس کا واضح الفاظ میں اظہار کر دیا گیا ہے کہ آپ کمربستہ ہو کر لوگوں کو انذار کریں، مخالفتوں کے علی الرغم اپنے موقفِ حق پر ڈٹے رہیں۔ دشمنوں کے معاملہ کو اللہ پر چھوڑیں اور اس امر کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں کہ آپ کا فریضہ اس قرآن کے ذریعہ سے لوگوں کو صرف یاددہانی کر دینا ہے، ہر ایک کے دل میں اس کو اتار دینا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس کو قبول وہی کریں گے جو سنتِ الٰہی کے مطابق اس کے قبول کرنے کے اہل ہوں گے۔ جو اس کے اہل نہیں ہیں وہ اس سے بیزار ہی رہیں گے خواہ ان کی ہدایت کے لیے آپ کتنے ہی جتن کریں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱ - ۱۰) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ آپ کمربستہ ہو کر لوگوں کے انذار کے لیے اٹھیں۔ اپنے رب ہی کی عظمت و کبریائی کا اعلان کریں۔ اپنے دامنِ دل کو ہر قسم کے غبار سے پاک رکھیں۔ شرک کی ہر چھوت سے دور رہیں۔ اپنی جدوجہد برابر جاری رکھیں اور اپنے رب کی خاطر تمام مخالفتوں کے علی الرغم حق پر ڈٹے رہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی کو برومند کرے گا اور آپ کی دعوت پھلے پھولے گی۔

(۱۱ - ۱۷) لوگوں کو قیامت کے ہول سے اچھی طرح آگاہ کر دیں کہ وہ دن کافروں کے لیے بڑا ہی سخت ہو گا، اس کو آسان چیز نہ خیال کریں۔ جو اپنے مال و جاہ کے غرور میں مست اور اس گھمنڈ میں مبتلا ہیں کہ جو کچھ انھیں دنیا میں حاصل ہے آخرت ہوئی تو اس میں بھی انھیں حاصل رہے گا بلکہ وہ اس سے بھی زیادہ پائیں گے، وہ اس حقیقت کو فراموش نہ کریں کہ جب اللہ نے ان کو پیدا کیا تو وہ اپنی ماؤں کے پیٹ سے تنہا اس دنیا میں آئے۔ مال و جاہ میں سے کوئی چیز بھی ان کے ساتھ نہ تھی۔ پھر اللہ نے ان کو مال و اولاد سے نوازا اور ان کے لیے کامیابیوں کی گوناگون راہیں کھولیں لیکن وہ اپنے رب کے شکر گزار ہونے کے بجائے اس رعونت میں مبتلا ہو گئے کہ جو کچھ انھیں حاصل ہے وہ ان کا پیدائشی حق ہے، جس طرح یہ یہاں حاصل ہے آخرت ہوئی تو اس سے بڑھ چڑھ کر وہاں حاصل ہو گا۔

حالانکہ ان کا یہ زعم بالکل باطل ہے۔ اس میں پھنس کر وہ ہماری آیات کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے تو یاد رکھیں کہ اس کی پاداش میں انھیں ایک بڑی ہی سخت چڑھائی چڑھنی پڑے گی۔

(۱۸ - ۲۵) قریش کے متمردین نے قرآن اور اس کے انذار کی تکذیب کے لیے جو بہانا تراشا اور جس استکبار کے ساتھ اس کا اظہار کیا اس کی تصویر اور ان کی بدبختی پر اظہارِ افسوس کہ انھوں نے قرآن کا بہت ہی غلط اندازہ کیا، وہ اس کو پیغمبر کی جادو بیانی کا کرشمہ اور اس کے انذار کو بالکل ناقابلِ التفات سمجھے حالانکہ اس کی ایک ایک بات حقیقت ہے جو ان کے سامنے آئے گی۔

(۲۶ - ۳۱) اس دوزخ کی تصویر جس سے اٹکل کے تیر تکے چلانے والوں کو سابقہ پیش آئے گا۔ ساتھ ہی ایک برسرِ موقع تنبیہ کہ یہ متکبرین چونکہ ہمہ دانی کے زعم میں بھی مبتلا ہیں اس وجہ سے دوزخ کا جو حال ان کو سنایا گیا ہے اس کی بعض باتوں کو وہ مذاق کا ہدف بنا لیں گے، کہیں گے بھلا اس طرح کی باتیں بیان کرنے کا کیا فائدہ؟ حالانکہ یہ باتیں اللہ تعالیٰ خاص حکمت سے بیان فرما رہا ہے جس کے اندر صلاحیت اور علم کی طلب ہے وہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے، رہے وہ جو جہل کے باوجود غرورِ ہمہ دانی میں مبتلا ہیں وہ ان کے سبب سے فتنہ میں مبتلا ہوں گے اور اپنی عاقبت برباد کریں گے۔

(۳۲ - ۴۸) قیامت کی ایک آفاقی دلیل اور اس کی تکذیب کرنے والوں کی جہالت پر اظہارِ تعجب کہ وہ اس کائنات کے اس سب سے بڑے حادثہ سے کس طرح نچنت ہیں! قرآن لوگوں کو اس سے آگاہ کر رہا ہے تاکہ جو اس کے لیے تیاری کرنی چاہیں وہ کر لیں اور جو منہ موڑنا چاہتے ہیں ان پر حجت تمام ہو جائے کہ وہ کوئی عذر نہ پیش کر سکیں۔ انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس دن ہر شخص اپنے اعمال کے عوض گرو ہوگا۔ اس کا عمل ہی اس کو چھڑائے گا اور عمل ہی جہنم میں لے جائے گا۔ اس دن کسی کی بھی سعی و سفارش ذرا بھی کسی کو نفع نہ پہنچائے گی۔ اس دن کی کامیابی صرف اصحاب الیمین کو حاصل ہوگی۔ وہ جنت میں براجمان گے اور وہیں سے بیٹھے بیٹھے وہ دوزخ والوں سے معلوم کریں گے کہ وہ دوزخ میں کیوں پڑے تو وہ ان کے جواب میں برملا اپنے ان جرائم کا اعتراف کریں گے جو ان کی اس بدانجامی کے سبب ہوئے۔

(۴۹ - ۵۶) قرآن سے بدکنے والوں کے حال پر تعجب۔ ان کے بدکنے کے اصلی اسباب کی طرف اشارہ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ آپ ان لوگوں کی پروا نہ کریں۔ آپ کا کام صرف یاددہانی ہے۔ جو لوگ اس یاددہانی سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے وہ اپنا حشر خود دیکھیں گے۔ اس سے فائدہ وہی اٹھائیں گے جو سنتِ الٰہی کے تحت اس کے سزاوار ہوں گے۔

سُوْرَةُ الْمُدَّثِّرِ

مَكِّيَّةٌ ______________ اٰيات : ۵۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱ - ۶ يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ ﴿۱﴾ قُمْ فَاَنْذِرْ ۖ ﴿۲﴾ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۖ ﴿۳﴾ وَثِيَابَكَ
فَطَهِّرْ ۖ ﴿۴﴾ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۖ ﴿۵﴾ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۖ ﴿۶﴾ وَ
لِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ؕ ﴿۷﴾ فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ ۙ ﴿۸﴾ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ
يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ۙ ﴿۹﴾ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ﴿۱۰﴾ ذَرْنِيْ وَمَنْ
خَلَقْتُ وَحِيْدًا ۙ ﴿۱۱﴾ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۙ ﴿۱۲﴾ وَّبَنِيْنَ
شُهُوْدًا ۙ ﴿۱۳﴾ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ۙ ﴿۱۴﴾ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ
اَزِيْدَ ۙ ﴿۱۵﴾ كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ؕ ﴿۱۶﴾ سَاُرْهِقُهٗ
صَعُوْدًا ؕ ﴿۱۷﴾ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۙ ﴿۱۸﴾ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۙ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ قُتِلَ
كَيْفَ قَدَّرَ ۙ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ نَظَرَ ۙ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۙ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۙ ﴿۲۳﴾
فَقَالَ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۙ ﴿۲۴﴾ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ؕ ﴿۲۵﴾
سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ﴿۲۶﴾ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ؕ ﴿۲۷﴾ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ۚ ﴿۲۸﴾
لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ۚۖ ﴿۲۹﴾ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ؕ ﴿۳۰﴾ وَمَا جَعَلْنَاۤ
اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۙ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ

كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا
وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ؕ كَذٰلِكَ
يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ
ع اِلَّا هُوَ ؕ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ﴿۳۱﴾ كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿۳۲﴾ وَالَّيْلِ اِذْ
اَدْبَرَ ﴿۳۳﴾ وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ﴿۳۴﴾ اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ﴿۳۵﴾ نَذِيْرًا
لِّلْبَشَرِ ﴿۳۶﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ﴿۳۷﴾ كُلُّ نَفْسٍۢ
مع بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ﴿۳۹﴾ فِيْ جَنّٰتٍ
يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۱﴾ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾
قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿۴۳﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ﴿۴۴﴾
وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۴۶﴾
حَتّٰىٓ اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ﴿۴۷﴾ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿۴۸﴾
فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ﴿۴۹﴾ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ﴿۵۰﴾
فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿۵۱﴾ بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ
يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿۵۲﴾ كَلَّا ؕ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۵۳﴾
كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ﴿۵۴﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۵۵﴾ وَمَا
يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَ
ع اَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿۵۶﴾

ترجمۂ آیات ۱-۵۶

اے چادر لپیٹے رکھنے والے! اٹھ اور لوگوں کو ڈرا۔ اور اپنے رب ہی کی کبریائی کی منادی کر اور اپنے دامن کو پاک رکھ اور ناپاکی کو چھوڑ اور اپنی سعی کو زیادہ خیال کر کے منقطع نہ کر۔ اور اپنے رب کی راہ میں ثابت قدم رہ۔ ۱-۷

پس جب صور پھونکا جائے گا تو وہ وقت نہایت کٹھن وقت ہو گا! کافروں پر آسان نہ ہو گا! چھوڑ مجھ کو اور اس کو جس کو میں نے پیدا کیا اکیلا۔ اور اس کو بخشا مال فراواں۔ اور بیٹے دیے حاضر باش اور اس کے لیے خوب راہ ہموار کی۔ پھر وہ یہ توقع رکھتا ہے کہ میں اس کے لیے اور زیادہ کر دوں گا۔ ہرگز نہیں! وہ تو ہماری آیتوں کا دشمن نکلا۔ میں اس کو عنقریب ایک سخت چڑھائی چڑھاؤں گا۔ ۸-۱۷

اس نے سوچا اور ایک بات بنائی۔ پس ہلاک ہو، کیسی بات بنائی! پھر ہلاک ہو، کتنی غلط بات بنائی! پھر اس نے نظر دوڑائی۔ پھر اس نے تیوری چڑھائی اور منہ بنایا۔ پھر پیٹھ پھیری اور تکبر کیا۔ پس بولا یہ تو محض ایک جادو ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے! یہ تو محض انسانی کلام ہے! ۱۸-۲۵

میں اس کو عنقریب دوزخ میں داخل کروں گا۔ اور کیا سمجھے کہ دوزخ کیا ہے! نہ ترس کھائے گی اور نہ چھوڑے گی۔ چمڑی کو جھلس دینے والی۔ اس پر انیس فرشتے متقرر ہوں گے۔ ۲۶-۳۰

اور ہم نے دوزخ پر نگران تو فرشتوں ہی کو بنایا ہے اور ہم نے ان کی یہ تعداد نہیں بیان کی مگر اس لیے کہ یہ آزمائش بنے ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا تاکہ یقین حاصل کریں وہ جن کو کتاب عطا ہوئی اور اہل ایمان اس سے اپنے ایمان کو بڑھائیں اور اہل کتاب

اور اہل ایمان شک میں نہ پڑیں، اور تاکہ جن کے دلوں میں روگ ہے وہ اور کفر کرنے والے کہیں کہ بھلا اس سے اللہ کی کیا مراد ہے! اسی طرح اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور راہ یاب کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور تیرے رب کے لشکروں کو صرف وہی جانتا ہے۔ اور یہ ماجرا محض انسانوں کی یاددہانی کے لیے ہے۔ ۳۱

ہرگز نہیں، شاہد ہے چاند اور رات جبکہ وہ پیٹھ پھیر لیتی ہے اور صبح جب روشن ہو جائے کہ یہ ماجرا ان بڑے ماجروں میں سے ہے جو انسان کی تنبیہ کے لیے بنایا گیا، ان کے لیے جو تم میں سے آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا چاہیں۔ ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گرد ہوگا۔ صرف دہنے والے اس سے مستثنیٰ ہوں گے، وہ باغوں میں ہوں گے، پوچھ گچھ کر رہے ہوں گے مجرموں کے باب میں۔ سوال کریں گے، تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟ وہ جواب دیں گے، ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے اور نہ غریبوں کو کھلاتے ہی تھے اور کٹ حجتیاں کرتے تھے اور ہم جزاء و سزا کے دن کو جھٹلاتے رہے یہاں تک کہ یقین کی ساعت آگئی۔ ۳۲-۴۷

تو ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کچھ نفع نہ دے گی۔ ان کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ یاددہانی سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں! گویا کہ وہ بدکے ہوئے گدھے ہوں جو شیر سے ڈر کے بھاگے ہوں۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اس کو کھلے ہوئے صحیفے پکڑا دیے جائیں۔ ہرگز نہیں، بلکہ وہ آخرت کا خوف نہیں رکھتے۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک یاددہانی ہے تو جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے اور وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے مگر یہ کہ اللہ چاہے ــــ وہی اہلِ تقویٰ اور وہی سزاوارِ مغفرت ہیں۔ ۴۸-۵۶

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ (۱-۲)

'مُزَّمِّل' اور 'مُدَّثِّر' کی بلاغت

'مُدَّثِّر' اور 'مُزَّمِّل' دونوں کے معنی جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ایک ہی ہیں۔ 'مُدَّثِّر' 'دِثَار' سے ہے جو اس چادر کے لیے آتا ہے جو سونے والا اپنے اوپر لے لیا کرتا ہے۔

چادر لپیٹے رکھنا، جیسا کہ ہم نے سابق سورہ میں واضح کیا، آدمی کی فکرمندی کی ایک علامت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدائے بعثت میں جو مشاہدات و تجربات ہوئے اول تو وہ خود ہی گراں بار کرنے والے تھے پھر جب آپ نے ان کا اظہار اپنے خاندان والوں کے سامنے کیا اور انھوں نے ان کا مذاق اڑانا شروع کیا تو آپ کی فکرمندی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ایسی حالت میں آپ زیادہ تر چادر لپیٹے ہوئے لوگوں سے الگ تھلگ رہتے جس طرح ایک فکرمند انسان رہتا ہے۔ آپ کی اسی فکر و پریشانی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نہایت پیار سے آپ کو 'مُزَّمِّل' اور 'مُدَّثِّر' سے خطاب فرمایا تاکہ خطاب ہی سے آپ کو تسلی مل جائے کہ ربِ کریم آپ کے حال سے اچھی طرح واقف ہے اور جب اس نے اس شفقت سے مخاطب فرمایا ہے تو وہ آپ کی پریشانی دور بھی فرمائے گا۔ چنانچہ سابق سورہ میں آپ کو 'مُزَّمِّل' سے خطاب کر کے قیامِ لیل کی تاکید فرمائی گئی جس میں اس فکر و پریشانی کا علاج بھی تھا اور اس مہم کے لیے تیاری بھی جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

انذارِ عام کے لیے کھڑے ہونے کا حکم

'قُمْ فَاَنْذِرْ' یہ اس مہم کا بیان ہے جس کی طرف پچھلی سورہ میں 'اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا' (۵) (ہم تم پر آگے ایک بھاری ذمہ داری ڈالنے والے ہیں) کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ یعنی کمربستہ ہو کر اٹھو اور پورے عزم و حوصلہ کے ساتھ اپنی قوم کو انذار کرو۔ مخالفت و مزاحمت، حالات کی نامساعدت اور ماحول کی اجنبیت کی پروا نہ کرو۔ جب تم ہمت کر کے اٹھ کھڑے ہو گے تو اللہ تعالیٰ تمھاری راہ آسان کرے گا اور غیب سے تمھاری تائید کے اسباب فراہم ہوں گے۔ سابق سورہ میں یہ اشارہ ہم کر چکے ہیں کہ 'اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا' (۵) سے اسی انذارِ عام کے حکم کی طرف اشارہ ہے جو یہاں دیا گیا ہے۔ عام طور پر لوگوں نے 'قَوْلٌ ثَقِیْلٌ' سے خود وحی کو مراد لیا ہے لیکن وحی تو اس سے پہلے بھی نازل ہو چکی تھی تو یہ کہنے کے کیا معنی کہ ہم عنقریب تم پر ایک قولِ ثقیل نازل کریں گے؟ البتہ انذار کا یہ حکم آپ کے لیے بلاشبہ ایک بہت ہی بھاری حکم تھا۔ مکہ اور طائف کے سرداروں کے کانوں میں توحید کی اذان دینا اور وہ بھی اس دعوے کے ساتھ کہ آپ اللہ کے رسول ہو کر آئے ہیں، اگر انھوں نے آپ کے انذار کی تکذیب کی تو اس کے عذاب کی زد میں آ جائیں گے کوئی سہل کام نہیں تھا۔

اس بھاری ذمہ داری سے آپ کا ہراس محسوس کرنا ایک امر فطری تھا۔ چنانچہ ابتداءً آپ نے اپنے کام کو اپنے خاص خاندان والوں ہی تک محدود رکھا اور ان پر بھی نہایت احتیاط کے ساتھ صرف اپنے بعض مشاہدات و تجربات کا اظہار فرما کر ان کا ردِ عمل معلوم کرنا چاہا جو نہایت مخالفانہ صورت میں سامنے آیا۔ چنانچہ اس دور میں آپ پر نہایت شدید فکرمندی کی حالت طاری رہی۔ جس کی تصویر 'مزمّل' اور 'مدثّر' کے الفاظ سے ہمارے سامنے آتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے آپ کو مبعوث فرمایا تھا وہ ہونا تھا چنانچہ پہلے (سورۂ مزمل میں) آپ کو اس صورت حال کے مقابلہ کے لیے تیاری کی ہدایت ہوئی پھر اس سورہ میں کمر باندھ کر انذارِ عام کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کا حکم ہوا۔

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (۳)

توحیدِ خالص کی منادی

یہ اس انذار کا پہلا حکم ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں توحید کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے یعنی صرف اللہ ہی کی کبریائی، یکتائی کا اعلان۔ مفعول کی تقدیم سے یہاں حصر کا مضمون پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی اللہ کے سوا جو بھی کبریائی کے مدعی ہیں یا جن کی کبریائی کا بھی دعویٰ کیا جا سکتا ہے وہ سب باطل، تم صرف اپنے رب ہی کی عظمت و کبریائی کا اعلان کرو۔ ایک جاہلی معاشرہ میں یہ اعلان ساری خدائی سے لڑائی مول لینے کے ہم معنی تھا لیکن دین کی بنیاد چونکہ اسی کلمہ پر ہے اس وجہ سے ہر نبی کو بے درنگ یہ اعلان کرنا پڑا۔

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (۴)

لفظ 'ثیاب' کا مفہوم

لفظ 'ثیاب'، جمع ہے 'ثوب' کی جس کے معنی کپڑے کے ہیں لیکن اس کے معنی دامن کے بھی ہو سکتے ہیں۔ بلکہ کلامِ عرب کے شواہد سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس مفہوم میں بھی آتا ہے جس کو ہم اپنی زبان میں 'دامنِ دل' سے تعبیر کرتے ہیں۔ امرؤ القیس کا مشہور شعر ہے۔

وان تك قد ساءتك منی خليقة

فسلی ثيابی من ثيابك تنسل[1]

اس شعر میں شارحین نے 'ثیاب' کو دل ہی کے معنی میں لیا ہے اور یہ معنی اس صورت میں لیے جا سکتے ہیں جب اس کو بطریق استعارہ 'دامنِ دل' کے مفہوم میں سمجھا جائے۔ امرء القیس ہی کا مصرعہ ہے۔

ثياب بنی عوف طهارٰی نقية[2]

لفظ 'ثیاب' کے اس مفہوم کی روشنی میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تم بالکل بے خوف ہو کر اپنے رب

---

[1] اگر میری کوئی حرکت تجھے بری ہی لگی ہے تو میرے دامنِ دل کو اپنے دامنِ دل سے جدا کر دے تو جدا ہو جائے گی۔

[2] بنی عوف کے دامن بالکل پاک صاف ہیں۔

کی کبریائی اور وحدت کی منادی کرو۔ مخالفین خواہ کتنی خاک بازی کریں اور کتنا ہی زور لگائیں لیکن تم اپنے دامنِ دل پر نجاستِ شرک کا کوئی چھینٹا نہ آنے دو۔ یہ امر واضح رہے کہ قرآن نے نہایت واضح الفاظ میں مشرکوں کو نجس اور شرک کو نجاست سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ ہدایت آپ کو اس لیے فرمائی گئی کہ بعد کے مراحل میں قریش کے لیڈروں نے آپ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ آپ کی سب باتیں مان لیں گے بشرطیکہ آپ بھی ان کے معبودوں کا کوئی مقام تسلیم کرنے پر راضی ہو جائیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ بات نہایت سختی سے رد فرما دی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی آپ کو نہایت تاکید کے ساتھ یہی ہدایت ہوئی کہ توحید بنیادِ دین ہے، اس باب میں آپ کوئی لچک ہرگز قبول نہ کریں: وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (القلم - ۶۸ : ۹) (وہ چاہتے ہیں کہ تم کچھ نرم پڑو تو وہ بھی کچھ نرم ہو جائیں) اور اسی مضمون کی ایک سے زیادہ آیتوں میں اس صورتِ حال کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ یہاں بھی اسی طرح کی ایک نہایت اہم تنبیہ ہے۔ پیغمبرؐ کو خطاب کر کے مشرکین پر گویا یہ حقیقت واضح کر دی گئی کہ شرک ایک ایسی نجاست ہے جس کا کوئی چھینٹا بھی اللہ کا رسول اپنے دامن پر گوارا کرنے والا نہیں ہے۔

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (۵)

'رُجز' 'رِجز' اور 'رِجس' سب قریب المخرج اور تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ اس کا استعمال اس گندگی کے لیے ہوتا ہے جس کو دیکھ کر طبیعت میں ارتعاش اور گھن پیدا ہو۔ یوں تو اس سے ہر قسم کی گندگی مراد ہو سکتی ہے لیکن یہاں یہ خاص طور پر شرک کی گندگی کے لیے آیا ہے اور مقصود اسی مضمون کی تاکید ہے جو 'وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ یعنی اپنے دامن کو شرک کے چھینٹوں سے محفوظ رکھنے کے لیے شرک کی ناپاکی سے دور رہو۔

اس ہدایت کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ العیاذ باللہ آپ کے کسی شرک میں مبتلا ہونے کا اندیشہ تھا۔ آپ جس طرح دورِ اسلام میں طاہر و مطہر رہے اسی طرح جاہلیت میں بھی شرک کے ہر شائبہ سے پاک رہے۔ مقصود صرف کفار و مشرکین کو آگاہ کرنا تھا کہ وہ جان لیں کہ جو منذر ان کے پاس آیا ہے اس کا موقف ان کے دینِ شرک کے معاملہ میں کیا ہے اور وہ اپنے رب کی طرف سے اس باب میں کن ہدایات کے ساتھ مبعوث ہوا ہے۔

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (۶)

'مَنٌّ' کے معنی جس طرح احسان کرنے کے آتے ہیں اسی طرح کسی چیز کو کاٹ دینے کے بھی آتے ہیں۔ سورۂ قلم میں فرمایا ہے: 'وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ' (۳) (اور بے شک تمہارے لیے ایک کبھی نہ منقطع ہونے والا صلہ ہے) یعنی جس انذار و تبلیغ کی تمہیں ہدایت کی جا رہی ہے اس کو برابر جاری رکھنا۔ یہ خیال ترک کر کے کہ اب کافی انذار کیا جا چکا، مزید کی ضرورت نہیں رہی، اس عمل کو منقطع نہ کر بیٹھنا۔

تالیفِ کلام کی ایک شکل اور اس کا محل

تمھارے رب کی طرف سے جو حکم دیا جا رہا ہے اس پر اس وقت تک قائم و دائم رہو جب تک رب ہی کی طرف سے اس باب میں کوئی اور ہدایت تمھیں نہ ملے۔

'تَسْتَکْثِرُ' یہاں نہی کا جواب نہیں ہے۔ اگر جواب ہوتا تو اس پر جزم آنا تھا۔ اگرچہ بعض قاریوں نے اس کو جزم کے ساتھ بھی پڑھا ہے لیکن متواتر قراءت صرف مصحف کی ہے اس وجہ سے ہمارے نزدیک اس کو ضمہ کے ساتھ ہی پڑھنا اولیٰ ہے اور اسی کے مطابق اس کی تاویل بھی ہونی چاہیے۔ اس صورت میں یہ لفظ یا تو حال کے محل میں ہوگا یا اس کو مستقل جملہ کی حیثیت دینی پڑے گی۔ میرے نزدیک یہ حال کے مفہوم میں ہے۔

لفظ 'اِسْتِکْثَارٌ' دو معنوں میں معروف ہے۔ ایک کسی چیز کو زیادہ کرنے اور زیادہ چاہنے کے معنی میں، دوسرے کسی چیز کو زیادہ سمجھ لینے یا زیادہ گمان کر لینے کے معنی میں۔ پہلے معنی کے لیے لفظ 'وَلَوْ کُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَکْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ (الاعراف ۷: ۱۸۸)' والی آیت میں ہے۔ دوسرے معنی کی وضاحت اہل لغت نے یوں کی ہے: استکثر الشیء رآہ کثیرًا او عدّہ کثیرًا (استکثر الشیء کے معنی ہوں گے کسی چیز کو زیادہ خیال کیا یا شمار کیا) صاحب اقرب الموارد نے اسی معنی کو پہلے لیا ہے۔ میرے نزدیک آیت میں یہ اسی معنی میں آیا ہے۔ مطلب، جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا، یہ ہوگا کہ انذار کا یہ فرض بغیر کسی وقفہ اور انقطاع کے برابر جاری رکھو، کبھی یہ گمان کر کے چھوڑ نہ بیٹھنا کہ کافی انذار ہو چکا، اب ضرورت نہیں رہی۔

یہ ہدایت اس لیے فرمائی گئی کہ رسول جس فرضِ انذار پر مامور ہوتا ہے اس کے متعلق سنت الٰہی، جیسا کہ جگہ جگہ ہم ذکر کر چکے ہیں، یہ ہے کہ اگر قوم اس کے انذار کی پروا نہیں کرتی تو ایک خاص مدت تک مہلت دینے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو لازمًا ہلاک کر دیتا ہے۔ یہ مہلت اتمام حجت کے لیے ملتی ہے اور اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کسی قوم کو اس کے لیے کتنی مہلت ملنی چاہیے۔ رسول کا فرض یہ ہے کہ وہ اس وقت تک اپنے کام میں لگا رہے جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے پاس یہ ہدایت نہ آ جائے کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا، اب وہ قوم کو اس کی تقدیر کے حوالہ کر کے اس علاقے سے ہجرت کر جائے۔ اگر رسول بطور خود یہ گمان کر کے قوم کو چھوڑ کر ہجرت کر جائے کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا تو اندیشہ ہے کہ حالات کا اندازہ کرنے میں اس سے اسی طرح کی غلطی صادر ہو جائے جس طرح کی غلطی حضرت یونس علیہ السلام سے صادر ہوئی جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو تنبیہ فرمائی اور ایک سخت امتحان سے گزارنے کے بعد ان کو پھر قوم کے پاس انذار کے لیے واپس بھیجا اور اس دوبارہ انذار سے اللہ تعالیٰ نے ان کی پوری قوم کو ایمان کی توفیق بخشی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کی عجلت سے محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی مرحلہ میں یہ آگاہی دے دی کہ تم جس فرض پر مامور کیے جا رہے ہو اس میں برابر لگے رہنا، کبھی از خود یہ سمجھ کر چھوڑ

نہ بیٹھنا کہ اب وہ فرض کافی حد تک ادا ہو چکا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ فیصلہ تمھارے کرنے کا نہیں بلکہ ہمارے کرنے کا ہے۔ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ (القلم - ۶۸ : ۴۸) (پس صبر کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو اور مچھلی والے کے مانند نہ بن جانا) اور اس مضمون کی دوسری آیات میں آپ کو صبر و ثبات کی تعلیم دی گئی ہے اور یہاں بھی آگے والی آیت میں یہی مضمون آ رہا ہے۔

ہمارے مفسرین نے عام طور پر اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ تم کسی پر کوئی احسان اس خیال سے نہ کرو کہ اس کا بدلہ اس سے زیادہ احسان کی صورت میں حاصل کرو، اگرچہ آیت کے الفاظ سے یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے لیکن سوال کلام کے موقع و محل کا بھی ہے۔ آخر اس سیاق و سباق میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیحت کرنے کا کیا موقع ہے! ہمارا خیال ہے کہ ان حضرات سے آیت کے دونوں لفظوں کے مفہوم متعین کرنے میں مسامحت ہوئی۔ ہم نے ان کی وضاحت کر دی ہے جس سے آیت کا صحیح مفہوم واضح ہو گیا ہے اب اس پر مزید بحث کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (۷)

اس کا مفہوم وہی ہے جو آیت وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا (الطور - ۵۲ : ۴۸) (اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو، تم ہماری آنکھوں میں ہو) کا ہے۔ 'صَبْرٌ' کے ساتھ جب 'ل' آتے تو اس کے معنی صبر و استقامت کے ساتھ انتظار کرنے کے ہو جاتے ہیں۔

اوپر والی آیت میں حضورؐ کو جو ہدایت ہوئی ہے اسی سے متعلق یہ ہدایت بھی ہے کہ اپنے کام کو کافی سمجھ کر کسی مرحلہ میں چھوڑ نہ بیٹھنا بلکہ صبر و استقامت کے ساتھ اس میں لگے رہنا اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرنا۔ اسی استقامت پر تمھاری کامیابی اور قوم پر اتمام حجت کا انحصار ہے۔

فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ ۙ فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ۙ عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ (۸-۱۰)

انذار کا اصل موضوع

یہ ذکر ہے انذار کے اصل موضوع کا جس سے غفلت ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے قریش کی مخاصمت کی بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ قیامت کو نہ مانتے تھے نہ ماننا چاہتے تھے۔ وہ اول تو اس کو نہایت مستبعد اور بعید از امکان سمجھتے تھے اور اگر کسی درجے میں مانتے تھے تو اپنی دنیوی کامیابیوں کو دلیل بنا کر یہ دعوے کرتے تھے کہ قیامت ہوئی تو جس طرح ان کو یہاں سب کچھ حاصل ہے اسی طرح وہاں بھی حاصل ہو گا اور اگر خدا نے ان پر ہاتھ ڈالا تو ان کے معبود اپنی سفارش سے انھیں بچا لیں گے۔ فرمایا کہ اس ہولناک دن سے ان کو اچھی طرح آگاہ کر دو کہ جب صور پھونکا جائے گا تو وہ دن بڑا ہی کٹھن ہو گا۔

'عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ' یعنی انھوں نے اس کو بہت آسان سمجھ رکھا ہے لیکن کافروں کے لیے

یہ دن آسان نہیں ہو گا۔

اوپر والی آیت میں مثبت پہلو سے کہنے کے بعد وہی بات منفی پہلو سے بھی فرمادی جس میں ان احمقوں پر نہایت بلیغ طنز بھی ہے جو اس کو ایک ناقابلِ اہتمام دن سمجھ کر بےچنت بیٹھے تھے کہ جب وہ آئے گا تو دیکھ لیں گے۔ فرمایا کہ وہ کوئی آسان دن نہیں ہو گا، بڑا ہی کٹھن دن ہو گا۔ اس کے لیے جو کچھ کیا جا سکتا ہے آج ہی کیا جا سکتا ہے۔ جس نے آج نہیں کیا وہ ہمیشہ کے لیے پکڑا گیا اور اس طرح پکڑا گیا کہ اس کو کوئی بھی چھڑانے والا نہ بنے گا۔

ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا ۙ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۙ وَّبَنِیْنَ شُهُوْدًا ۙ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِیْدًا ۙ ثُمَّ یَطْمَعُ اَنْ اَزِیْدَ (۱۱ - ۱۵)

مکہ اور طائف کے لیڈروں کو تنبیہ

یہ مکہ اور طائف کے ان برخود غلط لیڈروں کو نہایت تیز و تند لہجہ میں تنبیہ ہے جو اپنی خوشحالی دنیا ہی کو اپنے عقیدہ و عمل کی صحت اور خدا کے منظورِ نظر ہونے کی دلیل سمجھتے اور یہ توقع رکھتے تھے کہ آخرت ہوئی تو ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں، جیسا کہ ان کو ڈرایا جا رہا ہے، بلکہ ان کو یہاں جو کچھ حاصل ہے اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر وہاں حاصل ہو گا۔ فرمایا کہ ایسے سرپھروں کا معاملہ تم ہمارے اوپر چھوڑ دو۔ ہم ان سے نمٹنے کے لیے کافی ہیں۔ تم ان کی فکر میں زیادہ پریشانی نہ اٹھاؤ۔

'ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا' یہ وہی اسلوبِ بیان ہے جو سابق سورہ میں بالکل اسی موقع و محل میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے: 'وَذَرْنِیْ وَالْمُكَذِّبِیْنَ اُولِی النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِیْلًا' (المزمل - ۷۳: ۱۱) وہاں اس اسلوب کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

'خَلَقْتُ وَحِیْدًا' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان جب دنیا میں آتا ہے تو اس کے ساتھ نہ اس کا مال و جاہ ہوتا ہے نہ اس کا لاؤ لشکر۔ یہ چیزیں ملتی ہیں تو خدا کی عنایت سے ملتی ہیں اور یہ اسی وقت تک ساتھ رہتی ہیں جب تک اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ ان کا حق یہ ہے کہ انسان ان کو پا کر اپنے رب کا زیادہ سے زیادہ شکرگزار رہے نہ کہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہو جائے کہ وہ خدا کا بڑا چہیتا ہے اور آخرت ہوئی تو وہ اس سے بھی زیادہ پائے گا۔ یہ مضمون دوسری جگہ اس طرح ادا ہوا ہے: 'وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ' (الانعام - ۶: ۹۴) (اور تم ہمارے پاس آئے تنِ تنہا جس طرح ہم نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا)۔

مطلب یہ ہے کہ تم اس برخود غلط مغرور کو جو دنیا میں آیا تو اسی طرح جس طرح ہر شخص اپنی ماں کے پیٹ سے تنہا آتا ہے لیکن ہم نے اس کو مال و جاہ عنایت کیا تو وہ اپنے کو بہت بڑی چیز سمجھنے لگا اور اب اس کو آخرت سے ڈرایا جا رہا ہے تو وہ اس رعونت کا اظہار کرتا ہے کہ وہ آخرت میں اس سے بھی زیادہ کا حق دار ٹھہرے گا۔

اشارہ ایک خاص ذہنیت کی طرف نہ کہ خاص شخص کی طرف

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کسی خاص شخص کی طرف اشارہ ہے یا مکہ اور طائف کے عام دولتمندوں کا ذہن بیان ہو رہا ہے؟ مفسرین نے اس سے قریش کے لیڈروں میں سے ولید بن مغیرہ کو مراد لیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس تخصیص کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ ذہن صرف ولید بن مغیرہ ہی کا نہیں بلکہ قریش کے تمام سرداروں اور دولت مندوں کا تھا اور قریش ہی کی کیا خصوصیت ہے آج بھی جن کو مال و جاہ حاصل ہو جاتا ہے ان کے اندر یہی خناس سما جاتا ہے۔ کوئی ایسا ہی باتوفیق ہوتا ہے جو اس فتنہ سے محفوظ رہتا ہے۔ اس وجہ سے یہ سمجھنا تو صحیح نہیں ہے کہ یہ آیتیں ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئیں البتہ ان آیات میں جس ذہن اور جس کردار کی تصویر ہے اس کا ایک مصداق اس کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہم مقدمۂ کتاب میں واضح کر چکے ہیں کہ سلف جب کسی آیت کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہ فلاں کے بارے میں ہے تو اس سے ان کی مراد لازماً یہی نہیں ہوتی کہ خاص اسی کے بارے میں نازل ہوئی بلکہ بسا اوقات اس سے ان کا مقصود آیت کے ایک مصداق کی طرف اشارہ کر دینا ہوتا ہے۔ یہ مضمون صرف یہیں نہیں بیان ہوا ہے بلکہ قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے اور ہر جگہ اس سے مقصود متمرد دین کی عام ذہنیت کی طرف اشارہ کرنا ہے نہ کہ کسی خاص شخص کی طرف۔

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہاں حرف 'مَنْ' استعمال ہوا ہے جو واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس کے لیے ضمیریں بھی دونوں ہی طرح آ سکتی ہیں۔

'وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا' یعنی جب وہ دنیا میں آیا تو نہ مال کے ساتھ آیا نہ اولاد کے ساتھ بلکہ اسی طرح بے سر و سامان اور بے خدم و حشم آیا جس طرح دوسرے آتے ہیں۔ یہ اللہ کا اس کے اوپر احسان ہوا کہ اس نے اس کو پھیلا ہوا مال دیا۔ 'پھیلا ہوا مال' سے مراد یہ ہے کہ کہیں اس کے باغ ہیں، کہیں اس کے بنگلے اور کوٹھیاں ہیں، کہیں جانوروں کے گلّے اور ریوڑ ہیں، کہیں رقبے، تجارتی آڑھتیں اور دکانیں ہیں — اس زمانے کے سرمایہ دار ہر ملک کے بنکوں میں اپنے حساب کھولتے اور ہر ملک کی کمپنیوں میں اپنا سرمایہ لگاتے ہیں ان کو بھی اسی ذیل میں شمار کیجیے۔

'وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا' مال کے ساتھ اللہ نے اس کو بیٹے بھی دیے جو ہر مجلس، ہر مقام اور ہر محاذ پر اس کے ساتھ کھڑے ہونے والے اور اس کے پھیلے ہوئے کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹانے والے ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قبائلی زندگی میں خاندانی عصبیّت و جمعیّت کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مدافعت و مقابلہ کا تمام تر انحصار اس پر تھا۔ قوم و قبیلہ میں سرداری کا مقام اسی کو حاصل ہوتا جس کے بیٹے زیادہ اور کنبہ بڑا ہو اور بیٹے ایسی صلاحیت و قابلیت رکھنے والے ہوں کہ ہر ضرورت کے موقع پر باپ کے ساتھ شانہ بہ شانہ کھڑے ہو سکیں۔ لفظ 'شہود' اسی پہلو کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

'وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا' یعنی اس طرح مال و اولاد دے کر اس کے لیے عزت و وقار اور امارت و

سیادت کے حصول کے لیے اچھی طرح راہ ہموار کر دی۔

'ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ' یعنی اللہ تعالیٰ کے اس فضل و انعام کا حق تو یہ تھا کہ وہ اپنے رب کا شکرگزار و فرمانبردار بندہ بنتا لیکن ہوا یہ کہ وہ نعمتیں پا کر اکڑنے اور اترانے والا بن گیا۔ جب اس کو ڈرایا جاتا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جو ناشکروں اور کافروں کے لیے نہایت سخت ہو گا تو وہ دعویٰ کرتا ہے کہ اگر فی الواقع کوئی ایسا دن آیا تو اس دن وہ اس سے بھی زیادہ پائے گا جو اس کو یہاں حاصل ہے۔

كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا (۱۶)

برخود غلط مدعیوں کو جواب

یہ اس قسم کے برخود غلط لوگوں کے زعم باطل کی نہایت شدت کے ساتھ تردید ہے۔ فرمایا کہ ان کا یہ خواب ہرگز پورا ہونے والا نہیں ہے۔ اللہ نے ان کو جو نعمتیں دیں نہ ان کے حق کی حیثیت سے دیں نہ ان کے حاصل ہونے میں ان کی تدبیر یا ان کے تدبر کو کوئی دخل ہے بلکہ محض اپنے فضل و کرم سے یہ امتحان کرنے کے لیے دیں کہ دیکھے وہ اپنے رب کے شکرگزار و فرمانبردار رہتے ہیں یا خود سر، مغرور اور خدا کے باغی اور زمین میں فساد برپا کرنے والے بن جاتے ہیں۔ اس امتحان سے ثابت ہو گیا کہ وہ نعمتیں پا کر اللہ کی آیتوں کے دشمن بن گئے۔ 'آیات' سے مراد بحیثیت مجموعی قرآن اور خاص طور پر اس کی وہ آیتیں ہیں جو عذاب دنیا اور عذاب آخرت سے ڈرانے والی اور اس امر واقعی سے آگاہ کرنے والی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ اس دنیا میں کوئی متصرف ہے اور نہ آخرت میں اس کے سوا کوئی مولیٰ و مرجع بنے گا۔

سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا (۱۷)

نعمتوں کی ناشکری کرنے والوں کی سزا

'اِرْهَاقٌ' کے معنی کسی مشقت میں ڈالنے کے ہیں اور 'صَعُوْدٌ' کسی ایسی چوٹی یا گھاٹی کو کہتے ہیں جس کو عبور کرنا نہایت دشوار ہو۔

یہ سزا بیان ہوئی ہے اس انعام کی ناقدری کی جس کی طرف اوپر 'مَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ نعمتیں پا کر چونکہ وہ انہی کے پرستار بن کر رہ گئے اور اصل منعم کو بھول کر اپنے نفس ہی کی بندگی میں اس طرح لگ گئے کہ اس کی کسی خواہش کا بھی مقابلہ کرنے کا حوصلہ نہ کر سکے اس وجہ سے ان کو آخرت میں ایک نہایت پُرمشقت چڑھائی چڑھنی پڑے گی۔

نیکی اور بدی کے مزاج کا فرق

یہاں نیکی اور بدی کی یہ فطرت پیش نظر رہے کہ ان دونوں کا امتیاز تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیا ہے لیکن ساتھ ہی اس امتحان میں بھی اس کو ڈال دیا کہ بدی کی لذتیں تو عاجل رکھی ہیں اور تلخیاں اس کی آخرت میں سامنے آئیں گی۔ برعکس اس کے نیکی کی مشکلیں نقد ہیں اور نفع اس کا نسیہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان نیکی کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس میں قدم قدم پر اس کو نفس کی مزاحمت کے سبب سے

چڑھائیاں چڑھنی اور گھاٹیاں پار کرنی پڑتی ہیں اور بدی کی راہ اختیار کرے تو اس کی لذت تو اس کو نقد نقد ملتی ہے اور اس کے انجام بد کا معاملہ اس کے نزدیک موہوم ہوتا ہے۔ اس کشش کے سبب سے اکثریت اسی راہ کو اختیار کر لیتی ہے۔ نیکی کی راہ اختیار کرنے کا حوصلہ صرف وہی کرتے ہیں جن کے اندر صبر اور عزیمت ہو اور اس وصف کو پیدا کرنے کے لیے آدمی کو ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف حضرت مسیح علیہ السلام نے یوں اشارہ فرمایا ہے کہ 'بدی کی راہ فراخ اور اس پر چلنے والے بہت ہیں اور نیکی کی راہ تنگ اور اس پر چلنے والے تھوڑے ہیں'۔

سورۂ بلد میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے:

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۚ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۖ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ؕ فَكُّ رَقَبَةٍ ۙ اَوْ اِطْعٰمٌ فِىْ يَوْمٍ ذِىْ مَسْغَبَةٍ ۙ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۙ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ؕ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ؕ (البلد - ۹۰ : ۱۰ - ۱۷)	اور ہم نے انسان کو نیکی اور بدی دونوں کی راہیں سمجھا دیں۔ پس اس نے گھاٹی پار کرنے کا حوصلہ نہ کیا اور تم کیا سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے! غلام کی گردن چھڑانا یا بھوک کے زمانے میں کسی قرابت مند یتیم یا کسی خاک نشین مسکین کو کھلانا۔ مزید برآں یہ کہ وہ بنے ان لوگوں میں سے جو ایمان لائے اور جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر اور مرحمت کی تلقین کی۔

قرآن نے آخرت کی فوز و فلاح کا حق دار صرف انہی کو ٹھہرایا ہے جو دنیا میں نیکی کی راہ کے عقبات کو پار کرنے کا حوصلہ کریں گے۔ جو یہاں ان کو پار کرنے کی ہمت نہیں کریں گے ان کو دوزخ کے عقبات سے سابقہ پیش آئے گا جن کو پار کرنے پر وہ مجبور کیے جائیں گے لیکن وہ ان کو پار نہ کر سکیں گے۔

اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۙ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۙ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۙ ثُمَّ نَظَرَ ۙ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۙ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۙ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (۱۸ - ۲۵)

معاندین قرآن کے عناد کی تصویر

آیت ۱۶ میں یہ جو فرمایا ہے کہ 'وہ ہماری آیات کا شدید معاند ہے' یہ اسی عناد کی تصویر کھینچی گئی ہے اور غور سے دیکھیے کہ کیسی مکمل تصویر کھینچی گئی ہے۔

'اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ'۔ یعنی جب قرآن اس کو سنایا گیا تو اس نے اپنا ردِ عمل فوری طور پر ظاہر کرنے کے بجائے کچھ دیر غور کرنے کا تکلف کیا تاکہ دیکھنے والوں پر یہ اثر پڑے کہ ان کا لیڈر مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور کر کے اپنی رائے ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ 'وَقَدَّرَ' یعنی غور کرنے کے بعد جو رائے اس کے

ذہن میں آئی اس کو اس نے اپنے ذہن میں اچھی طرح تولا کہ وہ ایسی بات کہے جو دلوں میں اتر جائے اور ہر شخص پکار اٹھے کہ جو رائے ظاہر کی گئی ہے نہایت صائب ہے۔

'فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۙ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ' لیکن وہ غارت ہو کہ اس نے قرآن کا کتنا غلط اندازہ کیا! اور پھر غارت ہو کہ اس نے کتنی بے ہودہ رائے قائم کی۔ رائے کے ذکر سے پہلے دو مرتبہ اس تاکید کے ساتھ اس پر لعنت سے مقصود اس کی رائے کی شناعت کا اظہار بھی ہے اور سننے والوں کو متنبہ کرنا بھی کہ جب آدمی کی مت ماری جاتی ہے تو وہ اسی طرح پاگلوں کی سی باتیں کرتا اور گھر کو پیشیز ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کے برابر کا مدبر کوئی دوسرا نہیں ہے۔

'ثُمَّ نَظَرَ ۙ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۙ ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ' یہ اس کے اس متکبرانہ انداز کی تصویر ہے جو اس نے رائے ظاہر کرتے ہوئے اختیار کیا۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ قرآن نے ایسی مکمل تصویر کھینچی ہے کہ اگر اس کے بعد اس کی رائے کا ذکر نہ بھی ہوتا جب بھی ایک اداشناس نہایت آسانی سے سمجھ لیتا کہ یہ انداز کس رائے کی غمازی کر رہا ہے۔ فرمایا کہ پہلے تو اس نے تفکر سے سر اٹھا کر لوگوں کے چہروں کا جائزہ لیا تاکہ ان کے موڈ کا اندازہ کر سکے کہ اس رائے کے اظہار کے لیے ساعت سازگار ہے یا نہیں۔ پھر اس نے تیوری چڑھائی اور منہ بنایا تاکہ دیکھنے والوں کو اس کے اس انداز ہی سے پتہ چل جائے کہ اس غور و فکر کے بعد اس نے قرآن کے متعلق جو رائے قائم کی ہے وہ نہایت ہی مایوس کن ہے۔ پھر وہ نہایت استکبار کے ساتھ پیٹھ پھیر کر وہاں سے کچھ بڑبڑاتا ہوا چل کھڑا ہوا۔

'فَقَالَ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ ۙ إِنْ هَٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ' اگرچہ اوپر کی تصویر و تمثیل کے بعد کسی مزید تفصیل کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی بلکہ اداؤں اور حرکتوں ہی نے سارا راز کھول دیا تھا تاہم قرآن نے اس کے الفاظ بھی نقل کر دیے کہ وہ کیا زہر اگلتا ہوا نہایت استکبار کے ساتھ پیچھے مڑا۔ فرمایا کہ اس نے کہا کہ یہ تو جادو ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے اور یہ محض بشری کلام ہے۔

قرآن کو جادو کہنے کا ایک پہلو

قریش کے لیڈروں کی زبان سے قرآن کو جادو کہنے کی وجہ اس کتاب میں ہم جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ اس کی بے مثل فصاحت و بلاغت اور اس کی بے پناہ تاثیر و تسخیر کا انکار جب ان کے لیے ممکن نہیں رہا تو اس کے خلاف انھوں نے یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ یہ جادو ہے تاکہ عوام کے دلوں پر اس کے الہامی و خدائی کلام ہونے کا رعب جو بیٹھتا جا رہا تھا اس کا توڑ کریں۔ اس کو جادو کہہ کر وہ لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ اس کے اندر جو تاثیر و تسخیر ہے وہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ یہ آسمان سے اترا ہوا کلام ہے بلکہ یہ محض الفاظ و زبان کی جادوگری ہے اور یہ کوئی ایسی نادر چیز نہیں ہے جو پہلی مرتبہ ظہور میں آئی اور قرآن ہی کے ساتھ مخصوص ہو بلکہ یہ پہلے سے چلی آ رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ

تمھارے اس ملک میں اس سے پہلے بھی ایسے خطیب و شاعر گزر چکے ہیں جن کے کلام میں یہ جادو موجود تھا لیکن ان کو نہ کسی نے خدا کا فرستادہ مانا نہ انھوں نے خود کوئی فرستادہ ہونے کا دعویٰ کیا اور نہ ان کے کلام کو کسی نے کلام الٰہی سمجھا تو اسی کلام کی کیا خصوصیت ہے کہ اس کو خدائی ہونے کا درجہ دے دیا جائے!

'اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ' یعنی یہ محض بشری کلام ہے۔ اس کے ساحرانہ اسلوب بیان کو جتنی اہمیت چاہو دو۔ ہم کو اس سے انکار نہیں ہے لیکن اس کو آسمان پر چڑھانے کی کوشش نہ کرو۔

سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ۝ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ (۲۶-۲۸)

متکبرّوں کا انجام

یہ انجام بیان ہوا ہے اس قسم کے متکبرّوں کا۔ فرمایا کہ ہم اس کو عنقریب دوزخ میں داخل کریں گے۔

'وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ' یہ اس دوزخ کی ہولناکی کا اظہار ہے کہ تم کیا سمجھے کہ دوزخ کیا ہے! یعنی کوئی اس کو معمولی چیز نہ سمجھے۔ اس کی ہولناکی کا اندازہ یہاں سے نہیں ہو سکتا۔ اس کو وہی جانیں گے جن کو اس سے سابقہ پیش آئے گا۔ بدقسمت ہے وہ جو اس سے بے پروا ہو کر زندگی گزارے! اس طرح کا خطاب عام ہوتا ہے اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

'لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ' 'اَبْقٰى عَلَيْهِ' کے معنی ہوتے ہیں اس نے اس پر ترس کھایا اور رحم کیا۔ یہاں اگرچہ صلہ مذکور نہیں ہے، اس کے اظہار کا موقع نہیں تھا، لیکن یہ فعل استعمال یہاں اسی معنی میں ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دوزخ ایسی ظالم چیز ہو گی کہ نہ کسی پر ذرا ترس کھائے گی کہ اس کے عذاب میں کچھ تخفیف ہو جائے نہ کسی کو نظر انداز کرے گی کہ وہ اس سے بچ نکلے۔ یعنی نہ اس سے رحم کی کوئی امید نہ نظر انداز کیے جانے کی۔ وہ بالکل بے رحم بھی ہو گی اور پوری طرح چوکس بھی!

لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ (۲۹)

'بَشَرٌ' جسم کی کھال کے معنی میں ہے۔ یعنی اس کے شعلوں کی لپٹ کا یہ حال ہو گا کہ دور ہی سے مجرموں کی کھالوں کو جھلس دے گی۔ دوسرے مقام میں 'نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى' (المعارج - ۷۰: ۱۶) کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ یہ جہنم کی شدتِ تمازت کے وہ اثرات بیان ہوئے ہیں جو مجرموں پر اصل مقام عذاب تک پہنچنے سے پہلے ہی پڑنے شروع ہو جائیں گے۔ مقصود یہ دکھانا ہے کہ جس عذاب کی ابتدا یہ ہو گی اس کی انتہا کا اندازہ کون کر سکتا ہے!

عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ (۳۰)

آیات متشابہات سے متعلق ایک سوال کا جواب

فرمایا کہ اس کے اوپر انیس مامور ہوں گے۔ یہاں انیس کا معدود مذکور نہیں ہے لیکن آگے کی آیت میں اشارہ موجود ہے کہ یہ فرشتے ہوں گے۔ یہاں ان کے ذکر میں ابہام سے یہ بات نکلتی ہے کہ ان کی مزاجی خصوصیات، ان کی شکلیں اور ان کی قوتیں بالکل اس ڈیوٹی سے مناسبت رکھنے والی ہوں گی جس پر وہ مامور ہوں گے۔ مجرم ان کو دیکھ کر ہی یہ اندازہ کر لیں گے کہ یہ کسی پر نہ رتی برابر ترس کھانے والے ہیں اور نہ

ان کے چنگل سے چھوٹ سکنے کا کوئی امکان ہے۔

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں سوال پیدا ہو کہ دوزخ پر مامور فرشتوں کی تعداد انیس ہونے میں کیا حکمت ہے اور بالفرض ان کی تعداد انیس ہی ہے تو اس اہتمام سے اس کے ذکر کی کیا ضرورت تھی؟ اس سوال کا جواب آگے والی آیت میں خود قرآن نے دیا ہے لیکن اس جواب سے پہلے ایک ضروری تمہید ذہن نشین کر لیجیے۔

وہ یہ کہ جہاں تک آخرت کا تعلق ہے اس کے دلائل عقل و فطرت اور آفاق و انفس میں موجود ہیں اور قرآن نے پوری وضاحت سے وہ بیان کر دیے ہیں۔ رہیں جنت و دوزخ کی تفصیلات تو ان کی نوعیت متشابہات کی ہے جن کی اصل حقیقت کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ اس نے ان کو تمثیلات و تشبیہات کے پیرایہ میں سمجھایا ہے جن سے ہم فی الجملہ ان کا تصور تو کر سکتے ہیں لیکن ان کی اصل حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اگر آدمی ان کی اصل حقیقت جاننے کے درپے ہو تو وہ فتنہ میں پڑ جاتا ہے اور اس سے کچھ کرنا تو درکنار وہ اس اصل حقیقت کا بھی منکر بن جاتا ہے جس کی بنیاد عقل و فطرت کے قطعی دلائل پر ہوتی ہے۔ اس طرح کے معاملات میں ایک عاقل کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے اس کو مانے اور یہ ایمان رکھے کہ ان کی اصل حقیقت اس دن واضح ہو گی جس دن یہ سامنے آئیں گی۔ اس نکتہ کی وضاحت قرآن نے سورۂ آل عمران میں یوں کی ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ڤ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ڤ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ (آل عمران - ۳ : ۷)

وہی خدا ہے جس نے تم پر کتاب اتاری ہے جس میں (عقل و فطرت کے دلائل پر مبنی) محکم آیات ہیں جن کو اصل کتاب کی حیثیت حاصل ہے اور کچھ متشابہ آیات بھی ہیں (جن میں کوئی بات تمثیلی رنگ میں سمجھائی گئی ہے) تو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ جوئی اور اس کی اصل حقیقت کی دریافت کے زعم میں اس کی متشابہات ہی کے درپے ہوتے ہیں حالانکہ اس کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ رہے وہ لوگ جن کے قدم علم میں خوب جمے ہوئے ہیں ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ یہ متشابہات بھی محکمات ہی کی طرح ہمارے رب ہی کے پاس سے نازل ہوئی ہیں۔

اس قسم کے کج رو ذہن کے لوگ ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ قریش کے لیڈروں اور اہل کتاب کے

مفسدین میں بھی ایسے لوگ موجود تھے اس وجہ سے قرآن نے جب انیس فرشتوں کا ذکر کیا تو بر سر موقع تنبیہ بھی فرما دی (جو آگے آرہی ہے) کہ اگرچہ فتنہ پسند طبیعتیں اس کو فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنائیں گی لیکن اللہ تعالیٰ اس قسم کے حقائق اس لیے بیان فرماتا ہے کہ اس سے ان لوگوں کے علم میں اضافہ ہو جو علم کے طالب ہیں؛ اور جن کے اندر فتنہ جوئی کا ذوق ہے اوران کا کھوٹ ابھر کر سامنے آئے ـــــ اس تمہید کو سامنے رکھ کر آگے کی آیات تلاوت فرمایئے۔

وَمَا جَعَلْنَآ أَصْحٰبَ النَّارِ إِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۙ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِينَ اٰمَنُوٓا إِيمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُونَ ۙ وَلِيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُونَ مَاذَآ أَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۚ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ۚ وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ (۳۱)

متشابہات کے ذکر کی حکمت

یہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، بر سر موقع ایک تنبیہ ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ یہ آیت بہت بعد میں مدینہ کے دور میں نازل ہوئی۔ سابق آیت سے حرف عطف کے ساتھ اس کا اتصال قرینہ ہے کہ یہ ساتھ ہی نازل ہوئی ہے۔ بعد میں نازل ہونے والی آیتیں، جو اپنے سابق حکم کے ساتھ ملائی گئی ہیں، ان کا انفصال ہر جگہ نمایاں ہے۔ سورۂ مزمل میں اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ ..... (۲۰) والی آیت مدنی دور کی آیت ہے۔ چنانچہ سابق آیت سے اس کا انفصال نمایاں ہے۔ اس کو حرفِ ربط کے ذریعہ سے مربوط نہیں کیا لیکن یہاں یہ حرف عطف کے ذریعہ سے مربوط ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ آیت بھی ساتھ ہی نازل ہوئی اور مقصود اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مفسدین کے ذہن سے فی الجملہ آگاہ کر دینا ہے کہ جب تمھاری زبان سے وہ اس کی باتیں سنیں گے تو طرح طرح سے ان کا مذاق اڑانے کی کوشش کریں گے لیکن تم ان کی یاوہ گوئیوں کی پروا نہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ یہ باتیں اس لیے بیان فرماتا ہے کہ اس سے اہل ایمان کے علم میں اضافہ ہو اور جن کے اندر فتنہ جوئی کی بیماری ہے ان کا کھوٹ ابھر کر سامنے آجائے۔

وَمَا جَعَلْنَآ أَصْحٰبَ النَّارِ إِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۙ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا

یعنی اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنے کارخانۂ کائنات کے تمام شعبوں پر فرشتوں ہی کو مامور فرمایا، جنوں اور شیاطین کو نہیں مامور کیا، اسی طرح دوزخ پر بھی اس نے فرشتوں ہی کو مامور کیا۔ کسی دوسری مخلوق کو نہیں کیا ہے۔ یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر کام اس کی پیدا کی ہوئی پاکیزہ مخلوق ملائکہ ہی کے ذریعہ سے انجام پاتا ہے تاکہ کسی گوشے میں سر مو کوئی بات اس کے منشا کے خلاف نہ ہو۔ چنانچہ دوزخ کے جیل خانہ پر بھی اس نے فرشتوں ہی کو مامور فرمایا ہے۔

اس تعبیر میں نہایت لطیف طریقہ سے ان فتنہ پردازوں کا جواب بھی دے دیا جو بات بنا

سکتے تھے کہ یہ لو، جب مجرموں کے ساتھ فرشتے بھی دوزخ میں ہوں گے تو پھر کیا ڈر ہے، جس طرح وہ گزاریں گے ہم بھی گزار لیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس طرح کی دل لگی کی باتیں وہ کرنی چاہیں تو کر لیں لیکن یاد رکھیں کہ جیل پر مامور افسروں اور جیل کے قیدیوں کے درمیان آسمان و زمین کا فرق ہے۔ اس کا پتہ ان کو اس وقت چلے گا جب دوزخ کے جیل اور اس پر مامور فرشتوں سے سابقہ پیش آئے گا۔

اللہ تعالیٰ نے زندگی کے ہر شعبہ میں امتحان رکھے ہیں

'وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا' یہ ان فرشتوں کی تعداد کے ذکر کی حکمت کی طرف اشارہ فرمایا کہ اس کے اظہار سے مقصود یہ ہے کہ ان کی تعداد کا مسئلہ قیامت کے منکروں کے لیے ایک آزمائش بنے اور اس کی آڑ لے کر وہ جو کچھ اس کے خلاف کہنا چاہیں کہہ لیں۔ یہ امر واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی کے ہر گوشے میں امتحان رکھے ہیں جن کے ذریعہ سے بروں کی مخفی برائیاں اور اچھوں کی مستور نیکیاں ظہور میں آتی ہیں۔ یہ امتحان نہ ہوں تو انسان کی مخفی صلاحیتیں اجاگر ہو سکیں نہ نیک اور بد کے درمیان امتیاز ہو سکے۔ چنانچہ جنت اور دوزخ کی تفصیلات کے ذیل میں بھی اللہ تعالیٰ نے بعض ایسی حقیقتوں کا ذکر فرمایا جو منکروں کے لیے فتنہ بن گئیں۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کے جو مشاہدات بیان فرمائے یا دوزخ کے اندر قرآن نے زقوم کا جو ذکر کیا تو مخالفین نے ان کو موضوع بحث بنا کر طرح طرح سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی مذاق اڑایا اور جنت و دوزخ کا بھی۔ سورۂ بنی اسرائیل میں اس کی طرف یوں اشارہ ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ	اور ہم نے جو رؤیا تم کو دکھائی تو اسی لیے دکھائی
اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ	کہ وہ مخالفوں کے لیے آزمائش بنے، اسی طرح
الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ۔	اس درخت کو بھی جس پر قرآن میں لعنت کی گئی
(بنی اسرائیل - ۱۷: ۶۰)	ہے۔

شیاطین جن و انس کو حق کے خلاف فتنے برپا کرنے کے اس طرح کے مواقع اللہ تعالیٰ جو دیتا ہے اس کی حکمت بھی قرآن میں جگہ جگہ واضح فرما دی گئی ہے۔ سورۂ حج میں فرمایا ہے:

لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً	اللہ یہ موقع اس لیے دیتا ہے کہ شیاطین جو
لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ	کچھ حق کے خلاف کہیں وہ ان لوگوں کے لیے فتنہ
قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ	بنے جن کے دلوں میں روگ ہے یا جن کے دل سخت
شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ۙ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ	ہو چکے ہیں اور یہ ظالم بہت دور کے جھگڑے میں پڑ
اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ	چکے ہیں اور تاکہ وہ لوگ جن کو علم عطا ہوا ہے جان
(الحج - ۲۲: ۵۳-۵۴)	لیں کہ یہ جو قرآن نے بتایا ہے یہی حق ہے۔

سورۂ حج کی اس آیت کے تحت اس مسئلہ پر ہم تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔ وضاحت مطلوب ہو تو

ایک نظر اس پر ڈال لیجیے۔

اسی طرح یہاں بھی جب دوزخ کے فرشتوں کا ذکر انیس[19] کی تحدید کے ساتھ فرمایا تو یہ آگاہی بھی دے دی کہ اگرچہ اشرار اس کو فتنہ کا ذریعہ بنائیں گے لیکن اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق یہ امتحان ضروری ہے۔ اسی سے ان لوگوں کا کھوٹ ابھر کر سامنے آئے گا جن کے دلوں کے اندر خرابی ہے اور اسی سے ان لوگوں کے علم اور ایمان میں پختگی پیدا ہوگی جن کے اندر حق کی طلب اور حقیقت کی جستجو ہے۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ متمردین قریش نے سنا کہ دوزخ پر کل انیس ہی فرشتے مامور ہوں گے تو انھوں نے مذاق اڑایا کہ اگر کل اتنے ہی ہوں گے تو پھر کوئی اندیشہ کی بات نہیں ہے ہم ان سے آسانی سے نمٹ لیں گے۔ بعض نے شیخی بگھاری کہ ان میں سے اتنے کے لیے تو یہ بندہ تنہا ہی کافی ہے، باقی رہے اتنے تو ان سے اے فلاں! تم نمٹ لینا۔

'لِیَسْتَیْقِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَیَزْدَادَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِیْمَانًا'۔ 'لِ' یہاں نتیجہ کے بیان کے لیے ہے۔ یعنی حق و باطل کی اس کشمکش کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ جو سچے اہل کتاب ہیں اس سے ان کا یقین محکم ہوگا اور جو ایمان لائے ہیں ان کے ایمان میں افزونی ہوگی۔

'اُوْتُوا الْکِتٰبَ' سے یہاں قرینہ دلیل ہے کہ اچھے اہل کتاب مراد ہیں۔ اہل کتاب میں سے جو اپنی کتابوں پر واقعی ایمان رکھتے تھے ان کے لیے قرآن کی اس طرح کی باتوں کا مذاق اڑانے کی گنجائش نہیں تھی۔ خود ان کے صحیفوں میں اس طرح کی باتیں موجود تھیں۔ قرآن سے ان کو تائید مل گئی جس سے ان کا یقین محکم ہوا۔ یہی اہل کتاب ہیں جو بعد میں قرآن پر ایمان لائے۔

تقلیدی ایمان ضعیف ہوتا ہے

اہل ایمان کے ایمان میں افزونی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ اس کے خلاف جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ ان کے آگے آ جاتا ہے اور وہ اچھی طرح پرکھ لیتے ہیں کہ مخالفین کی نکتہ چینیاں بالکل بے وزن ہیں۔ ضد کی صحیح شناخت اس کے ضد ہی سے ہوتی ہے۔ دونوں پہلوؤں کے سامنے آ جانے کے بعد آدمی جس پہلو کو اختیار کرتا ہے علیٰ وجہ البصیرت اختیار کرتا ہے۔ اگر وہ ایمان کے پہلو کو اختیار کرتا ہے تو اس کا ایمان تقلیدی نہیں ہوتا بلکہ سمجھ بوجھ کر ہوتا ہے۔ اس کو وہ پورے جزم کے ساتھ اختیار کرتا ہے اور ہر آزمائش اس کے ایمان میں اضافہ کرتی ہے۔ جن کا ایمان محض تقلیدی ہوتا ہے اس کی جڑ مضبوط نہیں ہوتی اس وجہ سے معمولی بادِ مخالف بھی بسا اوقات اس کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔

'وَلَا یَرْتَابَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ'۔ وہی بات منفی پہلو سے فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس امتحان میں اس لیے ڈالتا ہے کہ جو سچے اہل کتاب ہیں وہ اور اہل ایمان شک کے حملوں سے محفوظ ہو جائیں۔ گویا یہ شک کے حملوں سے محفوظ کر دینے کے لیے ایک پیشگی احتیاطی تدبیر ہے۔

اچھے اہل کتاب کی تعریف

یہاں یہ امر پیش نظر رہے کہ اہل ایمان کے پہلو بہ پہلو اچھے اہل کتاب کا بھی ذکر آیا ہے حالانکہ یہ سورہ

جیسا کہ اوپر اشارہ گزرا، ابتدائی مکی سورتوں میں سے ہے جب کہ اہل کتاب سے براہ راست سابقہ پیش نہیں آیا تھا چنانچہ جن لوگوں نے اس آیت کو مدنی قرار دیا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی انھوں نے بتائی ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اچھے اہل کتاب مسلمانوں ہی کے حکم میں تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے شروع ہی سے ان کا ذکر اہل ایمان کے ہراول دستہ کی حیثیت سے کیا تاکہ پہلے ہی سے ان پر واضح ہو جائے کہ اس نبی کی بعثت کے دور میں انھیں کیا رول ادا کرنا ہے، اللہ تعالیٰ کی نظروں میں ان کی کیا جگہ ہے، آگے انھیں کن حالات سے گزرنا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کو محکم رکھنے کے لیے کیا تدبیریں اختیار فرما رہا ہے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے انھیں کس طرح بیدار رہنا چاہیے۔

حاسد یہود کا رویہ

'وَلِيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْكَافِرُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا'
اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ حاسد یہود اور کفار قریش پر ان متشابہات کا کیا اثر پڑے گا۔

'الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ' سے عام طور پر لوگوں نے منافقین کو مراد لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ لفظ 'مَرَضٌ' قرآن میں نفاق ہی کے لیے آیا ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس کتاب میں جگہ جگہ ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ حسد اور کینہ کی تعبیر کے لیے بھی آیا ہے اور ایسے مواقع میں اس سے مراد یہود ہوا کرتے ہیں اس لیے کہ ان کو بنی اسمٰعیل پر بھی حسد تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی۔ اس حسد کی تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ اوپر اچھے اہل کتاب کا ذکر ہو چکا ہے۔ اب ان کے مقابل میں حاسد یہود کے رویہ کا ذکر آ رہا ہے اور ساتھ ہی 'الْكَافِرُونَ' کے لفظ سے کفار قریش کی طرف بھی اشارہ فرما دیا کہ یہ دونوں گروہ ان متشابہات کے بارے میں ایک ہی روش اختیار کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ 'مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا'۔

ان کے اس قول کی وضاحت سورۂ بقرہ کی آیت ۲۶ کے تحت ہم کر چکے ہیں کہ اس طرح کی باتیں سن کر وہ ناک بھوں چڑھائیں گے اور متکبرانہ انداز میں کہیں گے کہ بھلا اس طرح کی تمثیلات سے اللہ کی مراد کیا ہے! یعنی یہ باتیں لایعنی ہیں اور اللہ تعالیٰ لایعنی باتیں نہیں کرتا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ سے اس طرح کی باتیں منسوب کر رہا ہے (العیاذ باللہ) وہ بھی لایعنی اور اس کا دعوائے رسالت محض افترا ہے۔

'كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ' یعنی اس طرح کی آزمائشوں اور امتحانوں میں ڈال کر اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت نصیب کرتا ہے۔ یہاں وہ بات یاد رکھیے جس کی وضاحت جگہ جگہ ہم کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ہر مشیت اس کی حکمت کے تحت ہے۔ جن کو وہ گمراہی کا مستحق پاتا ہے ان کو گمراہ کرتا ہے اور جو اس کی سنت

کے تحت ہدایت کے سزاوار ہوتے ہیں ان کو ہدایت بخشتا ہے۔ بالکل اسی سیاق و سباق میں سورۂ بقرہ
میں یوں فرمایا گیا ہے:

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ
اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا
الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَیَقُوْلُوْنَ مَاذَاۤ
اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ یُضِلُّ
بِهٖ كَثِیْرًا ۙ وَّ یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا ؕ
وَمَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ۙ
(البقرۃ - ۲ : ۲۶)

جو ایمان لائے وہ جانتے ہیں کہ یہی حق
ہے ان کے رب کی جانب سے۔ رہے
وہ جنھوں نے کفر کیا تو وہ کہیں گے کہ بھلا اس
طرح کی تمثیل سے اللہ کی کیا مراد ہو سکتی ہے!
اللہ اس سے بہتوں کو گمراہ کرتا اور بہتوں کو ہدایت
دیتا ہے اور وہ اس سے گمراہ انہی کو کرتا ہے
جو نافرمان ہوتے ہیں۔

نکتہ چینیوں کے غرورِ ہمہ دانی پر ضرب

وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۔ یہ ان نکتہ چینیوں کے غرورِ ہمہ دانی پر ضرب لگائی ہے کہ وہ اس زعم میں نہ رہیں کہ اس کائنات کے تمام بھیدوں کو وہ جانتے ہیں یا ان کے پاس اتنا علم اور اتنی عقل ہے کہ ان کو جان سکتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ زعم بالکل باطل ہے۔ تیرے رب کی فوجوں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ وہی جانتا ہے کہ اس کی افواج کتنی ہیں، اس میں کس یونٹ کی صلاحیتیں کیا ہیں، کون سی رجمنٹ کن اسلحہ سے لیس ہے اور کون اور کتنے افسر کس محاذ پہ مامور ہیں۔ نہ کوئی ان ساری باتوں کو جانتا ہے اور نہ جان سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رموزِ سلطنت میں سے جن بھیدوں سے آگاہ کر دے انسان کو چاہیے کہ ان کی قدر کرے اور ان کو اپنے خزانۂ علم میں بیش بہا اضافہ سمجھے۔ اس گھمنڈ میں نہ مبتلا ہو کہ خدا کی کائنات اتنی ہی ہے جتنی اس نے دیکھی ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس دور کے دانش فروشوں نے بھی قرآن کی جن باتوں پر شبہات وارد کیے ہیں یا جن کی من مانی تاویلیں کرنے کی کوشش کی ہے، اسی غرورِ ہمہ دانی میں مبتلا ہو کر کی ہے۔ جو باتیں ان کو اپنی محدود عقل کی گرفت سے باہر محسوس ہوئیں ان کا یا تو انکار کر دیا، اگر انکار کی جرأت ہوئی، ورنہ ان کی کوئی ایسی تاویل کرنے کی کوشش کی جو انکار سے بھی کئی قدم آگے ہوتی۔

وَمَا هِیَ اِلَّا ذِكْرٰی لِلْبَشَرِ ۔ یہ مقصد بتایا ہے قیامت کے احوال پر مشتمل ان آیات کا۔ فرمایا کہ یہ انذار کرنے والی آیتیں ہم نے نکتہ چینی کے لیے نہیں نازل کی ہیں بلکہ لوگوں کی تذکیر و تنبیہ کے لیے نازل کی ہیں تاکہ جو اس ابدی عذاب سے بچنا چاہتے ہیں وہ اس کے ظہور سے پہلے پہلے تیاری کر لیں۔ اللہ نے یاد دہانی سنا کر خطرے سے آگاہ کر دیا۔ اس سے فائدہ اٹھانا لوگوں کا اپنا کام ہے۔ جو فائدہ نہیں اٹھائیں گے ان کے پاس خدا کے آگے کوئی عذر نہیں ہوگا۔ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ وہ نیک و بد سے لوگوں کو آگاہ کر دیتا ہے۔ بالجبر

ہدایت کی راہ پر چلا دینا اس کی سنت کے خلاف ہے۔

'ھِیَ' کا مرجع عام مفسرین نے 'سقر' کو سمجھا ہے لیکن میرے نزدیک اس کا مرجع وہ آیات منذرات ہیں جن میں 'سقر' کے احوال سنائے گئے ہیں۔ اس لیے کہ 'ذِکْرٰی' یعنی یاددہانی ہونے کی حیثیت درحقیقت ان آیات ہی کو حاصل ہے نہ کہ 'سقر' کو۔

كَلَّا وَالْقَمَرِ ۝ وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ۝ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ (۳۲-۳۴)

آفاق کی بعض نشانیوں کا حوالہ

یہ آفاق کی چند نشانیوں کی قسم کھا کر فرمایا کہ جس قیامت اور دوزخ سے لوگوں کو آگاہ کیا جا رہا ہے وہ اس کائنات کے عظیم حوادث میں سے ہے اور اس کا ظہور قطعی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں تدریج و ترتیب ہے۔ جب اس کا وقت آ جائے گا تو وہ ظاہر ہو جائے گی۔ اپنے وقت سے پہلے نہیں ظاہر ہو گی۔ اس کے ظہور میں تاخیر سے یہ سمجھ بیٹھنا کہ وہ ظاہر ہو گی ہی نہیں حماقت ہے۔ رات میں اگر کوئی صبح کے لیے جلدی کرے تو اس کی جلد بازی کے سبب سے صبح اپنے وقت سے پہلے نہیں آئے گی۔ یہی حال قیامت کا ہے۔ اس کا بھی ایک وقت مقرر ہے۔ ٹھیک اسی وقت پر ظاہر ہو گی۔

'كَلَّا وَالْقَمَرِ'۔ آفاق کی نشانیوں میں سے پہلے چاند کی قسم کھائی ہے اور اس سے پہلے 'كَلَّا' کے ذریعے سے مخاطب کے زعم باطل کی پوری شدت سے تردید فرما دی ہے۔ قسم سے پہلے حرف نفی کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ اس طرح کے مواقع میں متکلم گویا مخاطب کے خیال کی تردید میں اتنا توقف بھی نہیں کرنا چاہتا کہ دلیل بیان کرنے کے بعد اس کی تردید کرے بلکہ شدت نفرت کے اظہار کے لیے اس کی تردید ہی سے کلام کا آغاز کرتا ہے اور پھر بقید قسم اپنی دلیل بیان کرتا ہے۔

قرآن مجید میں یہ اور اس نوع کی تمام قسمیں، جیسا کہ ہم جگہ جگہ وضاحت کرتے آ رہے ہیں، بطور شہادت یا بالفاظ دیگر اس دعوے کی دلیل کے طور پر کھائی گئی ہیں جو ان کے بعد مذکور ہوا ہے۔ یہاں مخاطب، جیسا کہ موقع و محل سے واضح ہے، مکذبین قیامت ہیں اور ان کا جو شبہ زیر بحث ہے وہ یہ ہے کہ قیامت آتی ہے تو آ کیوں نہیں جاتی۔ ان کے سامنے چاند کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے کہ جس طرح وہ درجہ بدرجہ ہلال سے بدر کے مقام تک پہنچتا ہے اسی طرح تم بھی مختلف اطوار و مراحل سے گزرتے ہوئے بالآخر ایک دن اس مقام تک پہنچو گے جہاں پہنچنے کی تمھیں خبر دی جا رہی ہے اور اپنے رب کے عدل کامل کے ظہور کا مشاہدہ کرو گے۔ جس طرح چاند کے سفر کے لیے منزلیں مقرر ہیں[۱]، ان کو طے کیے بغیر اس کا ظہور کامل نہیں ہوتا، خواہ اس کے لیے کوئی کتنی ہی جلد بازی کرے، اسی طرح اس روز جزا و سزا کے لیے بھی منزلیں مقرر ہیں جن سے گزرے بغیر اس کا ظہور نہیں ہو گا۔ کائنات

---

[۱] وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ (یٰس - ۳۶ : ۳۹) (اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں ٹھہرا دی ہیں)۔

کے نظام میں ہر تغیر اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی اسکیم کے مطابق ہوتا ہے۔ دوسروں کی طلب و تمنا اور ان کی عجلت یا تاخیر کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ دن آئے گا ضرور، اس کے آئے بغیر اس دنیا کی تخلیق کا مقصد پورا نہیں ہوگا لیکن یہ اسی وقت آئے گا جب اللہ تعالیٰ کی تقویم میں اس کا مقررہ وقت، منٹ اور سیکنڈ کے فرق کے بغیر پورا ہو جائے گا۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے چاند کے طلوع و غروب اور اس کے عروج و محاق سے دین کے مختلف حقائق پر استشہاد کیا ہے جن کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے اور آگے کی سورتوں میں بھی بعض اہم چیزیں آئیں گی جن کی ہم ان شاء اللہ وضاحت کریں گے۔ یہاں اس کے تدریجی ارتقاء کا پہلو پیش نظر ہے اور مقصود قیامت کے لیے جلدی مچانے والوں کو توجہ دلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نشانی کے ظہور کے لیے ایک معیّن پروگرام ہے جس کی حکمتوں اور مصلحتوں کو وہی جانتا ہے۔ جو چیز اس کے عدل کا بدیہی مقتضیٰ ہے اس کا ظہور تو لازماً ہوگا لیکن ہوگا اپنے وقت پر۔ سورۂ انشقاق میں بھی چاند کی قسم وارد ہوئی ہے اور ہمارے نزدیک وہاں بھی اسی پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا ہے:

وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ ۝ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ (انشقاق-۸۴: ۱۸-۱۹)
شاہد ہے چاند جب کہ وہ کامل ہوتا ہے کہ تم بھی درجہ بدرجہ بڑھو گے۔

یعنی خدا کے مقرر کردہ روز جزاء و سزا کے لیے تمھاری حاضری تو لازمی ہے لیکن جس طرح چاند درجہ بدرجہ اپنے آخری نقطہ پر پہنچتا ہے اسی طرح یہ دن بھی اپنے مراحل طے کر کے ظہور میں آئے گا۔

وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ۝ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ: چاند کے بعد یہ رات کی قسم کھائی ہے جب کہ وہ پیچھے مڑتی ہے اور صبح کی قسم کھائی ہے جب کہ وہ ہویدا ہوتی ہے۔ یعنی جس طرح رات کی تاریکی میں صبح کا کوئی نام و نشان نہیں ہوتا لیکن وقت آتا ہے کہ صبح نمودار ہو جاتی ہے وہی حال قیامت کے ظہور کا بھی ہوگا۔ یہ دنیا رات کے مانند ہے جس کی تاریکی صبح قیامت کو ڈھانکے ہوئے ہے لیکن وقت آئے گا کہ یہ تاریکی کافور ہوگی اور قیامت اچانک نمودار ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ جو ہر روز رات کی تاریکی کے بعد دن کی روشنی دکھاتا ہے اور کسی کو بھی اس کائنات کے اس عظیم انقلاب پر تعجب نہیں ہوتا وہ جب چاہے گا قیامت کو بھی اسی طرح نمودار کر دے گا اور اس وقت سب دیکھ لیں گے کہ جس چیز کو وہ ناممکن سمجھتے تھے وہ سامنے آگئی۔

بالکل یہی قسم، معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ، انذارِ قیامت کی تائید ہی کے مقصد سے سورۂ تکویر میں یوں آئی ہے:

وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ ۝ وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ ۝ (التکویر-۸۱: ۱۷-۱۸)
شاہد ہے رات جب کہ جانے لگتی ہے اور شاہد ہے صبح جب کہ وہ سانس لیتی ہے۔

اس کائنات کے ہر گوشے میں قیامت کی دلیل موجود ہے

اس تفسیر میں جگہ جگہ ہم اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے اس طرح بنائی ہے کہ اس کے ہر گوشہ میں کسی نہ کسی شکل میں قیامت کا ریہرسل برابر ہوتا رہتا ہے تاکہ انسان کو اس کے باب میں جو شبہ بھی لاحق ہو اس کو دور کرنے کے لیے اسے اپنے گرد و پیش ہی سے کوئی ایسی مثال مل جائے جو اس کے دل کو مطمئن کر دے بشرطیکہ اس کے اندر سلامت روی اور حق کی طلب ہو۔

إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ ۝ نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ (۳۵-۳۶)

یہ مذکورہ بالا قسموں کا مقسم علیہ ہے۔ یعنی قرآن کی یہ آیات جو دوزخ کے ہول سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے نازل کی گئی ہیں، ہنسی مذاق کی چیز نہیں ہیں بلکہ اس کائنات کے عظیم احوال و حوادث میں سے ہیں۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو ان سے سبق حاصل کرنے کے بجائے ان کو اپنے مذاق کا موضوع بنائیں۔

لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ (۳۷)

دلیلوں سے فائدہ اٹھانا لوگوں کا اپنا کام ہے

یعنی اس ہولناک دن سے سابقہ پیش آنے سے پہلے لوگوں کو اس سے آگاہ کرنا ضروری تھا تاکہ جب یہ آئے تو کوئی یہ عذر نہ کر سکے کہ اس کو اس سے آگاہ نہیں کیا گیا ورنہ وہ اس کے لیے تیاری کرتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے ذریعہ سے اتمامِ حجت کر دیا۔ رہا اس کو رد یا قبول کرنا تو یہ لوگوں کا اپنا کام ہے۔ جو اپنی عافیت کی خیر چاہے گا وہ اس کو قبول کرنے کے لیے آگے بڑھے گا اور جس کی شامت آئی ہوئی ہو گی وہ اعراض و استکبار کی روش اختیار کرے گا اور پیچھے ہٹ جائے گا۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ (۳۸)

عمل ہی نجات دے گا، عمل ہی ہلاک کرے گا

یعنی قانونِ الٰہی یہ ہے کہ جس طرح معلول اپنی علت کے ساتھ بندھا ہوا ہوتا ہے اسی طرح ہر شخص اپنے اعمال کے ساتھ بندھا ہوا ہو گا۔ جزاء و سزا کے دن اس کا عمل ہی اس کو چھڑائے گا اور عمل ہی اس کو ہلاک کرے گا۔ اگر کوئی حسب و نسب اور شرک و شفاعت کے بل پر اس دن کی آفتوں سے چھوٹنے کے زعم میں مبتلا ہے تو وہ یاد رکھے کہ اس طرح کی کوئی چیز اس کے کام آنے والی نہیں ہے۔

إِلَّا أَصْحَابَ الْيَمِينِ ۝ فِي جَنَّاتٍ يَتَسَاءَلُونَ ۝ عَنِ الْمُجْرِمِينَ (۳۹-۴۱)

اصحاب الیمین

اس دن نجات و فلاح صرف اصحاب الیمین کو حاصل ہو گی۔ اصحاب الیمین کی تفصیل اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت کو پیش نظر رکھ کر زندگی گزاری اور جن کے اعمال نامے ان کے دہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے۔ فرمایا کہ یہ لوگ بے شک نہ صرف اپنی نیکیوں کا پورا پورا صلہ پائیں گے بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص سے بھی ان کو نوازے گا۔ یہ لوگ بہشت کے باغوں میں ہوں گے اور وہاں آپس میں ان مجرموں کے انجام سے متعلق سوال و جواب کر رہے ہوں گے جن سے دنیا میں ان کو سابقہ رہا۔

اس سوال و جواب کی نوعیت سورۂ صافات کی مندرجہ ذیل آیات سے واضح ہوتی ہے

اور اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ آپس میں سوال و جواب کرتے کرتے کس طرح وہ دوزخ میں پڑے ہوئے مجرمین کو بھی مخاطب کرنے اور ان کے دوزخ میں پڑنے کا سبب معلوم کرنے کا موقع نکال لیں گے۔ فرمایا ہے:

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ۝ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّیْ كَانَ لِیْ قَرِیْنٌ ۝ یَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِیْنَ ۝ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِیْنُوْنَ ۝ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ۝ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ ۝
(الصّٰفّٰت - ۳۷ : ۵۰-۵۵)

پس اہل جنت ایک دوسرے کی طرف سوال و جواب کرتے ہوئے متوجہ ہوں گے۔ ان میں سے ایک کہے گا، دنیا میں میرا ایک ساتھی تھا جو کہا کرتا تھا کہ کیا تم بھی قیامت کی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو! بھلا جب ہم مر کر مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا جزا اور سزا کے لیے اٹھائے جائیں گے! کہیں گے بھلا جھانک کر دیکھو تو سہی! تو وہ جھانک کر دیکھے گا تو اس مجرم کو دوزخ کے بیچ میں دیکھے گا۔

مَا سَلَكَكُمْ فِیْ سَقَرَ (۴۲)

یعنی اہل جنت آپس میں مجرموں سے متعلق سوال و جواب کرتے کرتے اہل دوزخ کو مخاطب کر کے ان سے بھی پوچھ لیں گے کہ بتاؤ تمھیں دوزخ میں کیا چیز لے گئی!

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِیْنَ ۝ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِیْنَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِیَوْمِ الدِّیْنِ ۝ حَتّٰۤى اَتٰىنَا الْیَقِیْنُ ۝ (۴۳-۴۷)

اہل دوزخ کا اعتراف

اہل دوزخ ان کے جواب میں اعتراف کر لیں گے کہ ہمارے اعمال ہی ہمیں یہاں لانے والے بنے ہیں۔ قصور سارا ہمارا اپنا ہی ہے، کسی دوسرے کا نہیں ہے۔

سب سے پہلے وہ اپنے اس جرم کا اعتراف کریں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ دین کے عقائد میں جس طرح توحید کو سب پر تقدم حاصل ہے اسی طرح اعمال میں نماز کو سب پر تقدم حاصل ہے۔ ہر نبی نے سب سے پہلے اسی عمل کی دعوت دی ہے اور اسی کے اہتمام اور اسی کے ترک پر دین کو منحصر بتایا ہے۔

اس کے بعد وہ اپنے عدم انفاق کا اعتراف کریں گے کہ وہ مسکینوں کو کھلانے کے روادار نہ تھے۔ اعمال میں نماز کے بعد دوسرا درجہ انفاق کا ہے اور انہی دونوں پر تمام اعمالِ صالحہ کی عمارت قائم ہے۔ ہم جگہ جگہ اس حقیقت کی وضاحت کر چکے ہیں کہ نماز بندے کا تعلق خالق سے استوار کرتی ہے

اور زکوٰۃ (انفاق) اس کو خلق سے جوڑتی ہے اور انہی دو کی استواری پر آدمی کے دین کی استواری کا انحصار ہے۔

اس کے بعد وہ اس امر کا اعتراف کریں گے کہ قیامت اور جزا و سزا کے باب میں جس طرح کی نکتہ چینیاں اور موشگافیاں دوسرے کرتے تھے اسی طرح کی موشگافیاں کرنے والوں میں وہ بھی رہے ہیں اور انہی موشگافیوں کی آڑ لے کر انھوں نے جزا و سزا کے دن کو جھٹلایا یہاں تک کہ موت آگئی اور اس نے ان تمام چیزوں کا یقین دلا دیا جن کے بارے میں وہ شکوک پیدا کرتے رہے تھے۔

'كُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ' سے اشارہ اس طرح کی باتوں کی طرف ہے جس کی ایک مثال دوزخ پر مامور فرشتوں کی تعداد کے بارے میں اوپر گزر چکی ہے۔

'خوض فی الحدیث' کے معنی ہیں کسی بات میں مین میکھ نکالتے نکالتے کہیں سے کہیں جا نکلنا اور اس کو فتنہ اور حق سے انحراف کے لیے بہانہ بنا لینا۔

'حَتَّىٰ أَتَانَا الْيَقِينُ' یقین کے اصل معنی تو یقین ہی کے ہیں لیکن چونکہ موت کے بعد تمام ما بعد الموت حقائق آدمی پر روشن ہو جاتے ہیں اور وہ ان کے یقین پر مجبور ہو جاتا ہے اس وجہ سے موت کو بھی یقین سے تعبیر کرتے ہیں جس طرح ایک شے کے لازم سے خود اس شے کو تعبیر کر دیتے ہیں۔

یہاں مجرموں کے جو اعترافات نقل ہوئے ہیں وہ اس حقیقت کے اثبات کے لیے نقل ہوئے ہیں جو اوپر 'كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ' کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے تاکہ جو نادان اپنے خاندان، اپنے حسب و نسب اور اپنے شرکاء و شفعاء کے بل پر جزا و سزا کا مذاق اڑا رہے تھے ان کے کان اور ان کی آنکھیں کھلیں اور ان پر یہ حقیقت خود ان کے ہم مشربوں کی زبان سے واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نیک اعمال کے سوا کوئی چیز کام آنے والی نہیں ہے۔

فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ (۴۸)

مشرکین کی مزعومہ شفاعت کی نفی

یہ ان کے مزعومہ شفعاء اور ان کی مفروضہ شفاعت کی نفی فرمائی ہے کہ نہ وہاں ان کے مزعومہ شفعاء ہوں گے اور نہ ان کی شفاعت۔

یہاں کلام عربیت کے اسلوب پر ہے جس کو 'نفی الشیء بنفی لازمه' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور جس کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں۔ امرء القیس نے ایک صحرائی راستہ کی تعریف میں کہا ہے کہ 'لا یهتدی بمنارہ' اس کے منارہ سے رہنمائی نہیں حاصل کی جاتی۔ اس کا مطلب ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس میں منارے ہیں ہی نہیں کہ ان سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ مشرکین کو اپنے جن شفعاء پر ناز تھا ان کے متعلق قرآن نے صاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ 'إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ' (النجم - ۵۳: ۲۳) (یہ

تو محض فرضی نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں، ان کے حق میں خدا نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ یہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں)۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ (۴۹)

اعراض کرنے والوں کے حال پر تعجب

یہ ان کے حال پر تعجب کا اظہار فرمایا ہے کہ ان کو تو اپنے رب کا شکر گزار ہونا تھا کہ اس نے جزاء و سزا کے یوم موعود سے پہلے ان کی یاددہانی اور اصل حقائق سے آگاہ کرنے کے لیے ایک کتاب بھی نازل کر دی اور ایک رسول بھی بھیج دیا لیکن ان کا حال عجیب ہے کہ وہ اس یاددہانی سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں۔

'مُعْرِضِينَ' ضمیر مجرور سے حال پڑا ہوا ہے۔ یہ اسلوب عربیت میں معروف ہے۔ اس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ ۝ فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ (۵۰-۵۱)

یہ ان کی وحشت زدگی کی مثال ہے۔ فرمایا کہ ان کا حال ان بدکے ہوئے گدھوں کا ہے جو شیر سے ڈر کے بھاگے ہوں۔ 'قَسْوَرَةٌ' شیر کو کہتے ہیں۔ گدھے اور گورخر وغیرہ شیر کی آواز سن کر بھاگے ہوں تو وہ بڑی مشکل سے قرار پکڑتے ہیں۔ کسی طرف سے ذرا بھی کھٹکا ہو تو وہ اس طرح بھاگتے ہیں گویا شیر ہی آگیا۔ فرمایا کہ یہی حال ان لوگوں کا ہے۔ یہ اس یاددہانی سے ایسے سہمے ہوتے ہیں کہ اس کا ایک حرف بھی سننے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ ایک حقیقت جب اتنی واضح ہو کہ آدمی کا دل اس کے انکار پر بھی مطمئن نہ ہو اور اس کو قبول کرنے کے لیے بھی تیار نہ ہو تو اس سے اس کے گریز و فرار کی شکل یہی ہوتی ہے جو اس مثال میں واضح فرمائی گئی ہے۔ اس کی خواہش اور کوشش ہر وقت رہتی ہے کہ کسی طرف سے اس کے کانوں میں کوئی ایسی آواز نہ پڑنے پائے جو اس حقیقت کو یاد دلا دے۔

بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً (۵۲)

اعراض کا بہانہ

یعنی اس یاددہانی سے فرار کے لیے انھوں نے یہ بہانہ بنایا ہے کہ اگر خدا کو کوئی کتاب ہی اتارنی تھی تو انہی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر یہ کیوں اتاری گئی! ایسا کیوں نہ ہوا کہ ہمیں بھی کھلے ہوئے صحیفے پکڑا دیے جاتے! آخر اللہ تعالیٰ کے لیے ایسا کرنا کیا دشوار تھا! یہ وہی بات ہے جو دوسرے مقام میں یوں بیان ہوئی ہے:

وَإِذَا جَاءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا	اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے تو
لَن نُّؤْمِنَ حَتَّىٰ نُؤْتَىٰ مِثْلَ	وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اس پر اس وقت تک ایمان
مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ ۘ	نہیں لانے کے جب تک کہ ہمیں بھی اسی طرح

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (الانعام - ۶: ۱۲۴)

نہ ملے جس طرح اللہ کے رسولوں کو ملی ــــ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت سے کن کو سرفراز کرے!

كَلَّا ۖ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ (۵۳)

اصل حقیقت

یعنی نہ ایسا ہونا ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ ان کے گریز کی علت یہ نہیں ہے جو یہ ظاہر کر رہے ہیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ آخرت کے وقوع کے متوقع نہیں ہیں۔ 'يَخَافُوْنَ' یہاں 'يَرْجُوْنَ' کے مفہوم میں ہے اور اس معنی میں اس کا استعمال معروف ہے۔ اس کے شواہد اس کے محل میں ہم پیش کر چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ آخرت سے نچنت ہیں اور ان کی دلی خواہش یہی ہے کہ اس سے نچنت ہی رہیں، اس کی فکر ان کے عیش کو مکدر کرنے نہ پائے تو ان کو کوئی نشانی بھی قائل نہیں کر سکتی۔ ان کی طلب کے مطابق ان کو کھلے صحیفے بھی پکڑا دیے جائیں جب بھی وہ کوئی نہ کوئی بات بنا ہی لیں گے۔

كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ (۵۴-۵۵)

نبی صلعم کے لیے تسلی

یہ ان ہٹ دھرموں سے اظہار بے نیازی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پیام تسلی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس طرح کے ضدیوں کی زیادہ ناز برداری کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک یاددہانی ہے جو انھیں کر دی گئی۔ جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے اور سیدھی راہ اختیار کرے۔ اگر وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے تو اس کا انجام خود بھگتیں گے، نہ اللہ کا کچھ بگاڑیں گے نہ رسول کا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ پکڑنے سے پہلے لوگوں کو یاددہانی کر دیتا ہے تاکہ اس کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور رسول کا فرض یہ ہے کہ وہ اس یاددہانی کو لوگوں تک پہنچا دے۔ لوگوں کے دلوں میں ہدایت اتار دینا نہ رسول کی ذمہ داری ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ ان لوگوں کے دلوں میں اپنی ہدایت اتارے جو اس سے بیزار ہیں۔

وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ (۵۶)

ہدایت کے باب میں سنتِ الٰہی

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں اس نے پسند فرمائی ہے اور جو اس کتاب میں جگہ جگہ زیر بحث آ چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہدایت انہی کو بخشتا ہے جو اپنے سمع و بصر اور فواد کی صلاحیتوں سے کام لیتے ہیں، جو فطرت کے نور کی قدر کرتے ہیں، جو آفاق و انفس کی نشانیوں پر غور کرتے ہیں اور ہر اس بات کو سننے اور سمجھنے کے لیے اپنے کان کھلے رکھتے ہیں جو معقول ہو اگرچہ وہ ان کے نفس کی خواہشوں کے کتنے ہی خلاف ہو۔ اللہ تعالیٰ کی ہر مشیت اس کی حکمت کے تحت ہے۔ وہ انہی کو ہدایت بخشتا ہے جو ہدایت کی قدر کرنے والے ہوتے ہیں۔ جو اس کی قدر نہیں

کرتے ان کو ہدایت دینا تو در کنار اللہ تعالیٰ ان کی وہ صلاحیت بھی سلب کر لیتا ہے جو فطرت کی راہ سے ان کو حاصل ہوتی ہے۔ اس باب میں حضرت مسیح علیہ السلام کے ارشاد کا حوالہ ہم جگہ جگہ دے چکے ہیں۔

'هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰی وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ'۔ مفسرین نے عام طور پر 'هُوَ' کا مرجع اللہ کو قرار دیا ہے اور مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اللہ ہی تقویٰ کا سزاوار ہے اور مغفرت کا اہل ہے لیکن ہمارے نزدیک اس کا تعلق 'فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ' سے ہے۔ 'مَنْ' واحد، جمع دونوں کے لیے آتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے لیے ضمیریں دونوں قسم کی استعمال ہو سکتی ہیں۔ یہ بتایا گیا ہے کہ کون اس قرآن سے یاد دہانی حاصل کرے گا اور اس کے صلہ میں اللہ کی مغفرت کا سزاوار ٹھہرے گا اور کون اس سے محروم رہیں گے۔ فرمایا کہ جن کے اندر خدا کا خوف ہو گا وہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے اور وہ مغفرت کے اہل ٹھہریں گے۔ رہے وہ جن کے سینے خوفِ خدا سے خالی ہیں وہ اس سے محروم ہی رہیں گے اور جب وہ اس سے محروم رہیں گے تو خدا کی مغفرت سے بھی محروم رہیں گے۔ سورۂ بقرہ کے آغاز میں 'هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ' کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں کہ قرآن کا فیض کن لوگوں کو پہنچتا ہے اور کون لوگ اس سے محروم رہتے ہیں۔ اس سنتِ الٰہی کی تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر ڈال لیجیے۔ تقویٰ کے مختلف مدارج ہیں۔ انسان کی فطرت کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو تقویٰ ودیعت فرمایا ہے اور جس کا ذکر 'فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا' (الشمس - ۹۱ : ۸) میں ہے، یہاں اس تقویٰ کی طرف اشارہ ہے۔ آگے والی سورہ میں ان شاء اللہ اس فطری تقویٰ کی پوری وضاحت آپ کے سامنے آئے گی۔

اللہ تعالیٰ کی تائید اور اس کے فضل سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى اِحْسَانِهٖ۔

رحمان آباد
۱۸- دسمبر ۱۹۷۸ء
۱۷- محرم الحرام ۱۳۹۹ھ

تدبرِ قرآن

٧٥

القیٰمة

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ بھی، گروپ کی سابق سورتوں کی طرح، انذارِ قیامت کی سورہ ہے۔ سابق سورہ کا خاتمہ اس مضمون پر ہوا ہے کہ اس یاددہانی سے اعراض کرنے والوں کے اعراض کی اصل وجہ یہ ہے کہ انسان کے اندر نیکی اور بدی کا جو شعور اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمایا ہے یہ سرگشتگانِ دنیا اس کو ضائع کر بیٹھے ہیں۔ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ جو لوگ اس کو زندہ رکھتے ہیں ان کو مزید ہدایت و روشنی نصیب ہوتی ہے اور جو اس کو ضائع کر بیٹھتے ہیں وہ ایسے اندھے بہرے بن جاتے ہیں کہ ان پر کوئی تذکیر بھی کارگر نہیں ہوتی۔

اس سورہ میں اسی حقیقت کو اچھی طرح مبرہن کر دینے کے لیے نفسِ لوّامہ کی، جو ہر انسان کی فطرت کے اندر ودیعت ہے، اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے اور اس کو قیامت کے ثبوت میں ایک دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ انسان کے اندر ایک مخفی زاجر کی حیثیت رکھتا ہے جو اس کو، جب وہ کسی بدی کا ارتکاب کرتا ہے، ملامت اور سرزنش کرتا ہے۔ انسان کے اندر اس کا پایا جانا نہایت واضح ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ اس دنیا میں مطلق العنان اور غیر مسئول بنا کر نہیں چھوڑا گیا کہ چاہے وہ نیکی کرے یا بدی اس کے خالق کو اس سے کچھ بحث نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے اندر اس طرح کے کسی زاجر کو بٹھانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ انسان ایک عالمِ اصغر ہے اس کے اندر نفسِ لوّامہ کا پایا جانا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس عالمِ اکبر کے اندر بھی ایک نفسِ لوّامہ ہے جس کو قیامت کہتے ہیں۔ وہ ایک دن ظہور میں آئے گی اور ان تمام لوگوں کو ان کی بداعمالیوں پر سرزنش کرے گی جنھوں نے اپنے اندر کے مخفی زاجر کی تنبیہات کی پروا نہ کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کی عدالتِ کبریٰ کا ایک عکس ہر انسان کے اپنے وجود کے اندر نفسِ لوّامہ کی عدالتِ صغریٰ کی شکل میں موجود ہے جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ جو شخص کوئی برائی کرتا ہے وہ کہیں پسِ پردہ نہیں کرتا بلکہ خدا کی عدالت کے دروازے پر اور اس کے مقرر کیے ہوئے کوتوال کے روبرو کرتا ہے۔ چنانچہ نفسِ لوّامہ کی شہادت پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَهٗ (۵) (بلکہ انسان اپنے ضمیر کے روبرو شرارت کرنا چاہتا ہے) اسی حقیقت کی وضاحت

آگے کی آیات میں یوں فرمائی ہے کہ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ (۱۴-۱۵) (بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذرات تراشے)۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جدید فلسفہ اخلاق کے ماہروں نے بھی چند بنیادی نیکیوں کا نیکی ہونا اور چند معروف برائیوں کا برائی ہونا بطور اصول موضوعہ تسلیم کر کے اپنی بحث کا آغاز کیا ہے۔ اگرچہ وہ یہ نہیں بتا سکے کہ ان نیکیوں کا نیکی یا ان برائیوں کا برائی ہونا انھوں نے کہاں سے جانا جس کے سبب سے ان کی ساری عمارت بے بنیاد رہ گئی ہے لیکن یہ حقیقت انھیں تسلیم ہے کہ بنیادی نیکیوں اور بنیادی برائیوں کے شعور سے انسان محروم نہیں ہے۔ قرآن نے اس سورہ میں اس حقیقت سے یوں پردہ اٹھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر نہ صرف نیکی اور بدی کا شعور ودیعت فرمایا ہے بلکہ اس کے اندر ایک مخفی زاجر (ضمیر) بھی رکھا ہے جو برائیوں کے ارتکاب پر اس کو سرزنش کرتا اور نیکیوں پر اس کو شاباش دیتا ہے اور پھر اسی نفسیاتی حقیقت پر اس نے قیامت اور جزا و سزا کی دلیل قائم کی ہے کہ جس فاطر نے ہر انسان کے نفس کے اندر اس کی بدعملی پر سرزنش اور اس کی نیکی پر تحسین کے لیے یہ اہتمام فرمایا ہے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اس مجموعی کائنات کے لیے کوئی ایسا دن نہ لائے جس میں اس پوری دنیا کا محاسبہ ہو اور ہر شخص اپنی نیکیوں کا صلہ اور اپنی بدیوں کی سزا پائے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ میں مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱ - ۶) قیامت کی قسم خود قیامت کی قطعیت پر اور انسان کے اندر نفسِ لوّامہ کے وجود سے قیامت کے حق میں ایک نفسیاتی شہادت اور اس حقیقت کا انکشاف کہ جو منکرین اس کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مرکھپ اور گل سڑ جانے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا ممکن نہیں ہے، ان کا یہ خیال خود ان کے اپنے ضمیر کی شہادت کے خلاف ہے۔ ان کی مثال اس بے باک چور کی ہے جو کوتوال کے سامنے چوری کرتا ہے۔

(۷ - ۱۵) قیامت کے لیے جلدی مچانے والوں کو جواب کہ آج تو یہ ایک بدیہی حقیقت کو جھٹلانے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے قیامت کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن جب اس کی ہولناک ہلچل برپا ہو گی تو کہیں گے کہ اب کہاں بھاگیں! حالانکہ اس وقت کسی کے لیے خدا کے سوا کوئی اور ٹھکانا نہیں ہو گا۔ ہر ایک سے اس دن اس کے ایک ایک عمل کی بابت پرسش ہونی ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ان سے مخفی نہیں ہے اگرچہ وہ اس پر پردہ ڈالنے کے لیے کتنی ہی سخن سازیاں کریں۔

(۱۶ - ۱۹) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جلد بازی سے اجتناب کی ہدایت اور صبر کی تلقین کہ مخالفین خواہ

کتنی ہی جلدی مچائیں لیکن تم ان سے متاثر ہو کر قرآن کے اتارے جانے کے لیے جلدی نہ کرو بلکہ جس رفتار سے یہ اتر رہا ہے اس کو اطمینان سے اخذ کرو اور لوگوں تک اس کو پہنچاؤ۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی حکمت و مصلحت کے تحت نازل فرما رہا ہے اور اس کے جمع و ترتیب، حفاظت و صیانت اور اس کی توضیح و تبیین ہر چیز کی ذمہ داری اس نے اپنے اوپر لی ہے۔ ان معاملات میں کسی پہلو سے تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۲۰ - ۲۵) منکرینِ قیامت کو ملامت کہ تمھاری یہ ساری سخن سازیاں کسی دلیل پر مبنی نہیں ہیں۔ تم جو کچھ کہہ رہے ہو خود اپنے ضمیر کے خلاف محض اس وجہ سے کہہ رہے ہو کہ تم اس دنیا کا عشق رکھتے ہو اور آخرت کو نظر انداز کر رہے ہو حالانکہ آخرت ایک حقیقت ہے۔ اس دن بہت سے چہرے شاداب اور اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہوں گے اور بہتوں کے چہرے بگڑے ہوئے اور وہ یہ گمان کر رہے ہوں گے کہ ان پر کوئی کمر توڑ دینے والی مصیبت ٹوٹنی ہے۔

(۲۶ - ۴۰) کوئی اس گمان میں نہ رہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو شترِ بے مہار کی طرح چھوڑے رکھے گا۔ ہر ایک کو موت کی جان کنی سے سابقہ پیش آنا ہے اور اسی بے بسی و بے کسی کے حال میں اپنے رب کی طرف جانا ہے۔ بدقسمت ہے وہ جس نے نہ اللہ کی راہ میں خرچ کیا نہ نماز پڑھی بلکہ جب اس کو یاددہانی کی گئی تو نہایت رعونت سے منہ موڑ کر اپنے لوگوں میں چل دیا۔ ہر شخص کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جس خدا نے انسان کو منی کے ایک قطرہ سے وجود بخشا اور اس کا تسویہ کر کے گوناگوں صفات سے اس کو آراستہ کیا اس کے لیے اس کے مرکھپ جانے کے بعد دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہو گا۔

سُوْرَةُ الْقِيٰمَةِ

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيات : ۴۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ ﴿۱﴾ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ؕ ﴿۲﴾ آیات ۱-۴۰
اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ؕ ﴿۳﴾ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى
اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ﴿۴﴾ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ﴿۵﴾
يَسْئَلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ؕ ﴿۶﴾ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۙ ﴿۷﴾ وَخَسَفَ
الْقَمَرُ ۙ ﴿۸﴾ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۙ ﴿۹﴾ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ
اَيْنَ الْمَفَرُّ ۚ ﴿۱۰﴾ كَلَّا لَا وَزَرَ ؕ ﴿۱۱﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ اِلْمُسْتَقَرُّ ؕ ﴿۱۲﴾
يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ؕ ﴿۱۳﴾ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى
نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۙ ﴿۱۴﴾ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ؕ ﴿۱۵﴾ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ
لِتَعْجَلَ بِهٖ ؕ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۚ ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ
قُرْاٰنَهٗ ۚ ﴿۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ؕ ﴿۱۹﴾ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۙ ﴿۲۰﴾
وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ؕ ﴿۲۱﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا
نَاظِرَةٌ ۚ ﴿۲۳﴾ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۭ بَاسِرَةٌ ۙ ﴿۲۴﴾ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا
فَاقِرَةٌ ؕ ﴿۲۵﴾ كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۙ ﴿۲۶﴾ وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ۙ ﴿۲۷﴾

وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿٢٨﴾ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿٢٩﴾ اِلٰى رَبِّكَ
ع ۳۰/۱۷ يَوْمَئِذِ ِالْمَسَاقُ ﴿٣٠﴾ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿٣١﴾ وَلٰكِنْ كَذَّبَ
وَتَوَلّٰى ﴿٣٢﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿٣٣﴾ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٤﴾
ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٥﴾ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴿٣٦﴾
اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿٣٧﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ
فَسَوّٰى ﴿٣٨﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿٣٩﴾ اَلَيْسَ
ع ۲/۱۸ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿٤٠﴾

ترجمۂ آیات ۱-۴۰

نہیں، میں قسم کھاتا ہوں روزِ محشر کی اور نہیں، میں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی! کیا انسان نے گمان کر رکھا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر پائیں گے! ہاں، ہم جمع کریں گے اس طرح کہ اس کے پور پور کو ٹھیک کر دیں گے۔ بلکہ انسان اپنے (ضمیر کے) آگے شرارت کرنا چاہتا ہے۔ پوچھتا ہے قیامت کب ہوگی؟ ۱-۶

پس جب نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی اور سورج گہنا جائے گا اور سورج اور چاند اکٹھے کر دیے جائیں گے تو اس وقت انسان کہے گا کہ کہاں بھاگوں! ــــ ہرگز نہیں، کہیں پناہ نہیں! اس دن تیرے رب ہی کی طرف ٹھکانا ہوگا۔ اس دن انسان کو بتایا جائے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔ بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے اگرچہ کتنے ہی بہانے پیش کرے۔ ۷-۱۵

اس کو جلدی سیکھ لینے کے لیے اس کے پڑھنے پر اپنی زبان کو جلدی نہ چلاؤ۔ ہمارے ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو سنانا تو جب ہم اس کو سنا چکیں تو اس سنانے

کی پیروی کرو، پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی وضاحت کرنا۔ ۱۶-۱۹

ہرگز نہیں، بلکہ تم لوگ اس دنیا ہی سے عشق رکھتے ہو اور آخرت کو نظر انداز کیے ہوئے ہو۔ کتنے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے، اپنے رب کی رحمت کے متوقع اور کتنے چہرے اس دن اداس ہوں گے، گمان کر رہے ہوں گے کہ ان پر کمر توڑ دینے والی مصیبت ٹوٹنے والی ہے۔ ۲۰-۲۵

ہرگز نہیں، جب کہ جان ہنسلی میں آ پھنسے گی اور کہا جائے گا اب کون ہے جھاڑ پھونک کرنے والا! اور وہ گمان کرے گا کہ بس وقت چل چلاؤ کا ہے اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ جائے گی اس دن تیرے رب کی طرف جانا ہوگا۔ ۲۶-۳۰

پس اس نے نہ تو سچ مانا اور نہ نماز پڑھی بلکہ جھٹلایا اور منہ موڑا پھر اکڑتا ہوا اپنے لوگوں میں چل دیا۔ افسوس ہے تجھ پر افسوس ہے پھر افسوس ہے تجھ پر افسوس ہے! ۳۱-۳۵

کیا انسان گمان رکھتا ہے کہ وہ بس یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا! کیا وہ محض ٹپکائی ہوئی منی کی ایک بوند نہیں تھا! پھر وہ بنا خون کی ایک پھٹکی اور اللہ نے اس کا خاکہ بنایا اور اس کے نوک پلک سنوارے۔ پھر بنایا اس سے جوڑا، نر اور مادہ! کیا وہ خدا وند قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کر دے! ۳۶-۴۰

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ (۱)

قسم سے پہلے 'لا' کے استعمال کی نوعیت

عربیت کے اس اسلوب کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں ہو چکی ہے کہ قسم سے پہلے جب اس طرح 'لا' آیا کرتا ہے جس طرح یہاں ہے تو وہ قسم کی نفی کے لیے نہیں بلکہ مخاطب کے اس خیال کی نفی کے لیے آتا ہے جس کی تردید اس قسم سے مقصود ہوتی ہے۔ اس کی مثالیں جس طرح عربی زبان میں بکثرت موجود ہیں اسی طرح ہماری زبان میں بھی یہ اسلوب معروف ہے۔ آپ جس کسی شخص کی بات کی فوری تردید کرنی چاہتے ہیں تو کہتے ہیں: نہیں، خدا کی قسم، اصل حقیقت یوں ہے۔ اس اسلوب قسم سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ متکلم کے نزدیک مخاطب کی بات اتنی لغو ہے کہ وہ اس کی تردید میں اتنے توقف کا بھی روادار نہیں کہ قسم کے بعد اس کی تردید کرے بلکہ اس سے پہلے ہی اس کی تردید بلکہ اپنی بیزاری کا اظہار ضروری سمجھتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس 'لا' کو زائد اور بعضوں نے اس کو فعل سے متصل مانا ہے لیکن یہ دونوں رائیں عربیت کے خلاف ہیں۔ ہم نے جگہ جگہ اس کتاب میں اس کی تردید کی ہے۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی تفسیر سورۂ قیامہ میں اس پر وضاحت سے بحث کی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو اس کی مراجعت فرمائیے۔

یہاں قسم کا مقسم علیہ مذکور نہیں ہے اس کی دو وجہیں ہیں۔

مقسم علیہ کے حذف کی بلاغت

ایک یہ کہ یہاں مقسم علیہ اتنا واضح ہے کہ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے۔ گویا قسم خود اپنے مقسم علیہ پر دلیل ہے۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ اس کی متعدد مثالیں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔ سورۂ قٓ اور سورۂ صٓ میں 'وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ' اور 'وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ' کی قسمیں بھی اسی طرح مقسم علیہ کے بغیر آئی ہیں۔ اس طرح کی قسموں سے مقصود مخاطب پر یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ وہ جس چیز کی تردید یا تکذیب کر رہا ہے وہ خود اپنی صداقت پر ایسی شاہد عدل ہے کہ اس کے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے بعد نفس لوامہ کی جو قسم ہے وہ قیامت کے حق ہونے پر ایسی بدیہی دلیل ہے کہ اس کی تکذیب، جیسا کہ آگے وضاحت آئے گی، آدمی کے خود اپنے قلب و ضمیر کی تکذیب کے ہم معنی ہے۔ اس شہادت کے ہوتے قیامت کسی دلیل کی محتاج نہیں رہ جاتی بلکہ وہ بجائے خود دعویٰ اور دلیل قسم اور مقسم علیہ دونوں کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (۲)

نفس لوامہ کی شہادت قیامت پر

یہ دوسری قسم ہے اور اس کا مقسم علیہ بھی مذکور نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقسم علیہ خود قسم کے اندر ہی مضمر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر نفس لوامہ کا وجود شاہد ہے کہ قیامت حق ہے۔ گویا اس دوسری قسم نے قسم ہی کے پیرایہ میں دعوے اور دلیل دونوں کی وضاحت کر دی اور اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ قیامت کسی خارجی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔ اس کا عکس ہر انسان کے اپنے باطن کے اندر موجود ہے اور وہ اس کو دیکھتا بھی ہے اگرچہ اس کی تردید میں کتنی ہی دلیل بازیاں کرے۔

"نفسِ لوّامہ" سے مراد کوئی علیحدہ اور مستقل نفس نہیں ہے بلکہ یہ نفسِ انسانی ہی کا ایک پہلو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کی تشکیل اس طرح فرمائی ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی دونوں کا شعور ودیعت فرمایا ہے اور اس کی سعادت و شقاوت کے لیے ضابطہ یہ ٹھہرایا ہے کہ جو اپنے نفس کو برائیوں سے پاک رکھے گا وہ فلاح پانے والا بنے گا اور جو اس کو برائیوں سے آلودہ رکھے گا وہ نامراد ہو گا۔ سورۂ شمس میں اس کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ — اور شاہد ہے نفس اور اس کی تشکیل۔
فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ — پس اس کو الہام کر دی اس کی بدی اور
قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ — نیکی۔ جس نے اس کو پاک رکھا اس نے
وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ — فلاح پائی اور جس نے اس کو آلودہ رکھا
(الشمس - ۹۱ : ۷ - ۱۰) — وہ نامراد ہوا۔

اپنی تشکیل کی اس نوعیت کے سبب سے نفس بعض اوقات اپنی خواہشوں سے مغلوب ہو کر اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے اور وہ انسان کو کسی برائی پر آمادہ کر دیتا ہے۔ نفس کے اس رجحان کو قرآن میں نفسِ امّارہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے نفس کے اس پہلو کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے:

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ج اِنَّ — اور میں اپنے نفس کو بری نہیں ٹھہراتا۔
النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ — نفس بڑا ہی برائی کی راہ سجھانے والا
(یوسف - ۱۲ : ۵۳) — ہے۔

لیکن یہ نفس نیکیوں کا شعور بھی رکھتا ہے، اس وجہ سے جب تک اس کا توازن برقرار رہتا ہے اس وقت تک وہ اپنے کو بھی، اگر اس سے کوئی برائی صادر ہو جاتی ہے، ملامت کرتا ہے اور دوسروں کی برائیوں کو دیکھ کر بھی کڑھتا اور بسا اوقات ملامت کرتا ہے۔ نفس کے اسی پہلو کو یہاں نفسِ لوّامہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

نفس کے توازن کو قائم رکھنے کی تدبیر

نفس کے توازن کو درست رکھنے کی تدبیر اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ آدمی برابر اپنے رب اور روزِ جزاء و سزا کو یاد رکھے۔ یہ یاد نفس کے توازن کو درست رکھتی ہے اور وہ کبھی اس کی خواہشوں سے اتنا مغلوب نہیں ہوتا کہ بالکل ان کے آگے سپرانداز ہو جائے۔ اگر کبھی کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو نفسِ لوّامہ اس کو فوراً ٹوکتا ہے اور وہ متنبہ ہو کر توبہ و انابت سے اس داغ کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ جس نفس کے اندر یہ توازن پیدا ہو جائے قرآن نے اس کو نفسِ مطمئنہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ تربیتِ نفس کا سب سے اونچا مرتبہ یہی ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو دعوت دی ہے اور شریعت کے ذریعہ سے جس کا اہتمام فرمایا ہے۔ اسی نفس کو آخرت میں رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً

کا مقام حاصل ہو گا جو نفسِ انسانی کی معراج ہے۔

بدی کے بدی ہونے کا شعور انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ بدی کے بدی ہونے کا شعور انسان کی فطرت کے اندر روزِ اول سے ودیعت ہے۔ آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل نے حسد سے مغلوب ہو کر اپنے بھائی ہابیل کو قتل تو کر دیا لیکن قتل کر دینے کے بعد اس کی لاش کو چھپانے کی بھی کوشش کی۔ یہ کوشش ظاہر ہے کہ اسی وجہ سے اسے کرنی پڑی کہ اس کے گناہ ہونے کا اسے احساس ہوا۔ بڑے سے بڑا آدمی بھی گناہ کرتا ہے تو اس کو نیکی سمجھ کر نہیں کرتا بلکہ جذبات اور خواہشوں سے مغلوب ہو کر ہی کرتا ہے۔ اگر اس گناہ کے معاملے میں وہ اپنے نفس کو الاؤنس بھی دیتا ہے تو یہ بھی اپنی فطرت کے خلاف دیتا ہے اس لیے کہ وہی برائی اگر کوئی دوسرا اس کے ساتھ کر بیٹھتا ہے تو وہ اس کو برائی ٹھہراتا اور اس کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ بروں کے ضمیر کو ٹٹولیے تو معلوم ہو گا کہ ان کے اندر بھی احترام اور عزت نیکی ہی کے لیے ہے اگرچہ ان کا عمل اس کے خلاف ہے۔ انسان نے جب سے معاشرتی و اجتماعی زندگی کی کوئی شکل اختیار کی ہے اس کے اندر اس نے حق و انصاف کے قیام کے لیے لازماً ایک نظام بھی قائم کیا ہے۔ اگرچہ بسا اوقات بعض برائیوں نے معاشرے پر ایسا غلبہ پا لیا ہے کہ نیکیاں ان کے نیچے دب گئی ہیں، لیکن معاشرے کا مجموعی ضمیر اس پر کبھی راضی نہیں ہوا بلکہ اس کے اندر ایسے لوگ موجود رہے ہیں جنھوں نے معاشرے کے اندر وہی فریضہ انجام دیا ہے جو ہر صحیح الفطرت انسان کے اندر اس کا نفسِ لوامہ انجام دیتا ہے۔ اگر معاملہ اس حد سے گزر گیا ہے یعنی نیکی کی کوئی رمق سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی ہے تو قانونِ قدرت نے اس معاشرے کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا ہے۔

چند سوال اور ان کے جواب

اب سوال یہ ہے کہ جب انسان خود اپنے ضمیر کے اندر ایک نگران رکھتا ہے جو اس سے در ہو جانے والی برائیوں پر اس کو ٹوکتا رہتا ہے، تو اس کے لیے یہ تصور کرنا کس طرح معقول قرار دیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک شترِ بے مہار ہے، جس طرح کی زندگی وہ چاہے بسر کرے اور جس قدر چاہے اس نگران کی مخالفت کرے لیکن کوئی اس سے بازپرس کرنے کا حق نہیں رکھتا؟ اگر انسان شترِ بے مہار ہے تو یہ نفسِ لوامہ اس کے اندر کہاں سے آ گھسا؟ اگر اس کا خالق لوگوں کی نیکی اور بدی دونوں سے بے تعلق ہے تو اس نے نیکی کی تحسین اور بدی پر سرزنش کے لیے انسان کے اندر یہ خلش کیوں اور کہاں سے ڈال دی؟ پھر یہیں سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب اس نے ہر انسان کے اندر یہ چھوٹی سی عدالت قائم کر رکھی ہے تو اس پورے عالم کے لیے وہ ایک ایسی عدالتِ کبریٰ کیوں نہ قائم کرے گا جو سارے عالم کے اعمالِ خیر و شر کا احتساب کرے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دے؟ ان سوالوں پر جو شخص خواہشوں سے آزاد ہو کر غور کرے گا وہ ان کا یہی جواب دے گا کہ بے شک انسان کا اپنا وجود گواہ ہے کہ وہ خیر و شر کے شعور کے ساتھ پیدا

ہوا ہے، وہ شترِ بے مہار نہیں ہے بلکہ اس کے لیے لازماً ایک پرسش کا دن آنے والا ہے جس میں اس کو اس کی بدیوں کی سزا ملے گی اگر اس نے یہ بدیاں کمائی ہوں گی اور نیکیوں کا صلہ ملے گا اگر اس نے نیکیاں کی ہوں گی۔ اسی دن کی یاد دہانی ہی کے لیے خالق نے اس کا ایک چھوٹا سا نمونہ خود انسان کے نفس کے اندر رکھ دیا ہے تاکہ انسان اس سے غافل نہ رہے اور اگر کبھی غفلت ہو جائے تو خود اپنے نفس کے اندر جھانک کر اس کی تصویر دیکھ لے۔ یہی حقیقت حکماء اور عارفین نے یوں سمجھائی ہے کہ انسان ایک عالمِ اصغر ہے جس کے اندر اس عالمِ اکبر کا پورا عکس موجود ہے، اگر انسان اپنے کو صحیح طور پر پہچان لے تو وہ خدا اور آخرت سب کو پہچان لیتا ہے۔ سقراط کا مقولہ مشہور ہے کہ "اے انسان! تو اپنے کو پہچان!"

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ؕ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰۤى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ (۳-۴)

حقیقت سے فرار کے لیے منکرین قیامت کی سخن سازی

اگرچہ لفظ 'انسان' عام ہے لیکن روئے سخن قریش کے انہی منکرین قیامت کی طرف ہے جن کے شبہات پچھلی سورتوں میں زیرِ بحث آئے ہیں۔ ان سے اظہارِ بیزاری کے لیے بات عام لفظ سے فرما دی ہے۔ فرمایا کہ قیامت کو ثابت کرنے کے لیے یہ شہادت تو ہر انسان کے اپنے اندر ہی موجود ہے۔ اس کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن یہ لوگ یہ گمان کیے بیٹھے ہیں کہ ان کے مرنے اور سڑ گل جانے کے بعد ہم ان کی ہڈیوں کو جمع نہیں کر پائیں گے۔ فرمایا کہ اگر یہ چیز ان کو بعید از امکان نظر آتی ہے اور اس بنا پر وہ اپنے ضمیر کی شہادت کے خلاف قیامت کو جھٹلا رہے ہیں تو یاد رکھیں کہ ہم ان کی ہڈیوں کو صرف جمع ہی نہیں کریں گے بلکہ اس قدرت و کمال کے ساتھ جمع کریں گے کہ ان کے جوڑ جوڑ پور پور کو ٹھیک کر دیں گے۔ 'بنان' انگلیوں کے پور کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی حقیر سے حقیر جزو بھی ایسا نہ ہو گا جس کے جمع کرنے اور جوڑنے سے ہم قاصر رہ جائیں۔

'قٰدِرِيْنَ' حال واقع ہے 'نَجْمَعَ' کی ضمیرِ جمع سے۔

بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ (۵)

یعنی قیامت کا انکار اس بنا پر کہ ہڈیوں کو جمع کرنا ان کو بعید از امکان نظر آتا ہے محض حقیقت سے فرار کے لیے سخن سازی ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ اپنی خواہشوں کے ایسے غلام بن چکے ہیں کہ ان کی پیروی میں وہ خدا کے مقرر کیے ہوئے محتسب کے سامنے شرارت کرنا چاہتے ہیں جو کہیں دور نہیں بلکہ خود ان کے اندر ہی بیٹھا ہوا ہے۔ ان کی مثال اس چور کی ہے جو کوتوال کی موجودگی میں چوری کرے۔

'اَمَامَهٗ' کا مطلب عام طور پر لوگوں نے یہ لیا ہے کہ انسان اپنی آگے کی زندگی میں برابر

اپنے گناہوں پر جما رہنا چاہتا ہے اس وجہ سے قیامت کے انکار کے لیے بہانے تلاش کرتا ہے لیکن یہ مطلب لینے میں نہ نفسِ لوّامہ کی شہادت سے اس کا کوئی تعلق واضح ہوتا اور نہ اس میں انسان پر اس کے اس رویے کے خلاف کوئی حجت ہی قائم ہوتی۔ 'اپنے آگے' سے مطلب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ انسان اپنے ضمیر اور اپنے نفسِ لوّامہ کے روبرو، اس کی تذکیر و تنبیہ کے علی الرغم شرارتیں کرنا چاہتا ہے۔ قیامت کی سب سے بڑی شہادت انسان کے نفس کے اندر ہی موجود ہے لیکن جو شخص خود اپنی تردید و تکذیب کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اس کا کیا علاج ہے!

اس میں دلیل کا پہلو یہ ہے کہ قیامت پر حجت قائم کرنے کے لیے تو انسان کا ضمیر ہی کافی ہے لیکن جو شخص 'دروغ گویم بروئے تو' کی جسارت کرنے پر تلا بیٹھا ہو اس کا منہ نہیں بند کیا جا سکتا۔

اس سے یہ بات بھی نکلی کہ جو شخص اپنے نفسِ لوّامہ یا دوسرے لفظوں میں اپنے ضمیر کے خلاف کسی برائی کا ارتکاب کرتا ہے وہ درحقیقت خدا کے روبرو برائی کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس لیے کہ ضمیر درحقیقت، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، خدا کا مقرر کردہ محتسب اور قاضی ہے تو جس نے اس کے آگے برائی کی اس نے خدا ہی کے آگے برائی کی۔

یَسْـَٔلُ اَیَّانَ یَوْمُ الْقِیٰمَةِ (۶)

ایک احمقانہ مطالبہ اور اس کا مسکت جواب

یہ منکرینِ قیامت کی جسارت اور ڈھٹائی کا بیان ہے کہ باوجودیکہ خدا کا محتسب خود ان کے اندر ہی موجود ہے اور وہ اس کو محسوس بھی کر رہے ہیں لیکن جب ان کو قیامت سے ڈرایا جاتا ہے تو یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ قیامت کہاں ہے؟ وہ کب آئے گی! اگر اس کو آنا ہے تو آ کیوں نہیں جاتی! ہم اس کے ڈراوے سنتے سنتے تو تھک گئے لیکن اس کو نہ آنا تھا، نہ آئی تو اب ہم ان ڈراووں سے مرعوب ہونے والے نہیں ہیں۔ جو لوگ اس سے ڈرا رہے ہیں وہ اس کو لا کر ہمیں دکھائیں تو ہم اس کا حق ہونا مانیں گے۔ محض زبانی دھونس سے ہم ماننے والے نہیں ہیں۔

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۙ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۙ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۙ یَقُوْلُ
الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ (۷-۱۰)

یعنی آج تو وہ اس کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں گویا اس کے مقابلہ کے لیے ہر قسم کی تیاری کیے بیٹھے ہیں لیکن جب اس کی ہولناکی سے سابقہ پیش آئے گا تو کہیں گے، اب کہاں بھاگیں؟

قیامت کے دکھا دیے جانے کا مطالبہ چونکہ ایک بالکل ہی احمقانہ مطالبہ ہے اس وجہ سے اس سے تو یہاں تعرض نہیں کیا لیکن اس کی ہولناکی کے بعض پہلو ان کے سامنے رکھ دیے۔ فرمایا کہ اس دن نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی، چاند گہنا جائے گا، سورج اور چاند، جو آج اپنے الگ الگ مداروں میں گردش کر رہے ہیں، ان کی حد بندیاں ٹوٹ جائیں گی اور وہ آپس میں ٹکرا جائیں گے۔

یہ قیامت کے دن کے احوال ہیں جن کا تعلق متشابہات سے ہے۔ اس جہان میں ان کی اصل حقیقت کا سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ یہاں مقصود صرف یہ دکھانا ہے کہ جو دن ایسی ہلچل کا ہو گا کہ چاند اور سورج اپنے مداروں سے ہٹ کر ایک ہی مدار میں جا پڑیں گے۔ اس کی ہولناکی کا اندازہ کون کر سکتا ہے! مطلب یہ ہے کہ اگر عقل کا کوئی شائبہ تمھارے اندر ہے تو اس سے پناہ مانگو اور اس کی آفتوں سے بچنے کی جو راہ دکھائی جا رہی ہے اس کو اختیار کرو نہ کہ اس کے لیے جلدی مچاؤ۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ یہاں قیامت کے جو احوال بیان ہوئے ہیں وہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، صرف اس کا ہلکا سا تصوّر دینے کے لیے بیان ہوئے ہیں اور یہ اس کے بے شمار احوال میں سے صرف چند ہیں۔ آگے اسی گروپ کی سورتوں میں اس کے مختلف پہلو سامنے آئیں گے اور وہ بھی اس کے بے شمار پہلوؤں میں سے صرف چند ہی ہوں گے اس لیے کہ زبان ان کی تعبیر و تصویر سے قاصر ہے۔

كَلَّا لَا وَزَرَ ۝ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ (۱۱-۱۲)

یہ جواب ہو گا ان کے قول 'اَیْنَ الْمَفَرُّ' کا، یعنی وہ پکاریں گے کہ اب کہاں بھاگیں! ان کو جواب ملے گا کہ ہرگز نہیں، اب کوئی ٹھکانا اور بھاگنے کی جگہ نہیں ہے۔ اس دن تیرے رب ہی کی طرف سب کا ٹھکانا ہو گا۔ دوسری تمام راہیں فرار کی اس دن بند ہو جائیں گی۔

يُنَبَّؤُا الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ (۱۳)

قیامت کی غایت

یہ مقصد بیان ہوا ہے اس دن کے آنے کا۔ فرمایا کہ اس دن ہر شخص کو آگاہ کیا جائے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔ آگاہ کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اس دن اس کے سارے اعمال کے نتائج سامنے رکھ دیے جائیں گے۔ دنیا کی زندگی میں جو بدیاں اس نے کمائیں وہ بھی اس کے سامنے آ جائیں گی اور جن نیکیوں سے منہ موڑا ان کے نتائج بھی سامنے آ جائیں گے۔ قرآن میں جا بجا یہ تصریح ہے کہ اس دن آخرت سے غافل رہنے والے اپنے سر پیٹیں گے کہ کاش ہم نے آج کے دن کے لیے فلاں اور فلاں کام کیے ہوتے اور یہ بھی کہیں گے کہ کاش ہم نے رسولوں کے انذار سے انحراف نہ کیا ہوتا بلکہ ان کی دعوت پر ایمان لائے ہوتے۔ 'قَدَّمَ' اور 'اَخَّرَ' کے الفاظ ان کے تمام اعمالِ بد اور ان کی ساری کوتاہیوں دونوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ آخرت کی فیروز مندی کے لیے انسان کو بہت سے نیک کام کرنے اور بہت سے برے کام چھوڑنے پڑتے ہیں لیکن جو لوگ آخرت سے غافل یا اس کے منکر ہوتے ہیں وہ ان کاموں سے تو غافل یا منحرف رہتے ہیں جو وہاں کے لیے زادِ راہ کا کام دینے والے ہیں اور جو کام آخرت میں تباہی کا باعث بننے والے ہوتے ہیں، ساری زندگی وہ انھی کا ذخیرہ جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اس آیت میں ایسے ہی محروموں کے لیے تذکیر و تنبیہ ہے۔

بَلِ الۡاِنۡسَانُ عَلٰی نَفۡسِہٖ بَصِیۡرَۃٌ ۙ﴿۱۴﴾ وَّ لَوۡ اَلۡقٰی مَعَاذِیۡرَہٗ ﴿ؕ۱۵﴾ (۱۴-۱۵)

انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے

یہ اسی بات کی وضاحت دوسرے الفاظ میں ہے جو اوپر بَلۡ یُرِیۡدُ الۡاِنۡسَانُ لِیَفۡجُرَ اَمَامَہٗ' کے الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔ وہاں مخالفین قیامت کے سوال یَسۡـَٔلُ اَیَّانَ یَوۡمُ الۡقِیٰمَۃِ' کے تعلق سے کلام کا رخ تصویرِ قیامت کی طرف مڑ گیا تھا۔ اس کے بعد اصل سلسلۂ کلام پھر عود کر آیا اور بات پوری کر دی گئی۔ فرمایا کہ انسان قیامت سے گریز کے لیے کتنے ہی بہانے بنائے لیکن وہ اپنے نفس پر خود حجت اور گواہ ہے۔ 'بَصِیۡرَۃٌ عَلٰی نَفۡسِہٖ' کے معنی ہوں گے 'شَاھِدٌ عَلٰی نَفۡسِہٖ' (وہ اپنے اوپر خود گواہ ہے) اس کی دلیل اوپر بیان ہو چکی ہے کہ انسان کے اندر اس کا نفس لوامہ قیامت کا شاہد ہے، اس کو کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنے ہی ضمیر کے آئینے میں اس کی صورت دیکھ سکتا ہے۔

'مَعَاذِیۡرُ' جمع ہے 'مَعۡذِرَۃٌ' کی۔ یہ دراصل 'مَعَاذِرُ' ہے۔ اس میں 'ی' زیادہ ہو گئی ہے جس طرح 'مناکیر' میں زیادہ ہو گئی ہے۔ اس کے معنی جھوٹے عذرات اور لاطائل بہانوں کے ہیں۔ عربی میں مثل ہے 'اَلۡمَعَاذِرُ مَکَاذِبُ' بعضوں نے اس کو 'معذار' کی جمع بتایا ہے۔ جس کے معنی اہل یمن کی بولی میں پردہ کے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ قرآن قریش کی ٹکسالی زبان میں نازل ہوا ہے، اہل یمن کی بولی میں نہیں اترا ہے۔

لَا تُحَرِّکۡ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعۡجَلَ بِہٖ ﴿ؕ۱۶﴾ اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَہٗ وَ قُرۡاٰنَہٗ ﴿ۚۖ۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاۡنٰہُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَہٗ ﴿ۚ۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَہٗ ﴿ؕ۱۹﴾ (۱۶ - ۱۹)

آیات کا پس منظر

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفین کی جلد بازیوں اور ان کے نت نئے مطالبات کے مقابل میں صبر و انتظار کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر انذارِ عام کی جو بھاری ذمہ داری ڈالی تھی اس سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہونے کے لیے آپ کے پاس واحد سہارا وحیِ الٰہی ہی کا سہارا تھا۔ آپ کی تمام مساعی پر مامور سپاہی کی تھی اور آپ کوئی بھی قدم اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ مخالفین آپ کو زچ کرنے کے لیے طرح طرح کے اعتراضات و مطالبات پیش کر کے آپ کو پسپا کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے۔ اوپر ان کا ایک مطالبہ مذکور ہوا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جس قیامت سے ڈرا رہے ہو وہ کہاں ہے؟ اگر اس کا آنا قطعی ہے تو وہ آ کیوں نہیں جاتی! اسی طرح قرآن میں ان کا یہ مطالبہ بھی مذکور ہوا ہے کہ اگر قرآن اللہ کا کلام ہے تو وہ پورا کا پورا بیک دفعہ کیوں نہیں نازل ہو جاتا۔ غرض ہر طرف سے آپ پر نئے نئے اعتراضات و سوالات کی بارش تھی اور ہر سوال کے اطمینان بخش جواب کے لیے آپ کو برابر وحیِ الٰہی کا انتظار رہتا۔ اسی سے آپ کے قلب کو قوت، آپ کی روح کو حیاتِ تازہ، عقل کو رہنمائی اور ارادے کو ثبات و استحکام

حاصل ہوتا۔ چنانچہ قرآن اور احادیث دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کبھی حکمتِ الٰہی کے تحت وحی کے نزول اور جبریل امین کی آمد میں کچھ زیادہ وقفہ ہو جاتا تو آپ کی نگاہیں بار بار آسمان کی طرف اٹھ جاتیں۔ اسی شوق و اضطراب کا اظہار آپ سے اس وقت بھی ہوتا جب جبریل امین آپ پر وحی القا فرماتے۔ آپ ایک پُرشوق طالب کی طرح چاہتے کہ جلد سے جلد ساری وحی سن لیں اور اس کو اچھی طرح محفوظ بھی کر لیں کہ مبادا اس ابرنیساں کا کوئی قطرہ ضائع ہو جائے۔ اس تمہید کو ذہن میں رکھ کر اب آیات پر غور فرمائیے۔

نزولِ وحی کے وقت آنحضرت کے شوق و اضطراب کی کیفیت

'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ' یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عجلت و بے قراری سے روکا گیا ہے جو آپ پر اس وقت طاری ہوتی جب وحی آتی۔ اگرچہ شوق و عجلت کا مضمون ادب کے پامال مضامین میں سے ہے لیکن اس عجلت و بے قراری کی تعبیر کون کر سکتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت طاری ہوتی ہوگی جب ایک طویل وقفہ کے انتظار کے بعد اور مخالفین کی ژاژ خائیوں کے طوفان کے اندر حضرت جبریل امینؑ اللہ تعالیٰ کے نامہ و پیام کے ساتھ نمودار ہوتے رہے ہوں گے۔ ایک بچہ بھوکا ہو اور ماں اس کو چھاتی سے لگائے تو وہ چاہتا ہے کہ ماں کی چھاتی کا سارا دودھ ایک ہی سانس میں سڑپ لے۔ صحرا کا مسافر پیاس سے تڑپ رہا ہو اور طویل انتظار کے بعد اس کو پانی کا ڈول مل جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ پورا ڈول ایک ہی دفعہ پیٹ میں انڈیل لینا چاہتا ہے۔ ایک فراق زدہ کو جدائی کی کٹھن گھڑیاں گزارنے کے بعد نامۂ محبوب مل جائے تو وہ چاہے گا کہ ایک ہی نظر میں اس کا ایک ایک حرف پڑھ ڈالے۔ اگرچہ یہ مثالیں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ناقص ہیں، تاہم ان سے کچھ اندازہ اس شوق، اس عجلت اور اس اضطراب کا کیا جا سکتا ہے جن کا اظہار آپ کی طرف سے بے اختیار اس وقت ہوتا رہا ہوگا جب آپ وحی سے مشرف ہوتے رہے ہوں گے۔

اس کا سبب کوئی ایک نہیں تھا بلکہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، متعدد تھے۔ مثلاً

- یہ کہ آپ جس فریضۂ منصبی پر مامور تھے اس کا سارا پروگرام اسی سے معلوم ہوتا تھا۔
- آپ کی عقلی، ایمانی اور روحانی زندگی کا تمام تر انحصار اسی پر تھا۔
- حاضر اور مستقبل کے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے رہنمائی اسی سے ملتی تھی۔
- دشمنوں کے نت نئے اعتراضات و مطالبات کے فیصلہ کن جوابات اسی کے ذریعہ حاصل ہوتے تھے۔
- علم کا غیر معمولی شوق اور اس کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری کا صحیح احساس بھی اس کا ایک بہت بڑا سبب تھا۔

ان میں سے ہر محرک ایک پاکیزہ محرک ہے لیکن حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہی تھا کہ قرآن جس تدریج سے نازل ہو رہا ہے اسی طرح نازل ہو۔ چنانچہ آپ کو بار بار اس معاملے میں صبر و انتظار کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ سورۂ طٰہٰ کی آیات ۱۱۴-۱۱۵ میں بھی آپ کو اسی طرح کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ وہاں ہم اس کے بعض خاص پہلوؤں کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں بھی اصلاً اسی بات کا ذکر ہے لیکن موقع و محل کے تقاضے سے آپ کو یہ اطمینان بھی، جیسا کہ آگے کی آیت سے واضح ہو رہا ہے، یہاں دلا دیا گیا کہ آپ قرآن کی حفاظت و صیانت کی طرف سے بالکل مطمئن رہیں۔ اس کے جمع و ترتیب، اس کو سنانے، یاد کرانے اور اس کے محتاجِ وضاحت مقامات کی وضاحت کی ذمہ داری اللہ نے اپنے اوپر لے رکھی ہے۔ جتنا جتنا قرآن اترتا جائے اس پر آپ قناعت کریں۔ نہ اس کے اتارے جانے کے لیے کسی عجلت و اضطراب کا اظہار کریں، نہ اس کی حفاظت کے باب میں کسی تشویش میں مبتلا ہوں۔ ان باتوں کو اپنے رب پر چھوڑیں۔ ہر کام اپنے صحیح وقت پر، ٹھیک ٹھیک اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت کے مطابق ہوگا۔

'اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ' یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تشویش کو رفع فرمایا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ چونکہ ایک عظیم آسمانی خزانہ آپ کی تحویل میں دیا جا رہا تھا اس وجہ سے قدرتی طور پر اس کو اپنی امانت میں لیتے ہوئے آپ ایک ایک لفظ کو اس طرح محفوظ کرنے کی کوشش کرتے کہ کوئی حرف ضائع نہ ہونے پائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اطمینان دلایا کہ اس کو محفوظ کرنے اور اس کو سنانے کی ذمہ داری ہم نے اپنے اوپر لے رکھی ہے۔

قرآن کے جمع و ترتیب اور اس کی حفاظت کا وعدہ

لفظ 'جمع' یہاں ایک جامع لفظ ہے۔ اس سے مراد اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ میں محفوظ کرنا بھی ہے اور ان منتشر موتیوں کو ایک لڑی میں پرونا بھی۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے برابر رہنمائی حاصل ہوتی رہی کہ مختلف مواقع پر نازل ہونے والی آیات کو الگ الگ سورتوں میں، کس ترتیب سے آپ جمع کرائیں۔ چنانچہ اس رہنمائی کی روشنی میں آپ نے الگ الگ سورتوں میں، ان کے مواقع کی تعیین کے ساتھ، جمع کرنے کی ہدایت فرمائی اور جمع کرنے والوں نے آپ کے اس حکم کی تعمیل کی۔

اس کے علاوہ مزید اہتمام اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ہر رمضان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ اتنے قرآن کا مذاکرہ فرماتے جتنا نازل ہو چکا ہوتا تاکہ کسی سہو و نسیان کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حیاتِ مبارک کے آخری رمضان میں آپ نے یہ مذاکرہ دو مرتبہ فرمایا، اسی کی طرف 'قُرْاٰنَهٗ' کے لفظ سے اشارہ فرمایا گیا ہے۔

'فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ' یعنی تم اپنی طرف سے قرآن کے اتارے جانے کے لیے کوئی جلدی نہ کرو۔ یہ معاملہ اپنے رب پر چھوڑو۔ وہ اپنی حکمت کے مطابق جتنا چاہے گا نازل فرمائے گا اور اس کی حفاظت اور اس کے جمع و ترتیب کا اہتمام بھی فرمائے گا۔ تمہاری ذمہ داری

صرف یہ ہے کہ ہم جتنا قرآن سنا چکیں اس کے سنانے کی پیروی کرو۔ اسی کو پڑھو، اسی پر عمل کرو اور اسی کی دعوت دو۔ جو لوگ پورے قرآن کو یک دفعہ نازل کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کے مطالبہ کی کوئی پروا نہ کرو۔

'ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ'۔ اسی سلسلہ میں مزید اطمینان یہ بھی دلا دیا کہ اگر قرآن کے کسی مقام میں کسی وضاحت کی ضرورت ہوگی تو اس کے باب میں بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی وضاحت کی ذمہ داری بھی ہمارے اوپر ہے، جب وقت آئے گا تو یہ کام بھی ہم کر دیں گے۔ یہ اشارہ ان آیات کی طرف ہے جو کسی سابق حکم کی توضیح و تبیین یا اس کے نسخ یا تکمیل کے طور پر نازل ہوئیں۔ ان توضیحی آیات کی طرف ہم جگہ جگہ اشارہ کر چکے ہیں اور یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ ان کے بعد بالعموم 'کَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ' کے الفاظ سے قرآن نے یہ رہنمائی بھی دے دی ہے کہ یہ اسی وعدے کی تکمیل ہے جو اللہ تعالیٰ نے 'اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ' کے الفاظ میں فرمایا ہے۔

استاذ امامؒ کے بعض افادات

ان آیات کے تحت استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ لکھا ہے اس کے بعض حصے بھی ہم نقل کیے دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"مفسرین کا خیال ہے کہ ان آیات میں جس عجلت کا ذکر ہے اس کا سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اندیشہ تھا کہ مبادا قرآن کی کوئی بات ضائع ہو جائے۔ ہم کو اس رائے سے اختلاف نہیں ہے، لیکن اس میں تھوڑی سی تفصیل ہے جس کو سمجھ لینا ضروری ہے۔"

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ محسوس فرماتے کہ یہ ایک عظیم ذمہ داری اور بہت بڑی امانت ہے جو آپ کے سپرد کی جا رہی ہے، اس میں کوئی ادنیٰ کوتاہی بھی ہوئی یا اس کا ایک حرف بھی ضائع ہوا تو آپ کو اس کا جوابدہ ہونا پڑے گا۔ ساتھ ہی آپ کو یہ تمنا بھی تھی کہ اس میں اضافہ ہو، شاید آپ کی قوم اس کے کسی حصہ کی برکت سے راہ یاب ہو جائے۔ معاملہ کے یہ دونوں ہی پہلو نہایت واضح تھے چنانچہ اس سورہ میں آپ کو جو تسلی دی گئی اس میں ان دونوں پہلوؤں کی رعایت ہے۔"

"قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اجمالاً اور تفصیلاً دونوں طرح فرمایا ہے مثلاً

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِیْزٌ ۝ لَّا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۝ (حٰمٓ السجدۃ - ۴۱: ۴۱-۴۲)

اور یہ کتاب عزیز ہے جس میں باطل نہ اس کے آگے سے راہ پا سکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔

دوسرے مقام میں ارشاد ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝

ہم ہی نے اس یاددہانی کو نازل کیا ہے

(الحجر - ۱۵ : ۹) اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں کسی کمی بیشی یا تبدیلی کا امکان نہیں ہے۔ یہ باتیں اس وعدۂ حفاظت کے منافی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اوپر کی آیتوں میں فرمایا ہے۔ چنانچہ اسی امر پر پوری امت متفق ہے کہ قرآن بالکل محفوظ ہے۔ امامیہ کے متعلق جو مشہور ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کا کچھ حصہ غائب کر دیا گیا تو یہ بات ان کے اکابر علماء کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔ سید مرتضیٰ، شیخ الطائفہ محمد بن حسن طوسی، ابو علی طبرسی صاحب مجمع البیان، محمد بن علی بن بابویہ قمی، سب نے اس بے ہودہ خیال کی، پوری شدت کے ساتھ، تردید کی ہے۔ محمد بن علی بن بابویہ قمی کہتے ہیں کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ جو قرآن اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا بعینہٖ وہی قرآن ہے جو ما بین الدفتین امت کے ہاتھوں میں موجود ہے۔ قرآن ایک حرف بھی اس سے زیادہ نہیں ہے۔ جو شخص ہم سے یہ نسوب کرتا ہے کہ ہم قرآن مجید کے اس سے زیادہ ہونے کے قائل ہیں، وہ جھوٹا ہے۔ اس باب میں ان کے ہاں جو روایات ہیں ان کے بارے میں سید مرتضیٰ کہتے ہیں کہ امامیہ اور حشویہ میں سے جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے ان کے اختلاف کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ ان کے اختلاف کا تمام تر مدار چند ضعیف روایات پر ہے جن کو یہ صحیح سمجھتے ہیں حالانکہ ان روایات کا یہ درجہ نہیں ہے کہ ان کی بنیاد پر ایک ایسی بات کا انکار کر دیا جائے جس کی صحت قطعیت سے ثابت ہے۔"

آیت زیر بحث سے مولانا علیہ الرحمۃ نے جو استنباط کیے ہیں وہ یہ ہیں:

- قرآن حضورؐ کی زندگی ہی میں جمع کر کے، ایک خاص ترتیب پر آپ کو سنا دیا گیا۔ اگر یہ وعدہ آپ کی وفات کے بعد پورا ہونے والا ہوتا تو آپ کو اس قراءت کی پیروی کا حکم نہ دیا جاتا، جیسا کہ دیا گیا ہے: فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ (پس جب ہم اس کو سنا دیں تو اس کی پیروی کرو)۔
- آپ کو حکم تھا کہ جمع قرآن کے بعد جس طرح آپ کو قرآن سنایا جائے اسی طرح آپ اس کو پڑھیں۔ ...... اس حکم کا لازمی تقاضا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اس ترتیب کے مطابق قرآن سنایا ہو جس پر اس کی آخری قراءت ہوئی۔ اور یہ ترتیب وہی ترتیب ہے جو لوح محفوظ میں ہے۔ آخری قراءت کا اصل کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہونا ضروری ہے۔
- یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس جمع و ترتیب کے بعد اللہ تعالیٰ نے وہ باتیں بھی بیان فرما دیں جو تعمیم و تخصیص یا تخفیف و تکمیل کی نوعیت کی تھیں۔"

آگے مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

یہ ساری باتیں قرآن مجید سے ثابت ہیں اور ان کی تصدیق روایات سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی پوری پوری سورتیں لوگوں کو سناتے جو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ وہ اس خاص ترتیب پر آپ کو سنائی گئی ہوں۔ صحابہؓ اسی ترتیب پر قرآن سنتے، اس کو محفوظ کرتے اور اس کی پابندی کرتے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ آپ آیتوں کو مخصوص سورتوں میں، معین مقامات پر لکھواتے، اور صحابہؓ اس حکم کی تعمیل کرتے۔ پھر جب کوئی توضیحی آیت اترتی تو آپ اس کو بھی قرآن مجید میں اس کے معین مقام میں لکھواتے اور ان کے لکھوانے میں دو اصول ملحوظ رکھے جاتے: یا تو وہ ان آیات کے ساتھ ملا دی جاتیں جن کی وہ تشریح کرتیں یا سورہ کے آخر میں رکھ دی جاتیں اگر ان کا تعلق سورہ کے مجموعی مضمون سے ہوتا۔"

"ان توضیحی آیات کی ایک اور نمایاں علامت بھی قرآن کے تدبر سے سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ خود ان آیات کے اندر ایسے الفاظ موجود ہیں جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ توضیح و تشریح کے طور پر نازل ہوئی ہیں۔ مثلاً ان کے ساتھ بالعموم اس طرح کے الفاظ ہیں: 'كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ' (اس طرح اللہ لوگوں کے لیے اپنی آیتیں کھول رہا ہے)۔"

اسی طرح یہ بات بھی صحیح اور متفق علیہ روایات سے ثابت ہے کہ آخر میں حضرت جبریلؑ نے پورا قرآن، اس کی اصلی ترتیب کے مطابق آپ کو سنایا۔ اس سے نظامِ قرآن کے باب میں بہت سے شبہات خود بخود دور ہو جاتے ہیں۔[1]"

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۙ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ (۲۰-۲۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و انتظار کی تلقین کے بعد پھر کلام اپنے اصل سلسلہ سے جڑ گیا۔ مکذبینِ قیامت کو مخاطب کر کے فرمایا کہ قیامت کے بارے میں تمھارا یہ رویہ اس بنا پر نہیں ہے کہ اس کی کوئی دلیل تمھارے سامنے نہیں ہے۔ اس کی سب سے بڑی شہادت تو خود تمھارے اپنے قلب و ضمیر کے اندر موجود ہے۔ بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ تم دنیا اور اس کی مرغوبات سے عشق رکھتے ہو اور اس نقد کو چھوڑ کر آخرت کے نسیہ کے لیے بازی کھیلنے کا حوصلہ تمھارے اندر نہیں ہے۔

تکذیبِ قیامت کی اصل علت

'تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ' کے معنی ہیں 'آخرت کو نظر انداز کر رہے ہو'۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت تم سے مخفی نہیں ہے لیکن دنیا نقد ہے اس وجہ سے اس پر فریفتہ ہو اور آخرت نقد نہیں ہے اس وجہ سے جان بوجھ کر اس کو نظر انداز کر رہے ہو۔

---

[1] ماخوذ از تفسیر سورۂ قیامہ مؤلفہ امام فراہیؒ

وُجُوۡہٌ یَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ ۙ اِلٰی رَبِّہَا نَاظِرَۃٌ ۚ وَ وُجُوۡہٌ یَّوۡمَئِذٍۭ بَاسِرَۃٌ ۙ
تَظُنُّ اَنۡ یُّفۡعَلَ بِہَا فَاقِرَۃٌ (۲۲-۲۵)

اصل حقیقت

یعنی دنیا کے پیچھے آخرت کو نظر انداز کر رہے ہو تو کر و لیکن اس حقیقت کو نہ بھولو کہ جس کو نظر انداز کر رہے ہو وہ آکے رہے گی اور اس دن صورت حال بالکل مختلف ہو گی۔ جنھوں نے اس کو سامنے رکھ کر زندگی گزاری ہو گی ان کے چہرے تو اس دن تر و تازہ اور شاداب ہوں گے، وہ اپنے رب کی رحمتوں کے متوقع ہوں گے اور جنھوں نے اس کو نظر انداز کر کے زندگی گزاری ہو گی ان کے چہرے اترے ہوئے ہوں گے اور وہ گمان کر رہے ہوں گے کہ ان پر کوئی کمر توڑ دینے والی مصیبت نازل ہونے والی ہے۔

یہ جنت یا دوزخ میں داخل ہونے سے پہلے کے حالات کی تصویر ہے۔ متقین جنت جب دیکھیں گے کہ ہر قدم پر ملائکہ سلام و تحیت اور اعزاز و اکرام کے ساتھ ان کا خیر مقدم کر رہے ہیں تو اپنے روشن مستقبل کے تصور سے ان کے چہرے کھلے ہوئے ہوں گے اور وہ متوقع ہوں گے کہ اب ربِّ کریم کی اس کامل رحمت و عنایت کے ظہور کا وقت آگیا جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔ اس کے برعکس کفار کے ساتھ قدم قدم پر جس طرح کا معاملہ ہو گا اس سے ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہوں گی کہ اب اس کمر توڑ دینے والی مصیبت سے دوچار ہونے کا وقت آگیا جس سے ان کو آگاہ کیا گیا لیکن انھوں نے اس کو نظر انداز کیے رکھا۔

اِلٰی رَبِّہَا نَاظِرَۃٌ کا صحیح مفہوم

'اِلٰی رَبِّہَا نَاظِرَۃٌ' کے معنی ہیں وہ اپنے رب کی رحمت و عنایت کے متوقع و منتظر ہوں گے۔ 'نَظَرَ' کے بعد جب 'اِلٰی' کا صلہ آتا ہے تو اس کے معنی جس طرح کسی چیز کی طرف دیکھنے کے آتے ہیں اسی طرح کسی کی رحمت و عنایت کے متوقع و منتظر ہونے کے بھی آتے ہیں۔ ماہرین لغت نے اس کی وضاحت یوں کی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسے شخص سے، جس سے اس کو عنایت کی توقع ہو، یہ کہے کہ 'اِنَّمَا نَنْظُرُ الی اللہ ثم الیک' تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اللہ کے فضل اور اس کے بعد آپ کی عنایت کے متوقع ہیں۔[1]

کلام کا سیاق و سباق بھی یہاں اسی معنی کے حق میں ہے۔ دوزخ میں جانے والوں کی ذہنی حالت و کیفیت 'تَظُنُّ اَنۡ یُّفۡعَلَ بِہَا فَاقِرَۃٌ' کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے یعنی وہ حالات دیکھ کر یہ گمان کر لیں گے کہ اب ایک کمر توڑ دینے والی مصیبت ان پر ٹوٹنے والی ہے۔ اور اس گمان کے سبب سے ان کے چہروں پر بدحواسی طاری ہو گی۔ ان کے اس گمان کے مقابل میں اہل ایمان کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ وہ اپنے رب کی سب سے بڑی عزت کے ظہور کے متوقع ہوں گے اور اس توقع کے سبب سے ان کے چہرے کھلے ہوئے ہوں گے۔

---

[1] اقرب الموارد

'اَنْ یُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَۃٌ' کی تالیف زمخشریؒ نے یوں بیان کی ہے: 'ای یفعل بھا فعل ھو فی شدتہ فاقرۃ' (یعنی اس کو ایسی سزا ملنے والی ہے جس کی شدت کمر توڑ دینے والی ہے)۔ اگرچہ اس کے سوا بھی اس کی تالیف کی بعض صورتیں ممکن ہیں لیکن میں اس کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس کی بعض مثالیں آگے کی سورتوں میں آئیں گی۔

'فَاقِرَۃٌ' ایسی مصیبت کو کہتے ہیں جو ریڑھ کی ہڈیوں کو توڑ دینے والی ہو۔

رویت باری کے مسئلہ میں ہمارا نقطۂ نظر

'اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَۃٌ' سے بعض لوگوں نے رویتِ باری تعالیٰ پر استدلال کیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک جیسا کہ اس کی تاویل اور اس کے موقع و محل سے واضح ہے، یہ آیت اس مسئلہ سے تعلق رکھنے والی نہیں ہے۔ بلکہ یہ بالکل ہی دوسرے موقع و محل کی آیت ہے۔ اسی طرح جن لوگوں نے رویت باری تعالیٰ کی مخالفت کی ہے اور اس مخالفت کے جوش میں 'اِلٰی' کے معنی ہی بدل دیے ہیں، ان کی رائے بھی ہمارے نزدیک بالکل غلط ہے۔ رویتِ باری تعالیٰ کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ اس دنیا میں تو ہمارا ایمان، ایمان بالغیب ہے، ہم اپنے رب کو اس کی آیات اور نشانیوں کی اوٹ ہی سے دیکھ سکتے ہیں لیکن آخرت میں ہمارا ایمان بالمشاہدۃ ہو گا اور ہر حقیقت کے باب میں ہمیں حق الیقین کا مرتبہ حاصل ہو گا۔ رہا یہ سوال کہ اس مشاہدہ کی نوعیت کیا ہو گی تو اس کی حقیقت اس دنیا میں معلوم نہیں ہو سکتی۔ یہ چیز متشابہات میں داخل ہے اور متشابہات میں تعمق جائز نہیں ہے۔ اللہ جل شانہ، ہی جانتا ہے کہ اس مشاہدے کی نوعیت کیا ہو گی؟

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۝ وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ۝ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۝ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ الْمَسَاقُ (۲۶ - ۳۰)

عیشِ دنیا کے متوالوں کو موت اور آخرت کی یاد دہانی

عیشِ دنیا کے متوالوں کو یہ موت کی جان کنی اور اس وقت کی مایوسی و بے بسی کی یاد دہانی ہے کہ قیامت کو بعید از امکان نہ سمجھو۔ وہ لازماً آئے گی اور تمھیں خدا کی طرف اس دن سفر کرنا ہو گا جب تمھاری ساری جولانیاں ختم ہو جائیں گی اور بے بسی کا یہ حال ہو گا کہ پنڈلی سے پنڈلی لپٹی ہوتی ہو گی۔ بہتر ہے کہ اس سے پہلے کہ جان ہنسلی میں آ پھنسے اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ کے رہ جائے خدا کی طرف بھاگو اور اس سفر کے لیے کچھ سامان کر لو۔

فراہیؒ کے چند نکات

ان آیات کے تحت استاذ امام علیہ الرحمۃ نے جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح تحقیق پر مبنی ہے۔ ان کی تفسیر سے ہم اس کا ضروری خلاصہ اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں۔

'بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ' میں ضمیر نفس کے لیے ہے جو یہاں محذوف ہے۔ اس حذف کی مثال سورۂ واقعہ میں بھی ہے۔ فرمایا ہے: 'فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ' (الواقعۃ - ۵۶: ۸۳) (کیوں نہیں جب کہ جان حلق کو پہنچ جاتی ہے!) اس طرح کا حذف عربی میں معروف ہے اس وجہ سے 'نفس' کا ذکر

ضروری نہیں ہوا۔ کلامِ عرب میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ حاتم طائی کہتا ہے۔

اماوی ما یغنی الثراء عن الفتیٰ اذا حشرجت یوماً وضاق بھا الصدر

(اے ماویہ! مال آدمی کے کیا کام آئے گا جب جان سینے میں پھنسے گی)

اس میں 'حشرجت' کا فاعل نفس ہے لیکن اسی قاعدے کے مطابق جو مذکور ہوا اس کو حذف کر دیا۔ قرآن مجید میں بھی اس حذف کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً 'مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ' (فاطر-۴۵) (اور زمین کی پشت پر کوئی جاندار جیتا نہ چھوڑتا) اس میں دیکھیے ضمیر کا مرجع 'الارض' ہے جو محذوف ہے ....

'وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ' (اور پکاریں گے، ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا!) یہ فقرہ صورتِ حال کی شدت و نزاکت کی تعبیر کے لیے ہے اور مجہول کا صیغہ یہاں غایت درجہ بلیغ ہے۔ گویا ایسا سخت وقت ہوگا کہ کوئی شخص قائل کی طرف توجہ کرنے والا نہیں ہوگا، یا یوں کہو کہ اس قول کی اہمیت خود قائل کی ذات سے بالکل بے پروا کر دے گی۔ ہر شخص کی زبان پر بس یہی کلمہ ہوگا۔ نکرہ سے پہلے 'مَنْ' یا تو شدتِ طلب کے لیے آتا ہے یا غلبۂ یاس کی تعبیر کے لیے، طرفہ کا شعر ہے:

اذا القوم قالوا من فتی خلت اننی عنیت فلم اکسل ولم اتبلد

(جب قوم پکارتی ہے کہ ہے کوئی جوان! تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ ان کا اشارہ میری ہی طرف ہے، پھر میں کسی سستی اور بودے پن کا اظہار نہیں کرتا)۔

....

اب دیکھیے کہ یہاں آیت کا کیا منشا ہے اور یہ اسلوب کس مقصد کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں دو تاویلوں کا احتمال ہے اور ان دونوں میں فرق محض ظاہری ہے۔

پہلی تاویل یہ ہے کہ جب موت کی بے ہوشی طاری ہوگی اور جان سینے میں گھٹنے لگے گی تو تیماردار گھبرا کر پکاریں گے کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا جو اس جاں بلب کا علاج کرے!

دوسری تاویل یہ ہے کہ وہ کہیں گے کہ بس اب معاملہ آخر ہو چکا! اب کون اس کو شفا دے سکتا ہے! یہ اظہارِ یاس کا فقرہ ہے اور یہیں کہ مریض کو یقین ہو جائے گا کہ بس اب چل چلاؤ کا وقت ہے۔ مشہور شاعرہ خنسا نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے:

لکن سھام المنایا من یصبن لہ لم یشفہ طب ذی طب ولا راق

(جس کو موت کے تیر تراز و ہو گئے اس کو نہ کسی طبیب کی حذاقت شفا دے سکتی نہ کسی جھاڑ پھونک

والے کی جھاڑ پھونک،

یہ دو تاویلیں ہو سکتی ہیں۔ ہم نے دونوں سامنے رکھ دی ہیں۔ جو چاہو اختیار کر سکتے ہو لیکن ہمارے نزدیک دوسری تاویل نظم کلام سے زیادہ لگتی ہوئی ہے۔"

'وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ' کی وضاحت کرتے ہوئے مولاناؒ لکھتے ہیں:

"پنڈلی سے پنڈلی لپٹنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی چل نہ سکے گا۔ یہ حالت شدتِ ضعف و بے بسی کے سبب سے ہوگی۔ آدمی جب تک زندہ اور طاقت ور رہے ہر میدان میں جولانیاں کرتا ہے۔ جب مر جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پنڈلیاں باہم دگر لپٹ گئی ہیں۔ . . .

. . . .

ضعف و بے بسی کی تعبیر کے لیے التفاف ساق (پنڈلی کا لپٹ جانا) نہایت موزوں تعبیر ہے۔ مدعا کلام کا یہ ہے کہ جب معالج مریض سے مایوس، اعزہ و اقربا مددست بردار، فرمانبردار اعضاء قابو سے باہر ہو جائیں گے اور ایک بھاری بوجھ کے ساتھ اس کو رب کے حضور جانا ہوگا، سہارا دینے والا کوئی نہ ہوگا، تو اس وقت اس کا کیا حال ہوگا؟

بعض لوگوں نے 'ساق' کے معنی 'شدت امر' کے لیے ہیں۔ لیکن یہ قول ان لوگوں کا ہے جن کو عربی زبان سے کوئی مس نہیں ہے۔ یہ لوگ اجزاء اور مجموعہ کی دلالت میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ بلاشبہ 'کشف عن الساق' اپنی مجموعی صورت میں سرگرمی، مستعدی اور آمادگی کے مفہوم کے لیے عربی میں معروف ہے مگر جب یہ دونوں لفظ الگ الگ آئیں گے تو 'کشف' کے معنی کھولنے اور 'ساق' کے معنی پنڈلی کے ہوں گے۔ یہ نہیں ہے کہ یہ الگ الگ بھی اسی مفہوم کو ادا کریں۔

حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت ہے کہ 'ساق' سے مراد دنیا کا آخری دن اور آخرت کا پہلا دن ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ روایت کرنے والوں کو کچھ وہم ہوا ہے۔ اگر روایت صحیح ہے تو اس کو بیانِ واقعہ سمجھنا چاہیے نہ کہ 'ساق' کی تفسیر۔

پنڈلی لپٹنے کا ٹھیک مطلب سمجھ لینے کے بعد 'اِلٰی رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۣ الْمَسَاقُ' (اس دن تیرے رب کی طرف چلنا ہوگا) کا حسن موقع آپ سے آپ سمجھ میں آ جاتا ہے۔ گویا اس سفر کی تیاریوں میں انسان سے جو غفلت ہوئی ہے یہ اس پر اس کو سرزنش ہے کہ وہ برابر دنیا ہی کی طلب میں سرگرداں رہا یہاں تک کہ اسی تگ و دو میں اس کی تمام طاقت نچڑ گئی اور اس کو جانا ہے اپنے رب کے پاس تو وہ یہ سفر کس طرح طے کرے گا!"[1]

---

[1] ماخوذ از تفسیر سورۂ قیامہ مؤلفہ امام فراہیؒ۔

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی ۙ وَلٰکِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی ۙ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓی اَهْلِهٖ یَتَمَطّٰی ؕ اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی ۙ ثُمَّ اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی (۳۱-۳۵)

سفرِ دشوار اور زاد و راحلہ کچھ نہیں

یہ ان مکذبینِ آخرت کی محرومی کا بیان ہے کہ سفر تو ان کو اتنا کٹھن درپیش ہے لیکن زاد و راحلہ ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔ نہ انھوں نے خدا کی راہ میں انفاق کیا نہ نماز پڑھی در آنحالیکہ یہی دو چیزیں اس سفر میں کام آنے والی تھیں۔

'صَدَّقَ' کے بعد 'بِالْحُسْنٰی' کا لفظ بربنائے وضاحت قرینہ محذوف ہے۔ سورۂ لیل میں اس کی وضاحت یوں فرمائی ہے: 'فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ۙ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ۙ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی' (الیل - ۹۲: ۵-۷) (پس جس نے اپنا مال راہِ خدا میں دیا اور اپنے رب سے ڈرا اور آخرت کی جزائے حسن کی تصدیق کی تو اس کو ہم سہج راہ چلائیں گے) یہ امر واضح رہے کہ خدا کی راہ میں انفاق ان لوگوں کے لیے ایک دشوار گزار گھاٹی ہے جو آخرت اور اس کی جزائے حسن کے قائل نہ ہوں۔ یہ گھاٹی وہی لوگ پار کر سکتے ہیں جن کے دل مطمئن ہوں کہ دنیا میں جو کچھ وہ خرچ کریں گے آخرت میں ایک لازوال خزانہ کی صورت میں وہ ان کو ملنے والا ہے۔ آخرت کی جزا کا اعتقاد ہی ہے جو آدمی میں انفاق کا حوصلہ پیدا کرتا ہے، جو اس کو جھٹلانے والے ہوتے ہیں ان کی مٹھی انفاق کے لیے کبھی نہیں کھلتی۔ سورۂ لیل کی مذکورہ بالا آیت کے ساتھ ہی یہ حقیقت اس طرح واضح فرمائی گئی ہے: 'وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی ۙ وَکَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ۙ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی' (الیل ۹۲: ۸-۱۰) (رہا وہ جس نے بخیلی کی اور بے پروا ہوا اور جزائے حسن کی تکذیب کی تو ہم اس کو ایک کٹھن راہ چلائیں گے)۔

ان آیات کی روشنی میں 'فَلَا صَدَّقَ' کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس نے نہ آخرت کی جزائے حسن کی تصدیق کی اور نہ اپنے رب کی راہ میں خرچ کیا۔ گویا اس لفظ کے اندر تکذیبِ آخرت اور بخالت دونوں کا مفہوم مضمر ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ 'وَلَا صَلّٰی' (اور نہ اس نے نماز پڑھی) گویا انفاق اور نماز دونوں کا اصل محرک جزائے اعمال کا اعتقاد ہے اور جب یہ اعتقاد ہی معدوم ہے تو ان کے وجود پذیر ہونے کا کیا امکان باقی رہا۔

یہاں وہ بات بھی یاد رکھیے جس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہوتی آ رہی ہے کہ نماز اور انفاق ہی دین کے وہ بنیادی اعمال ہیں جن پر پوری شریعت قائم ہے۔ اب اس آیت سے یہ حقیقت بھی معلوم ہوئی کہ ان دونوں کا انحصار آدمی کے عقیدۂ آخرت پر ہے۔ جن کے اندر یہ عقیدہ محکم نہ ہوگا وہ ان کا اہتمام نہیں کر سکتے۔

'وَلٰکِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی'۔ 'کَذَّبَ' یہاں 'صَدَّقَ' کے مقابل میں اور 'تَوَلّٰی' یہاں 'صَلّٰی' کے بالمقابل ہے۔ یعنی ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ رسول اور آخرت کی تصدیق کرتا اور خدا کی راہ میں انفاق کرتا۔

اور نماز پڑھتا لیکن اس نے تکذیب اور اعراض کی روش اختیار کی۔

اعراض کی تصویر اور اس کا سبب

'ثُمَّ ذَهَبَ إِلَىٰ أَهْلِهِ يَتَمَطَّىٰ': یہ اس اعراض کی تصویر بھی ہے اور غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں اس کا سبب بھی بیان ہوگیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کے اندر مال و اولاد کا گھمنڈ ہوتا ہے ان کو خدا اور آخرت سے ڈرایا جائے تو یہ تذکیر ان پر کارگر نہیں ہوتی۔ وہ اپنی رفاہیت و جمعیت کو اپنی روش کے صحیح اور کامیاب ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں اس وجہ سے ان لوگوں کی نصیحتیں خاطر میں نہیں لاتے جو ان کی روش میں کسی غلطی کی نشان دہی کرتے ہیں۔ وہ ان سے اثر پذیر ہونے کے بجائے اکڑتے ہوئے اپنے اہل و عیال کی طرف چل دیتے ہیں کہ جب ہمیں یہ سب کچھ حاصل ہے تو یہ ہماری اقبال مندی کی دلیل ہوئی یا خرابی کی! خرابی ہمارے اندر نہیں بلکہ انھیں لوگوں کے دماغوں کے اندر ہے جو خود تو ہر چیز سے محروم ہیں لیکن ہمیں ڈراوے سنا رہے ہیں کہ ہم تباہی کی راہ پر چل رہے ہیں۔

یہاں وہ بات یاد رکھیے جو قرآن میں، مختلف اسلوبوں سے، بار بار بیان ہوئی ہے کہ اہل ایمان کی روش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کے اندر برابر خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی گزارتے ہیں کہ مبادا اس گلے کی نگہبانی کا حق ادا نہ ہو سکے اور وہ خدا کی کسی پکڑ میں آ جائیں۔ اہل ایمان کے اس احساس ذمہ داری کا اظہار قرآن میں یوں ہوا ہے إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ (الطور - ۵۲: ۲۶) (ہم پہلے سے اپنے اہل و عیال کے باب میں ڈرنے والے رہے ہیں) اس کے بالکل برعکس رویہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جن کے سینے خوف خدا سے خالی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اہل و عیال کو اپنے لیے سرمایۂ فخر و نازش اور ان کو اپنی اقبال مندی کی دلیل سمجھتے ہیں اس وجہ سے ان کے دماغ پر وہی نشہ سوار ہوتا ہے جو سورۂ کہف میں ایک باغ والے کے قصہ میں بیان ہوا ہے کہ مَا أَظُنُّ أَن تَبِيدَ هَٰذِهِ أَبَدًا (الکہف ۱۸: ۳۵) (میں یہ گمان نہیں رکھتا کہ یہ کبھی تباہ ہو جائے گا) اسی طرح کے لوگوں کی ذہنیت سورۂ مطففین میں بدین الفاظ بیان ہوئی ہے: وَإِذَا انقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمُ انقَلَبُوا فَكِهِينَ (المطففین - ۸۳: ۳۱) (اور جب وہ اپنے اہل کی طرف لوٹتے ہیں تو مگن ہو کر لوٹتے ہیں)۔

'أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ ۞ ثُمَّ أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ': أَوْلَىٰ لفظ وَيْلٌ سے ہے جو زجر، اظہار حسرت و ملامت اور اظہار نفرت و غضب کے لیے آتا ہے۔ اس معنی میں یہ کلام عرب میں بکثرت آیا ہے۔ خنساء کا مشہور شعر ہے:

همّمت بنفسی کل الهموم ۔۔۔ فَأَوْلَىٰ لنفسی أَوْلَىٰ لها

(میں نے اپنے نفس کے بارے میں طرح طرح کے ارادے کر ڈالے پس افسوس ہے میرے نفس پر، افسوس ہے!)

معلوم نہیں بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ سزاوار کس طرح کر دیا ہے۔ یہ عربیت کے بھی خلاف ہے اور سیاق و سباق سے بھی بے جوڑ ہے۔

اوپر سے کلام غائب کے اسلوب میں آرہا تھا، اس آیت میں اسلوب خطاب کا آگیا۔ اسلوب کی یہ تبدیلی افسوس اور نفرت کے اظہار میں شدت پر دلیل ہے۔ اس کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی ؕ اَلَمۡ یَکُ نُطۡفَۃً مِّنۡ مَّنِیٍّ یُّمۡنٰی ۙ ثُمَّ کَانَ عَلَقَۃً فَخَلَقَ فَسَوّٰی ۙ فَجَعَلَ مِنۡہُ الزَّوۡجَیۡنِ الذَّکَرَ وَ الۡاُنۡثٰی ؕ اَلَیۡسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یُّحۡیِۦَ الۡمَوۡتٰی ﴿۳۶-۴۰﴾

جس مضمون سے سورہ کا آغاز ہوا اسی پر خاتمہ

اب اسی مضمون پر سورہ کو ختم فرمایا ہے جس سے آغاز ہوا تھا۔ شروع میں فرمایا ہے: 'اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَہٗ ؕ بَلٰی قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ' اس کے بعد کلام انسان کی خود سری، دیدہ و دانستہ حق پوشی اور ہول قیامت کے ذکر کی طرف مڑ گیا تھا۔ اب آخر میں اسی سوال کو لے کر اس کا جواب دیا کہ جو لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے پر تعجب کر رہے ہیں کیا وہ یہ گمان کیے بیٹھے ہیں کہ انسان غیر مسئول چھوڑ دیا جائے گا! اگر غیر مسئول چھوڑ دیا جانا خدا کے عدل اور اس کی حکمت کے منافی ہے تو خدا کے لیے انسان کو دوبارہ پیدا کر دینا کیوں مشکل ہو جائے گا؟ کیا وہ خود اپنی خلقت کے مراحل پر غور نہیں کرتے کہ انسان پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوتا ہے جو رحم میں ٹپکا دی جاتی ہے۔ 'یُمۡنٰی' مجہول کا صیغہ عدم اعتناء و اہتمام کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ٹپکا دینے والا ایک بوند ٹپکا کر الگ ہو جاتا ہے، پھر اسے کچھ خبر نہیں ہوتی کہ وہ بوند کہاں اور کس حال میں ہے۔ بعد کے سارے تصرفات اس پر قدرت کرتی ہے اور تہ بہ تہ تاریکیوں کے اندر وہ اپنی صنعت گری سے اس کو مختلف مراحل سے گزارتی ہے۔ پانی کی بوند خون کی ایک پھٹکی کی شکل اختیار کرتی ہے۔ پھر اس کا خاکہ تیار ہوتا ہے۔ پھر اس کے نوک پلک سنوارے جاتے ہیں۔ بالآخر قدرت اس کو مرد یا عورت بنا کر وجود میں لاتی ہے۔ ان تمام مراحل میں قدرت کا قلم ہی اس پر سارے تصرفات کرتا ہے۔ کسی اور کا ہاتھ اس میں شریک نہیں ہوتا۔ اب غور کرو کہ جس خدا نے اپنی قدرت، حکمت اور صنعت گری کی یہ شانیں تمھارے وجود کے اندر تمھیں مشاہدہ کرائی ہیں کیا وہ تمھارے مرجانے کے بعد تمھیں دوبارہ زندہ کر دینے پر قادر نہیں ہوگا!

اللہ تعالیٰ کی عنایت اور اس کی توفیق بخشی سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔

ولہ الحمد فی الدنیا والاٰخرۃ۔

رحمان آباد
۱۹ر جنوری ۱۹۷۹ء
۱۹ر صفر ۱۳۹۹ھ

تدبّرِ قرآن

۷۶

الدّھر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ــــــ القیٰمۃ ــــــ کی توام ہے۔ سابق سورہ جس مضمون پر ختم ہوئی ہے اسی مضمون سے اس کا آغاز ہوا ہے۔ اُس کی آخری چار اور اس کی ابتدائی تین آیتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ دونوں نے ایک حلقۂ اتصال کی شکل اختیار کر لی ہے اور یہ چیز توام سورتوں میں بالعموم نمایاں ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

دونوں کا عمود بالکل ایک ہی ہے، البتہ نہج استدلال اور طریق بحث دونوں میں الگ الگ ہے۔ پہلی میں قیامت کی دلیل انسان کے اندر نفسِ لوّامہ کے وجود سے پیش کی گئی ہے اور اس میں یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر سمع و بصر کی جو صلاحیت ودیعت فرمائی ہے اور اس کو خیر و شر کے درمیان امتیاز کی جو قابلیت بخشی ہے اس کا بدیہی تقاضا ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں ان لوگوں کو دا دملے جنھوں نے ان اعلیٰ صلاحیتوں کا حق پہچانا اور اپنے پروردگار کے شکرگزار رہے اور وہ لوگ اپنے اندھے پن کی سزا بھگتیں جنھوں نے ان کی ناقدری کر کے کفر کی راہ اختیار کی۔ اگر یہ جزاء و سزا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک العیاذ باللہ شاکر اور کافر دونوں برابر ہیں۔

بعض مصاحف میں اس سورہ کو مدنی ظاہر کیا گیا ہے لیکن پوری سورہ کا مدنی ہونا تو الگ رہا اس کی ایک آیت کے بھی مدنی ہونے کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔ سورتوں کے مکی یا مدنی ہونے کا فیصلہ کرنے کے لیے اصلی کسوٹی ان کے مطالب و مضامین ہیں۔ آگے مطالب کا تجزیہ بھی آپ کے سامنے آئے گا اور آیات کی تفسیر بھی۔ ان سے واضح ہو جائے گا کہ جن لوگوں نے اس کو مدنی خیال کیا ہے ان کے خیال کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

اس سورہ میں مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱-۳) انسان کی خلقت سے متعلق اس بدیہی حقیقت کی طرف اشارہ کہ ایک دور اس پر ایسا گزرا ہے جب

اس کی کوئی ہستی نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو عدم کی ظلمت سے نکالا اور وجود کی روشنی بخشی۔ پھر اس کی تخلیق کا سلسلہ پانی کی ایک بوند سے جاری فرمایا۔ اس بوند کو مختلف اطوار و مراحل سے گزارتے ہوئے وہ اس درجے تک پہنچا دیتا ہے کہ وہ سننے سمجھنے والی ہستی بن جاتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کو خیر و شر دونوں کے راستے دکھا کر اس کا امتحان کرتا ہے کہ وہ شکر کی راہ اختیار کرتا ہے یا کفر کی۔

(۴-۲۲) خیر و شر کا امتیاز دے کر خالق نے انسان پر جو انعام فرمایا ہے اس کے لازمی تقاضے کا بیان۔ بالاجمال ان لوگوں کے انجامِ بد کی طرف اشارہ جو اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے اس شرف کی ناقدری کر کے کفر کی راہ اختیار کر بیٹھے۔ پھر اس عظیم صلہ کا بیان جس سے اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کو نوازے گا جنھوں نے اس کے انعام کی قدر کی اور اپنی زندگی جزاء و سزا کو پیشِ نظر رکھ کر گزاری۔

(۲۳-۲۸) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کی تلقین کہ تم ناشکروں اور نابکاروں کے اعتراضات و مطالبات کی پروا نہ کرو۔ جس رب نے تمھارے اوپر قرآن نازل کیا ہے اس پر بھروسہ رکھو۔ وہ ہر مشکل آسان کرے گا۔ حصولِ صبر و استقامت کے لیے نماز اور ذکرِ الٰہی کی تاکید اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کہ کفار کی اصل بیماری یہ ہے کہ یہ دنیا کے نقدِ عاجل کو آخرت کے نسیہ پر قربان کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ اس بیماری پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے وہ قیامت کے خلاف طرح طرح کے شبہات گھڑ رہے ہیں حالانکہ ان پر واضح ہے کہ تم جس چیز سے ان کو ڈرا رہے ہو وہ ایک حقیقت ہے اور ہمارے لیے یہ ذرا مشکل نہیں ہے کہ جس طرح ہم نے ان کو پہلے پیدا کیا اسی طرح ان کے جوڑ بند ٹھیک کر کے دوبارہ اٹھا کھڑا کریں۔

(۲۹-۳۱) مخالفین کو تہدید کہ اللہ کا رسول جو آگاہی تمھیں دے رہا ہے اس سے متعلق اس کی ذمہ داری صرف لوگوں کو آگاہ کر دینا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا تمھارا اپنا کام ہے۔ رسول یاددہانی کے بعد اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائے گا۔ قبولِ ہدایت کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی ایک معین سنت ہے۔ اس کے قبول کرنے والے تم میں سے وہی بنیں گے جو اس سنت کے تحت اس کے سزاوار ٹھہریں گے۔ جو اس کے سزاوار نہیں ہوں گے وہ اپنے کفر پر اڑے رہیں گے اور جہنم کے ایندھن بنیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ہر کام اس کے علم اور اس کی حکمت کے تحت ہوتا ہے۔

سُوْرَةُ الدَّهْرِ

مَکِّیَّةٌ ـــــــــــــــ اٰیات: ۳۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَکُنْ شَیْـًٔا مَّذْکُوْرًا ﴿۱﴾ آیات
اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًا ۱-۳۱
بَصِیْرًا ﴿۲﴾ اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا ﴿۳﴾ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا
لِلْکٰفِرِیْنَ سَلٰسِلَاۡ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِیْرًا ﴿۴﴾ اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ
کَاْسٍ کَانَ مِزَاجُهَا کَافُوْرًا ﴿۵﴾ ج عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ یُفَجِّرُوْنَهَا
تَفْجِیْرًا ﴿۶﴾ یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا کَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِیْرًا ﴿۷﴾
وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا ﴿۸﴾ اِنَّمَا
نُطْعِمُکُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا ﴿۹﴾
اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا ﴿۱۰﴾ فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ
شَرَّ ذٰلِکَ الْیَوْمِ وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ﴿۱۱﴾ ج وَجَزٰهُمْ بِمَا
صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِیْرًا ﴿۱۲﴾ لا مُّتَّکِـِٕیْنَ فِیْهَا عَلَی الْاَرَآئِکِ ج لَا یَرَوْنَ
فِیْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِیْرًا ﴿۱۳﴾ ج وَدَانِیَةً عَلَیْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ
قُطُوْفُهَا تَذْلِیْلًا ﴿۱۴﴾ وَیُطَافُ عَلَیْهِمْ بِاٰنِیَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّ

ترو حفص بغیر الالف فی الوصل فیهما ووقف علی الاول بالالف و علی الثانی بغیر الالف ۱۲

أَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيرَا ﴿١٥﴾ قَوَارِيرَا مِن فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا ﴿١٦﴾
وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا ﴿١٧﴾ عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّىٰ
سَلْسَبِيلًا ﴿١٨﴾ وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ إِذَا رَأَيْتَهُمْ
حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا ﴿١٩﴾ وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا
كَبِيرًا ﴿٢٠﴾ عَالِيَهُمْ ثِيَابُ سُندُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ ۖ وَحُلُّوا
أَسَاوِرَ مِن فِضَّةٍ ۚ وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا ﴿٢١﴾ إِنَّ هَٰذَا كَانَ
لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُم مَّشْكُورًا ﴿٢٢﴾ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ ع ۲۲ ۱۹
الْقُرْآنَ تَنزِيلًا ﴿٢٣﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا
أَوْ كَفُورًا ﴿٢٤﴾ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿٢٥﴾ وَمِنَ اللَّيْلِ
فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا ﴿٢٦﴾ إِنَّ هَٰؤُلَاءِ يُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ
وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيلًا ﴿٢٧﴾ نَّحْنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا
أَسْرَهُمْ ۖ وَإِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَا أَمْثَالَهُمْ تَبْدِيلًا ﴿٢٨﴾ إِنَّ هَٰذِهِ
تَذْكِرَةٌ ۖ فَمَن شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ﴿٢٩﴾ وَمَا تَشَاءُونَ
إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿٣٠﴾ يُدْخِلُ
مَن يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ ۚ وَالظَّالِمِينَ أَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿٣١﴾ ع ۲ ۹ ۲

ترجمۂ آیات ۱ - ۳۱

کیا گزرا ہے انسان پر کوئی وقت، زمانے میں، ایسا جب وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ
تھا! ہم نے انسان کو پیدا کیا پانی کی ایک مخلوط بوند سے۔ اس کو الٹتے پلٹتے رہے
یہاں تک کہ ہم نے اس کو دیکھنے سننے والا بنا دیا۔ ہم نے اس کو راہ سجھا دی۔ چاہے وہ

شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔ ۱-۳

ہم نے کفر کرنے والوں کے لیے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی آگ تیار کر رکھی ہے۔ ہاں، وفادار بندے ایسی شراب کے جام نوش کریں گے جس میں چشمۂ کافور کی ملونی ہو گی۔ اس چشمہ سے اللہ کے خاص بندے پئیں گے اور اس کی شاخیں نکال لیں گے جدھر جدھر چاہیں گے۔ یہ اپنی نذریں پوری کرتے اور اس دن سے ڈرتے رہے ہیں جس کا ہول ہمہ گیر ہو گا اور وہ مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے رہے ہیں۔ خود اس کے حاجت مند ہوتے ہوئے، (اس جذبہ کے ساتھ کہ) ہم تمھیں صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے کھلاتے ہیں، نہ تم سے کسی بدلے کے طالب ہیں نہ شکریہ کے، ہم اپنے رب کی طرف سے ایک ایسے دن سے اندیشہ ناک ہیں جو نہایت عبوس اور سخت ترش رو ہو گا۔ تو اللہ نے ان کو اس دن کی آفت سے بچایا اور ان کو تازگی اور سرور سے نوازا۔ اور انھوں نے جو صبر کیا اس کے صلہ میں ان کو جنت اور ریشمیں لباس عطا فرمایا۔ ٹیک لگائے ہوں گے اس میں تختوں پر۔ نہ اس میں گرمی کے آزار سے دوچار ہوں گے نہ سردی کے۔ باغ جنت کے سائے ان پر جھکے ہوئے اور اس کے خوشے بالکل ان کی دسترس میں ہوں گے۔ اور ان کے سامنے چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے گردش میں ہوں گے۔ شیشے چاندی کے ہوں گے۔ ان کو انھوں نے نہایت موزوں اندازوں کے ساتھ سجایا ہو گا۔ ۴-۱۶

اور وہ اس میں ایک اور شراب بھی پلائے جائیں گے جس میں ملونی چشمۂ زنجبیل کی ہو گی۔ یہ اس میں ایک چشمہ ہے جو سلسبیل سے موسوم ہے اور ان کی خدمت میں غلمان گردش میں ہوں گے جو ہمیشہ ایک ہی سن پر رہیں گے۔ جب تم ان کو دیکھو گے تو ان کو بکھرے

ہوئے موتی گمان کرو گے۔ جہاں دیکھو گے وہیں عظیم نعمت اور عظیم بادشاہی دیکھو گے۔ ان کے اوپر سندس کا سبز اور استبرق کا لباس ہوگا اور وہ چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا رب ان کو پاکیزہ مشروب پلائے گا۔ بے شک یہ تمھارے عمل کا صلہ ہے اور تمھاری سعی مقبول ہوئی! ۱۷-۲۲

ہم ہی نے تم پر قرآن نہایت اہتمام سے اتارا ہے تو صبر کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو اور ان میں سے کسی گنہگار یا ناشکرے کی بات کا دھیان نہ کرو۔ اور صبح و شام اپنے رب کے نام کی یاد رکھو اور رات میں بھی اس کو سجدہ اور اس کی تسبیح کرو، رات کے طویل حصہ میں۔ ۲۳-۲۶

یہ لوگ صرف دنیائے عاجل سے محبت رکھتے اور اپنے آگے ایک بھاری دن کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ ہم ہی نے ان کو پیدا کیا اور ان کے جوڑ بند مضبوط کیے اور جب ہم چاہیں گے ٹھیک انہی کے مانند بدل دیں گے۔ یہ ایک یاددہانی ہے تو جو چاہے اپنے رب کی راہ اختیار کر لے اور تم نہیں چاہ سکتے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ بے شک اللہ علیم و حکیم ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۲۷-۳۱

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا (۱)

استفہام بر اسلوب کی بلاغتیں

'ھَلْ' کے معنی مفسرین نے استفہام کے بجائے عام طور پر 'قَدْ' کے لیے ہیں۔ لیکن کلام عرب میں اس معنی کے لیے مجھے کوئی نظیر نہیں ملی۔ بعض مثالیں جو اس معنی کی شہادت کے طور پر پیش کی گئی ہیں ان پر میں نے غور کر لیا ہے۔ میرے نزدیک ان میں بھی 'ھَلْ' استفہام ہی کے لیے ہے۔ البتہ استفہام جس طرح ہماری زبان میں مختلف معانی کے لیے آتا ہے اسی طرح عربی میں بھی اس کے مختلف مفہوم ہوتے ہیں۔ ان سب کی وضاحت کے لیے یہاں نہ گنجائش ہے نہ ضرورت۔ پچھلی سورتوں میں اس کے بعض پہلو زیر بحث آ چکے ہیں اور بعض کے لیے آگے کی سورتوں میں موزوں مواقع آئیں گے۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ استفہام کا ایک بلیغ موقع استعمال وہ بھی ہے جب مخاطب سے کسی ایسی بات کا اقرار کرانا ہو جس کی نوعیت ہو تو ایک بدیہی حقیقت کی لیکن مخاطب اس کو تسلیم کرنے کے باوجود عملاً اس سے منحرف ہو۔ مثال سے یوں سمجھیے کہ کوئی ماں اپنے نافرمان بیٹے سے یوں کہے کہ 'کیا تجھے یاد نہیں کہ تو ایک مضغۂ گوشت کی صورت میں میری گود میں ڈالا گیا تھا، میں نے اپنا خون دودھ بنا کر تجھ کو پلایا اور پال پوس کر جوان کیا!'

اس پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہ محض ایک سادہ خبریہ جملہ نہیں ہے بلکہ اس کے اندر بہت سے معانی مضمر ہیں۔ مثلاً:

- اس میں بیٹے کو ایک عظیم حق کی یاددہانی ہے جو اس پر عائد ہوتا ہے اور جس سے اس کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے لیکن اس کا رویہ اس کے منافی ہے۔
- اس میں ملامت، غصہ، رنج اور اظہار حسرت کے بھی گوناگوں پہلو ہیں۔
- اس میں نہایت مبنی برحقیقت گلہ و شکوہ بھی ہے اور نہایت مؤثر اپیل بھی۔

یہ سارے مفہوم اس استفہام ہی سے پیدا ہوتے ہیں جو اس جملہ کے اندر ہے۔ اگر اس کو الگ کر کے جملہ کو سادہ خبریہ اسلوب میں کر دیجیے تو یہ تمام معانی ہوا ہو جائیں گے۔ بالکل یہی حال زیر بحث آیت کا بھی ہے۔ اس میں جو 'ھَلْ' ہے اس کے اندر بہت سے معانی مضمر ہیں جو آگے مضمون کے تدریجی ارتقا سے کھلیں گے۔ اگر اس کو آپ 'قَدْ' سے بدل دیں تو یہ آیت ان مطالب کی تمہید کے لیے بالکل ناموزوں ہو جائے گی جو آگے آ رہے ہیں۔

معلقات کے ایک قصیدے کا مطلع ہے:

هل غادر الشعراء من متردم — ام هل عرفت الدار بعد توهم

(کیا شاعروں نے شاعری میں کوئی خلا چھوڑ دیا تھا یا تجسس کے بعد تم نے منزل جاناں کا سراغ پا لیا ہے!!)

یہ ایک بہترین مطلع ہے اور اس کا سارا حسن اس کے خاص قسم کے استفہامیہ اسلوب میں مضمر ہے۔ اگر اس 'ھَلْ' کو 'قَدْ' سے بدل دیجیے تو یہ حسن بالکل غائب ہو جائے گا۔ شاعر خود اپنے آپ کو مخاطب کر کے پوچھ رہا ہے کہ آج یہ قصیدہ کہنے کا

ولولہ دل میں کیوں ابھرا ہے؟ کیا شاعری میں خلا رہ گیا تھا جس کو آج بھر دینے کا ارادہ ہے یا منزلِ جاناں کے آثار نے آتشِ عشق بھڑکا دی ہے جس کا حق ادا کرنا ہے! مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں ہیں۔ شاعری میں بھی ایک بہت بڑا خلا رہ گیا تھا جس کو اس قصیدے سے پورا کرنا ہے اور منزلِ جاناں کے سراغ کا مضمون بھی اب تک کے شاعروں کی ساری خونفشانیوں اور مضمون آفرینیوں کے باوجود ہنوز تشنہ ہی تھا، آج اس کا بھی حق ادا کر دینا ہے۔

یہاں اس مطلع کے محاسن کی وضاحت مقصود نہیں ہے، دکھانا صرف یہ ہے کہ اسلوب اور اسلوب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ باعتبار وزن تو یہ شعر لفظ 'قد' سے بھی پورا ہو جاتا ہے لیکن معنی کے اعتبار سے ظاہر ہے کہ اس کی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہ جاتی۔

آیت زیر بحث کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو قیامت اور جزا و سزا کے منکر تھے۔ ان کو مخاطب کر کے قرآن نے یہ سوال ان کے سامنے رکھا ہے کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ایک وقت انسان پر ایسا بھی گزرا ہے جب اس کا وجود کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں تھا بلکہ وہ پانی، کیچڑ، مٹی کے اندر رینگنے والی ایک حقیر مخلوق تھا۔ لیکن اسی حقیر مخلوق کو قدرت نے مختلف مراحل سے گزارا اور اس کی صلاحیتوں کو تربیت دے کر ایسے مرتبہ پر پہنچا دیا کہ وہ تمام مخلوقات سے اعلیٰ و اشرف بن گیا! اس سوال سے مقصود انسان کی قوتِ فکر کو حرکت میں لانا ہے کہ وہ سوچے کہ آخر قدرت نے اس پر یہ اہتمام کیوں صرف فرمایا، اس کو ان اعلیٰ صلاحیتوں سے کیوں نوازا؟ کیا محض اس لیے کہ وہ کھائے پیے اور ایک دن ختم ہو جائے! کیا ان صلاحیتوں سے متعلق اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟ کیا جس نے اس اہتمام سے اس کو وجود بخشا اس کا کوئی حق اس پر قائم نہیں ہوتا؟ یہ سوالات ہر اس شخص کے اندر پیدا ہونے چاہئیں جو اپنے وجود پر غور کرے۔

اپنا وجود انسان سے سب سے زیادہ قریب بھی ہے اور اس کی ہر چیز انسان کو دعوتِ فکر بھی دیتی ہے۔ آیت کے استفہامیہ اسلوب نے اس حسِ فکر کو بیدار کرنا چاہا ہے کہ انسان کی نظروں سے خدا اوجھل ہے تو اس کا اپنا وجود تو اوجھل نہیں ہے، وہ خود اپنے اندر خدا کی قدرت و حکمت اور اس کے عدل و رحمت کی نشانیاں دیکھ سکتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ غور کرے تو یہ حقیقت بھی اس پر روشن ہو جائے گی کہ ہر چند اس نے قیامت ابھی دیکھی نہیں لیکن خود اس کے نفس کے اندر قیامت کے شواہد اور اس کے دلائل اتنے واضح ہیں کہ وہ ان کا انکار نہیں کر سکتا بشرطیکہ وہ بالکل ہٹ دھرم اور کج رو نہ ہو۔

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا (۲)

انسان کو مزید غور کی دعوت

اوپر کی آیت میں انسان کے اس تاریک ماضی کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو زندگی کے نقطۂ آغاز سے تعلق رکھتا ہے۔ اب یہ اس کی پیدائش کے ان مختلف اطوار کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن کا ہر پہلو

اس کے سامنے ہے اور جو اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جس کی طرف اوپر والی آیت اشارہ کر رہی ہے کہ انسان پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوتا ہے، اسی بوند کو مختلف اطوار و مراحل سے گزار کر قدرت اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ سننے سمجھنے اور عقل و ہوش رکھنے والے انسان کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ انسان غور کرے کہ جس خدا نے پانی کی ایک بوند پر اتنے عجیب کرشمے دکھائے ہیں کیا اس کے لیے اس کو دوبارہ پیدا کرنا مشکل ہو جائے گا اور پھر اس بات پر بھی غور کرے کہ جس خدائے علیم و حکیم نے پانی کے ایک حقیر قطرے کو سمع و بصر کی اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا اور اس کو خیر و شر اور شکر و کفر میں امتیاز بخشا، کیا اس نے یہ ایک کارِ عبث کیا ہے کہ وہ باز پرس اور جزا و سزا کا کوئی دن نہیں لائے گا۔

'مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ' میں لفظ 'امشاج' جمع ہے 'مشج' اور 'مشیج' کی۔ اس کے معنی ملی جلی اور مخلوط چیز کے ہیں۔ 'امشاج' اگرچہ جمع ہے لیکن یہ ان الفاظ میں سے ہے جو جمع ہونے کے باوصف مفرد الفاظ کی صفت کے طور پر آتے ہیں۔ نطفہ کے مخلوط ہونے سے اس کا مختلف قویٰ و عناصر سے مرکب ہونا بھی مراد ہو سکتا ہے اور مرد و عورت کے نطفوں کا امتزاج بھی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جہاں مختلف عناصر اور متضاد طبائع اور مزاجوں کا امتزاج ہو وہاں ان کے اندر ایسا اعتدال و توازن برقرار رکھنا کہ پیشِ نظر مقصد کے مطابق صالح نتیجہ برآمد ہو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ یہ کام ایک حکیم و مدبر کی نگرانی میں ہو۔ کسی اتفاقی حادثہ کے طور پر اس طرح کے حکیمانہ کام کا وقوع ممکن نہیں ہے۔

لفظ 'ابتلاء' کا مفہوم

'نَّبْتَلِيْهِ' کو عام طور پر لوگوں نے بیانِ علت کے مفہوم میں لیا ہے۔ یعنی ہم نے انسان کو آزمانے کے لیے پیدا کیا۔ لیکن یہ علت کے مفہوم میں ہوتا تو اس پر لامِ علت آنا تھا حالانکہ یہ حال کی صورت میں ہے اور حال کا مفہوم علت کے مفہوم سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ حال ہی کے مفہوم میں ہے اور مطلب اس کا یہ ہے کہ ہم نے انسان کو اس طرح پیدا کیا کہ درجہ بدرجہ اس کو مختلف اطوار مراحل سے گزارتے ہوئے ایک سمیع و بصیر مخلوق کے درجے تک پہنچا دیا۔

'ابتلاء' کے معنی لغت میں جانچنے پرکھنے کے ہیں۔ آدمی جب کسی چیز کو جانچتا ہے تو اس کو مختلف پہلوؤں سے الٹ پلٹ اور ٹھونک بجا کر دیکھتا ہے۔ یہیں سے اس کے اندر ایک طور سے گزار کر دوسرے طور میں لے جانے کا مفہوم بھی پیدا ہو گیا۔ یہاں یہ لفظ اسی معنی میں ہے۔ اصحابِ تاویل میں سے بھی بعض لوگوں نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

انسان کی خلقت کے مختلف مراحل

انسان کی تخلیق جن اطوار و مراحل سے گزر کر مرتبہ تکمیل تک پہنچی ہے ان کی وضاحت قرآن میں جگہ جگہ ہوئی ہے۔ ہم بعض مثالیں پیش کرتے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا

اے لوگو، اگر تم مرنے کے بعد اٹھائے جانے کے بارے میں شک میں ہو تو اس بات پر غور کرو کہ ہم

خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۭ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَاۗءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ (الحج ۔ ۲۲ : ۵)

نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر پانی کی ایک بوند سے پھر خون کی ایک پھٹکی سے پھر گوشت کی ایک بوٹی سے، کوئی تام اور کوئی ناتمام تاکہ ہم تم پر اپنی قدرت و حکمت اچھی طرح ظاہر کر دیں۔ پھر ہم رحموں میں ٹھہراتے ہیں جتنا چاہتے ہیں ایک مدت معین تک پھر ہم تم کو بچے کی صورت میں باہر لاتے ہیں پھر ہم تم کو پروان چڑھاتے ہیں کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔

انہی اطوار و مراحل کی تفصیل سورۂ مومنون میں یوں آئی ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۠ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۤ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۭ (المؤمنون ۔ ۲۳ : ۱۲-۱۴)

اور ہم نے انسان کو پیدا کیا مٹی کے جوہر سے پھر ہم نے اس کو رکھا پانی کی ایک بوند کی صورت میں ایک محفوظ ٹھکانے میں۔ پھر ہم نے پانی کی اس بوند کو خون کی پھٹکی کی شکل دی پھر خون کی پھٹکی کو مضغۂ گوشت بنایا پھر گوشت میں ہڈیاں پیدا کیں اور ہڈیوں کو گوشت کا جامہ پہنایا پھر اس کو ایک بالکل ہی دوسری مخلوق کی صورت میں کھڑا کر دیا۔ پس بڑی ہی بابرکت ذات ہے اللہ، بہترین پیدا کرنے والے کی۔

ان آیات میں جن اطوار و مراحل کی تفصیل ہے انہی کی طرف بالا جمال آیت زیر بحث میں اشارہ فرمایا ہے اور انہی مراحل سے درجہ بدرجہ گزارنے کے لیے لفظ 'نَبْتَلِيْهِ' آیا ہے جس سے یہ بات نکلی کہ اس قطرے کو گہر ہونے تک بہت سے مرحلے طے کرنے پڑے ہیں اور ہر مرحلہ میں قدرت نے اس کو اچھی طرح جانچا پرکھا ہے کہ جس دور میں جو صلاحیت اس کے اندر پیدا ہونی چاہیے وہ پیدا ہوگئی یا نہیں!

'فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا' یہ اس تمام اہتمام و تدبر کا خلاصہ سامنے رکھا ہے کہ یا تو انسان پانی، مٹی، کیچڑ اور نطفہ کی شکل میں بالکل 'لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا' (نا قابل ذکر چیز) کا مصداق تھا یا وہ دور آیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سمع و بصر کی اعلیٰ صفات سے متصف ہستی بنا دیا۔ سورۂ مومنون کی محولہ بالا آیت میں اسی چیز کی طرف 'ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔

'سَمِيْعًا بَصِيْرًا' انسان کی تمام اعلیٰ صفات کی نہایت جامع تعبیر ہے۔ انہی صفات کے فیض سے انسان کے اندر خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت، پیدا ہوئی اور وہ اس قابل ٹھہرا کہ اللہ تعالیٰ اس کا امتحان کرے کہ وہ خیر کی راہ اختیار کر کے اپنے رب کا شکرگزار بندہ بنتا ہے یا شر کی راہ اختیار کر کے ناشکرا اور کافر نعمت بن جاتا ہے۔ پھر اس سے لازماً یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ جو اپنے سمع و بصر کی صلاحیتوں کی قدر کریں وہ اس کا صلہ پائیں اور جو ان کی ناقدری کریں وہ اس کی سزا بھگتیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس سارے اہتمام کا مقصد کیا جو انسان کی پیدائش کے لیے قدرت نے کیا!

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (۳)

سمع و بصر کا ثمرہ

یہ انسان کو سمیع و بصیر بنانے کا ثمرہ بیان ہوا ہے کہ پھر ہم نے اس کو راہ سجھا دی۔ 'راہ سجھانے' سے مراد یہ ہے کہ اس کو نیکی اور بدی کی راہ سجھا دی، جیسا کہ دوسرے مقام میں فرمایا ہے: 'وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ' (البلد - ۹۰ : ۱۰) (اور ہم نے اس کو دونوں راہیں سجھا دیں) سورۂ شمس میں فرمایا ہے: 'فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا' (الشمس - ۹۱ : ۸) (پس اس کو اس کی بدی اور پرہیزگاری الہام کر دی) ان دونوں راہوں کے سجھا دیے جانے کے سبب سے انسان خود اپنے اوپر خیر اور شر کا گواہ بن گیا اور اس کے پاس بدی کی راہ اختیار کرنے کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا۔ اس حقیقت کی طرف سابق سورہ میں یوں اشارہ فرمایا ہے۔ 'بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۙ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ' (القیٰمۃ - ۷۵ : ۱۴-۱۵) (بلکہ انسان اپنے اوپر خود گواہ ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذرات تراشے)۔

اختیار کی نعمت

'اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا' یہ انسان کے اختیار و ارادہ کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو نیکی و بدی کا امتیاز دے کر اس کو اختیار بخشا ہے کہ وہ چاہے تو نیکی کی راہ اختیار کرے، چاہے تو بدی کی راہ چلے۔ اگر نیکی کی راہ اختیار کرے گا تو وہ اپنے رب کا شکرگزار بندہ بنے گا اور اس کا انعام پائے گا اور اگر بدی کی راہ اپنائے گا تو وہ ناشکرا بنے گا اور اس کی سزا بھگتے گا۔

اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا۠ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا (۴)

خیر اور شر میں امتیاز کا لازمی نتیجہ

یہ خیر اور شر میں امتیاز بخشے جانے کا لازمی نتیجہ بیان ہوا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو شکر و کفر دونوں کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت بخشی ہے تو ضروری ہے کہ وہ ان لوگوں کو انعام سے نوازے جو شکرگزاری کی راہ اختیار کریں اور ان لوگوں کو سزا دے جو کفر کی راہ چلیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس صلاحیت کا دیا جانا لاحاصل رہا در آنحالیکہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے، اس کی شانِ حکمت سے یہ بعید ہے کہ وہ کوئی عبث کام کرے۔

کافروں کو سزا

فرمایا کہ چونکہ ہم نے انسان کو شکر اور کفر کا امتیاز بخشا ہے اس وجہ سے ہمارے ہاں شاکر اور کافر دونوں یکساں نہیں ہوں گے بلکہ ہم ان کے ساتھ الگ الگ معاملہ کریں گے۔ ناشکروں کے لیے ہم نے زنجیریں،

طوق اور بھڑکتی آگ تیار کر رکھی ہے۔ ان کے پاؤں میں زنجیریں پہنائی جائیں گی، گردنوں میں آہنی طوق ڈالے جائیں گے اور پھر ان کو گھسیٹ کر جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔

إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِن كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا ۝ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللَّهِ يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا (۵-۶)

شکر گزاروں کا انعام

یہ کافروں کے مقابل میں شاکر بندوں کے صلہ کا بیان ہوا ہے اور ان کو 'ابرار' سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس لفظ کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ 'برّ' کی اصل روح ایفائے عہد و ذمہ ہے اور لفظ 'شکر' کی اصل حیثیت نعمت کے حق کو پہچاننا اور اس کو ادا کرنا ہے۔ ان دونوں میں واضح قدر مشترک موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کے جو بندے اس کی نعمتوں کا حق پہچانتے اور اس کو ادا کرتے ہیں وہی در اصل اس کے وفادار بندے ہیں۔

لفظ 'کأس' کی تحقیق بھی اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ یہ ظرف اور مظروف یعنی شراب اور جام شراب دونوں معنوں میں آتا ہے۔

'مِزَاج' کے معنی ملونی کے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزوں میں بعض اوقات لذت، خوشبو یا ان کے مزاج میں اعتدال پیدا کرنے کے لیے بعض چیزیں ان کے استعمال کے وقت ملائی جاتی ہیں۔ شراب میں بھی اس طرح کی ملونیوں اور بعض دوسرے لوازم کا ذکر عرب شعرا کرتے ہیں۔ اہلِ جنت کی شراب میں یہ ملونی چشمۂ کافور کے آبِ زلال کی ہوگی۔

'کَافُوْر' سے مراد یہاں معروف کافور نہیں ہے۔ قرآن نے خود وضاحت فرما دی ہے کہ یہ جنت کا ایک چشمہ ہے جس کے کنارے بیٹھ کر اللہ کے خاص بندے شراب نوش کریں گے اور اس چشمہ کے پانی کی ملونی سے اس کے کیف و سرور کو دوچند کریں گے۔ رہا یہ سوال کہ اس کا نام کافور کیوں رکھا گیا ہے تو ناموں سے متعلق اس طرح کا سوال اگرچہ پیدا نہیں ہوتا تاہم ذہن اس طرف جاتا ضرور ہے کہ اسم اور مسمّی میں کوئی مناسبت ہوگی۔ یہ مناسبت کس نوع کی ہے؟ اس کا تعلق متشابہات سے ہے۔ اس کی اصل حقیقت اسی دن اور انھیں خاص بندوں پر کھلے گی جن کو اس سے بہرہ مند ہونے کی سعادت حاصل ہوگی۔

لبِ جو مے نوشی کا اہتمام

'یَشْرَبُ بِهَا' میں 'ب' میرے نزدیک ظرفیہ ہے جس طرح 'یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ' اور 'یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ' میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ چشمہ اللہ کے خاص بندوں کی بزم مے نوشی کے لیے مخصوص ہوگا۔ 'عباد اللہ' سے مراد وہی ابرار ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا۔ انہی کو یہ خاص شرف حاصل ہوگا کہ ان کی مے نوشی کے لیے اللہ تعالیٰ ایک مخصوص چشمہ کا بھی اہتمام فرمائے گا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مے نوشی اور لبِ جو میں بڑی مناسبت ہے۔

'یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِیْرًا'۔ 'تَفْجِیْرٌ' کے معنی کسی چشمہ کی بہت سی شاخیں نکال نکال کر ان کے جال بچھا دینا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس چشمہ پر پہنچنے کے لیے اہلِ جنت کو کوئی شدِ رحال نہیں کرنا پڑے گا بلکہ جو جہاں چاہے گا اس کی شاخیں نکال لے گا اور اس کی لذتوں اور اس کی سیر سے بغیر کسی زحمتِ سفر کے خوش وقت اور شادکام ہوگا۔

یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا کَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِیْرًا (۷)

ابرار کے وہ اعمال جن کے صلہ میں ان کو یہ سرفرازی حاصل ہوگی

یہ ان کے وہ اوصاف و اعمال بیان ہو رہے ہیں جن کے سبب سے ان کو ربِ کریم کی طرف سے یہ سرفرازی بخشی جائے گی۔

کوئی نیک کام کرنے کا عہد کر لینے کو 'نذر' کہتے ہیں۔ ان وفادار بندوں (ابرار) کے اوصاف میں الفاتے نذر کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔ جو لوگ ان نذروں کے پورے کرنے کا بھی اہتمام رکھیں گے جو انھوں نے بطورِ خود اپنے اوپر واجب کی ہوں ان سے ان نیکیوں کے بدرجۂ اولیٰ اہتمام کی توقع ہے جو ان کے رب نے ان پر واجب ٹھہرائی ہیں۔ ہمارے مفسرین نے اس لفظ کے مفہوم کو وسیع کر کے تمام نیکیوں پر حاوی کر دیا ہے، خواہ بندے نے اپنے اوپر وہ از خود عائد کی ہوں یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کی گئی ہوں۔ لیکن یہ اس لفظ کے حقیقی مفہوم سے تجاوز ہے۔

اسلام سے پہلے نذر کی اہمیت

یہاں یہ امر یاد رکھیے کہ 'نذر' کی اہمیت سابق ادیان میں بھی بہت رہی ہے اور عرب جاہلیت میں بھی اس کا بڑا اہتمام تھا۔ جو لوگ کوئی نیکی کا کام کرنا چاہتے، خواہ وہ حج و عمرہ کے قسم کی ہو یا قربانی و انفاق کے نوع کی، وہ اس کی نذر مانتے اور اہتمام سے اپنی نذر پوری کرتے۔ عربوں کے نذر اس کی وجہ زیادہ تر ان کی امیت تھی۔ دین کے طریقے ان کو واضح طور پر معلوم نہیں تھے اس وجہ سے ان کے اندر کے نیک لوگ نذروں کے ذریعہ سے اس خلا کو بھرتے۔ اسلام کے آ جانے کے بعد جب شریعت کے تمام اصول و فروع لوگوں کو معلوم ہو گئے تو اس کا دائرہ محدود ہو گیا۔ وہ نذریں جو مشرکانہ نوعیت کی تھیں وہ تو بالکل ہی ختم کر دی گئیں۔ جو نذریں تکلیف مالا یطاق نوعیت کی تھیں وہ بھی یا تو ممنوع قرار پا گئیں یا ان کی اصلاح کر دی گئی۔ یہ سورہ چونکہ اس دور کی ہے جب شریعت کے احکام و آداب لوگوں کو تفصیل سے معلوم نہیں ہوئے تھے اس وجہ سے اس میں اس کا ذکر خاص اہمیت سے ہوا۔ بعد میں جب شریعت کا پورا ہیتاق نازل ہو گیا تو اس کا دائرہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، نہایت محدود ہو گیا۔

خوفِ آخرت

'وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا کَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِیْرًا'۔ 'مُسْتَطِیْرٌ' کے معنی عام اور ہمہ گیر کے ہیں۔ یہ ان کے اندیشۂ آخرت کا بیان ہے کہ وہ ہمیشہ اس دن کی پکڑ سے ڈرتے رہتے ہیں جس کی آفت عام و ہمہ گیر ہوگی۔ یعنی اس دن بڑے اور چھوٹے، امیر اور غریب، راعی اور رعایا یہاں تک کہ عابد اور معبود سب کو اس کے

ہول سے سابقہ پیش آئے گا۔ صرف وہی لوگ اس سے محفوظ رہیں گے جن کو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا (۸)

غریبوں کی خدمت

یہ خلق کے ساتھ ان کے رویہ کا بیان ہے کہ وہ مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کی ضرورتیں، خود اپنی ضرورتیں نظر انداز کر کے پوری کرتے ہیں۔ لفظ 'طعام' محدود معنی میں نہیں ہے۔ زندگی کی دوسری ناگزیر ضروریات کا اہتمام بھی اس میں شامل ہے۔ قرآن میں یہ لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

'عَلٰى حُبِّهٖ' میں ضمیر کا مرجع

'عَلٰى حُبِّهٖ' میں ضمیر کا مرجع عام طور پر لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو مانا ہے۔ ان کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ وہ مسکینوں اور یتیموں کو اللہ کی محبت میں کھلاتے پہناتے ہیں۔ اگرچہ قاعدہ زبان کی رو سے اس میں کوئی خرابی نہیں ہے لیکن شواہد قرآن کے پہلو سے میں ان لوگوں کے قول کو ترجیح دیتا ہوں جو اس کا مرجع 'طعام' کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ اگرچہ وہ خود ضرورت مند ہوتے ہیں لیکن وہ اپنی ضرورت پر مسکینوں اور یتیموں کی ضرورت کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس قول کو ترجیح دینے کے مختلف وجوہ ہیں:

ایک وجہ یہ ہے کہ یہ ابرار کا کردار بیان ہو رہا ہے اور 'بِرّ' یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچی وفاداری کا مقام حاصل کرنے کے لیے یہ بات ضروری قرار دی گئی ہے کہ آدمی اللہ کی راہ میں وہ چیز خرچ کرے جو اس کو خود عزیز ہو، خواہ اس وجہ سے عزیز ہو کہ وہ بذاتِ خود قیمتی ہے یا اس وجہ سے کہ وہ اس کا ضرورت مند ہے چنانچہ فرمایا ہے 'لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ' (آل عمران - ۳: ۹۲) (تم اللہ کی وفاداری کا درجہ نہیں حاصل کر سکتے جب تک تم ان چیزوں میں سے اللہ کی راہ میں نہ خرچ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو)۔ یہی حقیقت دوسرے لفظوں میں یوں واضح فرمائی گئی ہے: 'وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ' (الحشر - ۵۹: ۹) (اور وہ اپنے اوپر غریبوں اور مسکینوں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود ضرورت مند ہوں)۔

• دوسری وجہ یہ ہے کہ ان ابرار کا صلہ آگے آیت ۱۲ میں بدیں الفاظ بیان ہوا ہے، 'وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا' (اور ان کو اللہ نے ان کے صبر کے صلہ میں جنت اور حریر سے نوازا)۔ یہاں غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ان کے صبر کے کردار کو واضح کرنے والی واحد چیز یہی ہے کہ وہ یتیموں اور مسکینوں کو خود ضرورت مند ہونے کے باوجود کھلاتے پہناتے رہے ہیں۔ اگر 'عَلٰى حُبِّهٖ' کی تاویل اس سے مختلف کر دی جائے تو یہاں ان کے صبر کے کردار کو واضح کرنے والی کوئی چیز نہیں رہ جاتی حالانکہ کلام اس کا مقتضی ہے۔ اس وضاحت نے 'عَلٰى حُبِّهٖ' کے ضمیر کا مرجع خود متعین کر دیا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ جو انفاق عزیز و مطلوب مال میں سے، خود اپنی ضرورت کو قربان کر کے ہوتا ہے، درحقیقت وہی اللہ کی رضا جوئی کے لیے ہوتا ہے۔ اس پہلو سے خدا کی محبت کا مضمون خود اس کے

اندر پیدا ہو جاتا ہے۔

اس آیت میں مسکین و یتیم کے ساتھ اسیر کا ذکر زمانۂ نزول کے حالات کے اعتبار سے ہوا ہے۔ اس زمانہ میں کسی جرم یا مطالبہ میں گرفتار قیدی عموماً اپنی حاجات لوگوں سے سوال کر کے پوری کرتے تھے۔ قاضی ابو یوسفؒ کے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عباسیوں کے زمانے تک یہی حال رہا ہے۔ اب جیل کے نظام میں بڑی تبدیلیاں ہو گئی ہیں اس وجہ سے اس انفاق کی وہ اہمیت باقی نہیں رہی لیکن اب بھی قیدیوں اور ان کے متعلّقین کی امداد کی ایسی بہت سی صورتیں ہیں جن میں انفاق اسی حکم میں ہو گا۔

إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۝ إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا (۹-۱۰)

انفاق صرف اللہ کی رضا جوئی کے لیے

یہ ان کے اس انفاق کے باطنی محرک کا بیان ہے کہ وہ جس کی مدد کرتے ہیں نہ اس سے اپنے اس انفاق کا کوئی معاوضہ چاہتے نہ اس بات کے خواہشمند ہوتے کہ وہ ان کا ممنونِ احسان اور شکر گزار ہو بلکہ وہ صرف اپنے رب کی رضا جوئی اور آخرت کے خوف سے ایسا کرتے تھے۔

یومِ آخرت کی صفت یہاں 'عَبُوْس' اور 'قَمْطَرِیْر' آئی ہے۔ 'عبوس' کے معنی ترش رو اور روکھے پھیکے کے ہیں۔ 'قمطریر' اسی مضمون کی شدت کے اظہار کے لیے بطور تاکید آیا ہے یعنی وہ دن ایسا اکھڑ، اکل کھرا اور ترش مزاج ہو گا کہ اس میں کوئی بھی کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں بنے گا۔ اس دن سابقہ ہر ایک کو اپنے اعمال سے پیش آئے گا۔ خدا کی رحمت صرف انہی لوگوں کی طرف متوجہ ہو گی جنھوں نے اس کی رضا جوئی میں مسکینوں اور یتیموں کی سرپرستی اور ہمدردی کی ہو گی اور اپنی ضروریات نظر انداز کر کے ان کی احتیاج پوری کرنے پر اپنا مال صرف کیا ہو گا۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ بات وہ قولاً ہر اس شخص سے کہیں بھی جس کی مدد کریں بلکہ یہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ان کے انفاق کے باطنی محرک کی تعبیر ہے کہ وہ جن حاجتمندوں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں صرف للہ و فی اللہ خرچ کرتے، اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور آخرت کے خوف کے سوا کوئی اور غرض ان کے سامنے نہیں ہوتی۔

فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا (۱۱)

یہ ان کا صلہ بیان ہوا کہ چونکہ وہ اس 'عبوس' اور 'قمطریر' دن سے اندیشہ ناک رہے اور اس کی آفتوں سے محفوظ رہنے کے لیے اپنا محبوب مال انھوں نے خرچ کیا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو اس کی آفتوں سے محفوظ رکھے گا اور اس دن جب سب کے چہرے اترے ہوئے ہوں گے ان کے چہرے ہشاش بشاش اور مسرور ہوں گے۔

وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا (۱۲)

صبر کی صفت کا صلہ — اور چونکہ انھوں نے صبر کیا اس وجہ سے ان کو جنت اور حریر کا صلہ عطا ہوگا۔ 'بِمَا صَبَرُوْا' سے اشارہ ان کے اس صبر کی طرف ہے جس کا ذکر اوپر 'وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔ خود بھوکے ہوتے ہوئے اپنے آگے کی رکابی دوسرے بھوکے کے آگے وہی سرکائے گا جس کے اندر صبر کی صفت ہوگی۔

'جنت' ان کو اس لیے ملے گی کہ اس کے پھل کھائیں اور اس کے عیش دوام سے بہرہ مند ہوں اور 'حریر' اس لیے کہ اس کے لباس پہنیں۔ مکان، غذا اور لباس تینوں چیزیں اس کے اندر آگئیں۔

مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآىِٕكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا (۱۳)

'سورج' اور 'زمہریر' نہ دیکھنے کا مفہوم یہ ہے کہ یہ لوگ گرمی اور سردی دونوں کی اذیتوں سے بالکل محفوظ، جنت کے تختوں پر براجمان ہوں گے۔ ان کے سورج میں روشنی اور قوت بخشی تو ہوگی مگر اس میں حدت و تمازت نہ ہوگی۔ اسی طرح وہاں کا موسم ہمیشہ خوش گوار، معتدل اور پربہار رہے گا، خزاں کی نحوست اور باد زمہریر کے آزار سے ان کو کبھی سابقہ نہیں پیش آئے گا۔

وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا (۱۴)

یعنی ان کے باغوں کے سائے بالکل ان کے سروں پر پھیلے ہوئے ہوں گے اور پھلوں کے خوشے اس طرح نکل رہے ہوں گے کہ بالکل ان کی دسترس کے اندر ہوں گے۔ کسی چیز کے حاصل کرنے کے لیے ان کو کوئی کاوش نہیں کرنی پڑے گی۔

وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا ۟ قَوَارِيْرَا۟ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا (۱۵-۱۶)

یعنی ان کے سامنے ہر وقت چاندی کے ظروف اور شیشے کے پیالے گردش میں ہوں گے اور یہ شیشہ بھی دیکھنے میں شیشہ ہوگا، حقیقت میں یہ بھی چاندی ہی کے جوہر سے بنا ہوگا۔

لفظ 'تقدیر' کا مفہوم — 'قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا' یعنی یہ ظروف اور پیالے مختلف شکلوں، مختلف پیمانوں اور الگ الگ اندازوں کے بنے ہوں گے اور خدام نے ان کو نہایت قرینہ اور حسن سلیقہ سے الگ الگ خانوں میں سجا کر رکھا ہوگا تاکہ حالات، وقت، ضرورت اور مطلوب شے کی مناسبت سے جس قسم کے سیٹ کی ضرورت ہو، پیش کر سکیں۔ لفظ 'تقدیر' ان تمام معانی پر حاوی ہے۔ اردو میں مجھے کوئی لفظ ایسا نہ مل سکا جو ان تمام کا احاطہ کر سکے۔

وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ۚ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا (۱۷-۱۸)

'زنجبیل' اور 'سلسبیل' — اوپر چشمۂ کافور کا ذکر ہوا۔ یہ ایک دوسرے چشمہ کا ذکر ہے۔ فرمایا کہ اس میں ایک اور شراب بھی ان کو پلائی جائے گی جس میں چشمۂ زنجبیل کی ملونی ہوگی۔ یہ بھی جنت کے چشموں میں سے ایک چشمہ

ہے جس کا دوسرا نام 'سلسبیل' ہے۔ ناموں سے متعلق ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ ان میں لغوی مفہوم کا اعتبار نہیں ہوتا۔ 'زنجبیل' کے مشہور معنی تو سونٹھ کے ہیں لیکن نام بادنیٰ مناسبت بھی رکھے جاتے ہیں۔ جنت اور دوزخ کی کتنی ہی چیزوں کے نام قرآن میں مذکور ہیں لیکن ان ناموں سے ان کے مسمّٰی کی حقیقت کا صحیح علم ممکن نہیں ہے۔ ہمارے لیے یہ بہت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ناموں سے آگاہ کر دیا۔ ان شاء اللہ ایک دن ان کی حقیقت بھی معلوم ہو جائے گی۔ اس چشمہ کا دوسرا نام 'سلسبیل' ہے۔ زجاج کے نزدیک اس کے معنی رواں دواں کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ نام بھی محض اس کی روانی کی مناسبت سے رکھا گیا ہے جو اس کے گوناگوں اوصاف میں سے صرف ایک ہے۔

وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ ۚ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا (۱۹)

غلمان اور ان کے اوصاف

یہ ان کی خدمت اور ان کے آگے جام پیش کرنے والے غلمان کے اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ فرمایا کہ یہ غلمان ہمیشہ ایک ہی سن و سال کے رہیں گے۔ 'مخلد' کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ اس وصف کے ذکر سے مقصود دو باتوں کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ ایک اس بات کی طرف کہ نوخیز چھوکرے ہوں گے اس وجہ سے خدمت میں نہایت چاک و چوبند، چست اور سرگرم ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ ہمیشہ ایک ہی سن و سال کے رہیں گے جس سے ان کی مستعدی بھی برابر قائم رہے گی اور وہ اپنے مخدوموں کی خدمت میں برابر رہنے کے سبب سے ان کے مزاج، عادت اور ذوق سے بھی اچھی طرح آشنا ہوں گے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ حسنِ خدمت میں تجربہ کو بڑا دخل ہے۔ بوڑھے خادم میں تجربہ ہوتا ہے لیکن اس کی مستعدی ختم ہو جاتی ہے۔ نئے خادم میں مستعدی ہو سکتی ہے لیکن تجربہ اور ذوق سے ناآشنائی کے سبب سے آقا کو تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ اہلِ جنت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے خدام مہیا کیے ہیں جن کی ہر خوبی دائمی ہو گی۔

'إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا'۔ یہ ان کے جمال، ان کی نظافت، ان کی خوش ادائی اور ان کی خوش لباسی کی تصویر ہے کہ جب تم ان کو دیکھو گے تو یہ گمان کرو گے کہ گویا ہر طرف موتی بکھرے ہوئے ہیں۔

وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا (۲۰)

یعنی جب دیکھو گے اور جہاں دیکھو گے وہیں ایک عظیم نعمت اور ایک عظیم بادشاہی کا جلوہ نظر آئے گا۔ گویا ہر قدم پر ع

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا این جاست

عَالِيَهُمْ ثِيَابُ سُندُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ ۖ وَحُلُّوا أَسَاوِرَ مِن فِضَّةٍ ۚ
وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا (۲۱)

اہلِ جنت کا لباس

'عَالِیَ' میرے نزدیک حال کے محل میں ہے اور مراد اس سے اہلِ جنت کے بالائی کپڑے — عبا اور قبا وغیرہ — ہیں۔

ان کے بالائی جامے سبز سندس اور استبرق کے ہوں گے۔ سندس اور استبرق ایران کے بنے ہوئے مشہور ریشمی کپڑوں کے نام تھے۔ بعض لوگوں نے ان دونوں کے درمیان باریک اور دبیز کا فرق کیا ہے لیکن یہ تحقیق غیر ضروری ہے۔ یہاں مراد جنت کے سندس اور استبرق ہیں جن کی اصل حقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اہلِ عرب، ایران اور مصر ہی کے تمدن سے اس زمانہ میں زیادہ آشنا تھے اس وجہ سے جنت کی نعمتوں کی تمثیل کے لیے زیادہ تر انہی کی تمدنی چیزوں کے نام مستعار لیے گئے۔ اس دور کے سلاطین سندس اور استبرق کی عبائیں زیبِ تن کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جن کے اوپر کے جامے سندس اور استبرق کے ہوں گے ان کے زیریں جامے اور بھی نرم و نازک ہوں گے۔ یہاں اہلِ جنت کے بالائی لباس کا تصور دے کر بات ختم کر دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے قیاس کر لو کہ اور وہ کیا کچھ پہنیں گے۔

اہلِ جنت کے ذوق کا لحاظ

'وَحُلُّوٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ'۔ اس زمانے کے سلاطین سونے اور چاندی کے کنگن بھی پہنتے تھے۔ فرمایا کہ ان کو چاندی کے کنگن بھی پہنائے جائیں گے۔ یہاں چاندی کے کنگنوں کا ذکر ہے۔ سورۂ کہف میں سونے کے کنگنوں کا ذکر ہے: 'یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّیَلْبَسُوْنَ ثِیَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ' (۳۱) (وہ اس میں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور سندس کے سبز لباس)۔ بعینہٖ یہی بات سورۂ حج آیت ۲۳ اور سورۂ فاطر آیت ۳۳ میں فرمائی گئی ہے۔ اس کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ تنوع کے اظہار کے لیے ہے کہ اہلِ جنت جب چاہیں گے سونے کے کنگن پہنیں گے اور جن کا جی چاہے گا چاندی کے پہنیں گے۔ تنوع پسندی اور اختلافِ مذاق ایک فطری چیز ہے۔ جنت میں ہر شخص کے ذوق اور اس کے انتخاب کا پورا لحاظ ہو گا۔ 'لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ فِیْهَا وَلَدَیْنَا مَزِیْدٌ' (قٓ ۔ ۵۰: ۳۵) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

مفسرین نے عام طور پر یہی توجیہ کی ہے لیکن میرا ذہن ایک اور طرف بھی جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اہلِ جنت کے مراتب میں، جیسا کہ سورۂ واقعہ میں تفصیل سے آپ پڑھ چکے ہیں، فرق ہو گا۔ ایک گروہ سابقون اوّلون اور مقربین کا ہو گا۔ دوسرا طبقہ اصحابِ یمین کا۔ ان دونوں طبقوں کی جنتوں اور نعمتوں میں فرق ایک قدرتی امر ہے۔ قرآن نے اس فرق کو واضح بھی کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس فرق کی بنا پر قرآن نے کہیں سونے کا ذکر کیا اور کہیں چاندی کا۔

ایک خاص نکتہ

'وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا'۔ اس ٹکڑے میں بھی ایک نکتہ قابلِ توجہ ہے۔ اوپر آیت ۵ میں ارشاد ہے: 'اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا' اللہ کے وفادار

بندے ایک ایسی شراب میں سے پئیں گے جس میں چشمۂ کافور کی ملونی ہوگی) اس کے بعد آیت ، میں فرمایا: 'وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا' (اور وہ اس میں ایک ایسا جام پلائے جائیں گے جس میں چشمۂ زنجبیل کی ملونی ہوگی) اور یہاں ارشاد ہوا کہ 'وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا' (اور ان کا پروردگار ان کو ایک شراب طہور پلائے گا) عربیت کا ذوق رکھنے والے آسانی سے اس فرق کو سمجھ سکتے ہیں جو ان تینوں اسلوبوں ___ 'يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ'، 'يُسْقَوْنَ كَاْسًا'، 'سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ' ___ میں ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ فرق کیوں ہے؟ میرے نزدیک یہ اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ ابرار درجہ بدرجہ قربِ الٰہی کی منزلیں طے کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچ جائیں گے کہ خود ربِّ کریم ان کو شرابِ طہور کا جام پلائے گا! یہ شرابِ طہور کیا ہے؟ اس کا تصوّر اس دنیا میں نہیں کیا جا سکتا اس وجہ سے اس کے لیے قرآن نے کوئی اس طرح کا تمثیلی اسلوب اختیار نہیں کیا جس طرح کا اسلوب اوپر چشمۂ کافور اور چشمۂ زنجبیل کے لیے اختیار فرمایا۔ اس کو صرف ربِّ کریم ہی جانتا ہے۔ کبھی کبھی میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہ اس مشک بُو، مہر بند شرابِ خالص کی طرف اشارہ ہے جو مقربین کے لیے خاص ہے اور جس کا ذکر سورۂ مطففین میں نہایت اہتمام سے بدیں الفاظ ہوا ہے:

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۝ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ۚ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۝ وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ۝ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ (المطففین - ۸۳ : ۲۵-۲۸)

اور وہ مہر بند شرابِ خالص کے جام پلائے جائیں گے۔ اس کی مہر مشک کی ہوگی اور یہ ہے ایسی چیز کہ اس کی طلب میں طالبین باہم دگر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں اور اس میں ملونی چشمۂ تسنیم کی ہوگی۔ یہ ایک چشمہ ہے جس پر مقربین خاص مے نوشی کریں گے۔

اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا (۲۲)

رب کریم کی طرف سے داد

یعنی یہ سب کچھ پاکر پروردگار کی طرف سے ان کو یہ داد بھی ملے گی کہ یہ تمہارے اپنے ہی اعمال کا صلہ ہے، اللہ کے نزدیک تمہاری سعی مقبول ٹھہری! اس کے لیے تمہیں کسی دوسرے کی سعی و سفارش کا ممنونِ احسان نہیں ہونا پڑا۔ اس میں ان لوگوں پر ایک تعریض بھی ہے جو اپنے مزعومہ دیوتاؤں کی سفارشوں کے بل پر جزا اور سزا سے غافل رہے حالانکہ وقت پر ان میں سے کوئی بھی ان کے کام نہ آئے گا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ۚ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ

مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا (۲۳-۲۴)

نبی صلعم کو صبر اور انتظار کی تلقین

جس محل میں سورۂ قیامہ میں آیت: لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ (۱۶) آئی ہے بعینہٖ اسی محل میں، اور اسی مقصد سے اس سورہ میں یہ آیت ہے۔ یعنی منکرین اور مومنین کا انجام بیان کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر اور انتظار کی تلقین فرمائی گئی ہے کہ تم صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو۔ ان لوگوں کے سامنے وہ سب کچھ آکے رہے گا جس سے قرآن ان کو آگاہ کر رہا ہے۔

'اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا'۔ یعنی یہ قرآن نہ تم نے اپنے جی سے لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے اور نہ اس کو تم نے ہم سے مانگ کر اپنے اوپر نازل کرایا ہے کہ اس کی پیش کردہ صداقتوں اور حقیقتوں کو ثابت کرنے اور لوگوں کو ان کے دکھا دینے کی ذمہ داری تمہارے اوپر ہو بلکہ یہ ہم ہیں جنھوں نے نہایت اہتمام سے اس کو تمہارے اوپر نازل کیا ہے۔ 'اِنَّا نَحْنُ' کے الفاظ میں جس زور اور جس عظمت و جلالت کا اظہار ہے اس پر نظر رہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ہم نے یہ قرآن تم پر اتارا ہے تو لوگوں کی مخالفتوں اور ان کی نزاع خائیوں کی پروا تم کیوں کرو! ان سے نمٹنے کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور ہم سب سے نمٹ لینے کے لیے تنہا کافی ہیں۔

لفظ 'تَنْزِيْل' جس اہتمام کی طرف اشارہ کر رہا ہے اس سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ یہ قرآن نہ تو کسی سائل کی درخواست ہے اور نہ یہ کوئی ہوائی بات ہے کہ ان لوگوں کی مخالفت سے یہ ہوا میں اڑ جائے بلکہ یہ نہایت اہتمام سے اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب ہے جس کی ہر بات پوری ہو کے رہے گی، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

'فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا'۔ 'فَاصْبِرْ' کے بعد 'ل' کا صلہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں یہ انتظار کے مضمون پر متضمن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ کتاب تم نے مانگ کر اپنے اوپر نہیں اتروائی ہے تو لوگوں کے اعتراضات و مطالبات سے تم کیوں پریشان ہو۔ تمہارے اوپر بلاغ کی ذمہ داری ہے وہ ادا کرتے رہو اور رب کے فیصلہ کا انتظار کرو۔ ان نابکاروں اور ناہنجاروں کی ذرا پروا نہ کرو جو مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کو وہ عذاب دکھا دیا جائے جس سے قرآن ان کو ڈرا رہا ہے۔

لفظ 'اطاعت' یہاں پروا کرنے کے معنی میں ہے۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ آیت: كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (العلق -۹۶- ۱۹) میں بھی یہ اسی معنی میں آیا ہے۔

آثم اور کفور کی تحقیق

'اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا'۔ اوپر آیت ۳ میں 'شاکر' اور 'کفور' کے الفاظ گزر چکے ہیں۔ وہاں فرمایا ہے 'اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا' (ہم نے انسان کو راہ دکھا دی ہے، چاہے وہ شکر گزار بنے یا ناشکرا)۔

یہاں 'شاکر' کے ضد کی حیثیت سے لفظ 'آثم' آیا ہے۔ اس کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ یہ لفظ حقوق تلف کرنے والے کے لیے آتا ہے۔ حقوق دو طرح کے ہیں، حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ حقوق العباد تلف کرنے والوں کے لیے معروف لفظ 'آثم' ہے اور حقوق اللہ نہ ادا کرنے والے کے لیے معروف 'کفور' ہے۔ اگرچہ یہ دونوں صفتیں لازم و ملزوم سی ہیں، جو حقوق العباد کا منکر ہو گا وہ حقوق اللہ ادا کرنے والا بھی نہیں بن سکتا، تاہم اشخاص کے رجحانات و میلانات کے اعتبار سے یہ بیماری ان کے اندر ذرا مختلف شکلوں میں نمایاں ہوتی ہے۔ بعض کے اندر خسّت، بخالت اور طمعِ مال، قساوتِ قلب پیدا کر دیتی ہے جو ان کو نیکی کا دشمن بنا دیتی ہے۔ بعض کے اندر انانیت، خود پرستی اور استکبار پیدا ہو جاتا ہے جو ان کو حق کے آگے جھکنے نہیں دیتا۔ قریش کے اندر ان دونوں کرداروں کے نمونہ علی الترتیب ابولہب اور ابوجہل تھے۔ ان دونوں طرح کے کرداروں کو سامنے رکھ کر یہاں 'وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اس میں اشارہ ہے اس حقیقت کی طرف کہ تمہارے مخالفوں میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ یا تو وہ طمعِ دنیا کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں اس وجہ سے تمہارے دشمن ہیں یا ان کے سروں پر انانیت کا بھوت سوار ہے جو ان کو حق کے آگے جھکنے نہیں دے رہا ہے اور یہ دونوں ہی قسم کے لوگ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی باتوں کو کوئی اہمیت دی جائے۔ ان کا مرض لاعلاج ہے۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۚ وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا (٢٥-٢٦)

صبر کا نسخہ

اوپر جس صبر کی تلقین فرمائی ہے یہ اس کا نسخہ بتایا ہے کہ صبح و شام اپنے رب کے نام کو یاد رکھو۔ صبح و شام احاطۂ وقت کے مفہوم میں بھی بولے جاتے ہیں اور لفظ 'ذکر' یہاں عام ہے جو نماز اور ذکرِ دوام دونوں پر شامل ہے۔ 'وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا' کے الفاظ سے تہجد کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔ خاص طور پر سورۂ مزمل کی تفسیر میں اس کے تمام اطراف زیر بحث آئے ہیں۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا (٢٧)

مخالفین کی اصل بیماری

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے آپ کے مخالفین کی اصل بیماری کا پتہ دیا ہے کہ یہ لوگ تمہارے انذار پر جو شبہات وارد کر رہے ہیں یہ محض اصل حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے ان کی سخن سازی ہے۔ ان کی اصل بیماری یہ ہے کہ اس دنیا کی لذتِ عاجل کے پرستار ہیں۔ آخرت کی خاطر وہ اس نقد کو چھوڑنے کا حوصلہ نہیں رکھتے، خواہ آخرت کا دن کتنا ہی کٹھن کیوں نہ ہو۔ اپنی اس دنیا پرستی کو چھپانے رکھنے کے لیے وہ قیامت پر بعض بناوٹی قسم کے شبہات کا اظہار کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو یہ تاثر دے سکیں کہ یہ لوگ تمہاری بات جو نہیں مان رہے ہیں تو اس کا سبب محض عناد اور انانیت نہیں بلکہ اس کے کچھ وجوہ ہیں۔

نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ ۚ وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا (٢٨)

یہ ان مخالفین کے لیے دھمکی بھی ہے اور اس میں قیامت پر ان کے سب سے بڑے شبہ کا جواب بھی،

ان کا سب سے بڑا شبہ، جو قرآن میں بار بار نقل ہوا ہے، یہی تھا کہ مرنے اور مٹی میں رل مل جانے کے بعد یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ دوبارہ اٹھائے جائیں! فرمایا کہ ہم ہی نے ان کو پیدا کیا اور ہم نے ہی ان کے جوڑ بند اور رگ پٹھے مضبوط کیے تو جب ہم ہی نے یہ سب کچھ کیا ہے اور اس سے وہ انکار نہیں کر سکتے تو ہم جب چاہیں گے پھر ان کے رگ پٹھے از سرِ نو مضبوط کر کے ان کو اٹھا کھڑا کریں گے۔ جب پہلی بار ہم کو اس کام میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تو وہی کام ہمارے لیے دوبارہ کیوں مشکل ہو جائے گا۔

'شَدَدْنَآ اَسْرَ' کے معنی ہڈیوں اور اعصاب کو ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے جوڑنے کے ہیں۔ 'بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ' میں جس مثلیت کی طرف اشارہ ہے اس سے مراد یہی جوڑ بند از سرِ نو درست کرنے میں مثلیت ہے۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ج فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (۲۹)

آگاہی اور اعلانِ بے نیازی — یہ ان لوگوں سے اظہارِ بے نیازی ہے کہ یہ آگاہی جو سنائی جا رہی ہے محض ان لوگوں کی خیر خواہی کے لیے سنائی جا رہی ہے۔ اس میں نہ اللہ کا کوئی نفع ہے اور نہ رسول کی کوئی ذاتی غرض اس میں مضمر ہے۔ جس کا جی چاہے اس کو قبول کر کے اپنے رب کی راہ اختیار کرے ورنہ اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہے جس سے یہ کتاب آگاہ کر رہی ہے۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ط اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ط وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۳۰-۳۱)

توفیقِ ایمان کے باب میں سنتِ الٰہی — یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے توفیقِ ایمان کے باب میں مقرر کر رکھی ہے اور جس کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ہر کام اس کے علم و حکمت پر مبنی ہے۔ وہ ہدایت کی توفیق انہی کو بخشتا ہے جو اپنے سمع و بصر سے کام لیتے اور خیر و شر، حق و باطل کے درمیان امتیاز کی اس صلاحیت کی قدر کرتے ہیں جو اس نے ان کے اندر ودیعت فرمائی ہے اور جس کی طرف آیات ۲-۳ میں اشارہ فرمایا ہے۔ رہے وہ لوگ جو اپنی یہ صلاحیتیں ضائع کر کے اندھے بہرے بن جاتے ہیں تو ان کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔ ان کے لیے خدا نے جہنم تیار کر رکھی ہے اور اس جہنم میں وہ اس وجہ سے پڑیں گے کہ انھوں نے اپنے اوپر خود ظلم کر کے اپنے آپ کو اس کا مستحق بنایا۔ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے۔ وہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علی احسانہ۔

رحمان آباد
۱۳- فروری ۱۹۷۹ء
۱۵- ربیع الاول ۱۳۹۹ھ

تدبرِ قرآن

۷۷

المرسلٰت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ اپنے عمود، تمہید اور طرز استدلال کے اعتبار سے چھٹے گروپ کی سورۂ ذاریات سے اور اپنے اسلوب بیان اور مزاج میں سورۂ رحمان سے مشابہ ہے۔ سورۂ ذاریات میں، بطریق قسم، ہواؤں کے عجائب تصرفات سے عذاب اور قیامت پر استدلال کیا گیا ہے اور عمود اس کا اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ[1] ہے۔ اسی طرح اس سورہ میں بھی ہواؤں کے عجائب تصرفات کی بطور شہادت قسم کھا کر فرمایا ہے کہ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ (بے شک جس چیز کی تمھیں وعید سنائی جا رہی ہے وہ ایک امر شدنی ہے)۔

مزاج اور اسلوب کلام میں سورۂ رحمان سے اس کی مشابہت یوں ہے کہ جس طرح وہ ترجیع والی سورتوں میں سے ہے، آیت فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ اس میں بار بار آئی ہے، اسی طرح اس سورہ میں آیت وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ[2] دس بار آئی ہے۔ ترجیع والی سورتوں کے باب میں، یہ اصولی حقیقت سورۂ رحمان کی تفسیر میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ ان میں خطاب بالعموم ان ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں سے ہے جو ایک واضح حقیقت کو محض مکابرت اور انانیت کی بنا پر، جھٹلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے کان اور آنکھیں کھولنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ متکلم صرف اپنے دلائل بیان کر دینے ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ ہر دلیل کے بعد بطور تنبیہ ان کے جرم اور انجام سے ان کو آگاہ بھی کرتا رہے۔ مخاطب کے اس مزاج کی رعایت ملحوظ نہ رکھی جائے تو جس طرح مریض کے مزاج سے ناواقف معالج کی دوا بے اثر رہ جاتی ہے اسی طرح مخاطب کے مزاج سے ناآشنا متکلم کا کلام بھی بے اثر ہو کے رہ جاتا ہے۔ مخاطبوں کے مزاج کا اختلاف ایک امر فطری ہے اس وجہ سے اس کا لحاظ بلاغتِ کلام کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ جو لوگ اس نکتہ سے ناآشنا ہیں وہ قرآن کی اس نوع کی ترجیعات کو تکرار پر محمول کرتے ہیں حالانکہ کلام کے

---

[1] جس عذاب کی تمھیں وعید سنائی جا رہی ہے وہ سچی ہے اور جزاء و سزا ایک امر شدنی ہے۔

[2] تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی۔

ادا شناس جانتے ہیں کہ قرآن میں ہر ترجیع اپنے محل میں انگشتری پر نگینہ کا حسن رکھتی ہے۔

سابق سورہ سے اس کے تعلق کی نوعیت یہ ہے کہ اس میں استدلال کی اصل بنیاد نفسِ انسانی کی شہادت پر ہے۔ فطرت کے اندر خیر و شر کے درمیان امتیاز کی جو صلاحیت ودیعت ہے اس کی اساس پر جزاء و سزا کو ثابت کر کے ایک روزِ جزا سے ان لوگوں کو ڈرایا گیا ہے جو اس بدیہی حقیقت کو جھٹلائیں اور ان لوگوں کو بشارت دی گئی ہے جو اپنے باطن کی گواہی قبول کریں اور اپنی زندگیاں اس کے تقاضوں کے مطابق سنواریں۔ اس سورہ میں اصل استدلال آفاق کے آثار و شواہد سے ہے۔ کسی انفسی دلیل کا حوالہ ہے تو محض اشارۃً۔ گویا نوعیتِ استدلال دونوں میں الگ الگ ہے، موضوع کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ مزاج میں یہ فرق بالکل واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ سابق میں بشارت کا پہلو نمایاں ہے اور اس میں انذار کا۔ اس کی سب سے بڑی شہادت اس کی ترجیع سے ملتی ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱-۷) ہواؤں کے عجائبِ تصرفات کی شہادت اس بات پر کہ لوگوں کو جس عذابِ دنیا اور عذابِ آخرت سے ڈرایا جا رہا ہے وہ کوئی اَن ہونی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب چاہا اپنی ہواؤں اور بادلوں ہی کے ذریعہ سے پچھلی قوموں کو یہ کرشمہ دکھایا ہے اور جب چاہے گا قریش کو بھی یہ کرشمہ دکھا دے گا۔ اگر وہ سلامتی چاہتے ہیں تو خدا کی رحمت اور نقمت کے جو آثار ان کے آگے پیچھے موجود ہیں ان سے سبق حاصل کریں۔ خود اپنے لیے اس کو دعوت دینے کی جسارت نہ کریں۔

(۸-۱۵) ہولِ قیامت کی اجمالی تصویر جس میں یہ دکھایا ہے کہ اس آسمان و زمین کی بڑی سے بڑی چیز بھی غیر فانی اور اٹل نہ سمجھو، نہ کوئی شے بذاتِ خود قائم ہے نہ خود مختار ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے قائم اور اسی کے اذن سے حرکت و عمل کرتی ہے۔ ایک دن آئے گا کہ اللہ تعالیٰ آسمان و زمین کے سارے نظام کو درہم برہم کر دے گا۔ اسی دن رسولوں اور ان کی قوموں کے مقدمے کی روبکاری ہے۔ یہ دن بڑا ہی اہم دن ہو گا۔ اسی دن فیصلہ ہو گا کہ رسولوں نے لوگوں کو کیا بتایا اور ان کی قوموں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس دن ان لوگوں کی تباہی ہے جنھوں نے رسولوں کی تکذیب کی۔

(۱۶-۱۹) قریش کے سامنے تاریخ ماضی کا درس سوالیہ صورت میں کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے اگلی قوموں کو ہلاک کیا اور بعد میں آنے والی قوموں میں سے بھی جنھوں نے ان کی روشِ بد کی تقلید

کی۔ ہم نے ان کو بھی انہی کے پیچھے چلتا کیا؛ اگر یہ واقعہ ہے اور اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو آخر آج کے مجرموں کے معاملے میں ہماری یہ سنتِ متواتر کیوں بدل جائے گی۔

(۲۰ - ۲۴) انسان کے وجود اور اس کی خلقت کے مراحل سے اللہ تعالیٰ کی قدرت، ربوبیت اور اس کی حکمت کی طرف اشارہ جس سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ انسان کا اپنا وجود شاہد ہے کہ اس کے خالق کے لیے اس کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ ایسا ضرور ہو گا اور اس دن ان لوگوں کی خرابی ہے جو اس کی تکذیب پر اڑے ہوئے ہیں۔

(۲۵ - ۲۸) جو جیتے ہیں اور جو مرتے ہیں وہ خدا ہی کی پیدا کی ہوئی زمین پر جیتے اور مرتے ہیں۔ اسی کے اندر خدا نے ان کی پرورش کا سامان بھی مہیا کیا ہے۔ نہ خدا کے احاطۂ قدرت سے کوئی باہر ہے نہ اس کی پرورش سے کوئی مستغنی۔ یہ صورتِ حال شہادت دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک دن سب کو ضرور جمع کرے گا۔ اس دن ان لوگوں کے لیے خرابی ہے جنھوں نے اس کی قدرت و ربوبیت کی شان نہیں پہچانی اور دنیا کی سرمستیوں میں کھوئے روزِ جزا و سزا کو جھٹلاتے رہے۔

(۲۹ - ۳۴) اس عذاب کی تصویر جس سے ان مکذّبین کو آخرت میں سابقہ پیش آنا ہے۔

(۳۵ - ۴۰) مکذّبین کی بے بسی و بے کسی کی تصویر۔

(۴۱ - ۴۵) اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کی فائز المرامی کی تصویر۔

(۴۶ - ۵۰) قریش کے استکبار پر ان کو دھمکی اور ان کے ایمان سے مایوسی کا اظہار۔

سُوْرَةُ الْمُرْسَلٰتِ

مَكِّيَّةٌ ——— آیات: ۵۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ﴿۱﴾ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ﴿۲﴾ وَّالنّٰشِرٰتِ آیات ۱-۵۰
نَشْرًا ﴿۳﴾ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ﴿۴﴾ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ﴿۵﴾ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ﴿۶﴾
اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ﴿۷﴾ فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ﴿۸﴾ وَاِذَا السَّمَآءُ
فُرِجَتْ ﴿۹﴾ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ﴿۱۰﴾ وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ﴿۱۱﴾
لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ﴿۱۲﴾ لِيَوْمِ الْفَصْلِ ﴿۱۳﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ﴿۱۴﴾
وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۵﴾ اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ
الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۹﴾
اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴿۲۰﴾ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۲۱﴾ اِلٰى
قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۲﴾ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ
لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۴﴾ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ﴿۲۵﴾ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ﴿۲۶﴾
وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿۲۷﴾
وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۹﴾
اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿۳۰﴾ لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ

اللَّهَبِ ﴿٣١﴾ إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ﴿٣٢﴾ كَأَنَّهُ جِمَالَتٌ صُفْرٌ ﴿٣٣﴾
وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ﴿٣٤﴾ هَٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُونَ ﴿٣٥﴾ وَلَا
يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ ﴿٣٦﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ﴿٣٧﴾ هَٰذَا
يَوْمُ الْفَصْلِ ۖ جَمَعْنَاكُمْ وَالْأَوَّلِينَ ﴿٣٨﴾ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ
فَكِيدُونِ ﴿٣٩﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ﴿٤٠﴾ إِنَّ الْمُتَّقِينَ ع ۱ ۲۱
فِي ظِلَالٍ وَعُيُونٍ ﴿٤١﴾ وَفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُونَ ﴿٤٢﴾ كُلُوا وَاشْرَبُوا
هَنِيئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٤٣﴾ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿٤٤﴾
وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ﴿٤٥﴾ كُلُوا وَتَمَتَّعُوا قَلِيلًا إِنَّكُمْ
مُجْرِمُونَ ﴿٤٦﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ﴿٤٧﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ
ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ ﴿٤٨﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ﴿٤٩﴾ فَبِأَيِّ
حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ ﴿٥٠﴾ ع ۲ ۱۰ ۲۲

ترجمۂ آیات ۱ - ۵۰

شاہد ہیں ہوائیں جن کی باگ چھوڑ دی جاتی ہے پس وہ اڑاتی ہیں غبار اندھا دھند اور شاہد ہیں ہوائیں پھیلانے والی (بادلوں کو)۔ پھر وہ معاملہ کرتی ہیں جدا جدا۔ پھر ڈالتی ہیں یاد دہانی اتمامِ حجت کے طور پر یا آگاہ کر دینے کو۔ بے شک جو وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ شدنی ہے۔ ۱ - ۷

پس جب کہ ستارے بے نشان کر دیے جائیں گے، آسمان پھٹ جائے گا، پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے اور رسولوں کے لیے وقت مقرر ہو گا ـــــ کس دن کے لیے وہ ٹالے گئے ہیں! ـــــ فیصلہ کے دن کے لیے! اور تم کیا سمجھے کیا ہے فیصلہ

کا دن! تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی! ۸ - ۱۵

کیا ہم نے اگلوں کو ہلاک نہیں کیا؟ پھر ان کے پیچھے پچھلوں کو نہیں لگاتے رہے ہیں؟ ہم مجرموں کے ساتھ یہی معاملہ کرتے ہیں۔ ہلاکی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے! ۱۶ - ۱۹

کیا ہم نے تم کو ایک حقیر پانی سے نہیں پیدا کیا؟ پس ہم نے اس کو رکھا ایک محفوظ مقام میں۔ ایک معین مدت تک۔ پس ہم نے اس کو ٹھہرایا اور ہم کیا ہی خوب ٹھہرانے والے ہیں! خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی! ۲۰ - ۲۴

کیا ہم نے زمین کو سمیٹ رکھنے والی نہیں بنایا زندوں اور مردوں کو؟ اور گاڑے اس میں پہاڑ اونچے اونچے اور پلایا تم کو پانی خوش گوار؟ —— ہلاکی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے! ۲۵-۲۸

چلو اس کی طرف جس کو جھٹلاتے رہے ہو۔ چلو تین شاخوں والے سایہ کی طرف۔ جس میں نہ چھاؤں ہے نہ شعلوں کی لپیٹ سے بچاؤ۔ وہ آگ اونچے محلوں کی طرح شعلے پھینکتی ہو گی —— زرد اونٹوں کی مانند —— اس دن جھٹلانے والوں کی خرابی ہے! ۲۹ - ۳۴

وہ دن منہ سے بات نکالنے کا نہ ہو گا اور نہ ان کو اجازت ہو گی کہ کوئی عذر پیش کر سکیں۔ اس دن جھٹلانے والوں کی تباہی ہے! ۳۵ - ۳۷

یہ ہے فیصلہ کا دن۔ ہم نے تم کو بھی اور اگلوں کو بھی جمع کر لیا۔ تو تمھارے پاس کوئی داؤ ہے تو وہ ہم سے کر دیکھو۔ اس دن جھٹلانے والوں کی تباہی ہے! ۳۸ - ۴۰

بے شک اللہ سے ڈرنے والے سایوں، چشموں اور اپنی چاہت کے میووں کے عیش میں ہوں گے۔ کھاؤ پیو راس آتا اپنے اعمال کے صلہ میں۔ ہم خوب کاروں کو اسی طرح صلہ دیتے ہیں۔ اس دن ہلاکی ہے جھٹلانے والوں کے لیے! ۴۱ - ۴۵

تم بھی کچھ دن کھا برت لو، تم تو ہو گنہگار۔ اس دن تباہی ہے جھٹلانے والوں کے لیے۔ ۴۶ - ۴۷

اور جب ان کو کہا جاتا ہے کہ اپنے رب کے آگے جھکو تو نہیں جھکتے۔ اس دن جھٹلانے والوں کی تباہی ہے۔ ۴۸ - ۴۹

اب اس کے بعد وہ بھلا کس چیز پر ایمان لائیں گے!! ۵۰

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا (۱)

'مُرْسَلٰتٌ' کے معنی چھوڑی ہوئی کے ہیں۔ یہ لفظ یہاں ہواؤں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اس سے ملائکہ کو بھی مراد لیا ہے لیکن بعد کی صفات، جیسا کہ واضح ہوگا، اس سے ابا کرتی ہیں۔ اس خیال کی بنیاد صرف اس غلط فہمی پر ہے کہ یہاں 'وَ' قسم کے لیے ہے اور عام خیال کے مطابق قسم کسی مقدس چیز کی ہونی چاہیے اس وجہ سے انھوں نے 'مُرْسَلٰتٌ' سے فرشتوں کو مراد لیا۔ لیکن ہم جگہ جگہ تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ قرآن میں قسمیں بیشتر شہادت یعنی دعوے پر دلیل کی نوعیت کی ہیں۔ یہ قسم بھی اسی نوع کی ہے جس طرح سورۂ ذاریات میں ہواؤں کی قسم عذاب اور جزاء و سزا کے حق ہونے پر کھائی گئی ہے اسی طرح یہ قسم بھی وعدۂ عذاب و قیامت کے شُدنی ہونے پر کھائی گئی ہے۔

عذاب کے شدنی ہونے پر شہادت

لفظ 'عُرْفٌ' گھوڑے کی ایال کے بالوں کے لیے آتا ہے جو پیشانی پر لٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس معنی کے لیے یہ ایک معروف لفظ ہے۔ امرؤ القیس کا مشہور شعر ہے:

نمش باعراف الجیاد اکفنا — اذا نحن قمنا عن شواء مضھّب

(جب ہم شکار کا کچا پکا گوشت کھا کر اٹھتے تو گھوڑوں کی ایال میں اپنے ہاتھ پونچھ لیتے)

گھوڑوں کی ایال پکڑ کر ان کو روکا بھی جا سکتا ہے اور اس کو چھوڑ کر ان کو جولانی کے لیے چھوڑا بھی جا سکتا ہے۔ آیت میں ہواؤں کو گھوڑوں سے اور ان کے آزاد کرنے کو ان کی ایال چھوڑ دینے سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ تعبیر نہایت بلیغ ہے۔ اس سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ہوائیں نہ خود کار ہیں نہ خود مختار بلکہ ان کی پیشانی خدا کی مٹھی میں ہے۔ جب وہ چاہتا ہے ان کو روک لیتا ہے اور جب چاہتا ہے چھوڑ دیتا ہے۔ فرمایا ہے: مَا مِنْ دَآبَّۃٍ اِلَّا ھُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِھَا (ھود - ۱۱: ۵۶) (نہیں ہے کوئی جاندار مگر وہ اس کی پیشانی کے بال کو پکڑے ہوئے ہے)۔

فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا (۲)

'عَصْفٌ' کے معنی تُند و تیز اور اندھا دھند چلنے کے ہیں۔ فرمایا ہے: حَتّٰٓی اِذَا کُنْتُمْ فِی الْفُلْکِ ج وَجَرَیْنَ بِھِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَۃٍ وَّفَرِحُوْا بِھَا جَآءَتْھَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَھُمُ الْمَوْجُ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ (یونس - ۱۰: ۲۲) (یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ ان کو لے کر چلتی ہیں موافق ہوا کے ساتھ اور وہ اس سے خوش ہوتے ہیں دفعتہً نمودار ہو جاتی ہے باد تند اور ان کو گھیر لیتی ہیں موجیں ہر جانب سے)۔

یہاں ہواؤں کا دوسرا مرحلہ بیان ہوا ہے کہ چھوڑے جانے کے بعد وہ بگٹٹ ہو کر اندھا دھند چلنے لگتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو تند ہو کر بالآخر طوفان اور عذاب بن جاتی ہیں اور قوم کی قوم کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہیں۔ ان کے عجائبِ تصرفات کی تاریخ قرآن میں تفصیل سے بیان ہو چکی ہے اور آج بھی ان کی تباہ کاریوں کے تجربات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔

وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا (۳)

ابرِ رحمت والی ہوائیں

'نَشْرٌ' کے معنی پھیلانے، چھینٹنے، ابھارنے، اگانے کے ہیں۔ یہ لفظ ان تمام معانی میں، قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں اس سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو ابرِ رحمت لاتی ہیں۔ اس لیے کہ ان میں 'نشر' کے مختلف پہلو موجود ہیں۔ یہ بادلوں کو ابھارتی ہیں، پھر ان کو فضا میں پھیلاتی ہیں، پھر اپنے رب کی رحمت کو چھینٹتی اور نباتات اگا کر زمین کو سرسبز و شاداب بناتی ہیں۔ فرمایا ہے: 'وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ' (الشوریٰ - ۴۲: ۲۸) (اور وہی ہے جو نازل کرتا ہے بارش بعد اس کے کہ لوگ اس سے مایوس ہو چکے ہوتے ہیں اور پھیلاتا ہے اپنی رحمت)۔

اوپر کی قسم تو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، طوفانی ہواؤں کی ہے اور یہ قسم ابرِ رحمت والی ہواؤں کی ہے جن پر زندگی کے قیام و بقا کا انحصار ہے۔

یہاں زبان کا یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ 'عٰصِفٰت' کو 'مُرْسَلٰت' پر 'ف' کے ساتھ عطف کر کے اس کی تدریجی ترقی کو واضح کر دیا۔ اس کے برخلاف اس آیت میں حرفِ عطف 'و' آیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ سابق کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک مستقل وصف ہے۔

فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا (۴)

ہوائیں خود مختار نہیں بلکہ مسخر ہیں

یہ وہی مضمون ہے جو سورۂ ذاریات میں 'فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے یعنی یہ ہوائیں فرق و امتیاز کرتی ہیں۔ کبھی بادلوں کو ہانک کر لاتی ہیں کبھی ان کو اڑا کر لے جاتی ہیں۔ ایک علاقہ کو جل تھل کر دیتی ہیں، دوسرے کو تشنہ چھوڑ جاتی ہیں۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یہ خود کار و خود مختار نہیں بلکہ ایک بالاتر قوت کے تابع فرمان ہیں۔ یہ فرق و امتیاز چونکہ 'نشر' کے ذریعہ سے اور اس کے بعد نمایاں ہوتا ہے اس وجہ سے عطف 'ف' کے ذریعہ سے ہوا۔

فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا (۵)

ہواؤں کی یاددہانی

یعنی بارش کے ساتھ ساتھ یہ لوگوں پر یاددہانی بھی اتارتی ہیں۔

بارش جن باتوں کی تذکیر کرتی ہے وہ قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہیں اور ان کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے۔ یہاں چند نمایاں پہلو ذہن میں تازہ کر لیجیے۔

- یہ آسمان و زمین میں توافق کے پہلو سے توحید اور اللہ ہی کی شکر گزاری کی یاد دہانی کرتی ہے۔
- اس کے اندر خدا کی ربوبیت کی جو شان ہے وہ خدا کے آگے مسئولیت کی یاد دہانی کرتی ہے۔
- مردہ زمین کو زندہ کر کے یہ بعث اور حشر و نشر کی یاد دہانی کرتی ہے۔
- کسی کے لیے رحمت اور کسی کے لیے عذاب بن کر یہ خدا کے اختیار مطلق اور اس کے عذاب و ثواب کی یاد دہانی کرتی ہے۔

عُذْرًا اَوْ نُذْرًا (۶)

یہ مقصد بیان ہوا ہے ان کرشموں کا جو ہواؤں کے تصرفات سے ہر انسان کے مشاہدے میں آتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ کرشمے اللہ تعالیٰ لوگوں پر اتمامِ حجت یا ان کو بیدار کرنے کے لیے دکھاتا ہے۔ 'اَوْ' یہاں تقسیم کے لیے ہے۔ یعنی ان لوگوں پر حجت تمام ہو جاتی ہے جو غفلت کی سرمستی میں پڑے رہنا چاہتے ہیں اور ان لوگوں کو یاد دہانی حاصل ہوتی ہے جو یاد دہانی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ سورۂ اعراف میں مصلحین کے ایک گروہ کا قول نقل ہوا ہے جس سے اس 'عُذْرًا اَوْ نُذْرًا' کی وضاحت ہوتی ہے:

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا نِ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ (الاعراف - ۷: ۱۶۴)

اور جب کہ ان سے ایک گروہ نے کہا کہ ان لوگوں کو نصیحت کرنے سے کیا فائدہ جن کو اللہ تعالیٰ یا تو ہلاک کر دینے والا ہے یا ایک سخت عذاب میں مبتلا کرنے والا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ تمھارے رب کے حضور معذرت کے لیے اور اس لیے بھی کہ شاید وہ ڈریں۔

یعنی یہ لوگ اگر ہماری نصیحت نہ مانیں گے تو ہم اپنے فرض نصیحت سے سبکدوش ہو جائیں گے، ہم پر کوئی ذمہ داری عند اللہ باقی نہیں رہے گی۔ پھر ذمہ داری ان کی ہو گی اور یہ قیامت کے دن اپنی گمراہی کے لیے کوئی عذر نہ پیش کر سکیں گے اور اگر ہماری بات مان کر اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے بن گئے تو یہی مقصود ہے۔ یہ چیز ان کے لیے بھی باعث برکت و رحمت ہو گی اور ہمارے لیے بھی۔

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ (۷)

قسموں کا مقصود

یہ مذکورہ قسموں کا مقسم علیہ ہے۔ فرمایا کہ جس بات کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ واقع ہو کے رہے گی۔ 'تُوْعَدُوْنَ' یہاں عام ہے، اس میں وعدہ اور وعید دونوں شامل ہے لیکن یہ سورہ، جیسا کہ ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں، انذار کی ہے اس وجہ سے یہاں وعید کا پہلو غالب ہے۔ یعنی جس عذاب اور قیامت سے تمھیں ڈرایا جا رہا ہے وہ اٹل ہے، اس سے تمھیں سابقہ پیش آ کے رہے گا۔

عذاب اور قیامت پر ہواؤں کے تصرفات کی شہادت گوناگوں پہلوؤں سے پچھلی سورتوں میں بیان

ہو چکی ہے تفصیل مطلوب ہو تو سورۂ ذاریات کی تفسیر پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے عذاب اور قیامت کے مکذبین کو ہواؤں کے تصرفات کی طرف توجہ دلا کر متنبہ فرمایا ہے کہ اپنی قوت و سطوت پر زیادہ نازنہ فرماؤ۔ اللہ عذاب لانا چاہے تو اسے کوئی بڑا اہتمام نہیں کرنا ہے۔ جس ہوا کی لائی ہوئی بارش سے جیتے ہو اسی کے پیچ ذرا سے ڈھیلے چھوڑ دے تو چشم زدن میں تمہاری ہستی کا نام و نشان ہی مٹ جائے۔ اس دنیا میں کتنی ہی قومیں گزری ہیں جن کو ہوا ہی نے خس و خاشاک کی طرح اڑا دیا۔

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۙ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۙ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ (۸-۱۰)

قیامت کی ہلچل کی تصویر

ان آیتوں میں قیامت کی ہلچل کی تصویر ہے کہ اس دن اس کائنات کی وہ چیزیں جو بہت عظیم، بڑی ہی پرشوکت اور بالکل غیر فانی اور لازوال نظر آتی ہیں اور جن کو دیکھ کر تم گمان کرتے ہو کہ بھلا ان کو ان کی جگہ سے کون ہلا سکتا ہے وہ بالکل بے نشان اور بے حقیقت ہو کے رہ جائیں گی۔ ہواؤں کے لائے ہوئے طوفانوں سے بڑے بڑے شہروں، محلوں اور قلعوں کو جس طرح بے نشان ہوتے دیکھا ہے اسی طرح اس دن ایسی ہلچل برپا ہو گی کہ ستارے بے نشان ہو جائیں گے، آسمان پھٹ جائے گا اور زمین کے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔

'طمس' کے معنی کسی چیز کو مٹا دینے اور بے نشان کر دینے کے ہیں، فرمایا ہے: 'مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَآ' (النساء ۴: ۴۷) (قبل اس کے کہ ہم چہروں کو مٹا دیں اور ان کو ان کے پیچھے پھیر دیں)۔ 'فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ' کے معنی ہوں گے، پس جب کہ ستارے بے نور اور بے نشان کر دیے جائیں گے۔ یہی بات دوسرے مقام میں 'وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ' (التکویر ۸۱: ۲) اور 'وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ' (الانفطار ۸۲: ۲) کے الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔

'وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ' یعنی یہ آسمان جس میں کہیں کسی شگاف اور دراڑ کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی، جو بالکل ٹھوس اور محکم نظر آتا ہے قیامت کے دن پھٹ جائے گا۔ قرآن کے دوسرے مقام میں فرمایا ہے: 'وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا' (اور آسمان کھول دیا جائے گا تو وہ دروازے دروازے بن کے رہ جائے گا)۔ سورۂ انفطار میں فرمایا ہے: 'اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ' (الانفطار ۸۲: ۱) (اس دن کو یاد رکھو جس دن آسمان پاش پاش ہو جائے گا)۔

'وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ'۔ 'نسف' کے معنی ریزہ ریزہ کر دینے، پیس دینے، پراگندہ کر دینے کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ متعدد مقامات میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً 'وَانْظُرْ اِلٰۤى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا' (طٰہٰ ۲۰: ۹۷) (اور اپنے اس دیوتا کو جس پر تو معتکف رہا ہے، دیکھ، ہم اس کو جلائیں گے پھر اس کو ریزہ ریزہ کر کے سمندر میں بکھیر دیں گے)۔

خود پہاڑوں سے متعلق، منکرینِ قیامت کے سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا گیا ہے: وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا ۝ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا (طٰهٰ ۲۰: ۱۰۵-۱۰۶) (اور وہ تم سے پہاڑوں کی بابت سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو، میرا رب ان کو ریزہ ریزہ کر دے گا اور زمین کو صفا چٹ چھوڑ دے گا)۔ بعض مقامات میں یہ بات بھی فرمائی گئی ہے کہ قیامت کے دن پہاڑ تودۂ ریگ (کثیب مہیل) اور سراب کے مانند ہو جائیں گے۔

اوپر کی دو آیتوں میں آسمان کا حشر بیان ہوا تھا، اس آیت میں زمین پر جو کچھ گزرے گی اس کی طرف اشارہ ہے۔ زمین کی چیزوں میں استحکام اور وسعت و عظمت کے اعتبار سے، سب سے زیادہ اونچا درجہ پہاڑوں ہی کا ہے۔ چنانچہ کفار قیامت کا مذاق اڑاتے تو یہ سوال بھی کرتے کہ قیامت آئے گی تو ان پہاڑوں کا کیا بنے گا، کیا ان کو بھی وہ توڑ پھوڑ دے گی! یہاں پہاڑوں کا انجام بیان کر کے گویا اس پوری زمین کا حشر بیان کر دیا کہ جب پہاڑوں پر، جن کو لوگ اٹل خیال کرتے ہیں یہ گزرے گی تو دوسری چیزوں کا جو حال ہو گا اس کے بیان کی ضرورت نہیں ہے۔

وَإِذَا الرُّسُلُ أُقِّتَتْ (۱۱)

رسولوں اور ان کی قوموں کے مقدمہ کی روبکاری

یہ اس اصل ہولناکی کا بیان ہے جس کی تمہید کے طور پر اوپر کی ہولناکیاں بیان ہوئی ہیں یعنی اس دن رسولوں کے لیے وقت مقرر ہو گا۔ ان کے لیے وقت مقرر کرنے سے مقصود ظاہر ہے کہ یہی ہے کہ ایک مقررہ وقت پر وہ دربارِ الٰہی میں حاضر ہو کر اپنی قوموں کی موجودگی میں یہ بتائیں کہ جس فریضۂ انذار پر وہ مامور کیے گئے تھے وہ انھوں نے انجام دیا یا نہیں؟ اگر انجام دیا تو قوموں نے ان کو کیا جواب دیا؟ قرآن کے دوسرے مقامات میں رسولوں کے اس مقصد کے لیے جمع اور بارگاہِ الٰہی میں ان کی قوموں کے رویے سے متعلق سوال کیے جانے اور ان کے گواہی دینے کا ذکر تفصیل سے ہوا ہے۔ سورۂ مائدہ کی آیت ۱۰۹ يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَا أُجِبْتُمْ ۖ قَالُوا لَا عِلْمَ لَنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ کے تحت ہم اس کی تفصیل پیش کر چکے ہیں۔ یہاں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ اس دن رسولوں اور ان کی قوموں کے مقدمہ کی روبکاری ہو گی۔ اللہ تعالیٰ رسولوں کی حاضری کے لیے بھی وقت مقرر فرمائے گا اور ان کی قوموں کی حاضری کے لیے بھی سمن جاری ہو گا۔ مزید تفصیل مطلوب ہو تو سورۂ اعراف کی آیت ۶-۷ کی تفسیر پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

فیصلہ کے دن کی اہمیت

'أُقِّتَتْ' دراصل 'وُقِّتَتْ' کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ عربی زبان میں الفاظ کے اندر اس طرح کا تصرف ہو جایا کرتا ہے۔ 'الرُّسُلُ أُقِّتَتْ' کے معنی ہوں گے رسولوں کے لیے وقت مقرر کیا جائے گا۔ یہ اسی طرح کا اسلوب ہے جس طرح کہتے ہیں 'ابغني خادمًا' یعنی ابغ لي خادمًا۔

لِأَيِّ يَوْمٍ أُجِّلَتْ ۝ لِيَوْمِ الْفَصْلِ (۱۲-۱۳) جب اس دن کے ذکر تک بات پہنچ گئی تو اس کی

عظمت و ہیبت کے بیان کے لیے یہ سوال مخاطبوں کے سامنے رکھ دیا کہ کچھ سمجھے کہ کس عظیم دن پر ہم نے ان رسولوں کی پیشی کو ٹالا ہے! اس کے بعد خود ہی جواب دیا ہے کہ نہ جانتے ہو تو کان کھول کر سن لو کہ 'لِیَوْمِ الْفَصْلِ' فیصلہ کے دن پر ٹالا ہے یعنی وہ دن ہماری عدالت کا دن ہوگا۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الْفَصْلِ (۱۴)

یہ اسلوبِ کلام، جیسا کہ جگہ جگہ ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ کسی چیز کی عظمت و ہیبت کے اظہار کے لیے آتا ہے۔ جس طرح 'لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ' کے سوال سے اس کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے اسی طرح اس سوال سے اس دن کے فیصلہ کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ گویا اس کی عظمت دو بار یاد دلا دی گئی۔

وَیْلٌ یَّوْمَىٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ (۱۵)

یہ اس دن کے فیصلہ کے نتیجے کا بیان ہے کہ اس دن ان لوگوں کی تباہی ہے جو اس کے جھٹلانے والے بنے رہے!

زبان کا ایک اسلوب　یہ آیت، جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں، اس سورہ میں بار بار آئے گی اور ہر جگہ اپنے ماسبق سے گہرے ربط کے باوصف، اس کی حیثیت بالکل مستقل ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو اس شرط کا جواب قرار دیا ہے جو اوپر مذکور ہوئی ہے لیکن یہ رائے عربیت کے خلاف ہے۔ اگر یہ جواب شرط کے محل میں ہوتی تو اس پر 'ف' آتی (الّا آنکہ جواب جملۂ فعلیہ یا ظرفیہ ہو) مثلاً فرمایا ہے: 'فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ ۝ فَذٰلِكَ یَوْمَىٕذٍ یَّوْمٌ عَسِیْرٌ' (المدثر ۷۴: ۸-۹) دوسرے مقام میں ہے: 'یَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۝ وَّتَسِیْرُ الْجِبَالُ سَیْرًا ۝ فَوَیْلٌ یَّوْمَىٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ' (الطور ۵۲: ۹-۱۱) اس قاعدے کی وضاحت ہم نے اس لیے ضروری سمجھی کہ اس جملہ کو جوابِ شرط مان کر اس کی تاویل کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس کی تاویل صحیح نہیں ہوگی۔ آگے اس کے مواقع پر اس کی وضاحت ان شاء اللہ ہو جائے گی۔ یہاں جوابِ شرط محذوف ہے جس طرح 'اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۝ وَاَلْقَتْ مَا فِیْهَا وَتَخَلَّتْ ۝ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝ یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ' (الانشقاق ۸۴: ۱-۶) میں محذوف ہے۔ جواب کے محذوف ہونے ہی کی وجہ سے یہ آیت اتنے گوناگوں پہلوؤں کی جامع بن گئی ہے کہ اس سورہ کے تقریباً ہر پیرے کے بعد یہ آئی ہے اور ہر جگہ اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔

اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِیْنَ ۝ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِیْنَ ۝ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِیْنَ ۝ وَیْلٌ یَّوْمَىٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ (۱۶-۱۹)

دعوے کی تائید میں آفاقی شواہد　یہ اسی دعوے کی تائید میں جو 'اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ' (۷) کے الفاظ میں اوپر مذکور ہوا، تاریخ کے آفاقی شواہد کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے تمھارے اگلوں کو ہلاک کیا اور

انھی کے پیچھے ان کے بعد والوں کو بھی لگاتے رہے ؟ یہ اشارہ ظاہر ہے کہ قومِ نوح، عاد اور ثمود اور ان کے بعد آنے والی ان قوموں کی طرف ہے جن کی سرگزشتیں تفصیل سے قرآن میں بیان ہوئی ہیں مثلاً قومِ لوط، مدین اور قومِ فرعون وغیرہ ۔ مطلب یہ ہے کہ جب تاریخ مسلسل اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ جن قوموں نے رسولوں اور ان کے انذار کی تکذیب کی ہم نے ان کو ہلاک کر دیا تو آخر انھی کی روش پر چلنے والے آج کے مجرموں کے باب میں ہماری سنت کیوں بدل جائے گی !

ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِیْنَ: میں میرے نزدیک فعل ناقص محذوف ہے۔ اس حذف کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگلوں کے بعد ان کی روش کی تقلید کرنے والے پچھلوں کو بھی ہم برابر ان کے پیچھے لگاتے رہے ہیں۔ سنتِ الٰہی کا یہ تسلسل اس بات کی دلیل ہے کہ اس متواتر سنت میں کسی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہی پہلے ہوا ہے اور یہی آئندہ ہوگا اور یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اللہ کے رسول نے جس فیصلہ کے دن یعنی آخرت سے لوگوں کو ڈرایا ہے وہ بھی لازماً ظہور میں آکے رہے گا۔

کَذٰلِکَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِیْنَ: اگرچہ یہ ایک کلیہ بیان ہوا ہے کہ ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کرتے آئے ہیں اور ایسا ہی کریں گے لیکن اس میں خاص طور پر قریش کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ہم یہی معاملہ ان کے ساتھ بھی کریں گے۔ اگر یہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے اور قیامت کے دن جو حشر تمام مجرموں کا ہوگا وہی حشر ان کا بھی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون سب کے لیے یکساں ہے۔

اس کے بعد وہی ترجیع والی آیت ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔ اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔ لفظ 'وَیْلٌ' نے یہاں عذاب کی ان تمام قسموں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے جن سے مجرموں کو اس دن سابقہ پیش آئے گا اور جن کی تفصیل قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ ایک مختصر لفظ ہے لیکن اس کے اختصار و ابہام کے اندر جو ہولناکی مضمر ہے وہ بڑی سے بڑی تفصیل کے اندر بھی نہیں سما سکتی۔

اَلَمْ نَخْلُقْکُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ۝ فَجَعَلْنٰهُ فِیْ قَرَارٍ مَّکِیْنٍ ۝ اِلٰی قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ۝ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ (۲۰-۲۴)

ایک انفسی دلیل

اوپر کی دلیل آفاقی تھی۔ اسی دعوے پر انسان کی خلقت سے یہ انفسی دلیل پیش کی گئی ہے۔ انسان کی خلقت سے قرآن نے قیامت پر متعدد پہلوؤں سے دلیل قائم کی ہے۔ مثلاً

- مٹی اور پانی کی ایک بوند سے اس کی پیدائش کا حوالہ دے کر امکانِ بعث اور امکانِ حشر و نشر کو ثابت کیا ہے۔
- اس کی خلقت کے اندر خدا کی قدرت، حکمت اور صنعت گری کے جو شواہد نمایاں ہیں ان سے جزا اور سزا کے لازم ہونے پر استدلال کیا ہے۔
- انسان کی پرورش کے لیے اس نے جو اہتمام فرمایا ہے اس سے بھی جزا اور سزا کے لزوم پر دلیل

قائم کی ہے۔

انسان کے اندر خیر و شر کے امتیاز کی جو صفت ودیعت فرمائی ہے اس سے ایک روزِ عدل کے لازمی ہونے پر دلیل پیش کی ہے۔

یہ مطالب یوں تو پورے قرآن میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن دور جانے کی ضرورت نہیں۔ اگر قریب ہی کی دو سورتوں ـــــــ القیٰمۃ اور الدھر ـــــــ کے مطالب پر آپ ایک نظر ڈال لیں تو ان تمام نکات کے شواہد آپ کو مل جائیں گے۔

منکرینِ قیامت کے شبہ کا جواب

'اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۙ فَجَعَلْنٰهُ فِىْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۙ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ'۔ یہ منکرینِ قیامت کے اس شبہ کا جواب ہے جو مرکھپ اور مرگل جانے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے سے متعلق وہ ظاہر کرتے۔ ان کو براہِ راست مخاطب کر کے فرمایا کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے حقیر پانی کی ایک بوند سے تم کو پیدا کیا ہے؛ مطلب یہ ہے کہ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا تو جب تم خود اپنے وجود کے اندر علانیہ مشاہدہ کرتے ہو کہ تمھارے خالق نے حقیر پانی کی ایک بوند کو انسان بنا کے کھڑا کر دیا تو تمھارے مرکھپ جانے کے بعد اگر وہ تمھیں ازسرِنو پیدا کرنا چاہے تو یہ کام اس کے لیے کیوں ناممکن یا مشکل ہو جائے گا۔ پہلی بار پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا دوسری بار!

'مَّهِيْنٍ' کے معنی حقیر و ناچیز کے ہیں۔ اس صفت کے لانے سے مقصود ایک تو یہ دکھانا ہے کہ انسان کی تخلیق کسی ایسے میٹریل سے نہیں ہوئی ہے جو نادر الوجود یا کمیاب ہو کہ اس کو دوبارہ پیدا کرنا ناممکن یا دشوار ہو جائے۔ وہ ایک بے قیمت اور حقیر چیز سے پیدا ہوا ہے جس کا نہایت وافر ذخیرہ قدرت کے پاس موجود ہے۔ دوسرے اس سے خالق کی عظیم و بے نہایت قدرت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ جو خدا پانی کی ایک بوند کو انسان بنا دے سکتا ہے اس کے لیے کوئی کام مشکل نہیں ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

'فَجَعَلْنٰهُ فِىْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ'۔ یہ ان حیرت انگیز تصرفات کی طرف اشارہ ہے جو اس حقیر قطرے کو گھر بنانے پر قدرت صرف کرتی ہے۔ فرمایا کہ ہم اس کو ایک محفوظ و مامون جائے قرار میں رکھواتے ہیں۔

'قَرَارٍ' سکون اور جائے سکون دونوں معنوں میں آتا ہے۔ یہاں یہ جائے قرار کے معنی میں ہے اور اشارہ اس سے رحم کی طرف ہے جس کو قدرت نے خاص اسی مقصد کے لیے ایک گوشۂ مامون بنایا ہے۔ لفظ 'مَكِيْنٍ' جب جگہ کی صفت کے لیے آتا ہے تو اس سے ایسی جگہ مراد ہوتی ہے جو اندیشوں، خطرات اور مداخلتِ غیر مطلوب سے بالکل محفوظ و مامون ہو۔

'اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ' یعنی ایک معین وقت تک ہم اس کو ایک محفوظ گوشہ میں رکھواتے ہیں تاکہ جو صلاحیتیں اس کے اندر پیدا کرنی مقصود ہیں وہ اپنے لیے جگہ بنا لیں۔ پھر یہ ہماری ہی قدرت و حکمت ہے

کہ اس مدتِ معین کے بعد اس کو اس گوشۂ مامون سے باہر لاتے ہیں۔

'فَقَدَرْنَا ﷺ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ'۔ میرے نزدیک اس میں پہلا لفظ 'قدر' سے ہے اور دوسرا قدرت سے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے عجائبِ قدرت کی ان نشانیوں کی طرف توجہ دلا کر فرمایا کہ دیکھ لو، انسان کی پیدائش میں ہم نے اپنے کیا کیا کرشمے دکھائے ہیں اور ہم کتنی اعلیٰ اور برتر قدرت رکھنے والے ہیں! مطلب یہ ہے کہ جب ہماری قدرت کی یہ اعلیٰ شانیں انسان کی خلقت میں ظاہر ہیں تو ہم اس کو دوبارہ پیدا کرنا چاہیں گے تو اس سے کیوں عاجز رہ جائیں گے!

اس کے بعد آیت ترجیع ہے اور اس کا موقع یہ ہے کہ دوبارہ پیدا کیے جانے پر جو شبہات وارد کیے جا رہے ہیں ان کی تردید کے لیے تو خود ان کی خلقت ہی کافی ہے۔ ایک دن وہ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور وہ دن جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہی خرابی کا دن ہو گا۔ سورۂ صافات میں یہ مضمون یوں بیان ہوا ہے:

فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝ (الصّٰفّٰت - ۳۷: ۱۹-۲۱)

وہ تو بس ایک ہی ڈانٹ ہو گی کہ دفعۃً وہ تاکنے لگیں گے۔ کہیں گے ہائے ہماری بدبختی! یہ تو جزا کا دن آ گیا! ہاں یہ وہی فیصلہ کا دن ہے جس کو تم جھٹلاتے رہے تھے۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ۝ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ۝ وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۲۵-۲۸)

پرورش کا اہتمام جزا و سزا کی دلیل ہے

یہ اسی یوم الفصل پر اس اہتمامِ ربوبیت سے دلیل قائم فرمائی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی پرورش کے لیے اس دنیا میں کر رکھا ہے۔ یہ دلیل قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے اور ہم ہر جگہ اس کی وضاحت کرتے آ رہے ہیں۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی پرورش کے لیے جو اہتمام فرمایا ہے اور اس مقصد کے لیے اس نے زمین و آسمان کو جس طرح مسخر کر کے اس کی خدمت میں لگا رکھا ہے اس کا لازمی اور بدیہی تقاضا یہ ہے کہ وہ غیر مسئول اور شترِ بے مہار بنا کر نہ چھوڑے رکھا جائے بلکہ ایک ایسا دن بھی آئے جس میں اس سے پرسش ہو کہ اس نے اللہ کی نعمتوں کا حق ادا کیا یا نہیں۔ پھر جس نے ادا کیا ہو وہ انعام پائے اور جس نے ان کو طغیان و فساد کا ذریعہ بنایا ہو وہ اس کفرانِ نعمت کی سزا بھگتے۔

'اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ۝ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا'۔ 'کفت' کے معنی جمع کرنے اور اکٹھا کرنے کے ہیں۔ عربی میں 'فِعَالٌ' کا وزن اس چیز کے لیے بھی آتا ہے جس سے فعل انجام پذیر ہو اس وجہ سے 'کِفَات' کے معنی جمع کر لینے والی کے ہوں گے۔ اسی معنی کے اعتبار سے اس میں فاعل کی قوت پیدا ہو گئی

ہے اور اس کے بعد مفعول لانا جائز ہوا۔

یہ ربوبیت اور احاطہ کے دوگونہ پہلوؤں سے معاد اور روز جزا و سزا کی دلیل بیان ہوئی ہے۔ ربوبیت سے استدلال زیادہ وضاحت سے آگے والی سورہ میں ہے جو اس کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ فرمایا ہے:

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا ۝ وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا ۝ وَخَلَقْنَاكُمْ أَزْوَاجًا ۝ وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝ وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا ۝ وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝ وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝ وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا ۝ وَأَنزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا ۝ لِّنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا ۝ وَجَنَّاتٍ أَلْفَافًا ۝ إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ۝

(النبا — ۷۸: ۶-۱۷)

کیا ہم نے زمین کو گہوارہ نہیں بنایا، پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا، اور تم کو جوڑے جوڑے نہیں پیدا کیا، تمھاری نیند کو دافع کلفت نہیں بنایا، رات کو پردہ پوش اور دن کو وقت معاش نہیں بنایا اور تمھارے اوپر سات محکم آسمان نہیں بنائے اور ایک روشن چراغ نہیں بنایا اور بدلیوں سے دھڑا دھڑ پانی نہیں برسایا تاکہ اس سے اگائیں غلے اور نباتات اور گھنے باغ؟ بے شک یہ چیزیں شاہد ہیں کہ فیصلہ کا دن مقرر ہے۔

احاطہ کے پہلو کی طرف اشارہ کرنے کے لیے یہاں 'اَحْيَاءً' کے ساتھ 'اَمْوَاتًا' کا بھی ذکر فرمایا۔ یعنی یہ زمین جس طرح اپنی آغوش میں تمام زندوں کو لیے ہوئے ہے اسی طرح تمام مردوں کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ جو مرتے ہیں وہ اس کے حدود سے کہیں باہر نہیں چلے جاتے بلکہ اسی کے اندر دفن ہوتے ہیں۔ قدرت ان کو اسی زمین کی تحویل میں بطور امانت دے دیتی ہے جس کے گہوارے میں وہ پیدا ہوتے اور پلتے ہیں۔ یہ اہتمام قدرت نے اسی لیے فرمایا ہے کہ جب لوگوں کو جمع کرنے کا وقت آئے تو وہ زمین کو حکم دے کہ جو کچھ اس کی تحویل میں ہے اس کو حاضر کرے اور وہ فوراً اس حکم کی تعمیل کرے گی۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ۝ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ۝' (الانشقاق - ۸۴: ۳-۴) (اور جب کہ زمین تان دی جائے گی اور جو کچھ اس کے اندر ہے وہ اس کو باہر نکال کر فارغ ہو جائے گی)۔ اسی بات کی طرف اشارہ سورۂ زلزال میں 'وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا' (۲) کے الفاظ سے فرمایا ہے۔ ان آیات سے اس حقیقت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ جو مرتا ہے وہ کہیں ناپید نہیں ہو جاتا ہے بلکہ زمین کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جب چاہے گا اس کو اسی زمین سے، جس سے اس کو پیدا کیا، پھر اٹھا کھڑا کرے گا۔ چنانچہ سورۂ طٰہٰ میں فرمایا ہے: 'مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ' (۵۵) (اسی

زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں ہم پھر تم کو لوٹا دیتے ہیں اور پھر اسی سے تم کو دوسری بار نکالیں گے)۔

ان تمام آیات پر تدبر کی نظر ڈالیے تو ایک اور واضح تر حقیقت بھی سامنے آئے گی کہ انسان اصلاً زمین ہی کے رحم سے پیدا ہوا ہے اور جب وہ مرتا اور دفن ہوتا ہے تو گویا مرتا نہیں بلکہ اسی رحم میں واپس لوٹا دیا جاتا ہے جس سے پیدا ہوا ہے تو جب اس کا پہلی بار پیدا ہونا کسی کے نزدیک کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے تو اس کا دوسری بار پیدا ہونا کیوں تعجب انگیز ہو جب کہ بطنِ زمین میں اس کا تخم موجود ہے۔

وَجَعَلْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَیْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا۔ یہ اسی ربوبیت کے مضمون سے متعلق ہے جو اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا میں بیان ہوا ہے۔ قرآن کی متعدد آیات میں یہ اشارہ موجود ہے کہ انسان کی رہائش و پرورش کے لیے زمین کو گہوارہ بنانے میں پہاڑوں کے وجود کو بڑا دخل ہے۔ اوپر سورۂ نبا کی جس آیت کا ہم نے حوالہ دیا ہے اس میں بھی فرمایا ہے کہ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا (کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو گہوارا بنایا ہے اور اس گہوارے کو متوازن رکھنے کے لیے اس میں پہاڑوں کی میخیں ٹھونکی ہیں؟) دوسرے مقام میں اسی حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے کہ وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ (لقمان ۳۱: ۱۰) (اور اس نے زمین میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے کہ مبادا وہ تمہارے سمیت کسی جانب کو لڑھک جائے)۔

پہاڑوں کے ایک اور نفع کی طرف بھی اشارہ فرمایا جو ربوبیت کے پہلو سے بڑی اہمیت رکھنے والا ہے۔ وہ یہ کہ ان پہاڑوں کی بلندی ہواؤں اور بادلوں کو کنٹرول کرنے اور پانی کے قدرتی ذخائر جمع کرنے میں بڑی مؤثر ہے۔ انسان شیریں پانی کا محتاج ہے اور یہ نعمت مہیا کرنے کے لیے قدرت نے یہ اونچے پہاڑ بنائے ہیں جو اسی کے بنانے کے ہیں کوئی دوسرا ان کو بنانے پر قادر نہیں ہے۔

اس طرح کلام درجہ بدرجہ ایک یوم الفصل اور روزِ جزاء و سزا کے ثبوت تک خود پہنچ گیا۔ اس بات کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ الفاظ میں بھی اس کو بیان کیا جائے۔ چنانچہ اس کے ذکر کو حذف کر کے ترجیع والی آیت سامنے رکھ دی۔ فرمایا: وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ۔ یعنی جو لوگ خدا کی ربوبیت اور اس کے احاطۂ قدرت کے اتنے بدیہی شواہد کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کے دن سے نچنت اور اس کو جھٹلانے والے بنے ہوئے ہیں اس دن ان کی تباہی ہے۔

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰی مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (۲۹)

اوپر والی آیت میں آپ نے دیکھا کہ اس فیصلہ کے دن کا مشاہدہ آفاق و انفس کے آثار و شواہد

کے اندر کرایا گیا ہے۔ اب چند آیتوں میں اس کی تصویر سامنے رکھ دی گئی ہے تاکہ جو چیز نگاہوں سے اوجھل ہے اس کا مشاہدہ ایک حاضر و مشہود چیز کی طرح منکرین کر لیں۔ چنانچہ اسلوب کلام ایسا اختیار فرمایا ہے گویا وہ چیز سامنے موجود ہے اور ان کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اب تک جس چیز کو جھٹلاتے رہے ہیں اس کی طرف چلیں اور اس کا مزا چکھیں۔ فرمایا کہ چلو اس چیز کی طرف جس کو اب تک جھٹلاتے رہے ہو۔

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰی ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ (۳۰)

'اِلٰی مَا کُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ' کے الفاظ میں جو ہولناک چیز چھپی ہوئی تھی یہ اس سے پردہ اٹھایا جا رہا ہے۔ فرمایا کہ ان تین شاخوں والے سایہ کی طرف چلو۔ 'ظِلٌّ' کے معنی تو سایہ کے ہیں لیکن یہاں ظاہر ہے کہ اس سے مراد معروف سایہ نہیں بلکہ دھوئیں کا سایہ ہے۔ سورۂ واقعہ آیات ۴۳-۴۴ میں فرمایا ہے: 'وَّ ظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ ۙ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِیْمٍ' (اور سیاہ دھوئیں کا سایہ، نہ ٹھنڈا نہ نفع بخش)۔

دھوئیں کے اس سائے کی صفت 'ذی ثلث شعب' آئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھواں ان کے آگے تمام سمتوں میں پھیلا ہوا ہوگا، صرف وہی سمت اس کی آفت سے محفوظ ہوگی جس سے یہ مکذبین جیسا کہ لفظ 'اِنْطَلِقُوْٓا' سے واضح ہے، کھدیڑ دیے جائیں گے جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کے بعد ان کے لیے دھواں ہی دھواں ہوگا۔

اس ٹکڑے کی تاویل میں بعض اصحاب علم نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ کفر کی بنیادی خصلتیں تین ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ سے غفلت؛ (۲) مخلوق سے بے پروائی؛ (۳) روز جزا کا انکار۔ انہی تین خصلتوں کے مطابق عذاب کی تین شاخیں ان کی طرف بڑھیں گی اور ان کو چھا لیں گی۔ یہ نکتہ لطیف ہے لیکن یہ تینوں خصلتیں باہم دگر بالکل لازم و ملزوم بھی ہیں اور یہ تمام کفار میں مشترک بھی نہیں۔ ان کی بنیاد پر کفار کی الگ الگ درجہ بندی کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ واضح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ سمتیں بہرحال چار ہی ہوتی ہیں تو جب وہ اس سمت سے نکال دیے جائیں گے جو اس دھوئیں کے عذاب سے محفوظ ہوگی تو تین سمتیں بچ رہتی ہیں اور یہ تینوں اس دھوئیں کے احاطہ میں ہوں گی۔ گویا اس کے بعد وہ ہر طرف سے دھوئیں کے عذاب میں ہوں گے۔

'لَّا ظَلِیْلٍ وَّلَا یُغْنِیْ مِنَ اللَّهَبِ' (۳۱)

یہ برسرِ موقع ایک مغالطہ کو رفع کیا ہے جو لفظ 'ظِلٌّ' سے پیدا ہوتا ہے۔ فرمایا کہ اس سایہ میں نہ چھاؤں ہوگی نہ شعلوں کی لپیٹ سے وہ بچاؤ کرنے والا بنے گا۔ یہی بات ذرا مختلف الفاظ میں سورۂ واقعہ کی اس آیت میں فرمائی گئی ہے جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ فرمایا ہے: 'وَّ ظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ ۙ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِیْمٍ' (سیاہ دھوئیں کا سایہ، نہ ٹھنڈا نہ فیض بخش) گویا دھوئیں کے اذیت بخش پہلو تو اس کے اندر سارے ہوں گے لیکن نفع بخش پہلو، جن کی توقع ہو سکتی تھی، ان کی نفی کر دی گئی۔

اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ (۳۲)

'اِنَّهَا' میں ضمیر کا مرجع وہ آگ ہے جو دھوئیں کے ذکر سے بطور اس کے لازم کے مفہوم ہوتی ہے۔ فرمایا کہ وہ گنبد کے برابر چنگاریاں اور شعلے پھینک رہی ہوگی۔ 'قصر' کی قراءت اور معنی میں بعض لوگوں نے اختلاف کیا ہے لیکن ہم نے اپنی اس کتاب میں ہر جگہ متواتر قراءت ہی کو ترجیح دی ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں یہ محل اور گنبد ہی کے معنی میں ہے اور یہ نہایت عمدہ تشبیہ ہے آگ کے کسی بڑے الاؤ سے اٹھتے شعلوں کی۔ یہ تشبیہ شعلوں کے پھیلاؤ، ان کی بلندی اور ان کے رنگ کی دی گئی ہے۔ محل بالعموم بلند جگہوں پر بنائے جاتے ہیں۔ دور سے دیکھیے تو وہ چمکتے ہوئے نظر آئیں گے اور اوپر کا رنگ نیچے کے رنگ سے مختلف ہوگا۔

كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ (۳۳)

یہاں ضمیر کا مرجع 'شرر' ہے اور رعایت لفظ کی گئی ہے۔ 'شرر' اسم صفت ہے۔ مذکر، مونث واحد اور جمع سب کے لیے اس کا استعمال یکساں ہوتا ہے۔ یہاں یہ جمع کے مفہوم میں ہے اس لیے کہ اس کی تشبیہ جمالۃ صفر، سے دی گئی ہے۔ 'جمالۃ' اونٹوں کی جماعت کو کہتے ہیں۔ یہ تشبیہ شعلوں اور چنگاریوں کے رنگ اور ان کی بڑائی دونوں کو نمایاں کر رہی ہے۔ صفرۃ (زردی) کی قید اس لیے لگائی ہے کہ دھوئیں کی آڑ سے شعلوں کا منظر ملگجے زرد رنگ کے اونٹوں کے رنگ سے بالکل مشابہ ہوتا ہے۔

آگے وہی آیت ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔ اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے کہ جس دن اس ہولناک منظر سے سابقہ پیش آئے گا اس دن ان تکذیب کرنے والوں کی تباہی ہے۔

هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ۙ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۳۵-۳۷)

مجرموں کی بے بسی کی تصویر

روزِ قیامت کی ہولناکی کی تصویر کے بعد یہ مجرموں کی بے بسی اور درماندگی کی تصویر ہے کہ آج تو قیامت کی تکذیب میں ہر ایک آگے بڑھ بڑھ کر طلاقت لسانی کا ثبوت دے رہا ہے لیکن اس دن سب کی زبانیں گنگ ہوں گی، کسی کے منہ سے بات نہ نکلے گی۔ آگے کی سورہ میں، جو اس کی مثنیٰ ہے، فرمایا ہے: 'لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا' (النبا - ۷۸: ۳۷) (اس دن مجرمین اس سے خطاب نہ کر سکیں گے)۔

قرآن میں یہ تصریح بھی ہے کہ اس دن مجرموں کے مونہوں پر مہر کر دی جائے گی اور اللہ تعالیٰ ان کے اعضا کو ناطق بنا دے گا جو ان کے تمام جرائم کی گواہی دیں گے۔

'وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ' یعنی نہ تو وہ خود زبان کھولنے کی جرأت کریں گے اور نہ ان کو یہ اجازت ملے گی کہ ان کے پاس کوئی عذر ہو تو اس کو پیش کریں۔

'وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ' ان کی اس بے بسی کے بیان کے بعد وہی آیت ترجیع ہے اور

اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے کہ جب حال یہ ہو کہ نہ وہ خود کوئی بات زبان سے نکالنے میں پہل کر سکیں گے اور نہ ان کو کوئی عذر پیش کرنے کی اجازت ہی ملے گی تو ہلاکی اور تباہی کے سوا ان کے لیے کیا چیز باقی رہی!

هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ۝ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ۝
وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۳۸-۴۰)

یہ ان مجرموں کو براہِ راست خطاب کرکے ارشاد ہو گا کہ تم جس یوم الفصل کی تکذیب کرتے رہے تھے آج اس کی عدالت تمہارا فیصلہ سنانے کے لیے قائم ہو گئی۔ دیکھ لو، ہم نے تم کو بھی جمع کر لیا اور تمہارے اگلوں کو بھی۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ کفار جب قیامت کا مذاق اڑاتے تو یہ بھی کہتے کہ کیا جب قیامت آئے گی تو اس دن ہمارے آباء و اجداد بھی اٹھائے جائیں گے؟ وہ اس طرز پر سوال سے قیامت کو ناممکن سے ناممکن تر ثابت کرنا چاہتے کہ بھلا یہ بات کس طرح تصور کی جا سکتی ہے کہ ہمارے تمام اسلاف بھی ایک دن قبروں سے اٹھائے جائیں گے! ان کے اسی سوال کو سامنے رکھ کر فرمایا کہ 'جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ' ہم نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ کر دکھایا، تم بھی ہمارے سامنے موجود ہو اور تمہارے اگلے بھی!

'فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ'۔ یعنی دنیا میں تو تم نے ہمارے رسول کو شکست دینے کے لیے بڑی بڑی چالیں چلیں۔ اگر کوئی اور چال باقی رہ گئی ہو تو وہ بھی آزما دیکھو۔ یہاں تمہارے اگلے پچھلے سب موجود ہیں۔ اگر وہ مدد کریں تو ان کی مدد بھی حاصل کر لو۔

یہاں اس امر پر نگاہ رہے کہ رسول کے انذار کی تکذیب کے لیے کفار نے جو کوششیں کیں ان کو اللہ تعالیٰ نے 'کَیْدٌ' یعنی چال سے تعبیر فرمایا۔ اس کی وجہ جیسا کہ ہم بار بار واضح کر چکے ہیں، یہ ہے کہ اس راہ میں ان کی ساری بھاگ دوڑ محض اپنی سیادت کو بچانے کے لیے تھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات حق ہے لیکن اپنی نفس پرستی اور انانیت کے سبب سے اس کے قبول کرنے پر وہ تیار نہیں ہوئے بلکہ طرح طرح کے شبہات و اعتراضات ایجاد کر کے اپنے عوام کو انھوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ جو کر رہے ہیں دلیل کے ساتھ کر رہے ہیں اور ان کا مقصود اپنے آبائی دین کا تحفظ ہے۔ حالانکہ یہ محض ان کی چال تھی۔

'وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ' آگے وہی آیتِ ترجیع ہے جو اوپر ہر پیرے کے بعد آئی ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس مطالبہ کے بعد، جو مذکور ہوا، ان کی بے بسی ان پر بالکل واضح ہو جائے گی اور وہ اس تباہی سے دوچار ہوں گے جو اس تکذیب کے نتیجہ میں ان کے سامنے آئے گی اور جو بہت بڑی تباہی ہو گی۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ (۴۱-۴۲)

متقیوں کا انعام

اس یوم الفصل میں مجرموں کا جو فیصلہ ہوگا وہ اوپر کی آیات میں بیان ہوا کہ وہ ایک ایسی آگ کی طرف بھیجے جائیں گے جس کا دھواں ان کو ہر طرف سے گھیرے گا۔ ان کے مقابل میں ان متقیوں کا انعام اکرام بیان ہو رہا ہے کہ وہ سایوں، چشموں اور اپنی پسند کے میووں میں ہوں گے۔ اس اسلوب بیان میں جب نعمتوں کا بیان ہوتا ہے تو اس سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ یہ نعمتیں ان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہوں گی۔ قرآن میں بھی یہ اسلوب جگہ جگہ استعمال ہوا ہے اور کلام عرب میں بھی اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔

كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيٓـًٔا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (۴۳)

یہ ان کو خوش خبری دی جائے گی کہ اب چین سے کھاؤ پیو۔ تمہارا یہ کھانا پینا راس آنے والا اور ہر غل و غش سے پاک ہوگا۔ یہ تمہارے ان اعمال کا صلہ ہے جو تم نے دنیا میں کیے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ ناشکروں نے دنیا میں جو کھایا پیا وہ ان کے لیے آخرت میں راس آنے والا نہیں بنے گا بلکہ وہ ان کے لیے تباہی کا سبب ہوگا اس لیے کہ انھوں نے اس کھانے پینے کا حق نہیں ادا کیا لیکن تمہارا یہاں کھانا پینا راس آنے والا بنے گا اس لیے کہ تم اپنے حقوق و فرائض سے سبکدوش ہو کر آئے ہو۔

'هَنِيٓـًٔا' کے معنی راس آنے اور سازگار ہونے کے ہیں۔ یہ مفعول سے حال پڑا ہوا ہے جو فعل سابق سے مفہوم ہو رہا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے: 'فَكُلُوهُ هَنِيٓـًٔا مَّرِيٓـًٔا' (النسآء - ۴ : ۴) جس میں ذوالحال واضح ہے۔ ذوالحال سے حال پڑنا عربی زبان میں معروف ہے۔ مثلاً مسافر کے لیے کہتے ہیں: راشدا مهديا۔

إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (۴۴)

یہ آیت اوپر کی آیت ۱۸ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ وہاں فرمایا ہے: 'كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ' (ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتے ہیں) یہاں اس کے مقابل میں فرمایا کہ ہم خوب کاروں کو اسی طرح دیا کرتے ہیں۔ لفظ 'مُحْسِنٌ' کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔

وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ (۴۵)

یہ آیت ترجیع ہے جس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔ ایک طرف تو خوب کاروں کے لیے یہ عیش جاوداں ہوگا، دوسری طرف منکرین اس عذاب میں جھونکے جائیں گے، جس کی تفصیل اوپر بیان ہوئی۔ تصور کیجیے اس بُعد کا جو دونوں کے درمیان ہوگا! جب آمنے سامنے یہ دونوں انجام نمایاں ہوں گے تب اپنی بدبختی کا ان لوگوں کو صحیح اندازہ ہوگا جنھوں نے عیش دنیا پر ریجھ کر اس کے انجام کا اندازہ نہیں کیا۔

كُلُوا وَتَمَتَّعُوا قَلِيلًا إِنَّكُم مُّجْرِمُونَ ۝ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ (۴۶-۴۷)

قریش کے لیڈروں کو براہِ راست خطاب

یہ آخر میں قریش کے لیڈروں سے خطاب ہے۔ اوپر جو باتیں فرمائی گئی ہیں اگرچہ وہ بھی انہی کے لیے فرمائی گئی ہیں لیکن وہ اصولی رنگ میں ہیں۔ یہ ان کو براہ راست مخاطب کر کے آگاہ کیا ہے کہ اس دنیا میں جو عیش تم کو حاصل ہے اس سے اس مغالطہ میں نہ رہو کہ آخرت ہوئی تو یہی کچھ تمھیں وہاں بھی حاصل ہوگا۔ تمھارا یہ عیش چند روزہ ہے۔ آخرت کی نعمتوں سے بہرہ مند ہونے کے لیے خوب کار رہنا ضروری ہے اور تم ہو نابکار۔ مجرموں کو وہی ملے گا جس کی تفصیل سنا دی گئی۔

'وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ' یہ آیت ترجیع ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے کہ نابکاروں کے لیے اس دن بڑی تباہی ہے جس کا اندازہ اس دنیا میں نہیں کیا جا سکتا۔

وَاِذَا قِیۡلَ لَہُمُ ارۡکَعُوۡا لَا یَرۡکَعُوۡنَ ۝ وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ (۴۸-۴۹)

ان کو تنبیہ کرنے کے بعد پھر خطاب کی جگہ غائب کا اسلوب آگیا جس میں ان کو ملامت ہے کہ یہ بدبخت لوگ اپنی موجودہ رفاہیت کو اس بات کی دلیل تو بنائے بیٹھے ہیں کہ آخرت ہوئی تو وہاں بھی ان کے لیے عیش ہی عیش ہے لیکن جب ان کو اس عیش و رفاہیت کا حق ادا کرنے کے لیے خدا کے آگے جھکنے کی دعوت دی جاتی ہے تو نہیں جھکتے بلکہ اکڑتے ہیں۔ 'رکوع' سے یہاں نماز کی تعبیر فرمائی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کا سب سے اعلیٰ مظہر اور کبر و غرور کی سب سے بڑی قاطع ہے۔

اس کے بعد آیت ترجیع ہے جس کا موقع بالکل واضح ہے کہ جو بر خود غلط اپنا فرض ادا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں لیکن حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کی آرزوئیں پوری ہونے والی نہیں ہیں۔ وہ دن آنے گا کہ یہ دیکھیں گے کہ وہاں ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے!

یہاں وہ بات بھی یاد رکھیے جو سورۂ قلم میں گزر چکی ہے کہ قیامت کے دن اس طرح کے متکبرین سجدہ کرنے کے لیے بلائے جائیں گے لیکن انھوں نے دنیا کی زندگی میں سجدہ نہیں کیا اس وجہ سے اس دن بھی وہ سجدہ نہ کر سکیں گے۔ یہ چیز ثابت کر دے گی کہ یہ بھی متکبرین میں سے ہیں اس وجہ سے یہ اسی سزا کے مستحق ہیں جو متکبرین کے لیے خاص ہے۔

فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ (۵۰)

منکرین کی ہٹ دھرمی پر ملامت

یہ ان منکرین کی ہٹ دھرمی پر ملامت اور ان کے ایمان سے مایوسی کا اظہار ہے کہ جب یہ اس انذار پر ایمان نہیں لا رہے ہیں جس کو قرآن اتنے واضح دلائل کے ساتھ سنا رہا ہے تو اس کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے! مطلب یہ ہے کہ نہ کوئی چیز حسنِ استدلال میں قرآن سے بڑھ کر ہو سکتی نہ عمقِ بیان اور قوتِ تاثیر و تسخیر میں، تو جب یہ ان کی عقلوں اور ان کے دلوں پر اثر انداز نہ ہو سکا تو اس سے بڑھ کر کیا چیز ہو سکتی ہے جو اثر انداز ہو سکے گی؟ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ ان کا مرض لاعلاج ہے۔ یہ دلیل اور بیان سے سمجھنے والے لوگ نہیں ہیں بلکہ اس وقت مانیں گے جب سب کچھ آنکھوں سے دیکھ

ہیں گے لیکن اس وقت کا ماننا بے سود ہو گا۔

'بَعْدَهٗ' کا مطلب بعض لوگوں نے یہ لیا ہے کہ اس دن کے آ جانے کے بعد یہ لوگ کس چیز پر ایمان لائیں گے۔ ان کے نزدیک مدعا یہ ہے کہ اس انذار پر ایمان لانے کا نفع ہے تو آج ہے، جب وہ دن آ جائے گا تو اس دن ایمان لائے تو کیا، نہ لائے تو کیا، اس وقت تو سب ہی ایمان لائیں گے لیکن اس سے کسی کو کوئی نفع نہیں پہنچے گا۔ اگرچہ اس تاویل کا بھی احتمال ہے لیکن قرآن کے نظائر سے زیادہ واضح تائید اسی تاویل کی نکلتی ہے جو ہم نے اختیار کی ہے۔ دوسرے مقام میں فرمایا ہے: 'فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَ اللّٰہِ وَاٰیٰتِہٖ یُؤْمِنُوْنَ' (الجاثیۃ ۴۵: ۶) (اور اللہ اور اس کی آیات سے بڑھ کر اور کون سی چیز ہو سکتی ہے جس پر وہ ایمان لائیں گے)۔ احتمال اگرچہ دونوں ہی تاویلوں کی صحت کا ہے اور اصل مدعا میں بھی کچھ زیادہ بُعد نہیں ہے لیکن اس تاویل میں وسعت زیادہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اوسع واحکم۔

بتوفیق ایزدی ان سطور پر سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للّٰہ اولاً و اٰخرًا۔

رحمان آباد

۸- مارچ ۱۹۷۹ء

۸- ربیع الثانی ۱۳۹۹ھ

تدبّرِ قرآن

۷۸

النبّا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ــــــ المرسلٰت ــــــ کی توام سورہ ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ جس طرح اس میں آفاقی، تاریخی اور انفسی دلائل سے یہ حقیقت ثابت کی گئی ہے کہ اس دنیا کے بامقصد و باغایت ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ یہ ایک دن ختم ہو اور اس کے بعد ایک ایسا فیصلہ کا دن آئے جس میں نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا صلہ ملے اور جو مجرم ہوں وہ اپنے کیے کی سزا بھگتیں اسی طرح اس سورہ میں بھی ایک یوم الفصل کا اثبات فرمایا ہے جس میں خدا کے باغی اپنی سرکشی کی سزا بھگتیں گے اور خدا ترس اپنی خدا ترسی کا انعام پائیں گے۔ استدلال اس میں خدا کی ربوبیت کے آثار و شواہد سے ہے جس سے آسمان و زمین کا چپہ چپہ معمور ہے۔

لب و لہجہ دونوں سورتوں کا بالکل ایک ہی ہے۔ کلام استفہام اقراری کے انداز میں شروع ہوا ہے جو ان منکرین و مکذّبین کو خطاب کرنے کے لیے مخصوص ہے جو بالکل بدیہی حقائق کو جھٹلانے کے درپے ہوں۔ دلائل کے پہلو بہ پہلو زجر و ملامت اور تہدید و توبیخ ہر آیت میں نمایاں ہے۔ اہل ایمان کے لیے جو بشارت ہے وہ بھی گویا ان مکذّبین کی تہدید ہی کے پہلو سے آئی ہے کہ وہ اس کو سامنے رکھ کر اپنے انجامِ بد کا موازنہ کر لیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱-۵) منکرین قیامت کی ان چہ میگوئیوں پر زجر و توبیخ جو قیامت کا ذکر سن کر نہایت سفیہانہ انداز میں وہ آپس میں کرتے۔ ان کو آگاہی کہ یہ خبر وہ خبر ہے کہ ان کے اندر عقل کا ادنیٰ شائبہ بھی ہوتا تو اس کی فکر ان کو راتوں کی نیند سے محروم کر دیتی چہ جائیکہ وہ اس کا مذاق اڑائیں۔

(۶-۱۷) اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، رحمت، حکمت اور قدرت کی ان نشانیوں پر غور کرنے کی دعوت جو زمین سے لے کر آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں اور جو شہادت دے رہی ہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس

دنیا میں مطلق العنان اور غیر مسئول بنا کر نہیں چھوڑا ہے بلکہ اس کی عدالت کے لیے ایک دن مقرر ہے جو لازماً آکے رہے گا۔

(۱۸ - ۳۰) ہولِ قیامت اور سرکشوں کے انجام کی تصویر، جس میں دکھایا ہے کہ اس دنیا کی کوئی چیز بھی اٹل یا خدا کے کنٹرول سے باہر نہیں ہے بلکہ ہر چیز اس کے حکم کے تابع ہے۔ جب وہ چاہے گا ایسا صور پھونکے گا کہ سب قبروں سے نکل کر فوج در فوج اس کی طرف چل پڑیں گے۔ آسمان، زمین، دریا اور پہاڑ سب متزلزل، پراگندہ اور منتشر ہو جائیں گے۔ جہنم اس دن گھات میں ہوگی۔ وہی تمام سرکشوں کا ٹھکانا بنے گی۔ اس میں دکھ کی ساری چیزیں جمع ہوں گی لیکن لذت و راحت کا کوئی نشان بھی نہ ہوگا۔ ہر ایک کو اس کے اعمال سے سابقہ پیش آئے گا اور ہر شخص کا ہر عمل رجسٹر میں لکھا ہوا موجود ہوگا۔ اس سے کہا جائے گا کہ جو انجام تمھارے سامنے آیا ہے وہ تمھارے اعمال کا قدرتی نتیجہ ہے۔ اب اس کا مزا چکھو۔

(۳۱ - ۳۶) اس دن خدا ترسوں کو جو صلہ ملے گا اس کی طرف اشارہ کہ وہ اپنے کسی چھوٹے سے چھوٹے عمل کے صلہ سے بھی محروم نہیں رہیں گے بلکہ اپنی ہر نیکی کا اجر پائیں گے۔ حق کی خاطر انھوں نے مخالفین کے جو چرکے اور طعنے سہے ان سب کا ان کو اجر ملے گا اور ان کو ایسی پاکیزہ سوسائٹی نصیب ہوگی جس میں ان لغویات کا کوئی مذکور نہیں ہوگا جن سے ان کو دنیا میں سابقہ رہا۔

(۳۷ - ۴۰) ان لوگوں کو تنبیہ جو باطل شفاعت کے بل پر اس دن کی ہولناکیوں سے نچنت ہیں۔ ان کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ یہ دن آکر رہے گا تو جو اپنے رب کی پناہ کا طالب ہے وہ اس کی راہ اختیار کرے۔ اللہ کے ہاں کوئی اس کی اجازت کے بغیر کسی کے لیے سفارش کا مجاز نہیں ہوگا اور اجازت کے بعد جو زبان کھولے گا وہ بالکل سچی بات کہے گا، کسی غلط بیانی کی جرأت کوئی نہیں کر سکے گا۔ اس دن ہر ایک کو اس کے اعمال سے سابقہ پیش آئے گا اور کافروں کے پلّے حسرت کے سوا کچھ پڑنے والا نہیں ہے۔

سُوْرَةُ النَّبَا

مَكِّيَّةٌ ــــــــــ اٰيات: ۴۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۱﴾ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ﴿۲﴾ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ آيات ۱-۴۰
مُخْتَلِفُوْنَ ﴿۳﴾ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ﴿۴﴾ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ﴿۵﴾ اَلَمْ
نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ﴿۶﴾ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ﴿۷﴾ وَّخَلَقْنٰكُمْ
اَزْوَاجًا ﴿۸﴾ وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ﴿۹﴾ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ﴿۱۰﴾
وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ﴿۱۱﴾ وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ﴿۱۲﴾
وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ﴿۱۳﴾ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً
ثَجَّاجًا ﴿۱۴﴾ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ﴿۱۵﴾ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ﴿۱۶﴾
اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ﴿۱۷﴾ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ
اَفْوَاجًا ﴿۱۸﴾ وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ﴿۱۹﴾ وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ
فَكَانَتْ سَرَابًا ﴿۲۰﴾ اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ﴿۲۱﴾ لِّلطّٰغِيْنَ
مَاٰبًا ﴿۲۲﴾ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ﴿۲۳﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا
شَرَابًا ﴿۲۴﴾ اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ﴿۲۵﴾ جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿۲۶﴾ اِنَّهُمْ
كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ﴿۲۷﴾ وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ﴿۲۸﴾ وَكُلَّ

ع ۱ ۳۰ ۱ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ﴿۲۹﴾ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ﴿۳۰﴾
اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ﴿۳۱﴾ حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ﴿۳۲﴾ وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا ﴿۳۳﴾
وَّكَاْسًا دِهَاقًا ﴿۳۴﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ﴿۳۵﴾ جَزَآءً
مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ﴿۳۶﴾ رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا
الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ﴿۳۷﴾ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ
صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾
ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ﴿۳۹﴾ اِنَّآ
اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۚ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ
ع ۲ ۱۰ ۲ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ﴿۴۰﴾

ترجمۂ آیات ۱-۴۰

یہ لوگ کس چیز کے بارے میں چہ میگوئیاں کر رہے ہیں؟ اس بڑی خبر کے بارے میں جس میں کوئی کچھ کہہ رہا ہے کوئی کچھ! ہرگز نہیں، وہ عنقریب جان لیں گے، پھر ہرگز نہیں، وہ جلد جان لیں گے!! ۱-۵

کیا ہم نے زمین کو گہوارہ اور پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا؟ تم کو جوڑے جوڑے نہیں پیدا کیا؟ تمھاری نیند کو دافعِ کلفت نہیں بنایا؟ رات کو تمھارے لیے پردہ اور دن کو وقتِ معاش نہیں بنایا؟ تمھارے اوپر سات محکم آسمان نہیں بنائے اور اس کے اندر ایک روشن چراغ نہیں رکھا؟ اور کیا ہم نے پانی سے لبریز بدلیوں سے موسلا دھار پانی نہیں برسایا کہ اس کے ذریعہ سے اگائیں غلہ اور نباتات اور گھنے باغ؟ —— بے شک فیصلہ کے دن کا وقت مقرر ہے! ۶-۱۷

جس دن صور پھونکا جائے گا تو تم آؤ گے فوج در فوج اور آسمان کھولا جائے گا تو
اس میں دروازے ہی دروازے ہو جائیں گے اور پہاڑ چلا دیے جائیں گے تو وہ بالکل
سراب بن کر رہ جائیں گے۔ بے شک جہنم گھات میں ہے، سرکشوں کا ٹھکانا۔ اس میں
رہیں گے مدتہائے دراز۔ نہ اس میں کوئی ٹھنڈک نصیب ہوگی، نہ گرم پانی اور پیپ کے سوا
کوئی پینے کی چیز۔ بدلہ ان کے عمل کے موافق۔ یہ لوگ محاسبہ کا گمان نہیں رکھتے تھے اور انھوں
نے ہماری آیتوں کی بے دریغ تکذیب کی اور ہم نے ہر چیز کو لکھ کر شمار کر رکھا ہے۔ تو
چکھو، اب تمھارے عذاب ہی میں ہم اضافہ کریں گے۔ ۱۸-۳۰

بے شک خدا ترسوں کے لیے فائز المرامی ہے۔ باغ اور انگور، اٹھتی جوانیوں
والی ہم سنیں، اور چھلکتے جام۔ نہ اس میں بک بک سنیں گے نہ بہتان طرازی۔ یہ تیرے
رب کی طرف سے صلہ ہوگا' بالکل ان کے عمل کے حساب سے۔

آسمانوں اور زمین اور ان کے مابین کی ساری چیزوں کے ربّ رحمان کی طرف
سے جس کی طرف سے یہ کوئی بات کرنے کا اختیار نہ رکھیں گے جس دن جبریل اور فرشتے صف بستہ
کھڑے ہوں گے کوئی بات نہیں کرے گا مگر جس کو ربِّ رحمان اجازت دے اور
وہ بالکل ٹھیک بات کہے گا یہ دن شدنی ہے تو جو چاہے اپنے رب کی طرف
ٹھکانا بنالے۔ ہم نے تم کو ایک قریب آجانے والے عذاب سے آگاہ کر دیا ہے'
جس دن آدمی اپنی اس کمائی کو دیکھے گا جو اس نے آگے کے لیے کی ہوگی اور کافر
کہے گا کاش، میں مٹی ہوتا! ۳۷-۴۰

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

عَمَّ يَتَسَآءَلُوۡنَ (۱)

'عَمَّ' دراصل ہے 'عَنۡ مَا' لیکن عام استعمال میں جس طرح بعض حروف کی آواز دب جاتی ہے اسی طرح 'عَمَّا' سے بھی 'الف' ساقط ہو گیا ہے اور یہ اسی طرح استعمال ہوتا ہے۔

منکرینِ قیامت کا استہزا

'تَسَاءُلٌ' کے معنی آپس میں کسی چیز سے متعلق پوچھ گچھ کرنے کے ہیں۔ پوچھ گچھ دریافتِ حال اور تحقیق کے لیے بھی ہوتی ہے اور بعض اوقات محض سخن گستری اور استہزا کے لیے بھی۔ یہاں یہ استہزا کے مفہوم میں ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ ذکر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو جب انذارِ قیامت پر مشتمل سورتیں سنائیں تو لب و لہجہ کی حرارت، اندازِ بیان کی سطوت و ہیبت اور دلائل کی قطعیت نے ان کا چرچا بہت جلد ہر حلقہ میں پھیلا دیا۔ قریش نے اپنے عوام کو اس کے اثر سے بچانے کے لیے جہاں بہت سی احمقانہ تدبیریں اختیار کیں وہاں یہ اوچھی تدبیر بھی اختیار کی کہ اپنی مجالس میں اس کو اپنے مذاق اور طبع آزمائی کا موضوع بنا لیا تاکہ لوگوں پر یہ اثر ڈالیں کہ یہ چیز کسی سنجیدہ غور و فکر کے لائق نہیں ہے بلکہ محض خیالی ہوّا ہے جس سے متاثر ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بعض نے کہا کہ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ جب لوگ مر کر سڑ گل جائیں گے تو وہ از سرِ نو زندہ کیے جائیں! بعض نے اس پر گرہ لگائی کہ کیا بھلا ہمارے اگلے بھی اٹھائے جائیں گے جو نہیں معلوم کب پیوندِ زمین ہوئے اور ان کی قبروں کا کوئی نشان بھی باقی نہیں رہا! تیسرے نے پرزور لہجہ میں اس کی تائید کی کہ ناممکن ناممکن، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، یہ سب محض خیالی باتیں ہیں۔

دوزخ اور اس کی آگ کا یوں مذاق اڑاتے کہ خوب ہوگی وہ آگ جس میں پانی بھی ہوگا اور درخت بھی! دوسرا اس نکتہ پر اس کو داد دیتا کہ بھلا یہ باتیں کسی کی عقل میں سمانے والی ہیں۔

جب قرآن نے ان کو آگاہ کیا کہ دوزخ پر انیس سرہنگ مامور ہوں گے تو اس کو انھوں نے اپنی طبع آزمائی کا موضوع بنا لیا۔ کوئی بولا کہ اگر اتنے ہی ہوں گے تو ان میں سے اتنوں سے تو میں تنہا نمٹ لینے کے لیے کافی ہوں۔ دوسرے نے ڈینگ ہانکی کہ پھر کوئی اندیشہ کی بات نہیں ہے، باقی سے نمٹنے کے لیے میں کمزور نہیں ہوں!

غرض قیامت اور اس کے احوال سے متعلق جو باتیں بھی ان کو سنائی گئیں ان سے سبق لینے کے بجائے انھوں نے ان کو مذاق میں اڑا دینے کی کوشش کی تاکہ ان کے عوام ان سے متاثر نہ ہونے پائیں۔

ان کی اسی طرح کی باتوں کو یہاں 'تساءل' سے تعبیر فرمایا ہے اور نہایت تیز و تند انداز میں پوچھا ہے کہ یہ لوگ کس چیز کے بارے میں چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔

اس سوال سے اس سورہ کا آغاز اس کے مزاج کا پتہ دے رہا ہے کہ اس میں ان کو بتایا جائے گا کہ جس چیز کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں وہ مذاق اڑانے اور ہنسی دل لگی کی چیز نہیں بلکہ وہ سوچیں تو ان کے لیے سر پیٹنے اور خون کے آنسو بہانے کی چیز ہے۔

عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۙ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ (۲-۳)

زبان کا ایک اسلوب

'نبا' کسی بڑے واقعہ یا اہم خبر کو کہتے ہیں۔ اس آیت سے پہلے اگرچہ حرفِ استفہام لفظاً مذکور نہیں ہے لیکن معناً یہ بھی اسی استفہام کے تحت ہے جو پہلے آیا ہے۔ اس کی نہایت واضح مثال سورۂ انشراح میں موجود ہے۔ فرمایا ہے: 'اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ ۙ وَوَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ' (الانشراح ۹۴: ۱-۲) (کیا ہم نے تمہارے سینہ کو کھول نہیں دیا اور تمہارے بوجھ کو اتار نہیں دیا؟)

یہاں 'وَوَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ' کا ٹکڑا دیکھیے لفظاً استفہام کے تحت نہیں ہے بلکہ بالکل سادہ خبریہ اسلوب میں ہے لیکن معناً یہ اسی کے تحت ہے۔ اس کی مثالیں قرآن میں بہت ہیں۔ اسی سورہ میں بھی آگے اس کی مثالیں آ رہی ہیں۔ مترجمین عام طور پر اس اسلوبِ بیان سے ناآشنا ہیں اس وجہ سے وہ اس طرح کے انشائیہ جملوں کا ترجمہ خبریہ اسلوب میں کر دیتے ہیں جس سے کلام کا اصل زور واضح نہیں ہوتا اس لیے کہ انشاء اور خبر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ کیا یہ لوگ اس بے دردی اور جسارت سے اس عظیم خبر کا مذاق اڑا رہے ہیں جو قیامت اور روزِ جزا و سزا سے متعلق ان کو سنائی جا رہی ہے؟ یہ خبر تو ایسی ہے کہ حق تھا کہ اس کی فکر خواب و خور کی لذت سے ان کو محروم کر دیتی لیکن یہ ایسے شامت زدہ ہیں کہ اس سے ڈرنے اور اس کے لیے تیاری کرنے کے بجائے اس کو اپنے طنز و مذاق کا موضوع بنائے ہوئے ہیں۔

منکرین قیامت کا تناقضِ فکر

'اَلَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ'۔ لفظ 'اختلاف' بیک وقت دو معنوں کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک اختلافِ رائے کو دوسرے تناقضِ فکر کو اور یہ دونوں معانی غور کیجیے تو معلوم ہوگا لازم و ملزوم ہیں۔ اختلافِ رائے تناقضِ فکر ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ مشرکین عرب سے متعلق ہم جگہ جگہ اس حقیقت کا اظہار کر چکے ہیں کہ قیامت کے باب میں وہ نہایت شدید قسم کے تناقضِ فکر میں مبتلا تھے۔[1] ایک گروہ ان کے اندر اس کا کھلم کھلا انکار کرتا تھا اور دوسرا جس کی تعداد زیادہ تھی، صریح انکار کے بجائے اس پر مختلف قسم کے شبہات وارد کرتا تھا۔ ان کا گمان تھا کہ اول تو اس کا ہونا ہی بہت مستبعد اور بعید از قیاس ہے

[1] مثلاً ملاحظہ ہو تفسیر سورۂ نمل (۲۷) آیت ۶۶

اور ہوئی بھی تو اس کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ہمارا لوٹنا ہمارے دیوتاؤں کی طرف ہوگا جو ہمیں خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے اور اگر خدا سے سابقہ پڑا بھی تو اتنی بے شمار مخلوق کے سارے اعمال و اقوال کو کون جان سکتا ہے کہ وہ ان کا حساب کرنے بیٹھے۔ یہ اس خبط میں بھی مبتلا تھے کہ جب اس دنیا میں ان کا حال اچھا ہے، جو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی نظروں میں اچھے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ جو عزت و سرفرازی اس نے ان کو اس دنیا میں دے رکھی ہے قیامت میں ان کو اس سے محروم کر دے۔

ان غلط خیالات کے ساتھ ساتھ وہ بہت سے ایسے صحیح عقائد کا اقرار بھی کرتے تھے جن سے ان باطل خیالات کی نفی ہوتی تھی لیکن قیامت اور جزا و سزا کو ماننا ان کی خواہش کے خلاف تھا اس وجہ سے وہ قرآن کی بار بار کی تذکیر کے بعد بھی اپنے فکری تناقض کا جائزہ لینے اور اس کو دور کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے حالانکہ عقل اور فطرت کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ انسان کو زندگی کے کسی ایسے معاملے میں اگر ذہنی یکسوئی حاصل نہ ہو جس میں اس کی ابدی فلاح یا ابدی ہلاکت کا راز مضمر ہے تو ان لوگوں کی بات توجہ سے سنے جو اس کے تضادِ فکر سے اس کو آگاہ کر رہے ہوں تاکہ ہلاکت سے محفوظ رہے۔ یہ درحقیقت اس کی اپنی ضرورت ہے نہ کہ یاددہانی کرنے والوں کی۔ قرآن نے یہاں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ قرآن ان کو جس عظیم واقعہ کی خبر دے رہا ہے اس کے بارے میں ان کا فکری تناقض اور کسی ذہنی الجھن میں مبتلا رہنا کسی طرح ان کے لیے خوش انجام نہیں ہے۔ یہ ابدی ہلاکت یا ابدی سعادت کا معاملہ ہے۔ قرآن کا یہ بڑا احسان ہے کہ اس نے اس تضاد و اختلاف سے نکلنے کی ان کو راہ دکھائی ہے۔ حق تھا کہ وہ اس کی قدر کرتے لیکن انھوں نے اپنی بدبختی سے اس کو تفریح طبع کا موضوع بنا لیا ہے۔

كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ (۴-۵)

منکرین کو تنبیہ

یہ نہایت زوردار الفاظ میں ان کو تنبیہ ہے کہ جو لذیذ خواب وہ دیکھ رہے ہیں یہ ہرگز پورے ہونے والے نہیں ہیں۔ قرآن جس انجام سے ان کو آگاہ کر رہا ہے وہ عنقریب ان کے سامنے آکے رہے گا۔ یہاں جملہ کی تکرار محض دعوے کو مؤکد کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ بیانِ حقیقت کے لیے ہے۔ اللہ کے رسولوں نے، جیسا کہ ہم ایک سے زیادہ مقامات میں لکھ چکے ہیں، اپنی قوموں کو بیک وقت دو عذابوں سے ڈرایا ہے۔ اول اس عذاب سے جو سنتِ الٰہی کے مطابق ہر اس قوم پر لازماً آیا ہے جس نے رسول کی تکذیب کر دی ہے۔ دوسرے اس عذاب سے جس میں وہ قیامت کے دن مبتلا ہوگی۔ ان دونوں عذابوں کو سامنے رکھ کر اس تنبیہی کلمہ کو دوبارہ دہرایا ہے۔

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا ۝ وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا ۝ وَخَلَقْنَاكُمْ أَزْوَاجًا ۝ وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ

سُبَاتًا ۝ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۝ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝ وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا
شِدَادًا ۝ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۝ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۝
لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۝ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۝ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا (۶-۱۷)

آثارِ ربوبیت سے استدلال

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے ان آثار کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس کی قدرت، حکمت، رحمت، ربوبیت، توحید، قیامت اور ایک روزِ جزا و سزا کے لازمی ہونے پر ایسی واضح حجت ہیں کہ کوئی سلیم الفطرت ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ آخر میں یہ نتیجہ سامنے رکھ دیا ہے کہ 'اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ کَانَ مِیْقَاتًا'، جو شخص بھی ان نشانیوں پر غور کرے گا وہ اس اعتراف پر مجبور ہو گا کہ اس کے بعد ایک فیصلہ کا دن ضرور آئے گا اور اس کا وقت اس کائنات کے خالق کے نزدیک معین ہے۔

'اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا'۔ سب سے پہلے زمین اور اس کے پہاڑوں کی طرف توجہ دلائی ہے کہ انسان اگر روزِ جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے تو کیا وہ ربوبیت کے اس اہتمام پر غور نہیں کرتا جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے، بغیر کسی استحقاق کے، کر رکھا ہے کہ زمین کو اس کے لیے گہوارے کی طرح قرار و سکون کی جگہ بنایا ہے اور اس میں پہاڑوں کی میخیں ٹھونکی ہیں تاکہ یہ اپنی جگہ پر برقرار رہے، کوئی تزلزل اس میں نہ پیدا ہونے پائے۔

زمین کے اندر پہاڑوں کے لنگر انداز کرنے کی مختلف حکمتوں کی طرف قرآن نے جگہ جگہ اشارے کیے ہیں۔ سابق سورہ میں بھی اس کی ایک عظیم مصلحت کی طرف اشارہ ہے۔ بعض مقامات میں اس کی یہ حکمت بھی بتائی ہے کہ زمین میں پہاڑ اس لیے گاڑے ہیں کہ وہ تمھارے سمیت کسی طرف لڑھک نہ جائے[1]۔ یہاں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ انسان اگر غور کرے تو یہ سمجھنے سے وہ قاصر نہیں رہے گا کہ جو رب اس زمین کے گہوارے میں اس اہتمام سے اس کی پرورش کر رہا ہے کس طرح ممکن ہے کہ وہ ایک ایسا دن نہ لائے جس میں ان لوگوں کو انعام دے جنھوں نے اس کی ربوبیت کا حق پہچانا اور اس کو ادا کیا ہو اور ان لوگوں کو سزا دے جنھوں نے اس کی ناشکری اور نافرمانی کی ہو۔ ربوبیت کے ساتھ مسئولیت لازمی ہے۔ ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کائنات کے خالق کے نزدیک شکرگزار اور ناشکر دونوں برابر ہیں۔ یہ ایسی بھونڈی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ سے متعلق اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

'وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا'۔ اگرچہ اسلوبِ کلام باعتبارِ الفاظ خبریہ ہو گیا ہے لیکن معناً یہ 'اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا' ہی پر معطوف ہے۔ اس کی وضاحت اوپر آیات ۱-۲ کے تحت ہو چکی ہے۔

---

[1] وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ (النحل - ۱۶ : ۱۵) (اور زمین میں اس کے پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے کہ مبادا وہ تمھارے سمیت لڑھک جائے)۔

یہ اشارہ ہے اس سب سے بڑے سامانِ تسلی کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں آدمی کے لیے مہیا کیا ہے۔ فرمایا کہ ہم نے تمھیں تنہا نہیں پیدا کیا بلکہ تمھارے ساتھ تمھاری ہی جنس سے تمھارا جوڑا بھی بنایا تاکہ وہ تمھارے لیے طمانیت اور سکینت کا ذریعہ بنے۔ یہ امر واضح رہے کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر چیز جوڑا جوڑا بنائی ہے اور یہ جوڑے آپس میں ایسی گہری وابستگی رکھتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی تنہا اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا نہیں کر سکتا۔ ان میں بظاہر تو نسبت ضدین کی ہے لیکن قدرت نے ان کے اندر ایسے ظاہری و باطنی داعیات رکھے ہیں کہ وہ باہم مل کر رہنے ہی میں سکون و راحت پاتے اور ایک برتر مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ یہ خصوصیت جس طرح اس دنیا کے تمام اضداد میں ہے اسی طرح میاں اور بیوی کے درمیان بھی ہے۔ اس چیز کی طرف قرآن نے سورۂ روم (۳۰) آیت ۲۱ میں یوں اشارہ فرمایا ہے: 'اَنۡ خَلَقَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا لِّتَسۡکُنُوۡۤا اِلَیۡہَا وَجَعَلَ بَیۡنَکُمۡ مَّوَدَّۃً وَّرَحۡمَۃً' (اس نے تمھاری ہی جنس سے تمھارے لیے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تمھارے درمیان اس نے محبت اور غمگساری رکھی)۔ اضداد کے اندر اس توافق و سازگاری کو قرآن نے توحید اور قیامت کی دلیل کی حیثیت سے جگہ جگہ پیش کیا ہے جس کی وضاحت ہم برابر کرتے آ رہے ہیں۔

'وَّجَعَلۡنَا نَوۡمَکُمۡ سُبَاتًا'۔ 'سبت' اور 'سبات' کے اصل معنی تو کاٹنے کے ہیں لیکن یہاں یہ دفعِ کلفت اور راحت و سکون کے معنی میں ہے۔ نیند کو 'سبات' اس وجہ سے کہا کہ یہ حرکت و عمل کے تسلسل کو منقطع کر کے کلفت سے نجات دیتی اور راحت و سکون حاصل کرنے کا موقع بہم پہنچاتی ہے جس سے قویٰ تازہ دم ہو جاتے ہیں۔

'وَّجَعَلۡنَا الَّیۡلَ لِبَاسًا'۔ رات کو تمھارے لیے لباس بنایا۔ رات کے لباس ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح لباس آدمی کو اپنے اندر چھپا لیتا اور سکون و اطمینان بخشتا ہے اسی طرح شب کی چادر بھی اس کو اپنے اندر چھپا لیتی ہے جس سے وہ خلل انداز ہونے والی چیزوں سے محفوظ ہو کر سکون حاصل کرتا اور از سرِ نو میدانِ عمل میں اترنے کے لیے صلاحیت بہم پہنچاتا ہے۔

'وَّجَعَلۡنَا النَّہَارَ مَعَاشًا' اور دن کو حصولِ معاش کی سرگرمیوں کا وقت بنایا۔

ان نشانیوں کی طرف توجہ دلانے سے مقصود یہ ہے کہ جو شخص بھی ان پر غور کرے گا اس میں بصیرت ہو گی تو وہ لازماً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ رات اور دن نہ از خود چکر کر رہے ہیں اور نہ ان کا یہ چکر بالکل بے غایت و بے مقصد ہے بلکہ ایک حکیم و تدبیر پروردگار اپنی خدمت کے لیے ان کو اس سرگرمی کے ساتھ مصروف کیے ہوئے ہے تاکہ لوگ ان کی خدمت سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے اس رب کے شکر گزار رہیں جس نے ان کی معاش و معیشت اور راحت و آسائش کے لیے یہ عظیم اہتمام فرمایا ہے۔

ساتھ ہی یاد رکھیں کہ ربوبیت کا یہ اہتمام مستلزم ہے کہ ایک ایسا دن بھی آئے جس میں وہ دیکھے کہ کس نے اس دنیا میں آنکھیں کھول کر زندگی گزاری اور کون اندھے بہرے بنے رہے اور پھر دونوں کے ساتھ ان کے رویے کے مطابق معاملہ کرے۔

'وَبَنَیْنَا فَوْقَکُمْ سَبْعًا شِدَادًا' زمین کی نشانیوں کے بعد آسمان کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی، فرمایا اب اوپر دیکھو ہم نے تمہارے اوپر سات محکم آسمان بنائے۔ آسمان کا ذکر اگرچہ یہاں الفاظ میں نہیں ہے لیکن جو صفات مذکور ہیں وہ خود دلیل ہیں کہ مراد آسمان ہی ہے۔ 'شداد' سے مراد وہی بات ہے جو سورۂ ملک میں یوں فرمائی گئی ہے:

اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ط مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ط فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ کَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْکَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِیْرٌ (الملک - ۶۷: ۳-۴)	جس نے پیدا کیے سات آسمان تہ بہ تہ۔ تم خدائے رحمان کی کاریگری میں کوئی خلل نہیں پا سکتے۔ تو نگاہ دوڑاؤ کہیں اس میں کوئی شگاف دیکھتے ہو! پھر نگاہ دوڑاؤ دوبارہ۔ نگاہ ناکام ہو کر تمہاری طرف پلٹ آئے گی اور وہ تھکی ہوئی ہو گی۔

مطلب یہ ہے کہ تم اس ناپیدا کنار چھت کو جہاں تک دیکھو گے اس کو محکم اور بالکل بے خلل پاؤ گے۔ کسی گوشے میں کسی ادنیٰ نقص کی بھی نشان دہی نہیں کر سکتے۔

'وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا' اور آسمان میں ہم نے ایک روشن چراغ رکھا۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد سورج ہے۔ یہی سورج اس دنیا میں روشنی، حرارت اور قوت کا ذریعہ ہے۔ یہ نہ ہو تو یہ سارا عالم تیرہ و تار ہو جائے۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ آسمان اور زمین میں الگ الگ دیوتاؤں کی حکمرانی نہیں ہے بلکہ دونوں میں ایک ہی خدائے قادر و قیوم کی حکومت ہے ورنہ ان میں یہ سازگاری کس طرح وجود میں آتی کہ آسمان کا سورج زمین والوں کی اس طرح خدمت گزاری کرتا۔

'وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا' 'مُعْصِرٰتٌ' بادلوں کی صفت کے لیے معروف ہے۔ یہ صفت پانی سے لبریز بادلوں کے لیے بھی آتی ہے اور پانی نچوڑنے والی بدلیوں کے لیے بھی۔ دونوں صورتوں میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہو گا۔

'مَآءً ثَجَّاجًا' زوردار، کثیر اور موسلا دھار بارش کو کہتے ہیں۔

بارش سے قرآن نے اپنے تمام بنیادی دعاوی پر دلیل قائم کی ہے جس کی تفصیلات گزر چکی ہیں۔ یہاں اگرچہ آسمان و زمین کے توافق کے پہلو سے توحید کی دلیل بھی اس میں موجود ہے لیکن خاص طور پر ربوبیت کا پہلو زیادہ نمایاں ہے جو مسئولیت اور جزا و سزا کی نہایت اہم دلیلوں میں سے ہے۔

'لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۵ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا' فرمایا کہ آسمانوں سے یہ بارش ہم اس لیے برساتے

ہیں کہ اس سے تمھارے لیے غلے اور تمھارے مویشیوں کے لیے گھاس اور سبزے اگائیں اور مزید برآں گھنے باغ۔

اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ' یہ اوپر کی ساری بحث و تفصیل کا خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے کہ یہ اہتمامِ ربوبیت اور آسمان سے لے کر زمین تک یہ انتظامِ پرورش صاف گواہی دے رہا ہے کہ جس پروردگار نے یہ سب کچھ کیا ہے وہ انسان کو غیر مسئول نہیں چھوڑے گا بلکہ لازماً ایک فیصلہ کا دن اس نے مقرر کر رکھا ہے جس میں وہ سب کو جمع کر کے فیصلہ کرے گا کہ کس نے اس کی ربوبیت کا حق پہچانا اور کس نے اس کی ناقدری کی۔ پھر ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا یا سزا دے گا۔

یہاں یہ آیت اس طرح آئی ہے گویا یہ یوم الفصل اس کائنات کے نظام کے اندر سے خود اپنی منادی کر رہا ہے۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو اس کو سن نہیں رہے ہیں۔ سعدیؒ نے کیا خوب بات کہی ہے ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نہ خوری

يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَأْتُوْنَ أَفْوَاجًا ۙ وَّفُتِحَتِ السَّمَاۗءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ۙ وَّ
سُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۭ إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۙ لِّلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا ۙ
لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ أَحْقَابًا ۚ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ۙ إِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ۙ
جَزَاۗءً وِّفَاقًا ۭ إِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ۙ وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ۭ وَكُلَّ شَيْءٍ
أَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ۙ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا (١٨-٣٠)

قیامت کی ہلچل کی تصویر

اوپر کی آیات میں یوم الفصل کے دلائل بیان کرنے کے بعد اب ان آیات میں اس ہلچل کی تصویر کھینچی گئی ہے جو اس دن اس پوری کائنات میں برپا ہو گی اور ساتھ ہی وہ انجام بھی سامنے رکھ دیا گیا ہے جس سے سرکشوں اور نافرمانوں کو سابقہ پیش آئے گا۔

يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَأْتُوْنَ أَفْوَاجًا ' فرمایا کہ اس یوم الفصل کے لیے اللہ تعالیٰ تمھیں جمع کرنا چاہے گا تو اس کام میں اس کو ذرا بھی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ بس ایک صور پھونکا جائے گا اور تم فوج در فوج قبروں سے نکل کر اللہ کے داعی کی طرف چل کھڑے ہو گے۔ دوسرے مقام میں یہ تصریح بھی ہے کہ لوگ قبروں سے اس طرح نکلیں گے جس طرح ٹڈیاں نکلتی ہیں اور داعی کی طرف اس طرح بھاگیں گے کہ ذرا بھی راہ سے منحرف نہیں ہوں گے۔

وَفُتِحَتِ السَّمَاۗءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ' اور یہ آسمان جو آج نہایت محکم اور ایک گنبدِ بے در کی شکل میں نظر آتا ہے اس دن اس طرح کھول دیا جائے گا کہ اس میں ہر طرف دروازے ہی دروازے نظر آئیں گے۔

وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ' اور یہ پہاڑ جو آج زمین میں گڑے ہوئے ہیں اس دن اکھاڑ کر چلا دیے جائیں گے نیز آج وہ ٹھوس پتھر ہیں لیکن اس دن یہ ریت کے تودوں کی طرح پھس پھسے ہو جائیں گے۔

'اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا لِّلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا': اس ہلچل کے بعد جہنم اچانک اس طرح نمودار ہو جائے گی گویا وہ سرکشوں کا ٹھکانا بننے کے لیے اس ہلچل کی آڑ میں گھات ہی میں بیٹھی ہوئی تھی، نہ اس کے لیے کوئی تیاری کرنی پڑے گی اور نہ سرکشوں کو اس کی تیاری کے انتظار میں کوئی مہلت ملے گی۔

'لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا'۔ 'اَحْقَابٌ' کے معنی قرنوں کے ہیں۔ اس کی وضاحت قرآن میں جگہ جگہ 'خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا' کے الفاظ سے ہو گئی ہے یعنی وہ اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ بعض لوگوں نے اس سے طویل مدت مراد لے کر یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ جہنم بالآخر ایک دن ختم ہو جائے گی لیکن یہ رائے غلط ہے۔ زبان کے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ مجمل کی شرح مفصل کی روشنی میں کرتے ہیں نہ کہ مفصل کی شرح مجمل کی روشنی میں۔ 'خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا' کے الفاظ ظاہر ہے کہ مفصل ہیں اور لفظ 'احقاب' مجمل۔ اس مجمل کو مفصل کی روشنی میں سمجھیں گے نہ کہ اس کے برعکس۔

علاوہ ازیں یہاں انجام باغیوں اور سرکشوں کا بیان ہوا ہے جس کے لیے قرآن کے دوسرے مقامات میں یہ تصریح ہے کہ ان کو جہنم سے کبھی نکلنا نصیب نہ ہو گا۔

'لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ۝ اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا': اس جہنم میں نہ ان کو کہیں ذرا ٹھنڈک نصیب ہو گی نہ کوئی پینے کی چیز۔ پینے کو ملے گا گرم کھولتا یا گندا پانی۔ لفظ 'غَسَّاقٌ' کی تشریح اہل لغت نے پیپ اور لہو سے بھی کی ہے اور گندے پانی سے بھی۔ ٹھنڈک کی یہاں مطلق نفی کی ہے۔ سورۂ مرسلات میں سایہ 'ظِلّ' کا لفظ آیا بھی ہے تو وہ دھوئیں کا سایہ ہے جس کی صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ نہ اس میں ٹھنڈک ہو گی نہ وہ شعلوں سے بچانے والا ہو گا۔

'جَزَآءً وِّفَاقًا'۔ یعنی یہ جو کچھ انھیں ملے گا ٹھیک ان کے اعمال ہی کا پورا پورا بدلہ ہو گا۔ دنیا میں جو کمائی انھوں نے کی اس کا انجام ان کے سامنے رکھا جائے گا۔ آخرت میں ہر نیکی اور بدی اپنی فطرت کے لحاظ سے پھل لائے گی اور وہی انسان کے سامنے آئے گا۔

'اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ۝ وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا'۔ یعنی ان لوگوں کو کسی حساب کتاب کا اندیشہ نہیں تھا اس وجہ سے بالکل بے فکر رہے اور نہایت بے دردی سے ہماری آیات کو، جو اس دن سے آگاہ کرنے کے لیے سنائی گئیں جھٹلاتے رہے۔ 'كِذَّابًا' مصدر ہے جو تاکید فعل کے لیے آیا ہے۔ اگرچہ اس کا وزن مختلف ہے لیکن معنی میں یہ تکذیب ہی کے ہے۔ تاکید کے مضمون کو ظاہر کرنے کے لیے اگر ترجمہ یوں کیجیے کہ نہایت بے دردی یا نہایت بے باکی سے جھٹلایا تو اس کا صحیح مفہوم ادا ہو جائے گا۔

'وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا'۔ یعنی وہ تو اس گمان میں رہے کہ نہ کوئی حساب ہے نہ کوئی سزا لیکن ہم نے ان کی ایک ایک بات لکھ کر شمار کر رکھی تھی۔ لکھ کر شمار کرنا پورے اہتمام کی دلیل ہے۔ یعنی اس میں کسی سہو و نسیان کا کوئی امکان نہیں ہے۔

'فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا' یہ مستقبل کے ماجرے کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے حاضر کے اسلوب میں بدل دیا ہے۔ فرمایا کہ تم تو اس انجام سے بے فکر رہے لیکن یہ لو، اپنے اعمال کا مزا چکھو۔ ساتھ ہی مستقبل سے ان کو بالکل مایوس کر دینے کے لیے یہ آگاہی بھی سنادی کہ اب آگے تمھارے لیے عذاب ہی عذاب ہے۔ اس میں کسی کمی بیشی کی امید نہ رکھو۔ اب جو تبدیلی بھی تمھارے حال میں ہوگی اس کی نوعیت عذاب میں اضافے ہی کی ہوگی۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ۝ حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ۝ وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا ۝ وَّكَاْسًا دِهَاقًا ۝ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ۝ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا (۳۱-۳۶)

قیامت سے ڈرنے والوں کا صلہ

سرکشوں اور باغیوں کے انجام کے بعد یہ متقیوں کا صلہ بیان ہوا ہے تاکہ تصویر کا دوسرا رخ بھی سامنے آجائے۔ فرمایا بے شک ان لوگوں کے لیے اس دن بڑی فیروز مندی و کامیابی ہے جنھوں نے روزِ جزا و سزا سے ڈرتے ہوئے زندگی گزاری۔ یہ حقیقت یہاں ملحوظ رہے کہ زندگی کو جادۂ مستقیم پر استوار رکھنے والی چیز خوفِ آخرت ہی ہے۔ جس کے اندر یہ ہے وہ متقی ہے اور جس کا سینہ اس خوف سے خالی ہے اس کے اندر شیطان اپنا مسکن بنا لیتا ہے اور وہ خدا کی نافرمانی بالکل بے خوف ہو کر کرتا ہے۔

'حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا' یہ اس کامیابی کی تفصیل ہے کہ ان کے لیے باغ ہوں گے اور انگور۔ 'حدائق' معروف تو کھجور کے باغوں کے لیے ہے لیکن کھجور کے باغوں کے لیے عمدہ طریقہ یہ تھا کہ کنارے کنارے کھجوروں کی باڑھ ہو اور بیچ میں انگوروں اور دوسرے پھلوں اور سبزیوں کے قطعات۔ یہاں 'حدائق' کے بعد 'اعناب' کا ذکر عام کے بعد خاص کے ذکر کے طور پر ہے اور اس سے اگر انگورستان مراد لیں تو یہ بھی مراد لے سکتے ہیں۔

'وَكَوَاعِبَ اَتْرَابًا' یہ حوروں کا ذکر ہے۔ ان کی تعریف میں فرمایا کہ یہ اٹھتی ہوئی جوانیوں والی اور باہم دگر بالکل ہم سن ہوں گی۔ ہم سنی آپس کی بے تکلفی، دل چسپی اور ہم طرحی و ہم مذاق کے لیے ضروری چیز ہے۔

'وَّكَاْسًا دِهَاقًا ۝ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا' یعنی ان کے لیے شراب خالص کے چھلکتے جام ہوں گے لیکن یہ شراب ان لغویات اور لاف زنیوں سے بالکل پاک ہوگی جو اس دنیا کی شراب کے لوازم میں سے ہیں۔ کیف و سرور میں وہ سب سے بڑھ کر ہوگی لیکن عقل و ہوش کو ماؤف نہیں کرے گی کہ ترنگ میں آکر آدمی یاوہ گوئی اور دروغ بافی پر اتر آئے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ شراب کی بدمستی میں بسا اوقات شرابی ایسی بے ہودہ تہمتیں بک دیتے ہیں جو خاندانوں اور قبیلوں میں مستقل عناد کا سبب بن جاتی ہیں۔ جن سوسائٹیوں میں غیرت کا احساس مردہ ہو جاتا ہے ان کے اندر تو اس طرح کی باتیں لوگ پی جاتے ہیں لیکن اہل عرب نہایت حساس و غیور تھے۔ شراب کی بدمستی میں بھی اگر کوئی زبان سے ایسا کلمہ نکال دے جس سے دوسرے کے ناموس پر حرف آتا ہو تو اس کے

نتائج اتنے دوررس ہوتے کہ ان کی تلافی ناممکن ہوجاتی۔ یہاں قرآن نے لفظ 'کذّاب' سے اسی طرح کی باتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا۔ جس طرح اوپر کفار کے بارے میں فرمایا ہے 'جَزَآءً وِّفَاقًا' ان کو ان کے اعمال کے بالکل ہم وزن اور ٹھیک ٹھیک ان کے موافق سزا ملے گی اسی طرح یہ اہل جنت کے باب میں فرمایا کہ ان کو ان کی نیکیوں کا پورے حساب سے صلہ ملے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی کسی چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی ضائع نہیں ہونے دے گا۔ اور اہل ایمان کے لیے فضل کا جو وعدہ ہے وہ مزید برآں ہے۔

رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا (۳۷)

فرمایا کہ اہل ایمان کے لیے یہ صلہ (جو مذکور ہوا) اس خدائے رحمان کی طرف سے ہوگا جو آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی ساری ہی چیزوں کا خداوند ہے، کوئی دوسرا کسی چیز میں اس کا شریک سہیم نہیں ہے کہ وہ کسی کو کچھ دے سکے۔

مزعوم سفارشیوں کی نفی

لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا۔ یہ کفار اور ان کے مزعومہ معبودوں کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ان کے معبودوں کو خدا کے ہاں بڑی رسائی ہوگی۔ یہ جو چاہیں گے خدا سے کہہ سکیں گے اور جو چاہیں گے منوا سکیں گے، یہ خیال بالکل باطل ہے۔ کوئی بھی مجاز نہ ہوگا کہ اس سے کوئی عرض معروض کر سکے۔ اس کے سامنے وہی زبان کھولیں گے جن کو اس کی طرف سے اجازت مرحمت ہوگی اور وہی بات منہ سے نکالیں گے جو بالکل حق ہوگی۔

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا (۳۸)

مشرکین کو سب سے زیادہ اعتماد فرشتوں کی سفارش پر تھا جن کو وہ اپنے زعم کے مطابق خدا کی بیٹیاں فرض کر کے پوجتے تھے۔ فرمایا کہ اس دن ان کا حال یہ ہوگا کہ جبریلؑ اور دوسرے ملائکہ ربّ العزت کے سامنے اس طرح صف بستہ حاضر ہوں گے جس طرح خدام اپنے آقا کے حضور میں حاضر ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی زبان کھولنے میں پہل نہیں کرے گا بلکہ وہی بات کرنے کی جرأت کریں گے جن کو خدائے رحمان کی طرف سے اجازت مرحمت ہوگی اور وہی بات کہیں گے جو بالکل ٹھیک ہوگی ـــ یعنی اگر مشرکین اس خبط میں مبتلا ہیں کہ ان کے دیوی دیوتا خدا سے جو بات چاہیں گے ناز و تدلّل سے منوا لیں گے اور ان کے حق میں جو سفارش چاہیں گے کر دیں گے تو یہ محض ان کی طمع خام ہے۔

یہاں 'روح' سے مراد حضرت جبریلؑ ہیں۔ ان کے لیے قرآن میں یہ لفظ جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ ملائکہ کے گل سر سبد وہی ہیں اس وجہ سے ان کا ذکر سب سے پہلے ہوا تاکہ واضح ہو جائے کہ جب اس دن

جبریلؑ کا یہ حال ہوگا تو تا بہ دیگراں چہ رسد! بعض لوگوں نے اس کو عام ارواحِ انسانی کے مفہوم میں لیا ہے لیکن اس کا یہاں کوئی قرینہ نہیں ہے۔

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا (۳۹)

یہ براءتِ ذمہ کا اعلان ہے کہ لوگوں کو اس دن کی آمد سے آگاہ کرنا ضروری تھا سو یہ کام کر دیا گیا۔ اب لوگوں کی ذمہ داری اپنی ہے۔ فرمایا کہ جس دن کی آمد سے یہ ڈرایا جا رہا ہے وہ ایک امرِ شدنی ہے۔ وہ آ کے رہے گا۔ نہ کوئی اس کو ٹال سکتا، نہ کوئی اس دن کسی کے کام آنے والا بنے گا تو جو اپنی خیر چاہے وہ اپنے رب کے پاس اپنا ٹھکانا بنا لے۔

'فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا' سے ایک بات تو یہ نکلی کہ اس معاملہ میں اللہ اور رسول کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ لوگوں کو اس دن سے آگاہ کر دیا جائے۔ یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اس کا خوف اتار بھی دیا جائے۔

دوسری بات یہ نکلی کہ اس دن پناہ صرف اللہ تعالیٰ ہی بنے گا، کسی اور کی پناہ اس دن کسی کو حاصل ہونے والی نہیں ہے۔

تیسری بات یہ نکلی کہ اللہ کو پناہ بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس دنیا میں اس کی بتائی ہوئی راہ اختیار کی جائے۔ جس نے یہاں اس کی راہ نہیں اختیار کی وہ آخرت میں اس کی پناہ نہیں حاصل کر سکے گا۔

اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۚ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا (۴۰)

یہ آخری تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ ہم نے ایک ایسے عذاب سے آگاہ کر دیا ہے جو بالکل قریب آ چکا ہے۔ یعنی رسول کی بعثت کے بعد اب قوم کا فیصلہ ہونا تو سنتِ الٰہی کے مطابق قطعی ہے اور یہ عذاب منکروں کے لیے عذابِ قیامت کا پیش خیمہ ہوگا۔ یوں بھی عذابِ قیامت کو دور خیال کرنا نادانی ہے۔ اس لیے کہ یہ زندگی چند روزہ ہے اور جو مرا اس کی قیامت اس کے سامنے ہے۔ من مات فقد قامت قیامتہ۔

'وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا'۔ یعنی اس دن ہر شخص کے اعمال اس کے سامنے آئیں گے اور جنھوں نے اس دن کے لیے کوئی تیاری نہ کی ہوگی وہ اپنی محرومی اور بدبختی پر اپنے سر پیٹیں گے کہ کاش ہم مٹی ہی رہے ہوتے، ہمارا وجود ہی نہ ہوا ہوتا!!

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ اولاً و اخراً۔

رحمان آباد

۴- اپریل ۱۹۷۹ء

۶ جمادی الاول ۱۳۹۹ھ

تدبرِ قرآن

٧٩

النّٰزعٰت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

ا۔ سورہ کا عمود

اس سورہ میں بھی قریش کے ان متمردین کو انذار ہے جو عذاب اور قیامت کو بالکل بعید از امکان محض ایک ڈھکوسلا خیال کرتے تھے۔ ہواؤں اور بادلوں کے عجائب تصرفات شہادت میں پیش کر کے ان کو آگاہ فرمایا ہے کہ اپنے آپ کو خدا کی پکڑ سے محفوظ نہ سمجھو اور رسول کو جھٹلانے کی جسارت نہ کرو۔ تم اسی وقت تک محفوظ ہو جب تک خدا نے تم کو مہلت دے رکھی ہے۔ جونہی یہ مہلت ختم ہوئی خدا کی پکڑ میں آ جاؤ گے اور اس کے لیے خدا کو کوئی اہتمام نہیں کرنا پڑے گا۔ یہی ہوائیں اور یہی بادل جو ہر جگہ موجود اور تمھاری زندگی کے لیے ناگزیر ہیں، قہرِ الٰہی کی شکل اختیار کر لیں گے اور تمھیں جڑ پیڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے۔

تمہید اور مطالب کے اعتبار سے یہ سورہ، سورۂ ذاریات اور سورۂ مرسلات سے ملتی جلتی ہوئی ہے۔ دنیا میں خدا کی پکڑ اور اس کی قدرت و ربوبیت کی جو شانیں بالکل نمایاں ہیں وہ اس امر کی نہایت واضح دلیل ہیں کہ ایک ایسا دن لازماً آنے والا ہے جس میں اللہ تعالیٰ ان سرکشوں کو سزا دے گا جنھوں نے اس کے حکموں سے سرتابی کی اور ان لوگوں کو اپنی ابدی رحمت سے نوازے گا جو اپنے رب کے حضور پیشی سے ڈرتے اور اپنی خواہشوں کو لگام لگاتے رہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱-۵) ہواؤں اور بادلوں کی شہادت اس امر پر کہ اللہ کا رسول دنیا اور آخرت کے جس عذاب سے آگاہ کر رہا ہے اس کا واقع ہونا ذرا بھی مستبعد نہیں ہے۔ جس خدا کے ہاتھ میں ہواؤں اور بادلوں کی باگ ہے وہ ان کو جس کے لیے چاہے رحمت اور جس کے لیے چاہے عذاب بنا دے۔ اس کی قدرت سے کوئی چیز بھی بعید نہیں ہے۔ دنیا میں رسولوں کے مکذبین کی جو تاریخ موجود ہے وہ شہادت دیتی ہے کہ ایک دن سب کو اپنے رب کے آگے حساب و کتاب کے لیے پیش ہونا ہے۔

(۶-۱۴) قیامت کی تمثیل اور اس دن اس کے جھٹلانے والوں پر جو گزرے گی اس کی تصویر۔

(۱۵-۲۶) قریش کے فراعنہ کی تنبیہ کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت کے ننھے حصہ کی یاددہانی جس کے لیے سورہ کا عمود مقتضی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہایت ناصحانہ انداز میں فرعون کو راہِ حق پر لانے کی کوشش کی لیکن اس نے اکڑ دکھائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خدا کی پکڑ میں آ گیا۔ اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کو کوئی بڑا اہتمام نہیں کرنا پڑا۔ ہواؤں کے معمولی تصرّف ہی نے اس کا سارا بیڑا غرق کر دیا۔

(۲۷-۳۳) اس بات کی دلیل کہ اللہ تعالیٰ کے لیے لوگوں کو از سرِ نو پیدا کر دینا ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ جس نے آسمان و زمین پیدا کیے، رات اور دن نمودار کیے، لوگوں کی پرورش کے لیے طرح طرح کے سامان مہیا کیے اس کے لیے لوگوں کو دوبارہ پیدا کر دینا کیا مشکل ہے؟ اس کی قدرت دلیل ہے کہ وہ ایسا کر سکتا ہے اور اس کی حکمت مقتضی ہے کہ وہ ایسا کرے۔

(۳۴-۴۱) باغیوں اور نافرمانوں کو اس دن جس انجام سے سابقہ پیش آئے گا اس کا بیان۔ ان کے بالمقابل اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کو جو صلہ ملے گا اس کی بشارت۔

(۴۲-۴۶) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ جو لوگ تمھیں زچ کرنے کو قیامت کی تاریخ اور اس کے دن کی بابت سوال کرتے اور اس کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں تم ان کی باتوں کا دھیان نہ کرو۔ قیامت کے دن اور اس کی تاریخ کا معاملہ تم سے متعلق نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرو۔ تم اس کے ظہور کا دن معیّن کرتے نہیں آئے ہو، بلکہ اس سے لوگوں کو آگاہ کرنے آئے ہو۔ آج جن کو قیامت بہت بعید معلوم ہو رہی ہے جب وہ اس کو دیکھیں گے تو محسوس کریں گے کہ دنیا میں ایک سہ پہر یا ایک دوپہر سے زیادہ نہیں رہے۔

سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ

مَكِّيَّةٌ ______ آيات: ۴۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۝۱ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۝۲ وَّالسّٰبِحٰتِ آیات ۱ - ۴۶
سَبْحًا ۝۳ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۝۴ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۝۵ يَوْمَ وقف لازم
تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝۶ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝۷ قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ
وَّاجِفَةٌ ۝۸ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝۹ يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ وقف لازم
فِى الْحَافِرَةِ ۝۱۰ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝۱۱ قَالُوْا تِلْكَ
اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۝۱۲ فَاِنَّمَا هِىَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝۱۳ فَاِذَا وقف لازم
هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ۝۱۴ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝۱۵ اِذْ نَادٰىهُ وقف لازم
رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝۱۶ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ
طَغٰى ۝۱۷ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝۱۸ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ
فَتَخْشٰى ۝۱۹ فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ۝۲۰ فَكَذَّبَ وَعَصٰى ۝۲۱ ثُمَّ
اَدْبَرَ يَسْعٰى ۝۲۲ فَحَشَرَ فَنَادٰى ۝۲۳ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝۲۴
فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ۝۲۵ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً
لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝۲۶ ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰىهَا ۝۲۷ رَفَعَ ع ۲۶/۳

سَمۡكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾ وَاَغۡطَشَ لَيۡلَهَا وَاَخۡرَجَ ضُحٰهَا ﴿۲۹﴾
وَالۡاَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾ اَخۡرَجَ مِنۡهَا مَآءَهَا وَمَرۡعٰىهَا ﴿۳۱﴾
وَالۡجِبَالَ اَرۡسٰىهَا ﴿۳۲﴾ مَتَاعًا لَّكُمۡ وَلِاَنۡعَامِكُمۡ ﴿۳۳﴾ فَاِذَا جَآءَتِ
الطَّآمَّةُ الۡكُبۡرٰى ﴿۳۴﴾ يَوۡمَ يَتَذَكَّرُ الۡاِنۡسَانُ مَا سَعٰى ﴿۳۵﴾ وَ
بُرِّزَتِ الۡجَحِيۡمُ لِمَنۡ يَّرٰى ﴿۳۶﴾ فَاَمَّا مَنۡ طَغٰى ﴿۳۷﴾ وَاٰثَرَ الۡحَيٰوةَ
الدُّنۡيَا ﴿۳۸﴾ فَاِنَّ الۡجَحِيۡمَ هِيَ الۡمَاۡوٰى ﴿۳۹﴾ وَاَمَّا مَنۡ خَافَ
مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفۡسَ عَنِ الۡهَوٰى ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الۡجَنَّةَ هِيَ
الۡمَاۡوٰى ﴿۴۱﴾ يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرۡسٰهَا ﴿۴۲﴾ فِيۡمَ
اَنۡتَ مِنۡ ذِكۡرٰىهَا ﴿۴۳﴾ اِلٰى رَبِّكَ مُنۡتَهٰىهَا ﴿۴۴﴾ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرُ
مَنۡ يَّخۡشٰىهَا ﴿۴۵﴾ كَاَنَّهُمۡ يَوۡمَ يَرَوۡنَهَا لَمۡ يَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا عَشِيَّةً
ع ۲ اَوۡ ضُحٰىهَا ﴿۴۶﴾

ترجمۂ آیات ۱-۴۶

شاہد ہیں جڑوں سے اکھاڑ پھینکنے والی ہوائیں، اور شاہد ہیں آہستہ چلنے والی ہوائیں اور شاہد ہیں فضاؤں میں تیرنے والے بادل، پھر ایک دوسرے پر سبقت کرنے والے اور خدا کے حکم نازل کرنے والے (کہ جس چیز سے تمھیں ڈرایا جا رہا ہے وہ شدنی ہے) ۱-۵

اس دن سے ڈرو جس دن کپکپی پڑے گی۔ اس کے پیچھے ایک دوسرا جھٹکا آئے گا۔ کتنے دل اس دن دھڑکتے ہوں گے۔ ان کی نگاہیں پست ہوں گی۔ ۶-۹

پوچھتے ہیں کیا ہم پھر پہلی حالت میں لوٹائے جائیں گے! کیا جب کہ ہم کھنکھناتی

ہڈیاں ہو چکیں گے! کہتے ہیں، یہ لوٹنا یا جانا تو بڑے ہی خسارے کا ہوگا!! ۱۰-۱۲

وہ تو بس ایک ہی ڈانٹ ہوگی کہ دفعتہً وہ میدان میں آ موجود ہوں گے۔ ۱۳-۱۴

کیا موسیٰ کی سرگزشت تمھیں پہنچی ہے؟ جب کہ اس کے رب نے وادیٔ مقدّس — طویٰ — میں اس کو پکارا کہ تم فرعون کے پاس جاؤ، اس نے بہت سر اٹھایا ہے۔ اس سے کہو کہ کیا تم میں کچھ اپنے کو سدھارنے کا جذبہ ہے؛ کیا میں تمھیں تمھارے رب کی راہ دکھاؤں کہ تم اس سے ڈرنے والے بنو؟ پس اس کو ایک بڑی نشانی دکھائی تو اس نے جھٹلایا اور بات نہ مانی۔ پھر پلٹا اپنی سرگرمیوں کو تیز کرتے ہوئے۔ پس جمع کیا اور اعلان کیا کہ تمھارا ربِّ اعلیٰ تو میں ہوں۔ پس اللہ نے اس کو آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑا۔ بے شک اس میں سبق ہے ان لوگوں کے لیے جو ڈر رکھنے والے ہیں۔ ۱۵-۲۶

کیا تمھارا بنانا زیادہ دشوار ہے یا آسمان کا؟ اس کو اٹھایا، اس کے گنبد کو بلند کیا، پس اس کو ٹھیک ٹھاک کیا۔ اس کی رات ڈھانک دی اور اس کے دن کو بے نقاب کیا اور زمین کو اس کے بعد ہموار کیا۔ نکالا اس سے اس کا پانی اور چارہ اور پہاڑوں کو اس میں گاڑا۔ تمھاری اور تمھارے مواشیوں کی نفع رسانی کے لیے۔ ۲۷-۳۳

پس جب وہ بڑا ہنگامہ برپا ہوگا (تو یہ سب کچھ درہم برہم ہو جائے گا) اس دن انسان اپنے کیے کو یاد کرے گا اور دوزخ ان لوگوں کے لیے بے نقاب کر دی جائے گی جن کو اس سے دوچار ہونا ہے۔ تو جس نے سرکشی کی اور آخرت

کے بالمقابل دنیا کی زندگی کو ترجیح دی اس کا ٹھکانا تو بس جہنم ہی بنے گی۔ اور وہ جو اپنے رب کے حضور پیشی سے ڈرا اور جس نے اپنے نفس کو خواہش کی پیروی سے روکا تو اس کا ٹھکانا لاریب جنت ہے۔ ۳۷-۴۱

وہ قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ وہ کب کھڑی ہوگی؟ تم اس بحث میں کہاں پڑے ہو! یہ معاملہ تو تیرے رب کے حوالہ ہے۔ تم تو بس ان لوگوں کو اس سے آگاہ کرنے والے ہو جو اس سے ڈریں۔ جس روز وہ اس کو دیکھیں گے تو گویا انھیں ایک شام یا اس کی صبح سے زیادہ وقفہ نہیں گزرا۔ ۴۲-۴۶

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۙ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا (۱-۲)

'نازعات' سے مراد

'نَازِعَاتٌ' اور 'نَاشِطَاتٌ' کی تاویل میں یوں تو متعدد اقوال منقول ہیں لیکن غالب رائے یہ ہے کہ ان سے مراد وہ فرشتے ہیں جو کفار کی جانیں سختی سے اور اہل ایمان کی جانیں نہایت نرمی سے نکالتے ہیں۔ اگرچہ اس قول کو شہرت حاصل ہے لیکن اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اس باب میں جو روایات ہیں وہ بالکل تفسیری نوعیت کی ہیں، جن کا یہ درجہ نہیں ہے کہ ان کی بنیاد پر کوئی بات اعتماد کے ساتھ کہی جا سکے۔ قرآن میں بھی کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے اس قول کے حق میں کوئی تائید نکلتی ہو۔ اہل کفر اور اہل ایمان کی جانوں کے نکالے لینے کا معاملہ تمام تر ایک روحانی و باطنی کیفیت سے تعلق رکھنے والا معاملہ ہے، وہ کوئی ایسی عام مشاہدے میں آنے والی چیز نہیں ہے کہ اس کو کسی دعوے پر بطور حجت پیش کیا جا سکے درآنحالیکہ یہ قسمیں یہاں بطور شہادت کھائی گئی ہیں۔ مفسرین کے نزدیک چونکہ ضروری ہے کہ قسم کسی مبارک و مقدس چیز کی ہو اس وجہ سے انھیں ان الفاظ سے فرشتوں کو مراد لینے کا تکلّف کرنا پڑا لیکن ہم برابر واضح کرتے آ رہے ہیں کہ قرآن میں قسمیں بالعموم کسی دعوے پر بطور شہادت آئی ہیں۔ ان کے اندر نمایاں پہلو دعوے پر دلیل کا ہوتا ہے۔ اس سے کچھ بحث نہیں کہ جس کی قسم کھائی گئی ہے وہ کوئی مقدس چیز ہے یا غیر مقدس۔

ہمارے نزدیک 'نازعات' سے مراد وہ تند ہوائیں ہیں جو درختوں، مکانوں اور گڑی ہوئی چیزوں کو اپنے زور سے اکھاڑ پھینکتی ہیں۔ اس طرح کی ہواؤں کی صفت کے طور پر 'ذاریات'، 'مرسلات' اور 'عاصفات' وغیرہ الفاظ بھی قرآن میں استعمال ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ 'ذَرْوًا'، 'عُرْفًا' اور 'عَصْفًا' کے الفاظ بطور تاکید آئے ہیں۔ اسی طرح یہاں لفظ 'نازعات' ان تند ہواؤں کے لیے استعمال ہوا ہے جو درختوں اور مکانوں کو اکھاڑ پھینکتی ہیں۔ اس کے ساتھ لفظ 'غَرْقًا' معنی کی شدت کے اظہار کے لیے بطور تاکید ہے۔

قوم عاد پر اللہ تعالیٰ نے باد تند کا جو عذاب مسلط فرمایا اس کی تصویر سورۂ قمر میں یوں کھینچی گئی ہے:

إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ۝ تَنزِعُ النَّاسَ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنقَعِرٍ (القمر - ۵۴: ۱۹-۲۰)

ہم نے ان پر ایک طویل نحوست کے زمانے میں باد صرصر مسلط کر دی جو لوگوں کو اس طرح اکھاڑ پھینکتی گویا وہ کھوکھلی کھجوروں کے تنے ہوں۔

یہاں فعل 'تَنۡزِعُ' استعمال ہوا ہے اسی سے اس سورہ میں 'نازعات' بطور صفت استعمال ہوا ہے۔

'ناشطات' سے مراد

'نَاشِطَاتٌ' 'نشط' کے مادہ سے ہے جس کے معنی کسی کام کو نرمی سے کرنے کے بھی آتے ہیں اور کسی رسی کی گرہ یا کسی جانور کے بندھن کو چرنے چگنے کے لیے چھوڑ دینے کے معنی میں بھی۔ یہاں قرینہ بتا رہا ہے کہ یہ نرم رو اور آہستہ خرام ہواؤں کے لیے آیا ہے جس طرح سورۂ ذاریات میں 'فَالۡجٰرِیٰتِ یُسۡرًا' کے الفاظ آئے ہیں۔

یہ امر واضح رہے کہ تند اور نرم رو ہواؤں کے عمل کی ظاہری نوعیت اگرچہ الگ الگ ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے عجائبات تصرّف کی شانیں دونوں کے اندر نمایاں ہیں۔ سورۂ ذاریات میں سیاقِ کلام اور ہے اس وجہ سے ہوا کی نرم روی کا ذکر بارش کے مقدمہ کے طور پر آیا ہے۔ یہاں اس کا ذکر مستقلاً ہوا ہے اس وجہ سے یہ رحمت اور نقمت دونوں کو محتمل ہے۔ رحمت کے لیے اس کا محتمل ہونا تو بالکل واضح ہے کہ ہوا کی مروحہ جنبانی ہی زندگی اور راحت و نشاط کا ذریعہ ہے لیکن اس کا رحمت یا نقمت بننا کلیتہً اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے۔ وہ چاہتا ہے تو بعض اوقات اس کی نرم روی کو بھی عذاب بنا دیتا ہے۔ چنانچہ آگے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت بیان ہوئی ہے جس سے اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے تند پوربی ہوا کے تصرف سے نجات دی اور اسی ہوا کے سکون کو فرعون اور اس کی فوجوں کی تباہی کا ذریعہ بنا دیا۔

وَالسّٰبِحٰتِ سَبۡحًا ۙ فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا ۙ فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا (۳-۵)

'سٰبِحٰتٌ' 'سَبۡحٌ' سے ہے جس کے معنی تیرنے کے بھی آتے ہیں۔ قرینہ اشارہ کر رہا ہے کہ یہاں یہ بادلوں کی صفت کے طور پر آیا ہے۔ اول تو ہواؤں اور بادلوں کا تعلق ہے ہی کچھ لازم و ملزوم سی چیز لیکن ایک واضح قرینہ یہاں یہ ہے کہ اس کے بعد اس کی دو صفتیں جو مذکور ہوئی ہیں وہ 'ف' کے ساتھ مذکور جو عربیت کے قاعدے سے اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ صفتیں 'سٰبِحٰت' ہی کی ہیں اور ان میں باہم دگر ترتیب بھی ہے۔ اس قاعدے کی وضاحت پچھلی سورتوں میں ہو چکی ہے۔

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ 'فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا ۙ فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا' کے الفاظ میں بادنیٰ تغیرِ الفاظ وہی بات فرمائی گئی ہے جو سورۂ ذاریات میں 'فَالۡجٰرِیٰتِ یُسۡرًا ۙ فَالۡمُقَسِّمٰتِ اَمۡرًا' کے الفاظ میں اور سورۂ مرسلات میں 'فَالۡفٰرِقٰتِ فَرۡقًا ۙ فَالۡمُلۡقِیٰتِ ذِكۡرًا' کے لفظوں میں فرمائی گئی ہے۔ مذکورہ سورتوں کی تفسیر میں یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ یہ بادلوں سے لدی ہوئی ان ہواؤں کی صفت ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس سرزمین کی طرف چلتی ہیں جس کے لیے حکم ہوتا ہے اور پھر وہاں وہ امرِ الٰہی کی تقسیم کرتی ہیں یعنی جن کے لیے حکم ہوتا ہے اس کی تعمیل کرتی ہیں۔ کسی علاقے پر وہ رحمت بن کر برستی ہیں اور کسی کے لیے عذاب بن جاتی ہیں۔ کسی جگہ جل تھل کر دیتی ہیں اور کسی جگہ کو خشک یا تشنہ چھوڑ

جاتی ہیں۔ گویا جو بات سورۂ ذاریات میں فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے وہی بات یہاں فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا کے الفاظ میں ارشاد ہوئی ہے۔

اس سے پہلے فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا کے الفاظ بادلوں کی اس بھاگ دوڑ کی تصویر پیش کر رہے ہیں جو فضا میں اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب ان کے مختلف دستے ایک دوسرے پر سبقت کرتے دیکھے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سب اپنے غیبی حاکم کے حکم کی تعمیل میں سرگرم تگاپو ہیں اور ہر ایک اس بات کا آرزومند ہے کہ امتثال امر میں اول نمبر اسی کا رہے۔

مقسم علیہ محذوف ہے — ان قسموں کا مقسم علیہ یہاں لفظوں میں مذکور نہیں ہے بلکہ محذوف ہے۔ مقسم علیہ کے محذوف ہونے کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ سورۂ صٓ، سورۂ قٓ اور سورۂ قیامہ سب میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ مقسم علیہ حذف کر دیا گیا ہے۔ جہاں ذکر کی کوئی خاص ضرورت نہ ہو وہاں حذف ہی اولیٰ ہوتا ہے۔ یہاں چونکہ قیامت کی ہلچل کا ذکر آگے تفصیل سے موجود ہے، جو مقسم علیہ کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے، اس وجہ سے اس کے ذکر کی کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ اس محذوف کو کھولنا چاہیں تو سورۂ مرسلات کی روشنی میں اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ کے الفاظ یہاں محذوف مان سکتے ہیں۔ گویا تند اور نرم ہواؤں اور بادلوں کے عجائب تصرفات کو شہادت میں پیش کر کے قریش کے متمردین کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ تمھیں جس عذاب سے ڈرایا جا رہا ہے اس کو بعید از امکان نہ سمجھو۔ اللہ تعالیٰ جب اس کو لانا چاہے گا تو اس کے لیے کوئی خاص اہتمام اس کو نہیں کرنا پڑے گا۔ اس کی ہواؤں اور اس کے بادلوں کے تصرفات کی جو تاریخ موجود ہے اور جو تمھیں سنائی بھی جا چکی ہے اگر اسی سے سبق حاصل کرو تو وہی تمھارے لیے کافی ہے۔ تم سے کہیں زیادہ طاقتور قومیں اس زمین پر بسی ہیں جن کو خدا نے اپنی ہواؤں ہی کے ذریعہ سے خس و خاشاک کی طرح اڑا دیا۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۙ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ (۶-۷)

یہ مقسم علیہ نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے گمان کیا ہے، بلکہ اس دن کی یاددہانی ہے جس دن اس عذاب سے سابقہ پیش آئے گا جس سے ان کو ڈرایا جا رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے اپنی قوموں کو دو عذابوں سے ڈرایا ہے۔ ایک اس عذاب سے جس سے قیامت کے دن دوچار ہونا پڑے گا۔ دوسرے اس عذاب سے جس سے اسی دنیا میں قوم کو سابقہ پیش آتا ہے۔ اگر وہ اپنے رسول کی تکذیب کر دیتی ہے۔

قیامت کے عذاب کی یاددہانی — پہلے آیات ۶-۱۴ میں عذاب قیامت کی تصویر ہے اس کے بعد آیات ۱۶-۲۶ میں اس عذاب کی تاریخی شہادت پیش کی گئی ہے جو تکذیب رسول کے نتیجہ میں اس دنیا میں پیش آتا ہے۔ عذاب قیامت کا ذکر یہاں اس لیے مقدم کر دیا ہے کہ اصل عذاب وہی ہے جس سے ہر ایک کو ہوشیار

رہنا چاہیے۔ وہ دائمی اور ابدی ہے۔ اس کے ہوتے دنیا کا عذاب نہ بھی ہو جب بھی کسی کے لیے کوئی اطمینان کا پہلو نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مزید اہتمام ہے کہ وہ رسولوں کی تکذیب کرنے والوں پر اس دنیا میں بھی عذاب نازل کرتا ہے۔

یہاں 'یومَ' سے پہلے فعل محذوف ہے۔ یعنی اس دن کو یاد رکھو یا اس کے ہم معنی کوئی فعل۔ 'رَاجِفَۃٌ' کے معنی کپکپی اور زلزلہ کے ہیں اور 'رَادِفَۃٌ' کے معنی پہلے جھٹکے کے بعد دوسرے جھٹکے کے۔ قیامت کی ہلچل، جیسا کہ دوسرے مقامات میں وضاحت ہو چکی ہے۔ صور کی دو پھونکوں میں مکمل ہوگی۔ یہاں انہی دونوں پھونکوں کے اثرات کی طرف اشارہ ہے۔ مقصود اس سے مکذّبینِ قیامت پر اس حقیقت کا اظہار ہے کہ قیامت کے ظہور کو بہت مستبعد اور ناممکن نہ سمجھو۔ بس دو جھٹکوں میں یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

قُلُوْبٌ یَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَۃٌ ۙ اَبْصَارُھَا خَاشِعَۃٌ (۸-۹)

اس دن کا اثر لوگوں کے دلوں پر

اوپر کی آیات میں اس دن کی ہلچل کے وہ اثرات بیان ہوئے ہیں جو اس کائنات میں نمودار ہوں گے۔ ان آیات میں اس کے ان اثرات کی طرف اشارہ ہے جو ارواح و قلوب پر طاری ہوں گے۔ فرمایا کہ اس دن کتنے دل ہوں گے جو دھڑک رہے ہوں گے اور ان کی نگاہیں سراسیمگی کے سبب سے جھکی ہوئی ہوں گی۔ یہ ان لوگوں کا حال بیان ہو رہا ہے جو اس دن سے نچنت رہے اور جب انھیں اس سے ڈرایا جاتا تو نہایت ڈھٹائی سے اس کا مذاق اڑاتے۔ رہے وہ لوگ جو اس دنیا میں، اس عذاب کو دیکھے بغیر، اس سے ڈرتے رہے وہ، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات میں تصریح ہے، اس دن کی گھبراہٹ سے بالکل محفوظ ہوں گے۔

'اَبْصَارُھَا' میں ضمیر کا مرجع 'قُلُوْبٌ' ہے۔ آدمی کے اندر دل ہی وہ چیز ہے جس سے اس کی شخصیت عبارت ہے اور جس کی کیفیات کی ترجمانی اس کے بدن کا رواں رواں کرتا ہے۔ خاص طور پر اس کی آنکھ تو وہ چیز ہے جس کے آئینہ میں اس کے دل کی مخفی سے مخفی کیفیت بھی جھلکتی ہے۔ دل کے ساتھ آنکھوں کے اس تعلق کے سبب سے ان کی اضافت دل کی طرف کر دی ہے۔

یَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِی الْحَافِرَۃِ ؕ ءَاِذَا کُنَّا عِظَامًا نَّخِرَۃً ؕ قَالُوْا تِلْکَ اِذًا کَرَّۃٌ خَاسِرَۃٌ (۱۰-۱۲)

کفار کے استہزاء کی تصویر

یہ تصویر ہے ان کے اس مذاق کی جو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کا ذکر سن کر وہ نہایت بے باکی سے کرتے۔

'حَافِرَۃٌ' کے اصل معنی نقشِ قدم کے ہیں لیکن محاورے میں اگر کہیں کہ 'فلان رجع علی حافرتہ او فی حافرتہ' تو اس کے معنی ہوں گے کہ فلاں شخص جس حال میں تھا اس سے نکل کر پھر الٹے پاؤں

اسی میں واپس آ گیا۔

یعنی جب انھیں ڈرایا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد حساب کتاب کے لیے زندہ کیے جاؤ گے تو وہ اس کا مذاق اڑاتے اور ایک دوسرے سے باندازِ استہزا پوچھتے ہیں کہ کیوں جی! کیا مر جانے اور بوسیدہ ہڈیاں ہو جانے کے بعد پھر ہم زندگی کی حالت میں لوٹائے جائیں گے!

'ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً' میں استفہام کا اعادہ ان کی افزونیِ حیرت کو ظاہر کرتا ہے کہ اول تو مرنے کے بعد از سرِ نو زندہ کیے جانے کا تصوّر ہی عجیب ہے لیکن اس سے بھی عجیب تر ماجرا یہ ہے کہ جب ہڈیاں بھی بوسیدہ ہو کر خاک میں مل جائیں گی تب لوگ زندہ کیے جائیں گے! ــــ مطلب یہ ہے کہ بھلا ایسی بعید از عقل و قیاس بات کون مان سکتا ہے!

'قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ' یعنی مذاق اڑانے کے بعد ذرا سنجیدہ موڈ بنا کر یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر یہ بات، جو یہ ملّا کہتے ہیں سچی نکلی تب تو یہ بڑی ہی نامرادی اور بڑے ہی خسارے کا لوٹنا ہوگا!

اگرچہ یہ بات سنجیدہ موڈ بنا کر کہتے وہ مذاق ہی کے طور پر لیکن یہ ان کے باطن کی غمازی بھی کرتی ہے کہ قیامت کی تکذیب پر ان کا دل مطمئن نہیں تھا۔ وہ اس کے دلائل کے وزن کو محسوس کرتے اور اس کے انکار کے عواقب سے ڈرتے لیکن زندگی کی لذتوں کو طلاق دے کر ان کی طبیعت ادھر آنے پر آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ اس وجہ سے اس خطرے کو ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کرتے اور کہتے کہ قیامت ہوئی تو ہے تو یہ بہت بڑا خطرہ لیکن جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا، ابھی سے اس کی فکر میں اپنے اوپر نیند حرام کیوں کی جائے! یہ امر یہاں واضح رہے کہ بے فکروں کا اصلی فلسفہ یہی ہے جس پر وہ زندگی گزارتے ہیں حالانکہ آخرت کا گمان اگر کسی درجے میں بھی ہے تو پھر دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ آدمی اس کو پیشِ نظر رکھ کر ہی زندگی گزارے۔

فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ (۱۳-۱۴)

یعنی جو سخن سازیاں یہ کرنی چاہتے ہیں کر لیں اور جتنے محالات پیدا کر سکتے ہیں کر لیں لیکن یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ جب ان کو اٹھانا چاہے گا تو نہ اس کو کوئی اہتمام کرنا پڑے گا، نہ اس میں ایک لمحہ کی تاخیر واقع ہوگی۔ صرف ایک ہی ڈانٹ میں یہ قبروں سے نکل کر میدانِ حشر میں موجود ہوں گے۔

'سَاهِرَةٌ' ہموار زمین اور کھلے میدان کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے میدانِ حشر مراد ہے۔ 'ایک ڈانٹ' سے اشارہ یہاں صور کے دوسرے نفخہ کی طرف ہے۔ اس کی وضاحت سورۂ زمر میں یوں فرمائی ہے: 'ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ' (الزمر - ۳۹ : ۶۸) (پھر اس صور میں دوبارہ پھونک ماری جائے گی تو وہ دفعۃً اٹھ کر تاکنے لگیں گے)۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۘ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (۱۵-۱۶)

تکذیبِ رسول کے نتیجہ میں جو عذاب آتا ہے اس کی شہادت

اوپر کے پیرے میں عذابِ قیامت کی تصویر تھی۔ اب یہ اس عذاب کی تاریخی شہادت کا حوالہ ہے جس سے رسولوں کے جھٹلانے والوں کو اس دنیا میں سابقہ پیش آیا ہے۔ اس کے لیے حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت کا انتخاب فرمایا ہے جو سب سے زیادہ مشہور و معروف شہادت ہے۔

'هَلْ اَتٰىكَ' کا سوال محض سرگزشت کی عبرتوں کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہے اور واحد کا خطاب ضروری نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہو بلکہ ہم جگہ جگہ وضاحت کرتے آرہے ہیں کہ یہ خطاب عام بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ سرگزشت کے آخر میں فرمایا بھی ہے کہ 'اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰی' (۲۶) (بے شک اس سرگزشت کے اندر ان لوگوں کے لیے بڑا درسِ عبرت ہے جو خدا کی گرفت سے ڈرنے والے ہیں)۔

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشتِ حیات کے اس ماجرے کی طرف اشارہ ہے جب وہ مدین سے واپس ہوتے ہوئے طور کے دامن میں پہنچے ہیں اور آگ کی چمک دیکھ کر آگ لینے یا راستہ معلوم کرنے کے لیے رات کے اندھیرے میں، وادیٔ طویٰ کی طرف گئے ہیں اور وہاں ان کو ایک درخت سے آواز آئی ہے کہ اے موسیٰ، میں تمھارا رب ہوں۔ میں نے تمھیں ایک کارِ عظیم کے لیے منتخب کیا تو تم فرعون کے پاس میرے رسول کی حیثیت سے جاؤ اور اس کو میرا پیغام پہنچاؤ۔

یہ سرگزشت یہاں چھوٹی چھوٹی کل بارہ آیتوں میں بیان ہوئی ہے لیکن قرآن کے ایجازِ بیان کا اعجاز ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رسول ہونے سے لے کر فرعون کے غرق ہونے تک کے سارے مراحل اس میں اس طرح بیان ہو گئے ہیں کہ کوئی ایسا پہلو چھوٹنے نہیں پایا ہے جو مخاطبوں کی سبق آموزی کے لیے ضروری ہو۔

اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ۝ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤی اَنْ تَزَكّٰی ۝ وَاَهْدِیَكَ اِلٰی رَبِّكَ فَتَخْشٰی (۱۷-۱۹)

یہ وہ پیغام ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے کر فرعون کے پاس بھیجا۔ فرمایا کہ فرعون کے پاس جاؤ اس نے بہت سر اٹھایا ہے۔ 'طَغٰی' سے مراد یہاں اس کے ربِّ اعلیٰ ہونے کا دعویٰ اور بنی اسرائیل کے ساتھ جبارانہ رویہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خدائی میں کسی کا یہ دعویٰ کہ وہ لوگوں کا ربِّ اعلیٰ ہے سب سے بڑی بغاوت ہے۔ اس بغاوت کی سرکوبی کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی خاص سند کے ساتھ اس کے پاس بھیجا کہ وہ پہلے اس کو نرمی کے ساتھ راہِ راست اختیار کرنے کی دعوت دیں، اگر سمجھ جائے تو فبہا ورنہ اس کے انجام سے اس کو آگاہ کر دیں۔

'فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤی اَنْ تَزَكّٰی' یعنی اس سے کہو کہ کیا تم میں کچھ رغبت پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی ہے کہ میں تمھیں اس کا طریقہ بتانے کی کوشش کروں؟ اس فقرے پر غور فرمائیے تو معلوم ہو گا کہ اس میں بیک وقت انتہائی درجے کی ناصحانہ شفقت بھی ہے اور ساتھ ہی وہ عظمت و جلالت بھی جو اللہ تعالیٰ یا اس کے سفیر کے

کلام میں ہونی چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تک تمھاری جو روش رہی ہے وہ تو یہی بتاتی ہے کہ تم سے کسی خیر کی توقع نہ رکھی جائے لیکن اللہ تعالیٰ بڑا کریم ہے۔ اب بھی گنجائش ہے کہ اگر تم سلامت روی کی زندگی اختیار کرنے کی رغبت ظاہر کرو تو یہ رستہ تم کو دکھانے کی کوشش کی جائے۔

فرعون کو حصول تزکیہ کی دعوت

لفظ 'تَزَکّٰی' یہاں وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی خود سری، انانیت اور ظلم اور جور سے پاک زندگی جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے بندے کی ہوتی ہے۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا اصل مقصد لوگوں کے نفوس کا تزکیہ ہی رہا ہے۔ یہ کام انھوں نے اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کی آیات کے ذریعہ سے انجام دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ارشاد ہے کہ ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ (الجمعۃ - ۶۲: ۲) (وہی ہے جس نے بھیجا امیوں میں ایک رسول انہی میں سے جو ان کو سناتا ہے اس کی آیات اور ان کو پاکیزہ بناتا ہے) اپنے اسی مقصد کا اظہار حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے سامنے فرمایا کہ اگر تم خدائی کے پندار سے ذرا الگ ہو کر اپنی اصلاح کی طرف مائل ہو تو میں تم کو اللہ کی کچھ باتیں سناؤں۔

'وَاَھْدِیَکَ اِلٰی رَبِّکَ فَتَخْشٰی' یعنی اس وقت تو تمھارے اوپر اپنی خدائی کا بھوت سوار ہے اس وجہ سے بالکل بگٹٹ چل رہے ہو لیکن بات سننے اور سمجھنے کا کچھ شوق ہو تو میں بتاؤں کہ تمھارا اور تمام جہان کا رب کون ہے جس سے سب کو ڈرنا چاہیے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ پاکیزہ زندگی خدا کی خشیت سے اور خدا کی خشیت اس کی صحیح معرفت سے پیدا ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان دو فقروں میں فرعون کو اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی۔

فَاَرٰىہُ الْاٰیَۃَ الْکُبْرٰی (۲۰)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ باتیں چونکہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی حیثیت سے فرمائیں اور ساتھ ہی فرعون کو اس بات سے بھی آگاہ فرمایا کہ وہ اپنے پاس خدا کے رسول ہونے کی سند بھی رکھتے ہیں تو فرعون نے کہا کہ میں تو اپنے سوا کسی اور رب سے واقف نہیں، اگر تمھارے پاس خدا کے رسول ہونے کی کوئی سند ہے تو وہ دکھاؤ۔ اس کے اس مطالبے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو بڑی نشانی دکھائی۔ 'بڑی نشانی' سے اشارہ عصا کی نشانی کی طرف ہے۔ اس کو بڑی نشانی سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ ید بیضاء کے سوا ان کے سارے معجزات درحقیقت اسی کے اندر مضمر تھے اور اسی کے ذریعہ سے ظاہر ہوئے۔

فَکَذَّبَ وَعَصٰی (۲۱)

فرعون کی سرگزشت

یعنی اس معجزہ کو دیکھنے کے بعد بھی فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا کا رسول تسلیم نہیں کیا بلکہ ان کو ساحر اور مفتری ٹھہرایا اور ان کی تکذیب کر دی۔ 'وَعَصٰی' یعنی اس دعوت کو جو اوپر آیات ۱۸-۱۹

میں مذکور ہوئی ماننے سے انکار کر دیا۔

ثُمَّ اَدْبَرَ یَسْعٰی (۲۲)

یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی باتیں سن کر ہٹا تو ان کو شکست دینے کی سرگرمیوں میں مصروف ہو گیا۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں ان سرگرمیوں کی تفصیل موجود ہے۔ اس نے چاہا کہ جادوگروں سے مقابلہ کرا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو شکست دی جائے لیکن درباریوں سے مشورہ کیا تو انھوں نے یہ رائے دی کہ یہ دونوں (موسیٰ اور ہارون علیہما السلام) بڑے ماہر جادوگر ہیں، عام جادوگروں سے ان کا مقابلہ کرانا شکست اور جگ ہنسائی کا سبب ہو سکتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ مملکت کے تمام اطراف کے ماہر جادوگروں کو دعوت دی جائے اور ایک کھلے میدان میں ان دونوں سے ان کا مقابلہ کرایا جائے۔ چنانچہ اس مشورے پر عمل کیا گیا لیکن اس کا نتیجہ شدید ناکامی کی صورت میں نکلا۔

فَحَشَرَ فَنَادٰی ۝ فَقَالَ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (۲۳-۲۴)

یہ فرعون کی اس تدبیر کی طرف اشارہ ہے جو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کے لیے سب سے آخر میں اختیار کی ہے۔ سورۂ زخرف سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مصر پر کوئی آفت آتی تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کرتا کہ وہ اپنے رب سے دعا کریں کہ یہ بلا ٹل جائے، اگر ان کی دعا سے یہ بلا ٹل گئی تو وہ ان کا مطالبہ ضرور تسلیم کر لے گا لیکن جب وہ بلا ٹل جاتی تو وہ پھر اپنے وعدے سے مکر جاتا۔ اس کی بار بار کی اس روش کا اثر یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سچائی کا اثر خود قبطیوں میں بہت بڑھنے لگا۔ اس سے گھبرا کر فرعون نے قوم کے تمام با اثر افراد کو جمع کیا اور ان کے اندر اپنا اثر بحال کرنے کی کوشش کی۔ اس موقع پر اس نے جو تقریر کی اسی کی طرف یہاں اجمالی اشارہ ہے۔ اس کی تفصیل سورۂ زخرف میں ہے:

وَنَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِہٖ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْکُ مِصْرَ وَہٰذِہِ الْاَنْہٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ج اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ ہٰذَا الَّذِیْ ہُوَ مَہِیْنٌ ۝ وَّلَا یَکَادُ یُبِیْنُ ۝ فَلَوْلَآ اُلْقِیَ عَلَیْہِ اَسْوِرَۃٌ مِّنْ ذَہَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَہُ الْمَلٰٓئِکَۃُ مُقْتَرِنِیْنَ ۝ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَہٗ فَاَطَاعُوْہُ ط اِنَّہُمْ کَانُوْا

اور فرعون نے اپنی قوم میں پکارا کہ کیا مصر کی بادشاہی اور یہ نہریں جو میرے نیچے جاری ہیں، میرے لیے نہیں ہیں؟ کیا تم لوگ دیکھ نہیں رہے ہو؟ تو یہ بہتر ہوا یا میں اس سے بہتر ہوں جو ایک حقیر آدمی ہے اور اپنی بات کھل کر کہہ بھی نہیں سکتا ہے (اگر یہ خدا کا رسول ہے) تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس پر سونے کے کنگن اتارے جاتے یا اس کے ساتھ فرشتے پرے باندھ کر آتے؟ ان باتوں سے

قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ٥ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ٥ (الزخرف - ۴۳: ۵۴ - ۵۵)	اس نے اپنی قوم کو بے وقوف بنا لیا اور وہ تھے ہی نافرمان لوگ۔ تو جب انھوں نے ہم کو غصہ دلا دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا پس ان سب کو غرق کر دیا۔

فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى (۲۵)

'نَکَال' کے معنی عبرت انگیز عذاب کے ہیں۔ یعنی جب اس نے سب کچھ دیکھا اور سن لینے کے بعد بھی اپنی سرکشی ہی پر اصرار کیا تو اللہ نے اس کو آخرت اور دنیا دونوں کے عذاب میں پکڑا۔ دنیا میں وہ سمندر کی موجوں کے حوالہ ہوا اور آخرت میں جہنم کے عذاب میں جھونک دیا جائے گا۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى (۲۶)

یہ وہ مقصد بیان ہوا ہے جس کے لیے یہ سرگزشت سنائی گئی ہے۔ فرمایا کہ اس میں ان لوگوں کے لیے بڑا درسِ عبرت ہے جو خدا کی پکڑ سے ڈرنے والے ہوں۔ بات اگرچہ عام صیغہ سے فرمائی گئی ہے لیکن اشارہ خاص طور پر قریش کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے اندر کچھ خوفِ خدا ہے تو وہ اس سے سبق حاصل کریں اور دانش مند وہی ہے جو دوسروں کے انجام سے سبق حاصل کرے نہ کہ خود اپنے اوپر سیلاب بلا گزر جانے کا انتظار کرے۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰىهَا (۲۷)

اب آگے کی سات آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور ربوبیت کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو آسمان و زمین کے ہر گوشے میں پھیلی ہوئی ہیں اور اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ اس دنیا کا خالق ایسی عظیم قدرت والا ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا کام بھی اس کے لیے مشکل نہیں ہے۔ جب وہ آسمان جیسی عظیم چیز کو پیدا کر سکتا ہے تو لوگوں کے مرکھپ جانے کے بعد ان کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا اس کے لیے کیا دشوار ہے؟ اسی طرح آسمان سے لے کر زمین تک اپنی ربوبیت کا جو اہتمام اس نے پھیلا رکھا ہے وہ اس بات کا شاہد ہے کہ وہ لوگوں کو غیر مسئول نہیں چھوڑے گا بلکہ ایک دن لازماً سب کو اکٹھا کرے گا اور یہ دیکھے گا کہ کس نے اس کی نعمتوں کا حق پہچانا اور کس نے ناشکری کی اور پھر ان کے اعمال کے مطابق ان کو جزا یا سزا دے گا۔ گویا منکرین قیامت کے جس شبہے کا آیات ۱۰ - ۱۲ میں حوالہ دیا گیا ہے اس کا جواب بھی دے دیا گیا اور ساتھ ہی قیامت کی ضرورت اور حکمت بھی واضح فرما دی گئی ہے۔

آسمان و زمین کی نشانیوں سے استدلال

'ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰىهَا'۔ فرمایا کہ اگر تمھیں اس بات پر تعجب ہے کہ مرنے اور ہڈیوں کے بوسیدہ ہو جانے کے بعد تم دوبارہ کس طرح زندہ کیے جا سکتے ہو تو سوچو کہ یہ عظیم آسمان جو تمھارے سروں پر پھیلا ہوا ہے، اس کو پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا تمھارا پیدا کیا جانا؟ اگر اس کائنات کا خالق

اس آسمان کے بنانے پر قادر ہو سکتا ہے تو دوسرا کون سا کام ہے جو اس سے زیادہ مشکل ہے کہ وہ اس پر قادر نہ ہو سکے گا!

رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۙ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا (۲۸ - ۲۹)

یہ آسمان کے اندر خدا کی عظیم قدرت و حکمت کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے تاکہ جو لوگ دوبارہ پیدا کیے جانے کو بعید از امکان سمجھ رہے ہیں وہ غور کریں کہ جس خدا کی قدرت کی یہ شانیں وہ ہر وقت دیکھ رہے ہیں اس کے لیے کسی کام کے ناممکن ہونے کا کیا سوال؟

'سَمْكٌ' کے معنی چھت کے ہیں۔ فرمایا کہ اس نے آسمان کو بنایا، اس کی چھت کو بلند کیا اور پھر اس کو اس طرح ہموار کیا کہ کسی کے امکان میں نہیں کہ اس کے کسی کونے میں کسی خلل کی نشاندہی کر سکے۔

'وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا' یعنی پہلے اس کے اندر رات ہی رات تھی۔ وہ جیسا کہ سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں اشارہ ہے، دھوئیں کی شکل میں تھا۔ لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی رات ڈھانک دی۔ اس کے حصہ کی روشنی نمودار کی، رات اور دن دونوں کو ایک نظام کا پابند بنا دیا۔ مطلب یہ ہے کہ جو خدا اس جہان پر رات طاری کر دینے پر قادر ہے، کیا اس کے لیے دنیا کے مرکھپ جانے کے بعد اس کو دوبارہ پیدا کرنا ناممکن ہو جائے گا؟ زیادہ مشکل پہلا کام ہے یا دوسرا؟

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ؕ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ۠ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ۙ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (۳۰ - ۳۳)

آسمان کی نشانیوں کے بعد یہ زمین اور اس کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی اور مقصود اس سے بھی، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، خدا کی قدرت اور اس کی پروردگاری کی طرف توجہ دلانا ہے کہ جس خدا نے زمین کو ہمارے لیے بچھایا، اس کے اندر سے اس کا پانی اور چارہ نکالا، اس کے توازن کو قائم رکھنے کے لیے اس کے اندر پہاڑوں کو گاڑا، کیا تم کو دوبارہ پیدا کرنا اس کے لیے مشکل ہو جائے گا؟ جب اس نے یہ سارے کام کیے اور اس کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی تو آپ اپنی ہی پیدا کی ہوئی مخلوق کو دوبارہ پیدا کر دینا کیوں دشوار ہو جائے گا!

'مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ' یہ اس ربوبیت کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس زمین کے چپہ چپہ پر نمایاں ہے۔ فرمایا کہ دیکھو تو معلوم ہو گا کہ تمہارے رب نے صرف تمہاری ہی ضرورت کا سامان نہیں کیا ہے بلکہ تمہاری خدمت کے لیے جو چوپائے پیدا کیے ہیں، ان کی ما یحتاج کا بھی پورا انتظام فرمایا ہے۔ اب غور کرو کہ جس پروردگار نے تمہاری پرورش کے لیے آسمان سے لے کر زمین تک یہ اہتمام فرمایا ہے کیا اس نے تمہیں محض اس لیے پیدا کیا ہے کہ کچھ عرصہ تک اس زمین میں کھاؤ پیو اور ایک دن ختم ہو جاؤ؟ اس سے اس کو کچھ بحث نہیں کہ تم میں سے کس نے نیکی کی زندگی بسر کی اور کس نے بدی کی؟ کس نے اپنے رب کی نعمتوں کا

حق پہچانا اور کس نے اندھے بہرے پن کی زندگی گزاری؟

غور کرو تو معلوم ہوگا کہ یہ مفروضہ بالکل باطل ہے۔ یہ مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ دنیا محض ایک بازیچۂ اطفال ہے۔ اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ العیاذ باللہ اس کا خالق حکیم نہیں، بلکہ ایک کھلنڈرا ہے جس کے نزدیک نیکی اور بدی میں کوئی امتیاز سرے سے ہے ہی نہیں ـــــ غور کیجیے کہ کیا اس کائنات کے عظیم خالق کے متعلق ایک لمحہ کے لیے بھی یہ تصور کیا جا سکتا ہے!

ایک سوال اور اس کا جواب

'وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا' کے الفاظ سے ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا زمین کی خلقت آسمان کے بعد ہوئی ہے؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ حٰمٓ السجدۃ کی آیت ۱۱ میں زمین اور اس کی بعض اہم نشانیوں کی تخلیق کے بعد فرمایا ہے کہ 'ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِىَ دُخَانٌ' (پھر اس نے آسمان کی طرف توجہ فرمائی اور وہ اس وقت دھوئیں کی شکل میں تھا) جس سے یہ گمان گزرتا ہے کہ آسمان کی تخلیق زمین کے بعد ہوئی ہے ـــــ اس سوال کا جواب ہم حٰمٓ السجدۃ کی مذکورہ آیت کے تحت دے چکے ہیں۔ براہِ کرم اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

یہاں اجمالاً صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ قرآن نے آسمان اور زمین کی تعمیر سے متعلق جو تصور دیا ہے وہ ایک مکان کی صورت میں دیا ہے جس میں آسمان کی حیثیت چھت کی اور زمین کی حیثیت فرش کی ہے۔ کسی مکان کا نقشہ جب بنایا جاتا ہے تو اس میں چھت اور فرش دونوں بیک وقت مدنظر ہوتے ہیں اور دونوں کا خاکہ ایک ہی ساتھ تیار کر لیا جاتا ہے لیکن تعمیر کے مختلف مراحل میں کبھی فرش اور اس کے متعلقات پر کام ہوتا ہے اور کبھی چھت اور اس کے اطراف پر۔ اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہلے آسمان پیدا ہوا یا زمین۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں اگرچہ باوّل وہلہ ذہن اس طرف جاتا ہے کہ پہلے زمین کی تخلیق ہوئی لیکن ساتھ ہی اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جب خالق نے آسمان کی تعمیر کا قصد فرمایا تو وہ دھوئیں (یا سائنس دانوں کی اصطلاح میں سحابیے کی شکل میں) موجود تھا۔ اسی طرح یہاں زیر بحث آیت میں اگرچہ بتبادر یہی ہوتا ہے کہ آسمان پہلے وجود میں آیا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ ایک خاص مرحلۂ تعمیر کی بات ہو جس کے بعد زمین کی تعمیر کا آخری مرحلہ (یعنی اس کا بچھایا جانا) عمل میں آیا ہو۔ اس عظیم اور ناپیدا کنار کائنات کی تعمیر کا معاملہ ایسا نہیں ہے جو ہماری محدود عقل کی گرفت میں آ سکے۔ اس کے تمام مراحل کا احاطہ اللہ تعالیٰ کا محیطِ کل علم ہی کر سکتا ہے۔

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى (۳۴)

'اَلطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى' کے معنی بڑی ہلچل اور بڑے ہنگامہ کے ہیں۔ مراد اس سے قیامت ہے۔ اس کے بعد اس شرط کا جواب برنبائے قرینہ محذوف ہے۔ اس طرح کے حذف کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں اور اس کی بلاغت بھی ہم واضح کر چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ بڑا ہنگامہ برپا ہوگا تو یہ

آسمان و زمین سب درہم برہم ہو جائیں گے۔

يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ مَا سَعٰى (۳۵)

یہ 'یَوْمَ' جواب شرط محذوف کا ظرف ہے جس طرح آیت ۶ میں 'یَوْمَ' مقسم علیہ محذوف کا ظرف ہے۔ یعنی اس دن انسان اپنے کیے کو یاد کرے گا۔ آج تو اس کو غفلت کی سرمستی میں کچھ ہوش نہیں کہ وہ کیا بنا رہا ہے، جب اس کو اس دن سے ڈرایا جاتا ہے تو اس کا مذاق اڑاتا ہے، لیکن اس دن اس کو ہوش آئے گا اور وہ دیکھے گا کہ وہ دنیا میں کیا کمائی کر کے آیا ہے۔

وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى (۳۶)

جہنم تیار ہے صرف پردہ اٹھنے کی دیر ہے

آج تو اسے آخرت اور جہنم بہت بعید از امکان نظر آتی ہے لیکن اس دن جہنم ان لوگوں کے لیے بے نقاب کر دی جائے گی جن کو اس سے دوچار ہونا ہے۔ 'بے نقاب کر دی جائے گی'، یعنی وہ بالکل تیار ہے۔ بس پردہ اٹھنے کی دیر ہے۔ پردہ اٹھتے ہی وہ ان سب کے سامنے ہوگی جو اس کو آنکھوں دیکھے بغیر ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

'لِمَنْ يَّرٰى' یعنی جن کے لیے، ان کے اعمال کی پاداش میں، اس کا دیکھنا مقدر ہے وہ اس کو دیکھیں گے۔ رہے اللہ کے وہ بندے جو بن دیکھے ہی اس سے لرزاں و ترساں رہے ہیں۔ اللہ ان کو اس سے دور رکھے گا۔ وہ اس کی آہٹ بھی نہیں سنیں گے۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۙ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۙ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى (۳۷-۳۹)

فرمایا کہ جس نے اس دنیا میں سرکشی کی ہوگی اور دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی ہوگی اس دن اس کا ٹھکانا بس جہنم ہی بنے گی جس سے اس کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا۔ پیچھے آیت ۱۷ میں فرعون کے طغیان کا ذکر گزر چکا ہے یہاں 'اٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا' سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اس طغیان میں وہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں جو آخرت کو نظرانداز کر کے اسی دنیا کے پجاری بن جاتے ہیں، اس سے الگ ہو کر وہ کسی چیز کو سوچنے اور ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔

'فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى' میں حصر کا مضمون ہے یعنی پھر ان کے لیے جہنم ہی جہنم ہے' کوئی اور راہ ان کے لیے کھلنے والی نہیں ہے۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۙ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (۴۰-۴۱)

البتہ وہ لوگ جو اپنے رب کے حضور پیشی سے ڈرتے رہے اور دنیا کے پیچھے بھاگنے کے بجائے جنھوں نے اپنے نفس کو خواہشوں کی پیروی سے روکا تو ان کا ٹھکانا بس جنت ہی ہوگی وہ اس سے کبھی محروم نہ ہوں گے۔

'مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ' سے مراد خدا کے حضور پیشی سے ڈرنا ہے۔ سورۂ مطفّفین میں اس کی وضاحت یوں آئی ہے:

اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّھُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۙ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ ۙ یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ (المطفّفین - ۸۳: ۴-۶)	کیا وہ یہ گمان نہیں رکھتے کہ وہ ایک بھاری دن کی حاضری کے لیے اٹھائے جانے والے ہیں؟ جس دن لوگ خداوندِ عالم کے حضور پیشی کے لیے اٹھیں گے!

اسی پیشی کا ڈر ہے جو انسان کو خواہشوں کی پیروی سے روکتا ہے۔ یہ ڈر نہ ہو تو نفس کو خواہشوں کے پیچھے بھاگنے سے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔

یَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰھَا (۴۲)

نبی صلعم کو تسلی

یہ اور اس کے بعد خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تم ان لوگوں کی پروا نہ کرو جو تمھیں زچ کرنے کے لیے قیامت کے ظہور کا وقت پوچھتے ہیں۔ تمھارا کام اس سے لوگوں کو آگاہ کر دینا ہے تاکہ جو متنبہ ہونا چاہیں وہ متنبہ ہو جائیں۔ رہے وہ جو اس کو دیکھ کر ماننا چاہتے ہیں اور اس کے ظہور کا وقت معلوم کرنے کے درپے ہیں ان کو مطمئن کرنا تمھاری ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ انھوں نے محض اس کی تکذیب کے لیے ایک بہانہ بنایا ہے۔

'اَیَّانَ مُرْسٰھَا' یعنی یہ اس کے ظہور کے وقت سے متعلق سوال کرتے ہیں۔ 'اَیَّانَ' وقتِ مستقبل سے متعلق سوال کے لیے آتا ہے اس وجہ سے اس کا ترجمہ میرے نزدیک 'کہاں' صحیح نہیں ہوگا بلکہ 'کب' ہونا چاہیے۔

'مُرْسٰی' کے معنی لنگر انداز ہونے کے ہیں۔ اس لفظ میں یہاں ایک قسم کا طنز مضمر ہے۔ یعنی یہ منکرین پوچھتے ہیں کہ ہم کب سے یہ خبر سن رہے ہیں کہ بس قیامت آیا ہی چاہتی ہے لیکن اس کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ آخر اس کا سفینہ ہمارے ساحل میں کب لنگر انداز ہوگا! اس کے انتظار میں تو ہماری آنکھیں پتھرا گئیں!

فِیْمَ اَنْتَ مِنْ ذِکْرٰھَا ۙ اِلٰی رَبِّکَ مُنْتَھٰھَا (۴۳-۴۴)

فرمایا کہ تمھیں اس بحث سے کیا تعلق؟ اس کا سرا تو صرف تمھارے رب کے پاس ہے۔ تم ان لوگوں کو یہ بتانے نہیں آئے ہو کہ قیامت کس دن آئے گی۔ اس کا علم تمھارے رب کے سوا اور کسی کے پاس نہیں ہے تو جو سوال سرے سے تم سے متعلق ہے ہی نہیں تمھیں اس سے کیا واسطہ اور تم اس کی کھوج کرید میں کیوں پڑو! اس کو اللہ کے حوالہ کرو جو اس کا حقیقی علم رکھنے والا ہے۔

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰھَا (۴۵)

جو لوگ قیامت کو دیکھ کر اس کو ماننا چاہتے ہیں ان کی ذمہ داری تمھارے اوپر نہیں ہے۔ ان کو

ان کے حال پر چھوڑ دو۔ تمہارا انذار صرف انہی پر کارگر ہوگا جو دلائل کی روشنی میں اس کو بن دیکھے ماننے اور اس سے ڈرنے کے لیے تیار ہوں۔

كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوٓا۟ إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحَىٰهَا (۴۶)

یعنی آج اگر ان کو یہ دکھائی نہیں جاتی یا اس کی تاریخ نہیں مقرر کی جاتی تو اس مغالطہ میں نہ رہیں کہ وہ اتنی دور ہے کہ اس کے لیے انھیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس دن اس کو دیکھیں گے اس دن کا احساس یہ ہوگا کہ گویا دنیا میں وہ ایک دن کے پچھلے یا اس کے پہلے پہر سے زیادہ نہیں رہے۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اوّلًا و اٰخرًا۔

رحمان آباد

۲۷ / اپریل ۱۹۷۹ء

۲۹ / جمادی الاوّل ۱۳۹۹ھ

تدبّرِ قرآن

۸۰

عبس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ——— النّٰزِعٰت ——— کے جوڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ اسلوبِ بیان اور موادِ استدلال میں بھی دونوں کے اندر نہایت واضح یکسانی ہے۔ مطالب کی ترتیب میں البتہ تبدیلی ہوئی ہے جس سے ایک نیا حسن اس میں پیدا ہو گیا ہے اور درحقیقت یہی واحد چیز ہے جو اس سورہ کو سابق سورہ سے ممتاز کرنے والی ہے۔ آپ دونوں کو سامنے رکھ کر آسانی سے ان کے مابہ الاشتراک اور مابہ الاختلاف کو معین کر سکتے ہیں۔

سابق سورہ کے آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے یہ جو فرمایا ہے کہ اِنَّمَآ اَنۡتَ مُنۡذِرُ مَنۡ یَّخۡشٰھَا (۴۵) (تم تو بس انہی لوگوں کو قیامت سے ڈرا سکتے ہو جو اس سے ڈرنے والے ہوں) اسی مضمون سے اس سورہ کی تمہید استوار فرمائی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو باندازِ عتاب قریش کے ان متمرّدین کے پیچھے وقت ضائع کرنے سے روک دیا ہے جو ایمان نہ لانے کے روز روز نئے نئے بہانے تلاش کرتے اور نازک مزاجی میں اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ آپ سے مطالبہ کرتے تھے کہ جب تک آپ اپنے غریب ساتھیوں کو اپنے پاس سے ہٹا نہیں دیں گے اس وقت تک وہ آپ کی مجلس میں بیٹھنے کے روادار نہیں ہوں گے۔ اس پوری سورہ میں انہی متمرّدین پر نہایت شدت سے عتاب ہے۔ اگرچہ خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن عتاب کا رُخ تمام تر قریش کے فراعنہ ہی کی طرف ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱ - ۱۰) ایک واقعہ کے تعلق سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ کہ جو لوگ اپنے کبر و غرور کے سبب سے تمہاری تعلیم و تذکیر سے مستغنی اور اس بات کے متمنّی ہیں کہ تم اپنے غریب ساتھیوں کو اپنے پاس سے ہٹا دو تب وہ تمہاری مجلس میں بیٹھنے کے روادار ہوں گے، ان کی ناز برداری کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔

ان کے ایمان کی ذمہ داری تمہارے اوپر نہیں ہے کہ تم ان کی ناز برداری میں اپنے جاں نثار ساتھیوں کی حق تلفی کرو۔ تمہارے اوپر اصل ذمہ داری انہی کی تربیت کی ہے جو تمہارے پاس ذوق و شوق سے آتے ہیں۔ جو نہیں آتے اور اپنی ناز برداری کے طالب ہیں ان کے بارے میں تم مسئول نہیں ہو کہ ان کو پانے کے لیے اپنوں کو ضائع کر دو۔

(۱۱-۱۶) قرآن کی عظمت کا بیان کہ یہ اللہ کی نازل کی ہوئی یاد دہانی ہے تو جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے۔ جو اس کی ناقدری کریں گے وہ اس کا نتیجہ خود بھگتیں گے یہ اللہ رب العٰلمین کا فرمان واجب الاذعان ہے، کسی سائل کی درخواست نہیں ہے۔ اس کو لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کرو جو اس کے شایانِ شان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن کی امانت میں اس کو محفوظ کیا ہے سب عالی مقام اور بلند مرتبہ لوگ ہیں اور تم بھی انہی کے زمرہ سے تعلق رکھنے والے ہو۔ سرکشوں اور مغروروں کی ناز برداری میں اتنا نہ جھکو جو تمہارے منصب اور تمہارے اس پیغام کے وقار کے خلاف ہے۔

(۱۷-۲۳) ان سرکشوں کی حالت پر اظہار افسوس جو قیامت کے انکار پر اڑے ہوئے ہیں۔ ان کو خود ان کی خلقت اور زندگی کے مراحل کی یاد دہانی کہ جو انسان پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوتا ہے اور مختلف مراحل طے کرتا ہوا قبر تک پہنچتا ہے حیف ہے اگر وہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کو ناممکن سمجھے! جو اتنے واضح دلائل کے بعد بھی سمجھنے اور ماننے پر تیار نہیں ہوا وہ کسی دلیل سے بھی قائل نہیں ہو سکتا۔

(۲۴-۳۲) خلقت اور مراحلِ زندگی کی طرف توجہ دلانے کے بعد ربوبیت کے اس وسیع اہتمام کی طرف اشارہ جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور چوپایوں کے لیے اس دنیا میں کر رکھا ہے اور جو اس امر کی نہایت واضح شہادت ہے کہ جس نے یہ سارا اہتمام کیا ہے وہ لوگوں کو غیر مسئول نہیں چھوڑے گا بلکہ ایک دن وہ سب سے ان نعمتوں کا حساب لے گا۔ اس دن فائز المرام وہی ہوں گے جنھوں نے نعمتوں کا حق ادا کیا ہو گا جنھوں نے ان کا حق ادا نہیں کیا ہو گا وہ سب اس دن ذلیل و نامراد ہوں گے۔

(۳۳-۴۲) قیامت کے دن کی تصویر۔ اس دن ہر شخص پر نفسی نفسی کی جو حالت طاری ہو گی اس کا نقشہ۔ جن لوگوں نے قیامت کی پیشی سے ڈرتے ہوئے زندگی گزاری ان کی شادمانی اور جو اس سے بے فکر رہے اور اسی حال میں مرے ان کی بدبختی و سیہ روئی کا بیان۔

سورۃ عبس

مکیۃ ——— آیات: ۴۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی ﴿۱﴾ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی ﴿۲﴾ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ آیات ۱-۴۲
يَزَّكّٰٓی ﴿۳﴾ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی ﴿۴﴾ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ﴿۵﴾
فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ﴿۶﴾ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰی ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ
يَسْعٰی ﴿۸﴾ وَهُوَ يَخْشٰی ﴿۹﴾ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی ﴿۱۰﴾ كَلَّآ اِنَّهَا
تَذْكِرَةٌ ﴿۱۱﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۱۲﴾ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾ وقف لازم
مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿۱۴﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾
قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴿۱۷﴾ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ﴿۱۸﴾ مِنْ
نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ
اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ﴿۲۲﴾ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ
مَآ اَمَرَهٗ ﴿۲۳﴾ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰی طَعَامِهٖٓ ﴿۲۴﴾ اَنَّا صَبَبْنَا
الْمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا
حَبًّا ﴿۲۷﴾ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ﴿۲۸﴾ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ﴿۲۹﴾ وَّحَدَآئِقَ
غُلْبًا ﴿۳۰﴾ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ﴿۳۱﴾ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۲﴾ فَاِذَا

جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿۳۴﴾ وَاُمِّهٖ
وَاَبِيْهِ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿۳۶﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ
يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴿۳۷﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿۳۸﴾
ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿۳۹﴾ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۰﴾
تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿۴۱﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾ ع ۴۲/۵

ترجمۂ آیات ۱ - ۴۲

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا کہ آیا اس کے پاس نابینا اور تمھیں کیا معلوم شاید وہ اپنی اصلاح کرتا یا نصیحت سنتا تو نصیحت اس کو نفع پہنچاتی! ۱-۴

جو بے پروائی برتتا ہے اس کے تو تم پیچھے پڑتے ہو حالانکہ تم پر کوئی ذمہ داری نہیں اگر وہ اپنی اصلاح نہ کرے اور جو تمھارے پاس شوق سے آتا ہے اور وہ خدا سے ڈرتا بھی ہے تو تم اس سے بے پروائی برتتے ہو۔ ۵-۱۰

ہرگز نہیں، یہ تو ایک یاددہانی ہے تو جو چاہے یاددہانی حاصل کرے۔ لائقِ تعظیم، بلند اور پاکیزہ صحیفوں میں، معزز باوفا کاتبوں کے ہاتھوں میں۔ ۱۱-۱۶

بُرا ہو آدمی کا، یہ کتنا ناشکرا ہے! اسے کس چیز سے پیدا کیا؟ پانی کی ایک بوند سے! اس کو پیدا کیا۔ پھر اس کے لیے ایک اندازہ ٹھہرایا۔ پھر اس کے لیے راہ آسان کر دی۔ پھر اس کو موت دی۔ پھر اس کو دفن کرایا پھر جب چاہے گا اسے اٹھا کھڑا کرے گا۔ ۱۷-۲۲

ہرگز نہیں، اس نے اس حکم کی تعمیل اب تک نہ کی جو اس کے رب نے اسے دیا۔ پس انسان اپنی غذا پر دھیان کرے کہ ہم نے برسایا پانی اچھی طرح، پھر پھاڑا

زمین کو اچھی طرح ۔ پھر اُگائے اس میں غلّے، انگور، ترکاریاں، زیتون، کھجور، گھنے باغ، میوے اور سبزہ، تمھاری اور تمھارے مویشیوں کی نفع رسانی کے لیے۔ ۲۴-۳۲

پس جب وہ کانوں کو بہرا کر دینے والی آواز آئے گی! (تب وہ شدنی ظاہر ہو گی) اس دن آدمی اپنے بھائی، ماں باپ اور اپنی بیوی اور بیٹوں سے بھاگے گا۔ اس دن ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہو گی۔ کتنے چہرے اس دن روشن ہوں گے، ہشّاش بشّاش! اور کتنے چہروں پر اس دن خاک اڑتی اور سیاہی چھائی ہو گی۔ یہی کافر و نابکار ہوں گے! ۳۳-۴۲

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی ۙ اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی (۱-۲)

عبداللہ بن ام مکتومؓ کے واقعہ کی نوعیت

'عَبَسَ'، کا فاعل یہاں مذکور نہیں ہے لیکن آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا کہ فاعل نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ 'اَعْمیٰ' سے یہاں اشارہ، تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ عبداللہ بن ام مکتومؓ کی طرف ہے۔ یہ ایک نادار اور نابینا صحابی تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے لیڈروں میں سے کسی سے یا ان کی کسی جماعت سے باتیں کر رہے تھے۔ آپ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا تھا اور وہ اپنے اعتراضات و شکوک پیش کر رہے ہوں گے کہ اسی اثنا میں عبداللہ بن ام مکتومؓ تشریف لائے اور موقع کی نزاکت کا اندازہ نہ کر سکنے کے باعث وہ بھی مجلس میں پہنچ گئے۔ ان کا یہ بے موقع آجانا حضورؐ کو ناگوار گزرا۔ اس ناگواری کی وجہ العیاذ باللہ یہ تو نہیں ہو سکتی کہ وہ نادار یا نابینا تھے، ناداروں اور نابیناؤں کی قدر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون کر سکتا تھا، البتہ حضورؐ کو اندیشہ ہوا ہو گا کہ ان وحشیوں کو ذرا مانوس کرنے کا جو موقع میسر آیا ہے عبداللہ بن ام مکتومؓ کے آجانے سے وہ ضائع ہو جائے گا۔ یہ بدک جائیں گے اور کہیں گے کہ جب تم نے اس طرح کے مفلسوں اور قلاشوں کو اپنے اردگرد اکٹھا کیا ہے تو تمہاری مجلس میں بیٹھ کر کون اپنی عزت گنوائے گا۔

قریش کے لیڈروں کی نازک مزاجی

یہ امر واضح رہے کہ قریش کے فراعنہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اعتراضات تھے ان میں ایک بڑا اہم اعتراض یہی تھا کہ آپ کے ساتھی قلاش اور مفلس لوگ ہیں۔ اس چیز کو وہ آپ کی نبوت کے خلاف ایک دلیل بنائے بیٹھے تھے۔ علاوہ ازیں آپ کے لیے یہ خیال بھی باعثِ تردد ہوا ہو گا کہ ممکن ہے یہ اپنی بڑائی کے نشہ میں آپ کے ایک محبوب صحابی کی کوئی توہین یا دل آزاری کر بیٹھیں جس سے مزید بدمزگی پیدا ہو۔

اسی واقعہ کو، جو بالکل اتفاق سے پیش آگیا، اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تعلیم دینے کا ذریعہ بنا لیا کہ آپ اپنی توجہ کا اصل مرکز اپنے ان صحابہؓ کو بنائیں جو اپنی اصلاح و تربیت کے طالب اور شوق و ذوق سے آپ کی مجلس میں حاضر ہوتے ہیں، ان لوگوں کے درپے زیادہ نہ ہوں جو بے نیاز ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ ان کی ناز برداری کریں۔

مغروروں کو نظرانداز کرنے کی ہدایت

پچھلی سورتوں میں یہ بات جگہ جگہ واضح ہو چکی ہے کہ ابتدا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے لیڈروں کو دعوت دینے کا خاص اہتمام تھا۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ آپ کو اوّل اوّل، جیسا کہ آیت

وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ (الشعراء ۲۶: ۲۱۴) سے واضح ہے، انہی کو خطاب کرنے کا حکم ہوا تھا۔ دوسری یہ کہ ان لوگوں کو پورے عرب کی سیادت و قیادت حاصل تھی۔ توقع تھی کہ اگر یہ دعوت قبول کر لیں گے تو پورے عرب میں دعوت کی کامیابی کی راہ کھل جائے گی۔ چنانچہ کچھ عرصے تک حضورؐ نے اپنا سارا زور انھیں پر صرف فرمایا اور ان کی طرف سے انتہائی رعونت اور توہین و دل آزاری کے اظہار کے باوجود آپ ان کو دعوت دینے میں لگے رہے لیکن جب ان کی رعونت بہت بڑھ گئی اور یہ واضح ہو گیا کہ یہ ہٹ دھرم نہ صرف یہ کہ کوئی اصلاح قبول کرنے والے نہیں ہیں بلکہ ان کے پیچھے جو وقت ضائع ہو رہا ہے اس سے ان غریب مسلمانوں کی حق تلفی ہو رہی ہے جو ایمان لا چکے ہیں اور جو اپنی تعلیم و تربیت کے لیے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی توجہ کے ان ناقدروں سے زیادہ مستحق ہیں تو آپ کو ان کے زیادہ درپے ہونے سے روک دیا گیا اور اس کے لیے عبداللہ ابن ام مکتومؓ کے واقعہ نے ایک نہایت مناسب موقع تقریب پیدا کر دی۔

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ ۝ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَىٰ (۳-۴)

آنحضرت صلعم کو تنبیہ کی نوعیت

اوپر کی آیات سے صرف ایک واقعہ کی خبر سامنے آئی ہے، نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ کس کا ہے اور نہ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کے ذکر سے مقصود کیا ہے لیکن یہاں 'یُدْرِیکَ' کے خطاب سے یہ بات نکلتی ہے کہ واقعہ کا تعلق حضورؐ سے ہے اور آپ کو اس بات پر تنبیہ فرمایا جا رہا ہے کہ آپ کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں بعض اوقات اتنی دور نکل جاتے ہیں کہ گلے کی بھیڑوں کی دیکھ بھال میں کوتاہی ہو جاتی ہے۔

پہلے ٹکڑے میں خطاب کے نہ ہونے سے قاری کے ذہن میں یہ سوال تو پیدا ہوتا ہے کہ معلوم کرے کہ کس کا واقعہ بیان ہو رہا ہے لیکن چونکہ مخاطب واضح نہیں ہے اس وجہ سے اس کو اپنی ذات سے متعلق کوئی پریشانی پیدا ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ چنانچہ حضورؐ کے اندر بھی واقعہ سے متعلق سوال تو فوراً پیدا ہوا ہوگا لیکن خطاب چونکہ براہِ راست نہیں تھا اس وجہ سے کچھ زیادہ پریشانی نہیں ہوئی ہوگی۔ برعکس اس کے اگر خطاب معین ہوتا تو یہ عتاب بہت سخت ہو جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں یہ بات متعین ہو جاتی کہ آپ پر عتاب ہوا اور وجہ عتاب یہ ہے کہ آپ نے ایک نابینا کے آنے پر ترش روئی اختیار فرمائی درآنحالیکہ واقعہ جیسا کہ اوپر واضح ہوا اور آگے آ رہا ہے، یہ نہیں ہے۔

حضرات انبیاءؑ کی لغزش کی نوعیت

آیاتِ زیرِ بحث میں خطاب اس لیے واضح فرما دیا ہے کہ یہاں وہ بات بھی بیان فرما دی گئی ہے جس پر عتاب ہوا ہے۔ یہ بات کسی فرض میں کوتاہی کی نوعیت کی نہیں بلکہ ادائے فرض میں حدِ مطلوب سے تجاوز کی نوعیت کی ہے۔ ہم یہ حقیقت جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے کوئی لغزش صادر ہوتی ہے تو وہ نفس کی خواہشوں کی پاسداری کی نوعیت کی نہیں ہوتی بلکہ کبھی کبھی

وہ اپنے رب کی رضا طلبی کے جوش میں اس حد سے آگے نکل جایا کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہوتی ہے مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے شریعت دینے کے لیے طُور پر بلایا تو اس کے لیے ایک خاص تاریخ بھی مقرر فرما دی لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام فرطِ شوق میں مقررہ تاریخ کا انتظار نہ کر سکے بلکہ اس سے پہلے ہی طُور پر پہنچ گئے۔ ان کی اس عجلت پر گرفت ہوئی تو انھوں نے یہ معذرت پیش کی کہ اے رب، میں تیری رضا طلبی کے شوق میں جلدی چلا آیا ہوں۔ اس طرح کی لغزش ظاہر ہے کہ نہایت اعلیٰ جذبہ سے ہوتی ہے۔ لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام حق و عدل کی کامل میزان ہوتے ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کی اس طرح کی لغزشوں پر بھی گرفت فرماتا ہے تاکہ میزان ہر پہلو سے درست رہے۔

یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جس لغزش پر گرفت فرمائی گئی ہے وہ بھی اسی نوعیت کی ہے۔ سادات قریش کے ایمان لانے سے چونکہ آپؐ پورے عرب کے لیے دعوت کی راہ کھلنے کی توقع رکھتے تھے اس وجہ سے اس کام میں آپ کا انہماک اس قدر بڑھ گیا کہ نہ آپ کو اپنے ذاتی آرام کی کوئی فکر رہی، نہ اس امر کا کوئی خیال رہا کہ یہ لوگ آپ کی ذات اور آپ کی دعوت کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اس انہماک سے یہ اندیشہ بھی پیدا ہوگیا کہ جو غریب مسلمان ایمان لا چکے ہیں ان کی تربیت کی جو ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے اس کو ادا کرنے کے لیے بھی آپ مشکل ہی سے کچھ وقت نکال سکیں گے۔ اس صورتِ حال پر قرآن نے جگہ جگہ آپ کو نہایت محبت آمیز انداز میں ٹوکا اور آگاہ فرمایا ہے کہ آپ نے قریش کے معاملے میں اس سے زیادہ ذمہ داری اپنے اوپر اٹھالی ہے جتنی اللہ نے آپ پر ڈالی ہے۔ آپ ان کے پیچھے اتنے ہلکان نہ ہوں۔ آپ پر اللہ کی بات پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی وہ آپ نے پہنچا دی، اب مزید ان کی ناز برداری کی ضرورت نہیں ہے۔ انھی حالات کے اندر عبداللہ بن ام مکتومؓ کا یہ واقعہ پیش آیا جس نے گویا اس بات میں ایک بالکل فیصلہ کن سورہ نازل کر دی۔ اس تمہید کی روشنی میں آیاتِ زیرِ بحث اور آگے کی آیات پر غور کیجیے۔

'وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ'۔ یعنی تم پر اس نابینا کا آنا اس اندیشہ سے گراں گزرا کہ شاید اس کے آجانے سے ان سادات کے پندار کو چوٹ لگے اور وہ بدک جائیں حالانکہ ہو سکتا ہے کہ تم ان کی ناز برداری میں ایک سچے طالب کو نظر انداز کر دو لیکن یہ پھر بھی نہ سنیں تو ایسے ناقدروں کے پیچھے اپنے ایک سزاوارِ تربیت ساتھی کی حق تلفی کس طرح جائز ہو سکتی ہے۔

رسول کی توجہ کے اصلی مستحق

اس سے معلوم ہوا کہ رسول کا اصل مقصد لوگوں کا تزکیہ ہے۔ جو لوگ اس کے پاس تزکیہ کے طالب بن کر آئیں اس کی توجہ و دلداری کے اصل حق دار وہی ہیں۔ دوسرے لوگ، خواہ بظاہر کتنی ہی اہمیت رکھنے والے ہوں، ان میں اگر اصلاح و تربیت کی طلب نہیں ہے تو رسول کے مقصد کے اعتبار سے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

سچے طالب کی دو صفتیں

یہاں ایک سچے طالب کی دو صفتیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ طالبِ تزکیہ ہوتا ہے۔ دوسری یہ کہ وہ یاددہانی سے فائدہ اٹھانے والا ہوتا ہے۔

بر درِ حقیقت تربیت گاہِ نبوی کے سچے شرکاء کے اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ ان میں بالعموم دو طرح کے لوگ ہوتے۔ ایک وہ جن کے سامنے اپنی اصلاح و تربیت سے متعلق کوئی سوال ہوتا اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں رہنمائی حاصل کرنے کے لیے آتے، دوسرے وہ جن کے سامنے اگرچہ کوئی خاص سوال تو نہ ہوتا لیکن وہ مجلس میں حاضر ہوتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بطورِ خود یا کسی سائل کے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمائیں اس سے بہرہ مند ہوں۔ یہاں 'لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى' سے پہلی قسم کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے اور 'يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى' کے الفاظ سے دوسری قسم کے لوگوں کی طرف۔ یہ دونوں ہی راہیں طلبِ علم کی ہیں اور مقصود ان دونوں کا حوالہ دینے سے یہ ہے کہ جس کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آنا ہو وہ انہی میں سے کسی ایک مقصد کو سامنے رکھ کر آئے اور وہی پیغمبر کے التفات کے حق دار ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اپنی ناز برداری کے خواہاں ہیں ان کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ اپنے گھروں میں بیٹھیں اور اپنے انجام کا انتظار کریں۔

أَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۙ فَأَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۙ وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكّٰى ۙ وَأَمَّا مَنْ جَاءَكَ يَسْعٰى ۙ وَهُوَ يَخْشٰى ۙ فَأَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى (۵-۱۰)

اصل تنبیہ

یہ وہ اصل تنبیہ ہے جو اس موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمائی گئی کہ ہونا تو یہ چاہیے کہ جو اپنی اصلاح کے طالب بن کر آئیں اور ان کے اندر خدا کے حضور پیشی کا خوف ہو وہ آپ کی توجہ کے اصل مستحق قرار پائیں لیکن ہو یہ رہا ہے کہ جو بے پروا و بے نیاز ہیں آپ ان کو دعوت دینے کے لیے تو اپنے رات دن ایک کیے ہوئے ہیں حالانکہ وہ اگر اپنی اصلاح نہیں چاہتے تو اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ آپ پر اصل ذمہ داری ان لوگوں کی ہے جو ذوق و شوق سے آپ کے پاس آتے ہیں لیکن آپ ان سے غفلت برتتے ہیں۔

'تَصَدّٰى' دراصل 'تَتَصَدَّدُ' ہے جو 'صَدَد' کے مادہ سے ہے جس کے معنی متوازی اور مقابل کے ہیں۔ اس میں جو تغیر ہوا ہے وہ عربیت کے قاعدے کے مطابق ہوا ہے جس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو بے نیازی برتتے ہیں ان سے تو آپ متعرض ہونے اور ان کو پرچانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ یہ بوجھ اللہ تعالیٰ نے آپ پر نہیں ڈالا ہے۔

'وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكّٰى'۔ یعنی آپ پر اصل ذمہ داری انذار و بلاغ کی تھی، وہ کر چکنے کے بعد آپ ان سے بری الذمہ ہوئے۔ یہ ذمہ داری آپ پر نہیں ہے کہ آپ انھیں لازماً مومن و مسلم بھی بنا دیں۔ یہ مضمون پیچھے کی سورتوں میں مختلف اسلوبوں سے گزر چکا ہے اور ہر جگہ اس کا مقصود

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ آپ اپنی ذمہ داری سے زیادہ بوجھ اپنے اوپر نہ اٹھائیں اور اپنے کو غیر ضروری مشقت میں نہ ڈالیں۔ اگر یہ محروم القسمت لوگ اپنی اصلاح نہیں چاہتے تو ان کو ان کی تقدیر کے حوالہ کریں۔

'جَآءَكَ يَسْعٰى'، 'يَسْعٰى' کا اصل مفہوم کسی کام کو ذوق و شوق اور سرگرمی و مستعدی سے کرنا ہے۔ دوڑنا اس کے لیے لازم نہیں ہے۔ 'فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ' کے معنی ہوں گے پس اللہ کے ذکر کی طرف سرگرمی اور مستعدی سے لپکو۔ آیت میں یہ لفظ اسی مفہوم میں آیا ہے یعنی جو لوگ آپ کے پاس نہایت ذوق و شوق سے اس طرح آتے ہیں جس طرح تشنہ چشمہ کی طرف بڑھتا ہے۔

'وَهُوَ يَخْشٰى'، یہ مقابل میں ہے 'اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى' کے۔ یعنی ایک تو وہ لوگ ہیں جو اس دنیا کی مطلوبات و مرغوبات میں اس طرح کھوئے ہوئے ہیں کہ انھیں کبھی یہ فکر ستاتی ہی نہیں کہ اس زندگی کے بعد بھی کوئی زندگی ہے اور اس کے لیے بھی کوئی تیاری ضروری ہے۔ دوسرے وہ ہیں جو اپنے اندر آخرت کی پیشی کا خوف رکھتے ہیں۔ اسی گروہ سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ آپ کی باتیں سنے اور ان کو حرزِ جاں بنائے نہ کہ پہلے گروہ سے لیکن آپ کا حال یہ ہے کہ آپ پتھروں میں جونک لگانے کے لیے تو رات دن سرگرم ہیں لیکن جن کے اندر اثر پذیری کی صلاحیت ہے ان کی طرف پوری توجہ کرنے کی فرصت آپ کو نہیں ملتی۔

ان آیات سے مندرجہ ذیل باتیں واضح ہوئیں:

ان آیات کی تعلیم

ایک یہ کہ ان میں بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو عتاب ہے اس کا اصل رخ آپ کی طرف نہیں بلکہ قریش کے ان نا اہل لیڈروں کی طرف ہے جن سے کسی خیر کی امید باقی نہیں رہی تھی۔ اس وجہ سے ضروری ہو گیا تھا کہ آپ ان سے صرفِ نظر کر کے اپنی ساری توجہ کا مرکز ان غریبوں کو بنائیں جو اسلام لا چکے تھے اور آپ کی تعلیم و تربیت کے اصل حقدار تھے۔

دوسری یہ کہ حضورؐ کو کسی فرض کی ادائیگی میں کسی کوتاہی پر نہیں ٹوکا گیا ہے بلکہ اس بات پر ٹوکا گیا ہے کہ آپ نے اس سے زیادہ ذمہ داری اپنے اوپر اٹھا لی ہے جتنی اللہ تعالیٰ نے آپ پر ڈالی ہے۔ گویا یہ اسی طرح کا پُرمحبت و جاں نواز عتاب ہے جو 'لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ'[1] (الشعراء ۲۶: ۳) اور اس مضمون کی دوسری آیات میں گزر چکا ہے۔

تیسری یہ کہ ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ رہنمائی دی گئی ہے کہ اسلام کی اصل دولت وہ غریب ہیں جن کے اندر خدا کی خشیت ہے نہ کہ وہ امیر جن کے سینے خدا کی خشیت سے خالی ہیں۔ اس وجہ

---

[1] معلوم ہوتا ہے تم اپنے آپ کو ان کے پیچھے ہلاک کر کے رہو گے کہ وہ مومن نہیں بن رہے ہیں۔

سے آپ اپنی توجہ کا اصل مرکز انہی کو بنائیں جو اہل ہیں۔ ان کے پیچھے اپنا وقت نہ ضائع کریں جن کے اندر خیر کی کوئی رمق باقی نہیں رہی ہے۔

اس عتاب کی ایک حقیقت افروز تمثیل

استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر سورۂ عبس میں اس عتاب کے رُخ کو ایک تمثیل سے سمجھایا ہے جو نہایت حقیقت افروز ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"اس کو ایک مثال سے سمجھو۔ فرض کرو ایک نہایت مستعد اور فرض شناس چرواہا ہے۔ اس کے گلّے کی کوئی فربہ بھیڑ گلے سے الگ ہو کر کھو جاتی ہے۔ چرواہا اس کی تلاش میں نکلتا ہے ہر قدم پر اس کی کھُر کے نشانات ملتے جا رہے ہیں۔ جنگل کے کسی گوشے سے اس کی آواز بھی آ رہی ہے۔ اس طرح وہ کامیابی کی امید میں دور تک نکل جاتا ہے اور اپنے اصل گلے سے کچھ دیر کے لیے غافل ہو جاتا ہے۔ جب وہ واپس لوٹتا ہے تو آقا اس کو ملامت کرتا ہے کہ تم پورے گلے کو چھوڑ کر ناحق ایک دیوانی بھیڑ کے پیچھے ہلکان ہوئے۔ اس کو چھوڑ دیتے، بھیڑیا کھا جاتا، وہ اسی کے لائق تھی۔ بتاؤ، اس میں عتاب کس پر ہوا؟ چرواہے پر یا کھوئی ہوئی بھیڑ پر۔ بالکل یہی صورت معاملہ یہاں بھی ہے۔ عتاب کا رخ بظاہر تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ضرور ہے لیکن غصہ کا سارا زور منکرین و مخالفین پر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تو اس عتاب کے اندر نہایت دل نواز شفقتیں مضمر ہیں۔"

كَلَّآ إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَن شَآءَ ذَكَرَهُۥ (۱۱-۱۲)

پیغمبر کی اصل ذمہ داری

'کَلَّا' یعنی اس طرح کے ناقدروں سے اس طرح چمٹنے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ یہ قرآن بس ایک یاددہانی ہے۔ جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے اور جس کا جی نہ چاہے وہ اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہے جس سے یہ لوگوں کو آگاہ کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پیغمبر پر ذمہ داری لوگوں تک اس یاددہانی کو پہنچا دینے کی ہے۔ یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں اس کو اتار بھی دے۔ اس پر ذمہ داری انذار کی ہے نہ کہ ایک ایک کی نازبرداری کی!

'اِنَّهَا' میں ضمیر کا مرجع 'ذِكْرٰى' ہے جو آیت ۴ میں ہے۔ اور 'ذَكَرَهٗ' میں بھی مرجع وہی ہے لیکن یہاں لحاظ معنی کا ہے اس وجہ سے ضمیر مذکر آئی۔ چونکہ 'ذِكْرٰى' اور 'تَذْكِرَةٌ' دونوں سے مراد قرآن ہی ہے اس وجہ سے یہاں ضمیر مذکر لا کر ان کے اصل مفہوم پر روشنی ڈال دی۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

اس سے وہ حقیقت واضح ہو گئی جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ یہاں اگر حضورؐ پر کوئی عتاب ہے بھی تو اس کی نوعیت عتاب محبت کی ہے کہ آپ نے اپنے اوپر وہ بوجھ کیوں اٹھا لیا ہے جو آپ کے رب نے آپ پر نہیں ڈالا۔

'فَمَن شَآءَ ذَكَرَهٗ' کے بعد کلام کا ایک حصہ حذف ہے۔ اس کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہو گی:

کہ جس کا جی چاہے اس یاددہانی سے فائدہ اٹھائے، جس کا جی چاہے وہ بہرا بنا رہے۔ دوسرے مقام پر یہی بات یوں فرمائی ہے: فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکھف - ۱۸:۲۹) (پس جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے)۔

فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۙ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۙ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۙ كِرَامٍ ۢ بَرَرَةٍ (۱۳-۱۶)

کلام کی عظمت کا بیان

اوپر کی آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو متکبرین سے اعراض اور بے پروائی برتنے کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے یہ اسی کی مزید وضاحت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح تمھارے شایانِ شان بات یہ نہیں ہے کہ ان مغروروں کے آگے تم اپنے آپ کو زیادہ جھکاؤ اسی طرح یہ کلام بھی، جو تم ان کو سنا رہے ہو، ایسی چیز نہیں ہے جو منت و سماجت کے ساتھ پیش کی جائے بلکہ یہ نہایت ہی اشرف، نہایت ہی بلند اور نہایت ہی پاکیزہ و برتر چیز ہے۔ یہ کوئی ناقص جنس نہیں ہے کہ تمھیں یہ فکر کرنی پڑے کہ کسی نہ کسی طرح یہ بک ہی جائے اگرچہ اس کی خاطر تمھیں خریداروں کی خوشامد ہی کرنی پڑے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے خزانۂ محفوظ کے لعل و گہر ہیں جو تم مفت لٹا رہے ہو۔ اگر یہ لوگ اس کی قدر نہیں کر رہے ہیں تو تمھارا کچھ نہیں بگاڑ رہے ہیں بلکہ اپنے ہی کو ابدی خسارے میں مبتلا کر رہے ہیں۔

'فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ'۔ یہ اس کلام کی عالی نسبی اور عالی مقامی کی تعریف ہے۔ 'فِيْ صُحُفٍ' دراصل 'هُوَ فِيْ صُحُفٍ' ہے۔ یہاں مبتدا کو حذف کر دیا ہے۔ صفاتِ مابعد کے بیان میں مبتدا کا حذف عربیت میں معروف ہے۔

'صَحِيْفَةٌ' لکھے ہوئے ورق کو کہتے ہیں۔ جمع کی صورت میں یہ بعض اوقات کتاب کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں اس سے اشارہ لوحِ محفوظ کی طرف ہے۔ 'مُكَرَّمَةٍ' یعنی وہ ایک عزیز، گراں مایہ اور قیمتی خزانہ ہے جس کی حفاظت اللہ کے فرشتے نہایت اہتمام سے کر رہے ہیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نہ اس تک ہر ایک کی رسائی ہے اور نہ ہر ایک اس کا اہل ہے کہ اس میں سے کچھ لے یا پا سکے بلکہ یہ اللہ ہی ہے کہ اس میں سے جس کو چاہتا ہے کچھ بخشتا ہے اور اسی نے تمھیں اس خزانے سے بخشا ہے تو اس نعمت سے انہی کو بہرہ مند کرو جو اس کے اہل ہیں۔ نااہلوں کے آگے ان موتیوں کو نہ ڈالو۔ یہ بات انجیل میں بھی نہایت موثر تمثیل کی صورت میں آئی ہے اور ہم کسی موزوں مقام میں اس کو نقل کر آئے ہیں۔

'مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ'۔ یہ دونوں صفتیں بھی اس کے مکرم ہونے کے پہلو ہی کی وضاحت کے لیے آئی ہیں۔ صفت 'مَرْفُوْعَةٍ' معنی اور رتبہ دونوں قسم کی بلندیوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ دوسرے مقام میں اس کی وضاحت یوں آئی ہے: وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ (الزخرف - ۴۳:۴)

(اور یہ اصل کتاب میں ہمارے پاس ہے، نہایت بلند اور پر حکمت)۔

'مُطَهَّرَةٍ' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ قرآن مجید شیاطین اور ارواح خبیثہ کی دست رس سے بالکل محفوظ ہے۔ مثلاً فرمایا ہے: 'فِیْ کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ ۝ لَّا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ' (الواقعۃ-۵۶ : ۷۸ - ۷۹) (وہ ایک محفوظ کتاب میں ہے جس تک صرف پاکیزہ یا تھولاہی کی رسائی ہے)۔

اس کلام کے حاملین کی صفات 'بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ ۝ کِرَامٍ بَرَرَةٍ' - یہ ان ملائکہ کی صفت بیان ہو رہی ہے جن کی امانت میں اللہ تعالیٰ نے اس کتاب عزیز کو محفوظ فرمایا ہے۔ اوپر 'لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ' والی آیت کا ہم نے حوالہ دیا ہے۔ اس میں جو بات منفی پہلو سے فرمائی گئی ہے وہی بات یہاں مثبت پہلو سے فرمائی گئی ہے۔ گویا پوری بات یوں ہے کہ اس کتاب عزیز تک ارواح خبیثہ کی رسائی نہیں ہے بلکہ یہ ان پاک فرشتوں کی تحویل میں ہے جو نہایت باعزت اور نہایت باوفا ہیں۔

'سَفَرَةٌ' جمع ہے 'سَافِرٌ' کی جس کے معنی قاری و کاتب کے ہیں۔ 'سفر' پڑھنے اور لکھنے دونوں کے معنی میں آتا ہے۔ اس کے اشتقاق پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اصل معنی ہیں تو لکھنے کے لیکن پڑھنے اور بیان کرنے کے مفہوم میں یہ وسیع ہو گیا ہے۔

لفظ 'کِرَامٍ' میں ان کی عالی مقامی اور بلند کرداری کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ایسے بلند مرتبہ اور معزز ہیں کہ ان سے کسی خیانت کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ نہ وہ اس میں خود کمی بیشی کر سکتے، نہ یہ امکان ہے کہ جنات و شیاطین کو اس تک رسائی کا کوئی موقع دیں۔

'بَرَرَةٍ' جمع ہے 'بَآرٌّ' کی۔ 'بَآرٌّ' کہتے ہیں فرماں بردار، باوفا اور اپنی ذمہ داریوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے والے کو۔ یہ صفت ان کی امانت داری کے وصف کو مزید نمایاں کرنے کے لیے آئی ہے مثلاً فرمایا ہے: 'نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ' (الشعرآء-۲۶ : ۱۹۳) (یہ کلام جبریل امین کے ذریعہ سے نازل ہوا ہے)۔ دوسرے مقام میں اس کی مزید وضاحت ہے: 'اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ ۝ ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ' (التکویر - ۸۱ : ۱۹-۲۱) (یہ کلام ایک باعزت رسول کے واسطہ سے القاء ہوا ہے، وہ بڑی قوت والا اور عرش والے کے حضور میں نہایت مقرب ہے۔ اس کی بات مانی جاتی ہے۔ مزید برآں وہ نہایت معتمد ہے)۔

قرآن اور اس کے محافظین کی ان صفات کے ذکر سے مقصود، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ قرآن ایسی چیز نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے منت و سماجت کے ساتھ پیش کی جائے بلکہ جس عظمت و شان کا وہ کلام ہے اسی وقار و خودداری کے ساتھ اس کی دعوت دی جانی چاہیے اور جس طرح کے باوقار ملائکہ کو اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت اور اس کو نازل کرنے پر مامور فرمایا ہے چاہیے کہ اللہ کا رسول اور اس کے ساتھی بھی اس کی دعوت و تبلیغ میں اسی

کردار کا مظاہرہ کریں۔

یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ وحیِ الٰہی کے اخذ و تلقّی کے لیے اللہ تعالیٰ نے جس ذات کا انتخاب فرمایا اور پھر جن لوگوں پر اس کی حفاظت، وصیانت اور تحریر و کتابت کی ذمہ داری ڈالی وہ کس کردار اور کن صفات کے لوگ تھے اور انھوں نے کس دیانت و امانت کے ساتھ اپنے اس فرض کو انجام دیا۔ گویا جن صفات کے ملائکہ کو اس خدمت پر آسمانوں میں مامور فرمایا گیا انہی صفات کے انسانوں کو اس زمین پر اس کے حمل و نقل کے لیے منتخب فرمایا گیا۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ (۱۷)

انسان کی بددماغی پر اظہارِ افسوس

اگرچہ لفظ 'اَلْاِنْسَانُ' عام ہے لیکن کلام کا رُخ انہی متکبرین کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ ہم پیچھے مناسب مواقع پر زبان کے اس اسلوب کی طرف توجہ دلا چکے ہیں کہ بعض مرتبہ کلام کا رخ ہوتا تو کسی خاص شخص یا کسی مخصوص گروہ ہی کی طرف ہے لیکن بات ان سے منہ پھیر کر عام صیغے سے کہہ دی جاتی ہے جس سے متکلم کی بے زاری کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ فرمایا کہ یہ انسان بھی عجیب مخلوق ہے! غارت ہوا کتنا ناشکرا بن کے رہ گیا ہے! اس کی بددماغی کا حال یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ اس کو اللہ کا کلام اور پیغام بھی سنایا جائے تو اس کے آگے جھک کر اور نیازمند بن کر سنایا جائے؎

درازدستیِ ایں کوتہ آستیناں بیں!

'مَآ اَكْفَرَهٗ' کا اسلوب اظہارِ تعجب اور اظہارِ نفرت دونوں کا حامل ہے۔

مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ۝ مِنْ نُّطْفَةٍ ۭ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۝ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ۝ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ۝ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ (۱۸-۲۲)

یہ ان مغروروں کے کبر و غرور پر ضرب لگاتی ہے لیکن مطالب کی ترتیب اس طرح ہے کہ چند چھوٹے چھوٹے جملوں میں انسان کی خلقت، مادۂ خلقت، مراحلِ خلقت، وسائلِ معیشت، غرضِ زندگی، موت، قبر سے لے کر حشر و نشر تک ساری باتوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے تاکہ ان پر اپنے غرور کی بے ثباتی بھی واضح ہو جائے اور وہ خود اپنی زندگی کے آئینہ میں اس جزا و سزا کو بھی دیکھ لیں جس کی خبر قرآن ان کو دے رہا ہے۔

'مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ' یہ سوال تحقیر کے لیے بھی ہے اور زندگی بعد الموت کی طرف توجہ دلانے کے لیے بھی۔ ان متمرّدین کو زعم تھا کہ جس طرح اس دنیا میں وہ باعزت اور صاحبِ سیادت و قیادت ہیں اسی طرح آخرت ہوئی تو وہاں بھی ان کے لیے شایانِ شان مراتب ہوں گے۔ اس زعم کے سبب سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ انذار ان کے دلوں پر بڑا شاق گزرتا تھا کہ

یہ ہم کو تو جہنم میں جھونکے جانے کے ڈراوے سنا رہے ہیں اور ان فقیروں کو جنت اور ابدی بادشاہی کی بشارت دے رہے ہیں جو ہمیشہ سے ہماری جوتیاں سیدھی کرتے آئے ہیں اور جن کو اپنے پہلو میں بٹھانا بھی ہم نے گوارا نہ کیا۔ ان کے اس زعم پر قرآن نے ان الفاظ میں ضرب لگائی ہے:

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ۙ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ۝ اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ۙ كَلَّا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ (المعارج - ۷۰ : ۳۶ - ۳۹)	پس ان کافروں کو کیا ہوگیا ہے کہ یہ تمہارے اوپر پلے پڑ رہے ہیں، داہنے بائیں سے ٹولیاں بنا بنا کر! کیا ان میں سے ہر شخص یہ توقع لیے بیٹھا ہے کہ وہ نعمت کے باغ میں داخل کر دیا جائے گا؟ ہرگز نہیں، ہم نے ان کو پیدا کیا ہے اس چیز سے جس کو وہ جانتے ہیں!

ان آیات کا سیاق و سباق اور اس کی تفسیر تدبر قرآن کی روشنی میں سمجھ لیجیے۔ یعنی نجس پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوئی مخلوق کو اپنی برتری اور پاک دامنی کا یہ غرہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے آپ کو پیدائشی حق دار جنت سمجھ بیٹھے۔

اسی طرح قرآن نے جگہ جگہ انسان کی خلقت اور اس کے مادۂ خلقت سے قیامت پر اس پہلو سے استدلال کیا ہے کہ جو خدا پانی کی ایک حقیر بوند کو انسان بنا سکتا ہے اس کے لیے اس کو مرنے کے بعد دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا کیا مشکل ہے! یہ مضمون، مختلف اسلوبوں سے بار بار بیان ہوا ہے، ہم صرف چند جامع آیات یہاں نقل کرتے ہیں:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝ (المومنون - ۲۳ : ۱۲ - ۱۶)	اور ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اس کو پانی کی ایک بوند کی شکل میں ایک محفوظ ٹھکانے میں رکھا۔ پھر ہم نے بوند کو ایک جنین کی شکل دی پھر اس جنین کو گوشت کا ایک لوتھڑا بنایا اور اس لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں اور ہڈیوں کو گوشت کا جامہ پہنایا پھر اس کو ایک بالکل ہی دوسری شکل دے دی۔ پس بڑا ہی بافیض و بابرکت ہے اللہ، بہترین خالق! پھر اس کے بعد لازماً تم مرنے والے ہو پھر تم قیامت کے دن اٹھائے بھی جاؤ گے۔

مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ' سوال کا جواب چونکہ بالکل واضح تھا جس سے کسی کے لیے بھی انکار کی گنجائش نہیں تھی اس وجہ سے جواب خود ہی دے دیا کہ پانی کی ایک بوند سے انسان کو پیدا کیا۔ اس پانی کی صفت قرآن کے دوسرے مقام میں 'مَھِیْن' آئی ہے جس کے معنی حقیر و ذلیل کے ہیں۔ یعنی نہ اپنی کمیت کے اعتبار سے کوئی بڑی چیز نہ قدر و قیمت کے اعتبار سے کوئی گوہر گراں مایہ! تو ایسے نجس قطرے سے وجود میں آنے والے انسان کو زیادہ اِترانا کس طرح زیب دیتا ہے!

انسان کی خلقت میں تدبیر و حکمت کا پہلو

'خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ' تحقیر کے مضمون کے بعد کلام کا رخ اس تقدیر، تدبیر اور تیسیر کے بیان کی طرف مڑ گیا ہے جو انسان کی خلقت اور اس کی زندگی کے اطوار و مراحل میں نمایاں ہے اور جو اس بات کی ناقابلِ انکار شہادت ہے کہ قدرت جس قطرے کو گہر بنانے پر اپنے عجائبِ تصرّف کی اتنی شانیں دکھاتی ہے وہ کوئی عبث اور بے مقصد چیز نہیں ہو سکتی بلکہ لازم ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں وہ اس کی قدر و قیمت کو پرکھے، اس کے خیر و شر کو تولے اور پھر جس کو اپنی میزان میں باوزن پائے اس کو چھانٹ لے اور جس کو ناکارہ اور بے قیمت پائے اس کو خس و خاشاک کی طرح تنور میں جھونک دے۔

'فَقَدَّرَهٗ' میں اشارہ ان منازل و مراحل کی طرف ہے جو انسان کی تدریجی تشکیل میں نمایاں ہیں۔ جس طرح چاند کے عروج و محاق کی منازل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ لفظ آیا ہے، مثلاً 'وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ' (یٰسٓ - ۳۶ : ۳۹) (اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں ٹھہرا دی ہیں) اسی طرح انسان کے تدریجی نشوونما اور اس کے بچپن، جوانی اور پھر زوال و فنا کی طرف توجہ دلانے کے لیے یہ لفظ یہاں استعمال ہوا ہے۔ اوپر سورۂ مومنون کی آیات کا حوالہ گزرا ہے اس میں بھی یہ مضمون ہے اور یہاں آگے کی آیات میں بھی اس کے بعض پہلو واضح فرمائے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تدریج و تقدیر خدا کی قدرت و حکمت اور اس اہتمام پر دلیل ہے جو انسان کی تخلیق میں نمایاں ہے اور یہ قدرت اور یہ اہتمام اس امر کی دلیل ہے کہ انسان کوئی عبث چیز نہیں ہے بلکہ اس کی خلقت ایک عظیم غایت کے لیے ہے جس کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ وہ مرنے کے بعد اٹھایا جائے، اس کا حساب ہو، اس کو جزا یا سزا ملے۔ ساتھ ہی انسان کی تخلیق میں خدا کی جو قدرت نمایاں ہے وہ اس بات کی ناقابلِ تردید دلیل ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا ذرا بھی مستبعد نہیں ہے۔

تیسیر اپنے وسیع مفہوم میں

'ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ' مفسرین نے عام طور پر اس تیسیر سے وہ تدبیر مراد لی ہے جو قدرت نے بچے کے بطنِ مادر سے برآمد ہونے کے لیے خود عورت اور بچے کے نظامِ جسم میں ودیعت فرما دی ہے اور جو دونوں کی مدد کے لیے عین وقت پر نمودار ہوتی ہے۔ یہ بات غلط نہیں ہے۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ یہ قدرتی انتظام نہ ہو تو کوئی دوسری تدبیر اس کا بدل نہیں ہے بلکہ زچہ و بچہ دونوں کے گھٹ کر مر جانے کا اندیشہ ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک تیسیر کے مفہوم کو اس قدر محدود کر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بچہ جس طرح بطنِ مادر

کے اندر قدرت ہی کی تدبیر و تیسیر سے نشوونما پاتا ہے اسی طرح مہد سے لحد تک قدرت ہی کی تیسیر اور رہنمائی سے وہ زندگی کے تمام نشیب و فراز طے کرتا ہے۔ یہ خدا ہی کی تیسیر ہے کہ بچہ کے پیدا ہونے کے بعد اس کی ماں کی چھاتیوں میں اس کے تغذیہ کے لیے دودھ اترتا ہے اور اس کو قدرت کی طرف سے جبلّی طور پر یہ رہنمائی ملتی ہے کہ ماں کی چھاتیوں کو چوسے۔ اسی طرح جوانی کے دور میں، وہ زندگی کے مختلف میدانوں میں جو سرگرمیاں دکھاتا اور جو فتوحات حاصل کرتا ہے ان میں بھی وہ خدا ہی کے بخشے ہوئے اعضاء و اسلحہ، خدا ہی کی عطا کردہ عقل اور خدا ہی کی بخشی ہوئی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ سورۂ اعلیٰ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی شان یہ بتائی ہے کہ اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی (الاعلیٰ - ۸۷ : ۲ - ۳) (جس نے خاکہ بنایا اور اس کے نوک پلک سنوارے اور جس نے صلاحیتیں ودیعت کیں اور پھر ان کے استعمال کی راہ دکھائی)۔

یہی حال انفسی اور اخلاقی عالم میں بھی ہے۔ سورۂ شمس میں فرمایا ہے: وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ (الشمس - ۹۱ : ۷ - ۱۰) (شاہد ہے نفس اور اس کی ترکیب، پس اس کو الہام کی اس کی بدی اور نیکی تو جس نے اس کو پاک رکھا اس نے فلاح پائی اور جس نے گندا کیا وہ نامراد ہوا) غرض زندگی کے ہر شعبہ میں خواہ وہ روحانی ہو یا مادی اللہ تعالیٰ ہی نے انسان کی راہ ہموار کی۔ اگر وہ اس راہ پر چلے تو وہ کبھی ٹھوکر نہ کھائے لیکن اپنے اختیار کے سوءِ استعمال سے وہ سیدھی راہ کے بجائے ٹیڑھی راہ اختیار کر لیتا ہے جو اس کو کسی ہلاکت کے کھڈ میں لے جا پھینکتی ہے۔

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ۔ یہ زندگی کے آخری مرحلہ کی طرف اشارہ ہے کہ بالآخر وہ وقت آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو موت دیتا اور دفن کراتا ہے۔ ہر پیدا ہونے والے کے لیے پیدا ہونے کے بعد سب سے زیادہ یقینی چیز موت ہی ہے۔ قدرت نے اس کو ایسے ضابطوں کے اندر جکڑ رکھا ہے کہ موت سے کسی کے لیے بھی مفر نہیں ہے۔ اس کی کمند بالکل بے خطا ہے۔

آخری مرحلہ

'اَقْبَرَهٗ' کے معنی کسی کو قبر میں رکھوانا یا دفن کرانا ہے۔ اس لفظ میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ جو مرتا ہے وہ فنا نہیں ہو جاتا بلکہ قدرت اس کو زمین کی تحویل میں دے دیتی ہے۔ جو شے تحویل میں دی جاتی ہے وہ لازماً ایک دن واپس لی جاتی ہے چنانچہ جب وقت آئے گا اللہ تعالیٰ اس امانت کو زمین سے واپس لے گا۔

ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ۔ 'اِنْشَار' کے معنی کھولنے، پھیلانے، چھینٹنے اور از سرِ نو اٹھا کھڑا کرنے کے ہیں۔ یعنی جب وہ چاہے گا اس کو اٹھا کھڑا کرے گا۔ اس کام میں اس کو ذرا بھی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ جب پانی کی ایک بوند کو رحمِ مادر کے اندر اس نے ایک انسان کی شکل دے دی اور

اس کام میں اس کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی تو اسی انسان کو زمین میں دفن کرانے کے بعد اس سے از سرِ نو برآمد کر لینا کیوں محال ہو جائے گا!

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَا أَمَرَهُ (۲۳)

یہ آیت اوپر والی آیت 'قُتِلَ الْإِنسَانُ مَا أَكْفَرَهُ' کے بالکل متوازی آیت ہے جس طرح اس میں ہٹ دھرموں کی ہٹ دھرمی پر اظہارِ تعجب اور پھر ان کے اپنے وجود سے اس قیامت پر دلیل ہے جس کو وہ ناممکن سمجھ رہے تھے اسی طرح اس آیت میں ان کی کج فہمی پر باندازِ زجر ملامت اور اس کے بعد قیامت اور جزا و سزا پر اس اہتمامِ ربوبیت سے دلیل ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے گرد و پیش میں پھیلا رکھا ہے اور جو زبانِ حال سے یہ شہادت دے رہا ہے کہ جس انسان کے لیے ربِ کریم نے یہ خوانِ نعمت بچھایا ہے وہ غیر مسئول نہیں چھوڑا جائے گا بلکہ اس کے لیے لازماً ایک روزِ حساب آنے والا ہے۔

'لَمَّا يَقْضِ مَا أَمَرَهُ' کے اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ جہاں تک سمجھانے اور دلائل پیش کرنے کا تعلق ہے اس میں اب کوئی کسر نہیں رہ گئی ہے لیکن ان ضدیوں کی ضد اور مکابرت کا وہی حال ہے جو پہلے تھا۔ جس دن کے لیے تیاری کی ان کو ہدایت کی جا رہی ہے اب بھی وہ اس سے بے پروا ہیں۔

'مَا أَمَرَهُ' میں وہ تمام احکام و اوامر بھی داخل ہیں جو فطرت کی بدیہیات میں سے ہیں اور وہ احکام بھی جو نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے لوگوں کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے۔ بدیہیاتِ فطرت کے امرِ الٰہی ہونے کی وضاحت ہم آیت 'فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ' (البقرۃ ۲: ۲۲۲) کے تحت کر چکے ہیں۔

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ (۲۴)

غور کرنے والے کے لیے دلائل کی کمی نہیں ہے — یعنی اگر وہ دلیل ان کی سمجھ میں نہیں آئی جو بیان ہوئی تو دلیلوں کی کمی نہیں ہے۔ انسان اپنی غذا ہی کے مسئلہ پر ذرا غور کی نگاہ ڈالے جس پر اس کی زندگی کا انحصار ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ اس کو پیدا کرتا پھر کس وسعت، کس تنوع اور ضروریات کی نوعیت کے لحاظ سے کتنی گوناگوں شکلوں میں اس کو پھیلا دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اس پر غور کرے گا تو ضد کی بات اور ہے لیکن اس کی عقل میں فتور نہیں ہے تو وہ نہایت آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے لوگوں کو مرنے کے بعد زندہ کر دینا ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ جو بارش اس کی غذا کا ذریعہ ہے وہی برابر اس کا مشاہدہ کراتی رہتی ہے۔ ساتھ ہی یہ نکتہ بھی اس کی سمجھ میں آ جائے گا کہ ربوبیت کا یہ وسیع انتظام مستلزم ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے آگے جواب دہ ہو۔ ایک دن لازماً اس سے پرسش ہونی ہے کہ اس نے ان نعمتوں کا حق ادا کیا یا نہیں۔ ہر حق کے ساتھ ذمہ داری کا لزوم ایک امرِ فطری ہے۔

أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا (۲۵-۲۶)

غور کرنے کا طریقہ — صرف غور کرنے کی دعوت ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ غور کی لائن بھی معین کر دی کہ یوں غور کرے۔ فرمایا کہ یہ ہماری ہی قدرت و عنایت کا کرشمہ ہے کہ ہم اچھی طرح مینہ برساتے اور پھر زمین کے مسامات کو اس

میتہ سے سیراب ہونے کے لیے اچھی طرح کھول دیتے ہیں۔ نہ آسمان سے پانی برسانا کسی کے بس میں ہے اور نہ زمین کے مسامات کو کھولنا کسی کے امکان میں، درآنحالیکہ انہی دونوں چیزوں پر زمین کی تمام فیض بخشی کا انحصار ہے یہی مضمون سورۂ انبیاء میں یوں بیان ہوا ہے: اِنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (الانبیاء۔ ۲۱: ۳۰) (آسمان اور زمین دونوں بند ہوتے ہیں پس ہم ان کو کھول دیتے ہیں)۔

اوپر کے پیرے میں انسان کی خلقت کی جو نوعیت بیان ہوئی ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے غور کیجیے تو دونوں دلیلوں کی مشابہت واضح ہو گی۔ وہاں بیان دلیل کا آغاز اس طرح ہوا ہے کہ بات اثباتِ امکانِ قیامت سے چلی پھر ربوبیت، مسئولیت اور جزا و سزا تک پہنچی ہے۔ یہاں بھی آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا کہ استدلال کی ترتیب وہی ہے۔ پہلے ایک جامع بات نے امکانِ معاد کی تمہید استوار کر دی۔ اس کے بعد ربوبیت کے آثار کی طرف توجہ دلائی گئی اور پھر مسئولیت اور جزاء و سزا کو ایک بدیہی نتیجہ کے طور پر سامنے رکھ دیا گیا ہے۔

فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۝ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۝ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۝ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۝ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا (۲۷-۳۱)

زمین کی بعض برکتیں

آسمان و زمین یا بالفاظ دیگر بارش اور زمین کے باہمی تفاعل سے اللہ تعالیٰ کی پروردگاری کی جو برکتیں اہل زمین کے لیے ظہور میں آتی ہیں یہ ان میں بعض ایسی نمایاں چیزوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن سے قرآن کے اوّل مخاطب، واقف بھی تھے اور جو انسان کی غذائی ضروریات میں بنیادی اہمیت رکھنے والی بھی ہیں۔

سب سے پہلے بعض ان چیزوں کی طرف توجہ دلائی جو زمین سے لگی ہوئی یا اس پر بچھی ہوئی پیدا ہوتی ہیں اور جن کو دیکھنے کے لیے نظر اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مثلاً غلہ، انگور اور ترکاریاں۔ غلہ غذائی چیزوں میں بنیادی اہمیت رکھنے والا ہے۔ دوسری ساری چیزیں اس کے تحت ہیں۔ اس وجہ سے اس کا ذکر سب سے پہلے کیا۔ غلہ کے بعد غذائی چیزوں میں دوسری اہمیت رکھنے والی چیز پھل ہے اور پھلوں میں راس الاثمار کی حیثیت انگور کو حاصل ہے اس پہلو سے بطورِ نمونہ اس کا ذکر فرمایا۔ اس کے بعد ترکاریوں کا ذکر فرمایا جو زمین پر پھیلی ہوئی پیدا ہوتی اور غلہ کے ساتھ سالن کے طور پر کام آتی ہیں، بعض کچی حالت میں اور بعض پکا کر۔ لفظ 'قضب' کا غالب استعمال اگرچہ انہی سبزیوں اور ترکاریوں کے لیے ہے جو کچی کھائی جاتی اور ترکار سالن کے حکم میں داخل ہیں لیکن عام سبزیوں اور ترکاریوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

اس کے بعد بعض ان نعمتوں کا ذکر ہے جو فضا میں ابھرے ہوئے درختوں سے حاصل ہوتی ہیں اور جن کو دیکھنے کے لیے نگاہ اٹھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ بطور مثال ان میں سے زیتون اور کھجور کا ذکر فرمایا۔ زیتون کو روغن پیدا کرنے والی چیزوں میں جو اہمیت حاصل ہے وہ معلوم ہے۔ قرآن میں اس کے روغن کی غذائی اہمیت کا بھی ذکر ہے اور سورۂ نور میں اس سے جلنے والے روشن چراغوں کی تمثیل بھی بیان ہوئی ہے۔

پھر کھجور کا ذکر ہے۔ کھجور اہل عرب کے لیے بیک وقت گوناگوں فوائد و برکات کا مجموعہ ہے۔ یہ ان کے لیے غذا سے بھرپور میوہ بھی ہے اور ذخیرہ کیے جانے کے قابل نہایت پُرمنفعت غلہ بھی۔ علاوہ ازیں اس سے وہ نہایت لذیذ مشروب بھی حاصل کرتے۔

'وَحَدَآئِقَ غُلْبًا'۔ خاص خاص چیزوں کے ذکر کے بعد یہ عام باغوں کی طرف اشارہ فرما دیا۔ 'حَدِیْقَۃ' گھرے ہوئے باغ کو کہتے ہیں۔ 'غُلْبٌ' جمع ہے 'اغلب' کی جس کے معنی موٹی گردن والے کے ہیں۔ لیکن جب یہ باغ کی صفت کے طور پر آئے تو اس سے مقصود درختوں کی شادابی کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے۔ باغ شاداب ہوگا تو لازماً درختوں کا گھیراؤ بڑھ جائے گا اور ان کے اوپر کے حصے باہم دگر مل کر گھنے ہو جائیں گے۔

'وَفَاکِھَۃً وَّاَبًّا'۔ یہ اس عام کو خاص پر ذکر کر دیا تاکہ قدرت کے اس خوانِ کرم کا دائرہ انسانوں کے ساتھ ان حیوانات تک وسیع ہو جائے جو بلاواسطہ یا بالواسطہ اس کے کام آتے ہیں۔

اوپر میووں میں سے صرف خاص خاص کا ذکر نام کی تصریح کے ساتھ ہوا تھا، یہاں لفظ 'فَاکِھَۃ' استعمال کر کے تمام میووں کی طرف اشارہ فرما دیا، خواہ عرب میں پیدا ہوتے ہوں یا عجم میں، خواہ وہ اعلیٰ درجے کے ہوں یا ادنیٰ درجے کے، اور خواہ وہ پرندوں ہی کے لیے مخصوص ہوں یا انسان بھی ان سے فائدہ اٹھاتے ہوں۔

علاوہ ازیں اوپر صرف انہی نعمتوں کا ذکر ہے جو انسانوں کو حاصل ہیں، درآنحالیکہ انسانوں کے ساتھ ان کی خدمت کرنے والے چوپائے بھی ہیں جن کا انسان محتاج بھی ہے اور جو اسی طرح پرورش کے حاجت مند ہیں جس طرح انسان ہے لیکن خاص ان کے لیے کسی چیز کا ذکر نہیں ہوا تھا۔ وہ کمی یہاں لفظ 'اَبّ' کا اضافہ کر کے پوری کر دی۔

'اَبّ' کے معنی نبات اور شاداب گھاس کے ہیں۔ چوپایوں کے کام آنے والی چیز تو وہ بھس بھی ہے، جو غلہ سے الگ کیا جاتا ہے لیکن وہ عام اور معمولی چیز ہے جب کہ یہاں موقع کسی ایسی چیز کے ذکر کا تھا جو ان کے لیے وہی درجہ رکھتی ہو جو درجہ انسانوں کے لیے 'فواکہ' کا ہے۔ تازہ اور شاداب گھاس ان کے لیے غذا بھی ہے اور ساتھ ہی ان کے وہ ان تمام میووں، سبزیوں اور ترکاریوں کا بہترین بدل بھی ہے جو انسان کو حاصل ہیں۔

لفظ 'اَبّ' پر استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر سورۂ عبس میں مفصل بحث کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ لفظ عربی کے معروف الفاظ میں سے ہے اس وجہ سے بعض روایات میں یہ بات جو نقل ہوئی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کو اس کے معنی کا علم نہیں تھا، کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ میرے نزدیک استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق نہایت تشفی بخش ہے۔ اگر کسی کو اس کے بارے میں کوئی خلش ہو تو وہ مولانا کی تفسیر سورۂ عبس کی مراجعت کرے۔

مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (۳۲)

فرمایا کہ یہ چیزیں ہم نے تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے برتنے کے لیے پیدا کی ہیں۔ مطلب یہ ہے

کہ ان چیزوں کا تمھاری نفع رسانی کے لیے ہونا تو بالکل واضح ہے اور اس امر میں بھی کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ سب نعمتیں تمھارے پروردگار کے فضل سے حاصل ہوتی ہیں تو اب تم سوچو کہ ان انعامات کے بعد تمھارے اوپر خدا کی طرف سے کوئی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے یا نہیں؟ یہ آخری بات اگرچہ لفظوں میں مذکور نہیں ہے لیکن سیاق کلام سے یہ خود واضح ہے، اس لیے کہ اوپر سے اصل بحث ہی یہی چلی آرہی ہے کہ یہ ضدی اور مغرور لوگ اپنے رب کی ناشکری اس وجہ سے نہیں کر رہے ہیں کہ ان پر خدا کے حقوق واضح نہیں ہیں یا یہ اپنی ذمہ داریوں کے شعور سے نابلد ہیں بلکہ یہ جان بوجھ کر محض اکڑ اور ضد کے سبب سے پیغمبر کی کوئی بات اپنی خواہشوں کے خلاف سننے اور ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

فَإِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ (۳۳)

قیامت کی یاددہانی

'صَاخَّةٌ' کے معنی بہری کر دینے والی کڑک یا چیخ کے ہیں۔ جس طرح سورۂ نازعات میں لفظ 'طَآمَّة' آیا ہے اسی طرح اس سورہ میں لفظ 'صَآخَّة' آیا ہے۔ یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ صور قیامت کی پہلی کڑک ہی ایسی ہولناک ہوگی کہ کانوں کو بہرا کر دے گی۔

'إِذَا' کا جواب، جیسا کہ سورۂ نازعات کی آیات ۳۰-۳۵ کے تحت بیان ہو چکا ہے بربنائے وضاحت قرینہ محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو یہ پیغمبرؐ کے انذار سے اپنے کان بند کیے ہوئے ہیں لیکن اس دن کیا کریں گے جس دن خدا کا منادی اتنے قریب سے ان کو پکارے گا کہ اس کی آواز سب کے کانوں کے پردے پھاڑ دے گی!

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۝ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ۝ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ۝ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ (۳۴-۳۷)

یہ تفصیل ہے اس دن کی ہولناکی کی۔

'يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۝ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ۝ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ'، 'إِذَا' کا جواب نہیں ہے۔ اگر جواب ہوتا تو عربیت کے قاعدے سے اسلوب بیان اور ہوتا۔ جواب تو، جیسا کہ سورۂ نازعات کی آیت 'يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ مَا سَعَىٰ' (النزعت ۷۹: ۳۵) کے تحت گزر چکا ہے، محذوف ہے البتہ اس سے محذوف جواب پر روشنی ضرور پڑتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج پیغمبرؐ کے انذار سے انھوں نے اپنے کان جو بند کر رکھے ہیں تو اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ان کو اپنی خاندانی اور قبائلی قوت و عصبیت پر بڑا ناز ہے۔ اس زعم نے ان کو اندھا کر رکھا ہے کہ بھلا ان کو ان کے مقام سے کون ہلا سکتا ہے یا ہلا سکے گا لیکن اس بہری کر دینے والی چیخ کے بعد جو دن آئے گا وہ ایسا ہولناک ہوگا کہ ہر ایک پر نفسی نفسی کی حالت طاری ہوگی۔ نہ بھائی اپنے بھائی کی فریاد سنے گا، نہ بیٹا اپنے ماں باپ کی دہائی پر کان دھرے گا اور نہ کوئی اپنی بیوی اور بیٹوں کی مصیبت میں ان کا شریک بننے کا حوصلہ کرے گا۔ اس دن ہر ایک کو اپنی ہی ایسی پڑی ہوگی کہ کسی دوسرے کی خبر لینے کا وہ کوئی تصور ہی نہ کر سکے گا اگرچہ وہ کتنا ہی قریبی عزیز ہو۔

یہی مضمون سورۂ معارج میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے:

وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۝ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ؕ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِىٕذٍۭ بِبَنِيْهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۝ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ۝ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۝ (المعارج - ۷۰: ۱۰-۱۴)

اور اس دن کوئی سرگرم سے سرگرم دوست بھی اپنے دوست کا پرسانِ حال نہ ہوگا۔ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے لیکن مجرم چاہے گا کہ کاش وہ اپنے بیٹوں، اپنی بیوی، اپنے بھائی، اپنے خاندان کو جو اس کو پناہ دیتا رہا ہے اور تمام اہلِ زمین کو فدیہ میں دے کر اس دن کے عذاب سے اپنے کو بچا لے۔

ان دونوں آیتوں میں اگر کوئی فرق ہے تو یہ ہے کہ آیت زیرِ بحث میں رشتہ داروں کی ترتیب اَبعد سے اَقرب کی طرف ہے اور اس آیت میں اَقرب سے اَبعد کی طرف اور یہ دونوں اسلوب بلاغتِ کلام کے تقاضے سے اختیار کیے گئے ہیں اور یہ بلاغت بالکل واضح ہے۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَىٕذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَىٕذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ (۳۸-۴۲)

اس دن اہلِ ایمان اور اہلِ کفر کے درمیان جو فرق ان کے چہروں سے نمایاں ہوگا، یہ آخر میں بالاجمال اس کی طرف اشارہ کر دیا تاکہ ان کے اس ظاہر سے ان کے باطن کا کچھ اندازہ ہو سکے کہ اہلِ ایمان کے دل اس دن کن امیدوں اور حوصلوں سے معمور ہوں گے اور اہلِ کفر کے دلوں پر اس دن کیا گزر رہی ہوگی۔

'مُّسْفِرَةٌ' کے معنی روشن اور تابناک کے ہیں۔ یہ 'اسفر الصبح' کے محاورے سے ماخوذ ہے۔ مسرت کی پہلی چمک جو اہلِ جنت کے چہروں پر ظاہر ہوگی یہ لفظ اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

'ضَاحِكَةٌ' بھی مسرت اور خوشی کی تعبیر ہے یعنی ان کے چہرے ہنستے ہوئے ہوں گے۔

'مُّسْتَبْشِرَةٌ'۔ یعنی ہشاش بشاش ہوں گے۔

اہلِ کفر کے چہروں کا جو حال ہوگا اس کی تصویر یوں کھینچی ہے کہ 'وَوُجُوْهٌ يَّوْمَىٕذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۙ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ' کہ ان پر خاک اڑ رہی اور سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔ اس لیے کہ ان پر امید کے تمام دروازے بند ہو چکے ہوں گے۔

'اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ'۔ یہ آخر میں ان کی فردِ قراردادِ جرم کی طرف اجمالی اشارہ ہے کہ ان کا یہ حشر اس وجہ سے ہوگا کہ یہ خدا کے ناشکرے اور اس کے باغی و نافرمان رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر اتمام کو پہنچی۔ وھو الموفق للصواب۔

رحمان آباد

۲۱ - مئی ۱۹۷۹ء

۲۴، جمادی الثانی ۱۳۹۹ھ

تدبرِ قرآن

۸۱

التکویر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سے تعلق

پچھلی دونوں توام سورتوں ——— النّٰزعٰت اور عبس ——— میں جس ہولِ قیامت سے 'طَامَّۃ' اور 'صَآخَّۃ' کے ناموں سے ڈرایا گیا ہے اس سورہ میں اسی ہول کی پوری تصویر ہے۔ آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں پھر انسان کے قریب و بعید اور اس کے ظاہر و باطن کے ہر گوشہ میں اس ہلچل کے جو اثرات مترتب ہوں گے وہ اس طرح نگاہوں کے سامنے کر دیے گئے ہیں کہ انسان اگر سوچنے سمجھنے والا ہو تو ان آیات کے آئینے میں وہ سب کچھ دیکھ سکتا ہے جو ابھی پس پردہ ہے لیکن ایک دن وہ سب اس کے سامنے آنے والا ہے۔

اس کے بعد قریش کے مکذبین کو مخاطب کر کے آگاہ کیا گیا ہے کہ قرآن اس دن سے جو تمھیں ڈرا رہا ہے تو اس کو ایک حقیقت سمجھو اور اس کے لیے تیاری کرو۔ یہ خدا کا نازل کردہ کلام ہے جو اس نے اپنے سب سے مقرّب و معتمد فرشتے کے ذریعہ سے اپنے رسول پر اتارا ہے۔ اگر تم نے اس کو کاہنوں کی کہانت اور شاعروں کی شاعری سمجھ کر رد کر دیا تو یاد رکھو کہ نہ خدا کا کچھ بگاڑو گے نہ رسول کا بلکہ اپنی ہی تباہی کا سامان کرو گے۔ رسول کا کام لوگوں تک اس یاددہانی کو پہنچا دینا ہے۔ اس کے بعد ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے اور یہ بھی یاد رکھو کہ اس پر ایمان لانے کی توفیق انہی کو حاصل ہو گی جو حق کے قدردان اور اس کے طالب ہوں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سنت ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

پہلے چھ آیتوں میں وہ احوال بیان ہوئے ہیں جو مردوں کو زندہ کیے جانے سے پہلے پیش آئیں گے۔

(۱-۳) اس کائنات کی بلند و بالا اور عظیم و پرشوکت چیزوں مثلاً سورج، چاند اور پہاڑوں کا اس دن جو حال ہو گا اس کی تصویر۔

(۴-۶) زمین کی ہر چیز پر اس دن نفسی نفسی کی جو حالت طاری ہوگی اس کا اجمالی بیان۔ محبوب ترین چیزیں چھوٹی پھریں گی لیکن ان کا کوئی پوچھنے والا نہ ہوگا۔ جنگلوں اور غاروں کے وحوش و بہائم سمندروں کی طغیانی سے فرار کے لیے اکٹھے ہو جائیں گے، شیر اور ہرن دونوں پاس پاس ہوں گے لیکن مشترک مصیبت کے سوا ان کو اور کسی چیز کا بھی کچھ ہوش نہ ہوگا۔

اس کے بعد آٹھ آیتوں میں وہ احوال بیان ہوئے ہیں جو اٹھائے جانے کے بعد مشاہدہ میں آئیں گے۔

(۷-۱۴) انسانوں کی ان کے عقائد و اعمال کے اعتبار سے درجہ بندی اور معصوم مظلوموں کی دادرسی ہوگی۔ لوگوں کے اعمالنامے کھلیں گے۔ آسمان سرخ ہو جائے گا، جہنم دھکائی جائے گی، جنت اپنے حق داروں کے قریب لائی جائے گی اور ہر ایک اس دن دیکھ لے گا کہ وہ اپنے رب کے حضور کیا نذرانہ لے کر آیا ہے۔

(۱۵-۲۱) ستاروں کے ٹوٹنے اور شب کی تاریکی کے بعد صبح کے نمودار ہونے سے اس بات پر شہادت کہ یہ قرآن کاہنوں کی خرافات کی قسم کی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ یہ خدا کے ایک جلیل القدر فرشتے کا لایا ہوا کلام ہے جو عرش والے کے نزدیک بڑا ہی باعزت و با اقتدار ہے۔ تمام ملائکہ اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ وہ نہایت معتمد اور امانت دار ہے۔

(۲۲-۲۶) قرآن کے مکذبین کو تنبیہ کہ جو رسول تم کو یہ کلام سنا رہا ہے وہ کوئی خبطی و دیوانہ نہیں ہے بلکہ اللہ کا رسول اور نہایت فرزانہ ہے۔ وہ جس فرشتہ سے اپنی ملاقات کا دعویٰ کر رہا ہے یہ کوئی وہم نہیں بلکہ بیانِ حقیقت ہے۔ اس نے اس فرشتہ کو بالکل کھلے افق میں دیکھا ہے۔ وہ غیب دانی کا حریص نہیں ہے بلکہ اس پر جو وحی آتی ہے وہ بالکل غیر ارادی طور پر مبدأ فیض سے نازل ہوتی ہے۔ نادان ہیں جو اس کے کلام کو کسی شیطانِ رجیم کا القاء سمجھتے ہیں اور اس کے انذار کو جھٹلا رہے ہیں۔

(۲۷-۲۹) مکذبین کو مزید تنبیہ کہ اگر اسی طرح اپنی ضد پر اڑے رہ گئے تو یاد رکھو کہ نہ اللہ کا کچھ بگاڑو گے نہ اس کے رسول کا بلکہ اپنی ہی تباہی کا سامان کرو گے۔ جو کلام تم کو سنایا جا رہا ہے یہ تمھارے لیے یاددہانی ہے، اس سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا تمھارا اپنا کام ہے۔ نہ رسول کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کو تمھارے دلوں میں زبردستی اتار دے اور نہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ اس کو قبول کرنے پر مجبور کر دے۔ اس کے لیے انہی کے سینے کھلیں گے جو سیدھی راہ اختیار کرنے کا حوصلہ رکھنے والے ہوں گے اور یہ حوصلہ انہی کے اندر پیدا ہوگا جو سنتِ الٰہی کے مطابق اس کے سزاوار ہوں گے۔

سُورَةُ التَّكْوِير

مَكِّيَّةٌ ——— آيات : ٢٩

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

آيات إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (١) وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ (٢) وَإِذَا الْجِبَالُ
١-٢٩ سُيِّرَتْ (٣) وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (٤) وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ (٥)
وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (٦) وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ (٧) وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ
سُئِلَتْ (٨) بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (٩) وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ (١٠)
وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ (١١) وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ (١٢) وَإِذَا
الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ (١٣) عَلِمَتْ نَفْسٌ مَا أَحْضَرَتْ (١٤) فَلَا أُقْسِمُ
بِالْخُنَّسِ (١٥) الْجَوَارِ الْكُنَّسِ (١٦) وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ (١٧)
وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ (١٨) إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ (١٩) ذِي قُوَّةٍ
عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ (٢٠) مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ (٢١) وَمَا
صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ (٢٢) وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ (٢٣) وَمَا
هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ (٢٤) وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ (٢٥)
فَأَيْنَ تَذْهَبُونَ (٢٦) إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ (٢٧) لِمَنْ شَاءَ
مِنْكُمْ أَنْ يَسْتَقِيمَ (٢٨) وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ

رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٩﴾ ع

ترجمۂ آیات ۱ - ۲۹

جب کہ سورج کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور ستارے بے نور ہو جائیں گے۔ پہاڑ چلا دیے جائیں گے اور دس ماہہ گابھن اونٹنیاں آوارہ پھریں گی۔ وحشی جانور اکٹھے ہو جائیں گے اور سمندر اُبل پڑیں گے۔ ۱-۶

جب کہ نفوس کی جوڑیں ملائی جائیں گی اور زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر ماری گئی! جب کہ اعمال نامے کھولے جائیں گے اور آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی۔ جب کہ دوزخ بھڑکا دی جائے گی اور جنت قریب لائی جائے گی، تب ہر جان کو پتہ چلے گا کہ وہ کیا لے کر آئی ہے! ۷-۱۴

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے، چلنے والے اور چھپ جانے والے ستاروں کی اور رات کی جب وہ جانے لگتی ہے اور صبح کی جب وہ سانس لیتی ہے کہ یہ ایک باعزت رسول کا لایا ہوا کلام ہے۔ وہ بڑی ہی قوت والا اور عرش والے کے نزدیک بڑا ہی بارسوخ ہے۔ اس کی بات مانی جاتی اور وہ نہایت امین بھی ہے۔ ۱۵-۲۱

اور تمہارا یہ ساتھی کوئی خبطی نہیں ہے۔ اور اس نے اس کو کھلے افق میں دیکھا ہے اور یہ غیب کی باتوں کا کوئی حریص نہیں ہے اور یہ کسی شیطانِ رجیم کا القاء نہیں ہے۔ ۲۲-۲۵

تو تم کہاں کھوئے جاتے ہو! یہ تو بس عالم والوں کے لیے ایک یاددہانی ہے۔ اس کے لیے جو تم میں سے سیدھی راہ اختیار کرنی چاہے اور تم نہیں چاہو گے مگر یہ کہ اللہ، عالم کا خداوند چاہے۔ ۲۶-۲۹

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (۱)

'تکویر' کے معنی کسی شے کو لپیٹ دینے یا ایک گٹھڑ کی صورت میں باندھ لینے کے ہیں۔ 'کَوَّرَ العمامۃ عَلٰی رَاْسِہٖ' کے معنی ہیں 'اس نے عمامہ اپنے سر پر لپیٹ لیا'۔

قیامت کے ظہور کے وقت سورج کا حال — قیامت کے ظہور کے وقت آسمانوں بلکہ اس پوری کائنات کی سب سے زیادہ نمایاں اور شاندار چیز — سورج — کا جو حال ہو گا یہ اس کی تصویر ہے کہ اس کی بساط بالکل لپیٹ دی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ جب سورج کی بساط ہی لپیٹ دی جائے گی تو وہ سارا عالم تیرہ و تار ہو جائے گا جو اس کی تابانی سے روشن ہے۔ اگرچہ سورج کے چھپنے کا مشاہدہ ہمیں آج بھی ہر روز ہوتا رہتا ہے لیکن اس کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ یہ صورت صرف اس وجہ سے پیش آتی ہے کہ ہم اس سے اوٹ میں ہو جاتے ہیں البتہ جب قیامت کی ہلچل برپا ہو گی تو سورج کا سارا نظام ہی بالکل درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے اس تاریکی کا جب کہ سرے سے سورج ہی تاریک ہو جائے!

وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ (۲)

ستاروں کا حال — 'اِنْکِدَار' کے معنی دھندلے ہو جانے اور ماند پڑ جانے کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد ستاروں کا بے نور ہو جانا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب سورج ہی کی بساط لپیٹ دی جائے گی تو اس کے نظام سے وابستہ جتنے بھی بلب اور قمقمے ہیں وہ سب آپ سے آپ بے نور ہو جائیں گے۔

وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (۳)

پہاڑوں کا حال — آسمان کے بعد یہ زمین کی سب سے شاندار اور عظیم چیز — پہاڑوں — کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ پہاڑ جو زمینوں میں گڑے ہوئے ہیں، جن کو سمجھتے ہو کہ یہ بالکل غیر فانی اور اٹل ہیں، ان کی جگہ سے ان کو ہلایا نہیں جا سکتا[۱]، یہ اس دن چلا دیے جائیں گے۔ یہاں صرف چلا دیے جانے کا ذکر ہے لیکن دوسرے مقامات میں اس کی تفصیل بھی ہے کہ وہ اس طرح اڑتے پھریں گے جس طرح بادل اڑتے پھرتے ہیں۔

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (۴)

---

[۱] یہ امر ملحوظ رہے کہ منکرین قیامت کو جب قیامت کی ہلچل سے ڈرایا جاتا تو وہ اس کا مذاق اڑانے کے لیے یہ سوال کرتے کہ قیامت آئے گی تو کیا وہ پہاڑوں کو بھی اکھاڑ پھینکے گی؟

محبوب چیزوں کی کس مپرسی

'عِشَارُ' جمع ہے 'عُشَرَاءُ' کی۔ یہ لفظ اس اونٹنی کے لیے آتا ہے جو دس ماہ کی گابھن یعنی بچہ جننے کے قریب ہو۔

عظیم چیزوں کی بے ثباتی کے بعد یہ محبوب چیزوں کی بے وقعتی واضح فرمائی ہے کہ اس دن کی ہلچل لوگوں پر ایسی نفسی نفسی کی حالت طاری کر دے گی کہ کسی کی نظروں میں اس کے محبوب سے محبوب مال کی بھی کوئی وقعت باقی نہیں رہے گی۔

یہ بات قرآن کے اولین مخاطب، اہل عرب کے خاص مذاقِ طبیعت کو پیش نظر رکھ کر فرمائی گئی ہے۔ ان کے مال میں سب سے زیادہ قدر کی جگہ ان کے اونٹوں کو حاصل تھی۔ خاص طور پر وہ اونٹنیاں ان کو نہایت عزیز و محبوب تھیں جن کے حمل پر دس ماہ گزر چکے ہوں اور بچہ جننے کا وقت اب قریب آ لگا ہو۔ اس طرح کی اونٹنیوں کے مالک ان کی نگہداشت کا قدرتی طور پر خاص اہتمام کرتے۔ ان کی مستقبل کی بہت سی آرزوؤں کا ان پر انحصار ہوتا۔ انہی محبوب اونٹنیوں کو بطور مثال ذکر کر کے دنیا کی محبت میں پھنسے ہوئے غافلوں کو ہولِ آخرت کی یاد دہانی فرمائی ہے کہ اس کا پہلا ہی مرحلہ اتنا شدید ہو گا کہ اس وقت کسی کو اپنی محبوب سے محبوب چیزوں کا بھی کچھ ہوش نہیں رہے گا۔ گابھن اونٹنیاں آوارہ پھریں گی لیکن ان کے مالکوں کو خود اپنی اس طرح پڑی ہو گی کہ وہ کسی اور چیز کی طرف، خواہ وہ کتنی ہی محبوب و مطلوب کیوں نہ ہو، توجہ نہیں کر سکیں گے۔ یہی حقیقت دوسرے مقام 'تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ أَرْضَعَتْ' (الحج - ۲۲ : ۲) (جس دن ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی) کے الفاظ سے سمجھائی گئی ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ یہاں اس دن کے ہول کی حقیقت محبوب مال کی ناقدری سے سمجھائی گئی ہے اور وہاں شفقتِ مادری کے مردہ ہو جانے سے درآنحالیکہ یہ جذبہ اتنا قوی ہے کہ اس دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی مصیبت بھی اس کو مغلوب نہیں کر سکتی۔

وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ (۵)

وحشی جانوروں کا حال

یعنی انسان تو انسان اس دن کے ہول سے وحشی جانوروں پر بھی ایسی نفسی نفسی کی حالت طاری ہو گی کہ ان کو جس جگہ پناہ ملنے کی توقع ہو گی، آپس کی فطری دشمنیاں بھول کر سب اکٹھے ہو جائیں گے۔ جنگل میں آگ لگ جائے یا سیلاب کا پانی پھیل جائے تو جنگلی جانور سراسیمگی کی حالت میں جس ٹیلے اور ٹیکرے پر ان کو پناہ ملنے کی توقع ہو وہاں اکٹھے ہو جاتے ہیں اور مشترک مصیبت کا ہول ان پر ایسا طاری ہوتا ہے کہ بکری، شیر اور بھیڑیے پاس پاس کھڑے ہوتے ہیں لیکن کسی کو ہوش نہیں۔ حتیٰ کہ اس کا حریف یا شکار اس کی بغل میں ہے۔ یہی صورتِ حال خوفناک ترین شکل میں ظہورِ قیامت کے وقت پیش آئے گی۔ آگے والی آیت: وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (۶) (اور جب کہ سمندر ابل پڑیں گے) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سمندر اپنی حدوں سے آزاد ہو کر زمین پر پھیل جائیں گے۔ یہ ہمہ گیر

مصیبت جنگلی جانوروں پر بھی نفسی نفسی کی حالت طاری کردے گی۔

وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (۶)

سمندروں کی طغیانی

لفظ 'تَسْجِیْر' اصلاً تنور کو ایندھن سے بھر کر بھڑکا دینے کے لیے آتا ہے پھر اسی مفہوم سے وسعت پاکر یہ دریاؤں اور سمندروں کی طغیانی کے لیے بھی آنے لگا۔ دریا جب بے قابو ہوکر اپنے حدود سے باہر نکل پڑیں اور زمین پر پھیل جائیں تو اس حالت کی تعبیر کے لیے یہ معروف لفظ ہے۔ اس معنی کو ادا کرنے کے لیے لفظ 'تَفْجِیْر' بھی آیا ہے، چنانچہ بعد والی سورہ میں جو اس کی توام سورہ ہے، یہی بات 'وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ' (الانفطار - ۸۲: ۳) کے الفاظ سے تعبیر فرمائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو یہ سمندر اپنے حدود کے اندر بند ہیں لیکن جب قیامت کی ہلچل برپا ہوگی تو یہ ابل کر تمام سطح پر چھا جائیں گے۔

وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (۷)

ظہور قیامت کے بعد کے احوال

اوپر کی آیات میں وہ احوال بیان ہوئے جو ظہور قیامت کے وقت پیش آئیں گے۔ اب اس آیت اور بعد کی آیات میں وہ باتیں بیان ہو رہی ہیں جن کا تعلق ظہورِ قیامت کے بعد کے احوال سے ہے۔

فرمایا کہ جب نفوس کی جوڑیں ملائی جائیں گی' جوڑیں ملانے سے مقصود لوگوں کی ان کے اعمال و عقائد کے اعتبار سے الگ الگ گروہ بندی ہے۔ یہ اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے جس کی تفصیل سورۂ واقعہ کی آیت، 'وَكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً'[1] سے لے کر آیت ۵۶ تک بیان ہوئی ہے۔ وہاں واضح فرمایا ہے کہ اس دنیا میں تو نیک و بد دونوں ایک ہی ساتھ زندگی گزارتے ہیں لیکن یہی حالت ہمیشہ نہیں رہے گی بلکہ ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جب لوگوں کی درجہ بندی ان کے ایمان و اخلاق کی بنیاد پر ہوگی۔ اس دن وہ لوگ فائز المرام اور ابدی بادشاہی کے حق دار ٹھہریں گے جو اس روز عدل کی میزان میں پورے اتریں گے اور وہ لوگ ابدی خسران و ذلت سے دوچار ہوں گے جو اس سے بے پروا ہوکر زندگی گزاریں گے۔ اس کے بعد لوگوں کو تین بڑے گروہوں ـــــ اصحاب الیمین، اصحاب الشمال اور سابقون و مقربون ـــــ میں تقسیم کیا جاتا بیان کیا ہے اور ہر گروہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو معاملہ ہوگا اس کی تفصیل ہے۔ اسی چیز کی طرف دو لفظوں میں یہاں اشارہ فرما دیا ہے اور مقصود لوگوں کو متنبہ فرمانا ہے کہ یہ دنیا آزمائش و امتحان کے لیے ہے۔ اس میں خیر و شر اور حق و باطل دونوں کو مہلت ملی ہوئی ہے لیکن قیامت کے بعد جو جہانِ نو پیدا ہوگا اس میں باطل

---

[1] اور اس وقت تم تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔

کے پرستار جہنم میں جھونک دیے جائیں گے اور ان لوگوں کو ابدی سرفرازی حاصل ہوگی جو امتحان میں پورے اتریں گے۔

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (۸-۹)

معصوم مظلوموں کی دادرسی

یہ اس روزِ عدل کے عدل کی طرف اشارہ ہے اور اس کے بیان کے لیے بطورِ مثال زندہ درگور کی ہوئی لڑکی کی دادرسی کا حوالہ ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس دن سب سے پہلے وہ معصوم اپنی مظلومیت کی داد پائیں گے جو بالکل بے گناہ ان لوگوں کے ہاتھوں ظلم کے شکار ہوئے جن کو خدا نے ان کا محافظ بنایا۔ 'مَوْءٗدَةٌ' زندہ درگور کی ہوئی لڑکی کو کہتے ہیں۔ عرب جاہلیت کے بعض اجڈ قبائل میں سنگدل باپ اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ بیشتر تو اس سنگ دلی کا سبب فقر کا اندیشہ ہوتا لیکن بعض حالات میں غیرت کی بے اعتدالی بھی اس کا باعث بن جاتی۔ ان مظلوم بچیوں کو زندہ درگور کرنے والے چونکہ ان کے باپ ہی ہوتے، جن کو ان کے اوپر کلی اختیار حاصل ہوتا، اس وجہ سے ان کی داد فریاد کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

اخروی عدالت کا مزاج

قرآن نے یہاں ان بے زبان مظلوموں کی دادرسی کا ذکر کر کے اخروی عدالت کا مزاج واضح فرمایا ہے کہ اس میں سب سے پہلے ان کی دادرسی ہوگی جو اس دنیا میں سب سے زیادہ بے بس اور کمزور تھے اور جو اپنے اوپر گزرے ہوئے ظلم کی کسی کے آگے فریاد بھی نہ کر سکے۔ ان کو سب سے پہلے پکارا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ انھیں کس گناہ پر مارا گیا؟ ان سنگدل باپوں کو یہ نہایت ہی سخت قسم کی تنبیہ ہے کہ اگر ان کی سنگ دلی کے خلاف یہ بے زبان و بے گناہ بچیاں فریاد نہ کر سکیں تو اس سے وہ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ خدا کے ہاں بھی ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوگا۔ اس دن اللہ تعالیٰ خود ان کے خون کا مدعی بنے گا۔ وہ ان مظلوموں سے پوچھے گا کہ تمھیں کس جرم میں مارا گیا؟ اس سوال کا مقصد ظاہر ہے کہ یہی ہوگا کہ ان کے قتلِ ناحق کا مقدمہ جو دنیا کی کسی عدالت میں نہ جا سکا اس کو رب العزت خود اپنی عدالت میں لائے اور اس کا فیصلہ فرمائے۔

وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ (۱۱)

ہر ایک کا کچا چٹھا اس کے سامنے

'صُحُفٌ' سے مراد لوگوں کے اعمال نامے ہیں اور ان کے کھولے جانے سے مقصود یہ ہے کہ ہر ایک کا سارا کچا چٹھا اس کے سامنے آ جائے گا۔ آگے فرمایا ہے 'عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا اَحْضَرَتْ' (یعنی ہر جان یہ جان لے گی کہ آج کے دن کے لیے اس نے کیا کیا ہے)۔

وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ (۱۱)

آسمان سرخ ہو جائے گا

'کَشْطٌ' کے اصل معنی کسی چیز کے اوپر سے اس چیز کے اتار لینے کے ہیں جو اس کو ڈھانکے ہوئے ہو۔ یہیں سے یہ ذبیحہ کی کھال اتار لینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اونٹنی کی کھال کھینچ لینے کے

لیے یہ عربی میں معروف لفظ ہے اور یہ امر بالکل ظاہر ہے کہ ذبیحہ کی کھال اتار لینے کے بعد اس کا گوشت سرخ سرخ نظر آنے لگتا ہے۔ گویا یہ آسمان کے سرخ ہو جانے کی تعبیر ہے۔ سورۂ رحمٰن میں 'فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ (۳۷)' کے الفاظ آئے ہیں اور یہاں آگے کی آیت میں جہنم کے بھڑکائے جانے کا ذکر ہے جو نہایت واضح قرینہ اس بات کا ہے کہ آسمان کی یہ سرخی جہنم کے بھڑکائے جانے کے سبب سے ہوگی۔

وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ (۱۲)

'تَسْعِيْر' کے معنی بھڑکانے اور دہکانے کے ہیں۔ جہنم تیار تو پہلے سے ہوگی لیکن جب مجرموں کو اس میں ڈالنے کا وقت آئے گا تو وہ ان کو جلانے کے لیے خاص طور پر بھڑکا دی جائے گی پھر جب مجرم اس میں ڈالے جائیں گے تو وہ اپنا مطلوب ایندھن پا کر مزید قوت سے بھڑکے گی۔

وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ (۱۳)

متقیوں کے لیے جنت کی پیشکش

'اِزْلَاف' کے معنی قریب لانے کے ہیں۔ یعنی وہ ان متقیوں کے قریب لائی جائے گی جو اس کے مستحق قرار پائیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ 'جنت' بھی پہلے سے تیار ہوگی، البتہ اس کی نقاب کشائی اس وقت ہوگی جب لوگوں کی درجہ بندی ہو جائے گی۔ سورۂ قٓ میں یہ وضاحت بھی فرما دی گئی ہے کہ اس قریب لانے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ کہیں دور سے قریب لائی جائے گی، وہ دور نہیں ہوگی بلکہ پاس ہی ہوگی لیکن وہ قریب ہوتے ہوئے باوصف اور قریب لائی جائے گی تاکہ اہل جنت کی تشریف و تکریم کے لیے ایک پیش کش کے طور پر ان کے سامنے پیش کی جائے۔ فرمایا ہے 'وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ' (قٓ - ۵۰ : ۳۱) (اور جنت خدا ترسوں کے لیے قریب لائی جائے گی درآنحالیکہ وہ کچھ دور بھی نہ ہوگی)۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ (۱۴)

تمام شرطوں کا جواب

اوپر جتنے 'اِذَا' گزرے ہیں یہ ان سب کا اکٹھے جواب ہے۔ یعنی جب یہ یہ احوال پیش آئیں گے تب ہر جان کو پتہ چلے گا کہ وہ اپنے رب کے آگے پیش کرنے کے لیے کیا لے کر آئی ہے۔ اس جاننے سے مقصود ظاہر ہے کہ اس کے انجام کو جاننا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آج کے حالات میں اس کا مذاق اڑا رہے ہیں وہ مذاق اڑا لیں لیکن یاد رکھیں کہ یہ دن آنے والا ہے اور ایک عظیم بلچل کے ساتھ آنے والا ہے اور اس دن ہر ایک دیکھ لے گا کہ اس کے لیے اس نے کیا تیاری کی اور کیا چیز نظر انداز کی درآنحالیکہ نہ کرتے کی تھی۔ آگے والی سورہ میں، جو اس کی توام سورہ ہے، یہی مضمون زیادہ وضاحت سے بیان ہوا ہے۔ فرمایا ہے، 'عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ' (الانفطار - ۸۲ : ۵) (تب ہر ایک جان لے گا اس نے کیا کیا اور کیا چھوڑا)۔

فَلَا أُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۙ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۙ وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ ۙ وَالصُّبْحِ

اِذَا تَنَفَّسَ ۝ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (۱۵-۱۹)

قرآن کی تکذیب کے لیے ایک اشغلہ

یہ انذار کا مذاق اڑانے والوں کے اس وہم کی تردید ہے جو انھوں نے اللہ کے رسول اور اس کی کتاب سے متعلق ایجاد کیا اور جس کو دلیل بنا کر انھوں نے اپنے عوام کو ورغلانے کی کوشش کی کہ وہ قرآن کو کوئی خدائی وحی سمجھ کر اس سے مرعوب یا متاثر نہ ہوں۔ انھوں نے جب دیکھا کہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے متاثر ہو رہے ہیں اور عذاب و قیامت کا ڈراوا ایک حقیقت بنتا جا رہا ہے جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکل سکتا ہے کہ وہ اس دعوت کے حامی بن جائیں تو انھوں نے ان کو اس سے بدگمان کرنے کے لیے یہ اُشغلہ ایجاد کیا کہ نہ یہ قرآن خدائی وحی ہے اور نہ اس کے پیش کرنے والے اللہ کے رسول ہیں بلکہ یہ ہمارے کاہنوں کی طرح کے ایک کاہن ہیں۔ جس طرح کاہنوں کا تعلق جنات سے ہوتا ہے جو ان پر غیب کی باتیں القاء کرتے ہیں اسی طرح ان کا رابطہ بھی (العیاذ باللہ) کسی شیطان سے ہے جو ان پر اپنی باتیں القاء کرتا ہے اور وہ اس کو خدائی وحی کے نام سے پیش کرتے اور دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں جن کو اس نے ہمارے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ ہم ان کی اطاعت کریں اور اگر ہم نے ان کی بات نہ مانی تو اس دنیا میں بھی ہم پر عذاب آ جائے گا اور اس کے بعد آخرت میں بھی ہمارے لیے جہنم تیار رہے۔

قرآن نے ان کے اس پراپیگنڈے کی جگہ جگہ تردید کی ہے۔ خاص طور پر سورۂ شعراء اور سورۂ نجم میں اس کی تردید پوری وضاحت سے ہوئی ہے اور ہم نے بھی اس کے تمام پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ یہاں بھی ان کے اسی پراپیگنڈے کی تردید ایک نئے پہلو سے ہے جس کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے عربوں میں مروّج کہانت کی اصل و بنیاد کو جان لینا ضروری ہے۔

اس کہانت کی بنیاد دو چیزوں پر تھی:

کہانت کی بنیاد دو چیزوں پر تھی

ایک تو ان کے مزعومہ علم نجوم پر۔ وہ ستاروں کے متصرّف بالذّات ہونے کے معتقد اور ان میں سے بعض کے سعد اور بعض کے نحس ہونے کے مدعی تھے۔ اسی طرح ان کے طلوع و غروب، ان کے گرنے اور چڑھنے اور ان کے چلنے اور چھپنے کے متعلق مختلف قسم کے اوہام انھوں نے ایجاد کر رکھے تھے جن کی بنیاد پر وہ اپنے عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے مختلف قسم کی مبارک یا منحوس پیشین گوئیاں کرتے اور اپنی غیب دانی کی دھونس جماتے۔ مثلاً بسا اوقات یہ افواہ پھیلا دیتے کہ فلاں ستارے کی الٹی گردش سے ایک بڑا خطرہ ظہور میں آنے والا ہے اس سے بچنے کی تدابیر معلوم کرنے کے لیے لوگ ان سے رجوع کریں۔ پھر جو بدقسمت ان کے دام میں آ جاتے ان کو وہ اچھی طرح بے وقوف بناتے۔

دوسری یہ کہ وہ جنات سے رابطہ رکھنے اور ان کے ذریعہ سے غیب کی خبریں معلوم کرنے کے مدعی تھے۔ سورۂ شعراء کی تفسیر میں وضاحت ہو چکی ہے کہ جب کوئی شخص ان سے کسی معاملے میں غیبی رہنمائی کا

طالب ہوتا تو وہ اس مقصد کے لیے مراقبہ کی نمائش کرتے اور پھر ایک مقفّٰی اور مسجّع کلام کی صورت میں جو اکثر بے معنی یا ذومعانی ہوتا، اپنی مزعومہ وحی پیش کرکے اس کے کچھ الٹے سیدھے معنی بیان کرتے اور دعویٰ کرتے کہ یہ وحی ان پر عالمِ غیب کے اسرار سے واقف ایک جن نے کی ہے۔

کہانت کے ستونوں پر قرآن کی ضرب

قرآن نے جگہ جگہ کہانت کے ان دونوں ہی ستونوں پر ضرب لگائی ہے۔ شمس و قمر اور ستاروں کے طلوع و غروب کو اس نے اس طرح پیش کیا ہے جس سے یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ ان میں سے کوئی مؤثر بالذات ہے اور نہ کوئی سعد یا نحس بلکہ ان کا طلوع و غروب خالقِ کائنات کے اختیار میں ہے۔ وہی جب چاہتا ہے ان کو مطلع پر نمودار کرتا ہے اور جب چاہتا ہے ان کو نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ وہ خود اپنے وجود سے شہادت دیتے ہیں کہ وہ آسمان و زمین کے رب کے ہاتھ میں مسخر ہیں۔ اسی کے حکم سے آتے اور اسی کے حکم سے جاتے ہیں۔ ع

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

سورۂ انعام آیات ۷۵-۸۳ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا جو تدریجی ارتقاء نمایاں فرمایا گیا ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ وہ اس باب میں قرآن کے طریقِ استدلال اور اس کے منطقی نتیجہ کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہے۔

اسی طرح کہانت کے دوسرے ستون پر ضرب لگانے کے لیے قرآن نے شہابِ ثاقب کا حوالہ دیا اور واضح فرمایا ہے کہ کسی جن کے لیے ملأ اعلیٰ تک رسائی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اگر غیب کی خبریں معلوم کرنے کے لیے وہ ٹوہ لگاتے ہیں تو ان کی سرکوبی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ستاروں کے اندر یہ انتظام کر رکھا ہے کہ ان کی برجیوں سے ان کے اوپر شہابِ ثاقب کے راکٹ پھینکے جاتے ہیں۔ یہ مضمون یوں تو جگہ جگہ بیان ہوا ہے لیکن زیرِ بحث قسموں کو سمجھنے کے لیے سورۂ نجم اور سورۂ جن کی متعلق آیات پر ایک نظر ڈال لینا کافی ہوگا۔

اس تمہید کی روشنی میں اب آیات کے الفاظ اور ان کے معانی پر غور کیجیے۔

آیاتِ قسم کے الفاظ کی تحقیق

فَلَآ اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ ۙ الۡجَوَارِ الۡکُنَّسِ ۙ یہ بحث اس کتاب میں جگہ جگہ گزر چکی ہے کہ قرآن مجید میں اس طرح کی قسمیں جو آئی ہیں وہ کسی دعوے پر شہادت کے مقصد سے آئی ہیں اور یہ بات بھی واضح کی جا چکی ہے کہ قسم سے پہلے اگر اس طرح 'لَا' آیا ہے جس طرح یہاں ہے تو وہ قسم کی نفی کے لیے نہیں بلکہ مخاطب کے اس زعم کی نفی کے لیے آیا ہے جس کی تردید اس قسم سے مقصود ہے۔

'خُنَّسٌ'، جمع ہے 'خَانِسٌ' کی۔ اس کے معنی آگے بڑھ کر پیچھے پلٹ جانے والے، ظاہر ہو کر غائب ہو جانے والے اور نمایاں ہو کر روپوش ہو جانے والے کے ہیں۔ یہ لفظ ستاروں کی صفت کے طور

پر آتا ہے اور ان کے لیے اس قدر معروف ہے کہ بسا اوقات موصوف کے ذکر کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ مجرد صفت ہی موصوف کو ظاہر کر دینے کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔ بعض اہل لغت نے اس کو بعض خاص ستاروں کے ساتھ مخصوص کیا ہے لیکن یہ دعویٰ بے دلیل ہے۔ یہاں ستاروں کی جو صفات مذکور ہوئی ہیں وہ تمام ستاروں پر یکساں منطبق ہوتی ہیں خواہ وہ ثوابت ہوں یا سیارے، زحل ہو یا عطارد اور ان کے قبیل کے دوسرے ستارے۔

'اَلْجَوَارِ الْكُنَّسِ' یہ انہی ستاروں کی مزید صفات کا بیان ہے اور ان کا بغیر حرفِ عطف کے آنا عربیت کے اس معروف قاعدے سے، جس کی وضاحت اس کے محل میں گزر چکی ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے موصوف الگ الگ نہیں ہیں۔

'جَوَارِی' کے معنی چلنے والے کے ہیں اور 'كُنَّسٌ' جمع ہے 'كَانِسٌ' کی۔ 'کنس الظبی' کے معنی ہوں گے ہرن اپنے مامن میں چھپ گیا۔ 'کنست النجوم' کے معنی ہوں گے کہ ستارے اپنے مدار میں چلے اور چل کر اپنے ٹھکانوں میں روپوش ہو گئے۔ صاحبِ اقرب الموارد نے وضاحت کی ہے کہ یہ صفت تمام ستاروں کی مشترک صفت ہے۔

ستاروں کی قسم کہانت کے ابطال کے پہلو سے

ستاروں کی یہ قسم یہاں کہانت کے ابطال کے لیے کھائی گئی ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ کاہنوں کے مزعومہ علمِ غیب کی بنیاد دو چیزوں پر تھی۔ ایک ان ستاروں کے مؤثر بالذات ہونے کے تصور پر، دوسرے اس وہمِ باطل پر کہ آسمانوں کے اندر ایسے ٹھکانے (مقاعد للسمع) ہیں جن میں بیٹھ کر جنات غیب کی باتیں سنتے اور پھر ان کو پہنچاتے ہیں۔ ستاروں کی مذکورہ صفات کا حوالہ دے کر قرآن نے ان کے ان دونوں باطل تصورات کی نفی کر دی۔ طلوع کے بعد ان کے غروب اور آنے کے بعد ان کے جانے اور اس طلوع و غروب اور ایاب و ذہاب میں اوقات کی ایسی پابندی کہ منٹ اور سیکنڈ کا بھی فرق نہ پیدا ہونے پائے اس امر کی نہایت واضح شہادت ہے کہ وہ اس کائنات کے نظام میں مؤثر بالذات عناصر کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ایک بالاتر حکیم و تدبیر کے ہاتھوں میں مسخر ہیں۔ اس وجہ سے اصل مولیٰ و مرجع اور نافع و ضارّ وہ ہے نہ کہ یہ محکوم و مقہور کواکب و نجوم۔

دوسرے وہم کے ابطال کے لیے قرآن نے اس کائنات کے ایک راز کو آشکارا فرمایا ہے کہ ان ستاروں کے اندر شیاطین کے استراقِ سمع اور تجسسِ غیب کے لیے ٹھکانے نہیں بنے ہوئے ہیں، جیسا کہ نادانوں نے گمان کر رکھا ہے، بلکہ اس کے برعکس ان کے اندر ایسی برجیاں اور دیدبان بنے ہوئے ہیں جہاں سے ان شیاطین پر مار پڑتی ہے جو ملاءِ اعلیٰ کی باتوں کی ٹوہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ستاروں کی یہ صفتیں یہاں قسم کے اسلوب میں بیان ہوئی ہیں اس وجہ سے بتقاضائے بلاغت ان میں غایت درجہ ایجاز ہے۔ تاہم الفاظ کے اندر ایسے اشارے یہاں بھی موجود ہیں جو غور کرنے والوں

کی رہنمائی کے لیے کافی ہیں، مثلاً 'خُنَّس' کی صفت واضح طور پر ان کے افول و غروب کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ اس صفت کے ذکر سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ نادانوں نے صرف ان کے طلوع کو اہمیت دی اور ان کو معبود بنا بیٹھے حالانکہ ان کی پسپائی اور ان کے ڈوبنے کو بھی دیکھنا تھا جو ان کے محکوم و مسخّر ہونے کی نہایت واضح دلیل ہے۔

اسی طرح 'الْجَوَارِ الْكُنَّسِ' کے اندر ایک ہلکا سا اشارہ اس نقل و حرکت کی طرف بھی ہے جو یہ ستارے شیاطین کے تعاقب میں کرتے ہیں جب وہ استراقِ سمع کی کوشش کرتے نکلتے ہیں تو اس وقت ستاروں کا منظر دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ ایک برقِ خاطف تیر کی طرح نکلی اور اپنے ہدف پر پہنچ کر دفعتہً پھر اپنے ترکش میں چھپ گئی۔

وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ ۝ وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ (۱۷-۱۸)

یہ دوسری قسم ہے جو اسی دعوے پر ایک دوسرے پہلو سے شہادت ہے۔

'عَسْعَسَ' کے معنی اہل لغت نے تاریک ہو جانے کے بھی لکھے ہیں اور پیچھے ہٹ جانے اور گزر جانے کے بھی۔ اگرچہ آیت کی تاویل دونوں معنوں کی روشنی میں ہو سکتی ہے لیکن میں دوسرے معنی کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعینہٖ یہی قسم، بالکل اسی سیاق و سباق اور معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ سورۂ مدثر کی آیات ۳۳-۳۴ میں بھی آئی ہے۔ وہاں 'عَسْعَسَ' کی جگہ لفظ 'أَدْبَرَ' آیا ہے۔ فرمایا ہے: 'وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ۝ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ' (شاہد ہے رات جب کہ وہ پیچھے ہٹ جاتی ہے اور شاہد ہے صبح جب کہ وہ بے نقاب ہو جاتی ہے) وہاں بھی اس قسم کے بعد قرآن مجید کے انذارِ قیامت کی حقانیت ثابت کی گئی ہے اور یہاں بھی، جیسا کہ آگے وضاحت آ رہی ہے، اسی دعوے کی تصدیق فرمائی گئی ہے۔

'وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ' میں لفظ 'تَنَفَّسَ' سے مقصود تو صبح کا نمودار ہونا ہی ہے لیکن اس طریقۂ تعبیر میں ایک خاص بلاغت ہے جو اصحابِ ذوق سے مخفی نہیں ہے۔ یہ لفظ گویا یہ تاثر دیتا ہے کہ صبح رات کے بوجھ کے نیچے اس طرح دبی ہوتی ہے کہ اس کا دم گھٹ رہا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اوپر سے اس بوجھل لحاف کو سرکاتا ہے اور اس کو سانس لینے اور سر اٹھانے کا موقع نصیب ہوتا ہے۔

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ (۱۹)

اصل دعویٰ — یہ مذکورہ بالا دونوں قسموں کا مقسم علیہ یا بالفاظِ دیگر وہ اصل دعویٰ ہے جس کو ثابت کرنے کے لیے یہ قسمیں کھائی گئی ہیں۔ فرمایا کہ بے شک یہ قرآن ایک معزز و مکرّم فرستادۂ الٰہی کا لایا ہوا کلام ہے۔ 'رسول' سے یہاں مراد حضرت جبریلؑ ہیں۔ آگے جو صفات بیان ہوئی ہیں اور جن کی وضاحت آ رہی ہے ان سے متعین ہو جائے گا کہ ان صفات کے موصوف حضرت جبریل علیہ السلام ہی ہو سکتے ہیں۔

یہی بات آگے آیت ۲۵ میں منفی پہلو سے بھی فرما دی گئی ہے جس سے لفظ کریم کا اصل موقع و محل واضح ہوتا ہے۔ فرمایا ہے: 'وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ' (اور یہ کسی راندۂ درگاہ شیطان کی القاء کی ہوئی بات نہیں ہے) مطلب یہ ہے کہ محروم القسمت ہیں وہ لوگ جو اس قرآن کو کاہنوں کی بکواس کی قسم کی کوئی چیز قرار دیتے اور اللہ کے رسول کو کاہن کہتے ہیں۔ کاہن جو کچھ پیش کرتے ہیں وہ شیطانی القاء ہوتا ہے جس میں صداقت کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ وہ غیب دانی کے مدعی ہوتے ہیں لیکن ان کے شیاطین کی رسائی ملاءِ اعلیٰ تک ہونا تو درکنار وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسے مردود و مبغوض ہیں کہ وہ آسمانوں میں گھات لگانے کی کوشش کرتے ہیں تو ان پر شہابوں کے ذریعہ سے سنگ باری ہوتی ہے۔ اس کے برعکس یہ کلام جو ان کو سنایا جا رہا ہے یہ اللہ کے ایک ایسے فرشتہ کا لایا ہوا کلام ہے جو خدا کی بارگاہ میں عزت پائے ہوئے اور نہایت مقرب و مکرم ہے۔

ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۙ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۝ (۲۰-۲۱)

حضرت جبریلؑ کی مزید صفات

یہ حضرت جبریل امینؑ کی مزید صفات بیان فرمائی گئی ہیں تاکہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ قرآن کس محفوظ و مامون اور پاکیزہ ذریعہ سے اترا ہوا کلام ہے اور کاہن جس ذریعہ سے اپنا مزعومہ علم حاصل کرتے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے۔ فرمایا کہ یہ باعزت رسول نہایت زور و قوت والا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسی اعلیٰ اور محکم صلاحیتوں سے نوازا ہے کہ دوسری شیطانی طاقتیں اس کو مرعوب یا مغلوب یا متاثر نہیں کر سکتیں کہ اس کے فرائضِ مفوّضہ میں وہ مزاحم ہو سکیں یا اس سے کوئی چیز اچک سکیں یا اس کو دھوکا دے سکیں۔ وہ صاحبِ عرش کے احکام پورے اختیار و اقتدار کے ساتھ نافذ کرتا ہے اس لیے کہ وہ اس کی بارگاہ میں نہایت تقرب اور رسوخ رکھنے والا ہے۔ اس کو صاحبِ عرش تک براہِ راست رسائی حاصل ہے کوئی دوسرا اس کے اور صاحبِ عرش کے درمیان حائل نہیں ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام کی یہی صفت سورۂ نجم کی آیات ۵-۶ میں 'شَدِيْدُ الْقُوٰى' اور 'ذُوْ مِرَّةٍ' کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے جس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

'مُطَاعٍ' یعنی جو ارواح و ملائک اس کی ماتحتی میں ہیں وہ سب بے چون و چرا اس کی اطاعت کرتے ہیں، مجال نہیں ہے کہ سرمو اس کے احکام سے انحراف کر سکیں یا اس کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکیں یا اس کے دیے ہوئے احکام میں کوئی تحریف یا ترمیم یا شیاطین کے ساتھ کوئی سازباز کر سکیں۔

'ثَمَّ' کی تحقیق

'ثَمَّ اَمِيْنٍ' کلام عرب کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ 'ثُمَّ' اور 'ثَمَّ' کے مواقع استعمال میں بڑا فرق ہے۔ 'ثَمَّ' کسی جگہ کی طرف خاص طور پر اشارہ کے لیے بھی آتا ہے اور کسی صفت سے پہلے اس پر خاص اہتمام سے زور دینے کے لیے بھی، مثلاً سورۂ شعراء میں فرمایا ہے: 'وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ (۶۴)'

اس کا ترجمہ اگر ثَمَّ کے صحیح مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیجیے تو یہ ہوگا کہ وہیں ہم لائے دوسروں کو بھی۔ یعنی جس راہ سے ہم نے بنی اسرائیل کو نجات دی وہیں ہم فرعونیوں کو بھی لائے تاکہ ان کو غرق کر دیں۔

اسی طرح سورۂ دھر کی آیت وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا (۲۰) میں بھی یہ لفظ آیا ہے۔ اس کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ ہمارے نزدیک یہ ہوگا کہ جہاں دیکھو گے وہیں عظیم نعمت اور عظیم بادشاہی دیکھو گے؛ ع

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا این جا است

اسی طرح صفت سے پہلے جب یہ آتا ہے تو اس کی عظمت و اہمیت کو نمایاں کرنے کے لیے آتا ہے۔ یہاں یہ صفت 'امین' سے پہلے آیا ہے تو اس سے مقصود حضرت جبریل علیہ السلام کی اس صفت کی طرف خاص طور پر توجہ دلانا ہے۔ یعنی مذکورہ صفات کے ساتھ ان کی خاص اہمیت رکھنے والی یا خاص طور پر ذکر کے لائق صفت یہ بھی ہے کہ وہ نہایت امانت دار ہیں۔

اس صفت کے خاص اہتمام کے ساتھ ذکر کی وجہ یہ ہے کہ ان کی یہی صفت اس امر کی ضمانت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول کے پاس جو کچھ لاتے ہیں اس میں نہ کسی ملاوٹ کا کوئی شائبہ ہوتا نہ کسی کمی بیشی کا کوئی اندیشہ۔ اس کے برعکس کاہنوں کے علم کا حال یہ ہے کہ وہ جن شیاطین سے علم حاصل کرتے ہیں وہ اُچکے اور چور ہوتے ہیں۔ اول تو ملاء اعلیٰ تک وہ پہنچ نہیں پاتے اور اگر کوئی بات اچکنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ بیشتر جھوٹ ہوتی ہے جس میں مزید جھوٹ ملا کر وہ اپنے کاہنوں پر القا کرتے ہیں اور یہ کاہن ان سے بھی بڑھ کر جھوٹے ہوتے ہیں جو اپنی دکان داری کو فروغ دینے کی خاطر رائی کو پربت بناتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس ناپاک جوہڑ کو اس چشمۂ صافی سے کیا نسبت جس سے اللہ کا رسول فیض یاب ہوتا ہے!

وَمَا صَاحِبُكُم بِمَجْنُونٍ (۲۲)

قریش کو تنبیہ

رسول کے ذریعۂ علم کی عظمت و طہارت واضح کرنے کے بعد یہ قریش کے لیڈروں کو مخاطب کر کے تنبیہ فرمائی کہ تمھارے یہ ساتھی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اگر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے تمھیں انذار کرنے پر مامور فرمایا ہے اور جو کچھ وہ تمھیں سنا رہے ہیں وہ اس کا کلام ہے جو اس نے اپنے سب سے زیادہ مقرب فرشتے کے ذریعہ سے ان پر نازل فرمایا ہے تو ان کی ان باتوں کو خبط و جنون پر محمول نہ کرو بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔

یہاں لفظ صَاحِبُكُمْ کے استعمال میں بڑی بلاغت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تمھارے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں۔ تمھارے ہی اندر یہ پیدا ہوئے۔ تمھارے ہی ساتھ یہ رہے سہے اور تمھارے ہی

اندر ان کی اب تک کی زندگی کا ہر دور گزرا اور تم میں سے ہر شخص ان کی شرافت، رزانت، متانت، عفت، صداقت اور امانت کا گواہ رہا ہے۔ اب اگر ان کی موعظت تمھیں گراں گزر رہی ہے تو ان کے اب تک کے کردار کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرو نہ کہ ان کو خبطی، دیوانہ، مجنون اور کاہن و منجم بنا ڈالو۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ (۲۳)

یعنی اگر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے اس فرشتہ کو دیکھا ہے جو ان پر وحی لے کر آتا ہے تو یہ بھی کوئی جھوٹ یا فریبِ نفس نہیں ہے بلکہ بیانِ حقیقت ہے۔ انھوں نے فی الواقع اس فرشتے کو بالکل کھلے ہوئے اور صاف افق میں دیکھا ہے۔ 'افق مبین' سے مراد فضائے آسمانی کا وہ حصہ ہے جو نظر کے سامنے ہے جس کا مشاہدہ بغیر کسی شائبۂ اشتباہ کے ہوتا ہے۔ سورۂ نجم میں اسی کو 'افقِ اعلیٰ' سے تعبیر فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی ۙ
ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰی ۙ وَهُوَ
بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی ؕ ثُمَّ دَنَا
فَتَدَلّٰی ۙ فَكَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ
اَوْ اَدْنٰی ۚ فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِهٖ مَآ
اَوْحٰی ؕ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی ۝
اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی ۝
(النجم۔ ۵۳: ۵-۱۲)

اس کو ایک بڑی مضبوط قوتوں والے، طاقتور نے تعلیم دی ہے۔ وہ سیدھا ہوا درآنحالیکہ وہ افقِ اعلیٰ میں تھا۔ پھر وہ قریب ہوا اور جھک پڑا۔ بس دو کمانوں یا اس سے بھی کم کا فاصلہ رہ گیا۔ پس اللہ نے وحی کی اپنے بندے کی طرف جو وحی کی۔ یہ مشاہدہ جو اس نے کیا وہ کوئی فریبِ نفس نہیں ہے۔ تو کیا تم لوگ اس سے اس چیز پر جھگڑتے ہو جس کا اس کو مشاہدہ ہوتا ہے۔

ان آیات کی تفسیر تدبرِ قرآن میں پڑھ لیجیے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان مشاہدات کی طرف اشارہ ہے جو آپ کو آغازِ وحی میں ہوئے۔ جب آپ نے ان کا ذکر اپنی قوم کے لوگوں کے سامنے کیا تو وہ آپ کے سر ہو گئے اور اس کی تردید میں طرح طرح کی باتیں انھوں نے بنائیں۔ کسی نے اس کو شیطانی القاء قرار دیا اور کسی نے محض واہمہ کی خلاقی۔ انہی جھٹلانے والوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ نہ یہ کوئی فریبِ نفس ہے اور نہ فریبِ نظر بلکہ یہ کھلے ہوئے افق کا ایک ایسا مشاہدہ ہے جس میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں ہے۔

وَمَا هُوَ عَلَی الْغَیْبِ بِضَنِیْنٍ (۲۴)

اللہ کا رسول غیب کا حریص نہیں ہے

یعنی ہمارا رسول تمھارے کاہنوں کی طرح غیب کا حریص نہیں ہے کہ جو واہمہ دل میں گزر جائے اس کو حقیقت سمجھ کر غیب دانی کا مدعی بن بیٹھے اور اپنی دکان سجا لے بلکہ اس کو جو مشاہدہ ہوتا ہے یا جو وحی اس پر آتی ہے وہ اضطراری طور پر آتی ہے جس کو وہ تمھارے سامنے پیش کرتا ہے۔ تمھارے

کاہن غیب جاننے کے لیے نہ جانے کیا کیا پاپڑ بیلتے ہیں اور اسی پر ان کی دکان داری کا انحصار ہوتا ہے اس وجہ سے کوئی سچی چیز ہاتھ نہیں آتی تو جھوٹ ہی سے اپنی دکان چمکاتے ہیں لیکن اپنے اس ساتھی کے متعلق تمھیں اچھی طرح علم ہے کہ وہ ان چیزوں کے پیچھے کبھی نہیں پڑے۔ یہ جو کچھ تمھارے آگے پیش کر رہے ہیں یہ غیب دانی کی نمائش یا جلبِ زر کا کوئی بہانہ نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت کا اظہار ہے جس کے اظہار پر وہ مضطر ہیں۔

'ضَنِیْنٌ' کا ترجمہ عام طور پر لوگوں نے 'بخیل' کیا ہے لیکن میں نے حریص کیا ہے۔ بخل و حرص دونوں لازم و ملزوم ہیں اس وجہ سے ان میں فرق محض ظاہری ہے لیکن میں نے حرص کے معنی کو اس وجہ سے ترجیح دی ہے کہ لفظ 'ضَنٌّ' بخل کے معنی میں جب آتا ہے تو اس کا صلہ 'ب' آتا ہے اور یہاں 'عَلٰی' آیا ہے جو اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ 'حرص' کے معنی پر متضمن ہے۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ (۲۵)

اوپر جو بات 'اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ' کے الفاظ میں فرمائی ہے وہی بات یہ منفی پہلو سے مؤکد کر دی ہے کہ یہ کسی شیطانِ رجیم کا القا نہیں ہے جو تمھارے کاہنوں پر ہوتا ہے۔

'رَجِيْمٍ' مقابل ہے 'كَرِيْمٍ' کے۔ مطلب یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر جو فرشتہ وحی لے کر آتا ہے وہ تو اللہ کا ایک عالی مقام فرشتہ ہے اور تمھارے کاہنوں پر جو شیاطین اترتے ہیں وہ کھدیڑے اور راندے ہوئے ہیں۔ 'رَجِيْمٍ' کے معنی سنگسار کیے ہوئے کے ہیں۔ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ جو شیاطین آسمانوں میں غیب کی خبریں معلوم کرنے کے لیے چھپنے کی کوشش کرتے ہیں ان پر شہابوں کے ذریعہ سے سنگساری ہوتی ہے اس وجہ سے 'رجیم' ان کی مستقل صفت ہے۔

فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ (۲۶)

یہ ان ہٹ دھرموں کی کور ذوقی اور ہٹ دھرمی پر اظہارِ تعجب ہے کہ کہاں یہ قرآن اور کہاں تمھارے کاہنوں اور شیاطین کی خرافات۔ دونوں میں کیا نسبت! آخر تم ضد کے جنون میں کہاں سے کہاں نکل جاتے ہو کہ گہر اور پشیز میں فرق نہیں کر پاتے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ (۲۷-۲۸)

یہ آخر میں نہایت مؤثر تنبیہ و موعظت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا والوں کے لیے اس وقت کے ظہور سے پہلے یاددہانی ہے جو بہرحال آنے والا ہے اور جس سے کسی کے لیے مفر نہیں ہے اگر تم اس کو قبول کرو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے، کسی دوسرے پر احسان نہیں کرو گے۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ اس کو قبول کرنا یا رد کرنا تمھاری اپنی ہی ذمہ داری ہے خدا یا اس کے رسول کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اس کو تمھارے دلوں میں اتار دیں تو جس کو اپنی راہ سیدھی کرنی ہو وہ سیدھی کر لے ورنہ

اپنی کج روی کے اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہے جس سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۲۹)

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کا حوالہ دیا ہے جو اس نے ہدایت و ضلالت کے باب میں ٹھہرا رکھی ہے کہ وہ ہدایت کی توفیق انہی کو بخشتا ہے جو اس کے طالب بنتے اور اس کے لیے اپنی صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہیں۔ جو اندھے بہرے ہو کر زندگی گزارتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ان کی پسند کردہ ضلالت ہی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا کرتا ہے۔ اس سنتِ الٰہی کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ سورۂ مدثر کی آخری آیات کے تحت بھی اس کی وضاحت ہوئی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

بتوفیقِ ایزدی ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فللّٰہ الحمد علی احسانہٖ۔

رحمان آباد

۱۷ - جولائی ۱۹۷۹ء

۲۱ - شعبان ۱۳۹۹ھ

تدبرِ قرآن

۸۲

الانفطار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــــ التکویر ـــــــ کی توام ہے۔ دونوں کے ظاہر و باطن اور اسلوب و معنی میں نہایت واضح مشابہت ہے۔ جس طرح سابق میں پہلے اس ہلچل کی تصویر کھینچی گئی ہے جو ظہورِ قیامت کے وقت آسمانوں اور زمین میں برپا ہوگی اسی طرح اس کا آغاز بھی اسی ہول کے ذکر سے ہوا ہے۔ دونوں میں اصل مدعا بھی تقریباً ایک ہی طرح کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ پہلی سورہ میں ہولِ قیامت کی تصویر کے بعد فرمایا ہے: عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ (۱۴) (اس دن ہر جان اس چیز کو دیکھ لے گی جو اس نے پیش کی) اسی طرح اس سورہ میں، ٹھیک اسی محل میں، فرمایا کہ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ (۵) (اس دن ہر جان دیکھ لے گی جو اس نے آگے بڑھایا اور جو پیچھے چھوڑا) سلف سے بھی یہ بات منقول ہوئی ہے کہ جس کو ہولِ قیامت کی تصویر دیکھنی ہو وہ ان سورتوں میں دیکھے۔ دونوں میں اصل مخاطب وہ اغنیاء و مستکبرین ہیں جو قرآن کے انذار کو اس وجہ سے خاطر میں نہیں لا رہے تھے کہ ان کو اپنے قلعوں اور حصاروں میں دراڑ پڑنے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔

البتہ بنائے استدلال دونوں میں الگ الگ ہے۔ پہلی سورہ میں استدلال کی بنیاد قرآن کی صداقت و حقانیت پر رکھی گئی ہے۔ یعنی یہ واضح فرمایا گیا ہے کہ اس کا منبع، اس کے نزول کا واسطہ اور اس کا حامل سب طاہر و مطہر اور نورٌ علیٰ نور ہیں۔ جو لوگ اس کا جوڑ کاہنوں اور نجومیوں کی اٹکل پچو باتوں سے ملانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ شبِ دیجور اور صبحِ صادق کے درمیان امتیاز سے قاصر ہیں۔

اس سورہ میں استدلال خالقِ کائنات کی صفاتِ خلق، قدرت، حکمت، عدل اور رحمت سے ہے۔ یعنی انسان کی خلقت کے اندر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور رحمت کی جو نشانیاں ظاہر ہیں ان کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ وہ ایک روزِ جزا و سزا بھی لائے جس میں اپنے نیکوکار و وفادار بندوں کو انعام اور نافرمانوں اور سرکشوں کو سزا دے۔ ایک ایسے دن کا آنا لازمی ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کام ذرا بھی دشوار نہیں۔ جب اس نے پہلی بار پیدا کیا اور اس میں اس کو کوئی مشکل نہیں پیش آئی تو دوبارہ پیدا کرنا اس کے لیے کیوں مشکل ہو جائے گا؟ اگر اس دنیا میں وہ مجرموں کے جرائم سے چشم پوشی کر رہا ہے تو اس

کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ نیکی اور بدی کے معاملے میں گمے حس ہے۔ بلکہ یہ محض اس کی کریمی ہے کہ وہ بندوں کو مہلت دیتا ہے کہ وہ اپنے رویے کی اصلاح کرلیں، اگر چاہیں اور اصلاح نہ کریں تو ان پر اس کی حجت پوری ہوجائے اور قیامت کے دن وہ کوئی عذر نہ کرسکیں۔ اس تاخیر سے کسی کو یہ مغالطہ نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ سے کسی کا کوئی قول و عمل مخفی ہے۔ اس نے ہر شخص پر اپنے معزز فرشتے مامور کر رکھے ہیں جو اس کی ہر بات نوٹ کر رہے ہیں۔

ب ۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱ - ۵) ظہورِ قیامت کے وقت آسمان اور اس کے ستاروں، زمین اور اس کی قبروں پر جو گزرے گی۔ اس کی اجمالی تصویر اور لوگوں کو یہ تنبیہ کہ اس دن سب کا کچا چٹھا اس کے سامنے آجائے گا۔

(۶ - ۸) انسان کی خلقت کے اندر خدا کی قدرت، حکمت، رحمت اور عدل کی جو شانیں ظاہر ہیں ان کی روشنی میں یہ یاد دہانی کہ نہ قیامت کے وقوع کو بعید از امکان سمجھو نہ اس مغالطہ میں رہو کہ تم یوں ہی شترِ بے مہار بنا کر چھوڑے رکھے جاؤ گے۔ تمہاری صنعت گری میں اس نے جو اہتمام فرمایا ہے وہ دلیل ہے کہ تمہارا وجود بے مقصد اور بے غایت نہیں ہے۔

(۹ - ۱۲) اس مغالطہ میں نہ رہو کہ خدا کو تمہارے تمام اقوال و اعمال کا علم کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک دن وہ تمہارا حساب کرنے بیٹھے۔ اس نے تمہارے ہر قول و فعل کو لکھنے کے لیے تمہارے اوپر اپنے معزز فرشتے مامور کر رکھے ہیں جو ہر چیز نہایت احتیاط اور دیانت داری سے نوٹ کر رہے ہیں۔

(۱۳ - ۱۶) جزا و سزا کے دن نیکوکار اور وفادار بندے نعمت کے باغوں میں داخل ہوں گے اور نابکار و نافرمان دوزخ میں جھونک دیے جائیں گے۔ دوزخ میں پڑنے کے بعد پھر ان کو اس سے کبھی باہر نکلنا نصیب نہ ہوگا۔

(۱۷ - ۱۹) جزا کے بالکل بے لاگ ہونے کا بیان کہ اس دن سارا زور و اختیار صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔ کوئی دوسرا کسی کے معاملہ میں دخیل یا اثر انداز نہ ہو سکے گا۔

سُورَةُ الْاِنْفِطَار

مَكِّيَّةٌ ——— آیات: ۱۹

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

آیات ۱-۱۹

إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ ﴿١﴾ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ﴿٢﴾ وَإِذَا
الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ﴿٣﴾ وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ ﴿٤﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ
مَا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ ﴿٥﴾ يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ
الْكَرِيمِ ﴿٦﴾ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ﴿٧﴾ فِي أَيِّ صُورَةٍ
مَا شَاءَ رَكَّبَكَ ﴿٨﴾ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالدِّينِ ﴿٩﴾ وَإِنَّ
عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ﴿١٠﴾ كِرَامًا كَاتِبِينَ ﴿١١﴾ يَعْلَمُونَ مَا
تَفْعَلُونَ ﴿١٢﴾ إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ﴿١٣﴾ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ﴿١٤﴾
يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ ﴿١٥﴾ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ ﴿١٦﴾ وَمَا
أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ ﴿١٧﴾ ثُمَّ مَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ ﴿١٨﴾
يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا ۖ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ ﴿١٩﴾

ترجمۂ آیات ۱-۱۹

جب کہ آسمان پھٹ جائے گا اور جب کہ ستارے بکھر جائیں گے اور جب کہ سمندر پھٹ پڑیں گے اور جب کہ قبریں اگلوائی جائیں گی تب ہر جان کو پتہ چلے گا کہ اس کے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔ ۱-۵

اے انسان! تجھے تیرے ربِّ کریم کے باب میں کس چیز نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے! جس نے تیرا خاکہ بنایا، پھر تیرے نوک پلک سنوارے اور تجھے بالکل موزون کیا! جس شکل پر چاہا تجھے متشکّل کر دیا! ۶-۸

ہرگز نہیں، بلکہ تم جزا کو جھٹلاتے ہو۔ حالانکہ تم پر نگران مامور ہیں، دبیرانِ گرامی۔ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔ ۹-۱۲

بے شک نیکوکار عیش میں ہوں گے اور نابکار دوزخ میں۔ وہ جزا کے دن اس میں داخل ہوں گے اور پھر اس سے وہ اوجھل ہونے والے نہیں۔ ۱۳-۱۶

اور تم کیا سمجھے جزا کے دن کو! بولو، کیا سمجھے جزا کے دن کو! اس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے لیے کچھ نہ کر سکے گی۔ معاملہ اس دن اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوگا!! ۱۷-۱۹

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ (۱)

'اِنْفِطَار' کے معنی پھٹ جانے اور شق ہو جانے کے ہیں۔ ظہورِ قیامت کے وقت آسمان کے پھٹ جانے کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ سورۂ انشقاق کی پہلی ہی آیت میں یہی مضمون 'اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ سورۂ رحمٰن کی آیت ۳۷ میں بھی لفظ 'اِنْشِقَاق' استعمال ہوا ہے اور 'اِنْفِطَار' و 'اِنْشِقَاق' دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔

ایک نیا عالم نئے نوامیس کے ساتھ

قیامت کے بعد ایک بالکل نیا عالم، نئے نوامیس و قوانین کے تحت ظہور میں آئے گا اس وجہ سے اس عالمِ کہن کی ہر چیز ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ اس ٹوٹ پھوٹ کی شکل کیا ہوگی؟ اس کا صحیح تصور آج نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کی یاددہانی اس لیے فرمائی گئی ہے کہ جو اغنیا و متکبرین اپنے قلعوں اور گڑھیوں کے اعتماد پر بالکل بے خوف ہیں، سمجھتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ بنا رکھا ہے وہ ان کو ہر خطرے سے محفوظ رکھنے کے لیے کافی ہے، ان کو جھنجھوڑا جائے کہ قیامت کی ہلچل ایسی ہوگی کہ تمھارے بنائے ہوئے گھروندوں کا تو کیا ذکر اس پورے عالم کی یہ محکم چھت جس میں تم ڈھونڈھے سے بھی کوئی رخنہ نہیں پا سکتے، بالکل رخنہ ہی رخنہ اور شگاف ہی شگاف بن کر رہ جائے گی۔

یہاں اس الجھن میں اپنے دماغ کو نہ ڈالیے کہ یہ آسمان جو ہمیں نظر آتا ہے یہ محض ایک خلا ہے یا کوئی ٹھوس چیز ہے بلکہ اس امر پر یقین رکھیے کہ جس طرح آج اس کا مشاہدہ آپ ایک محکم چھت کی شکل میں کر رہے ہیں جس میں کسی رخنہ کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی اسی طرح قیامت کی ہلچل کے وقت اس میں شگاف ہی شگاف نظر آئیں گے۔

وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ (۲)

ستاروں کا نظم درہم برہم

'اِنْتِثَار' کے معنی بکھر جانے اور منتشر و پراگندہ ہو جانے کے ہیں۔ یعنی آج تو ستارے ایک غیر مرئی شیرازے میں پروئے ہوئے آسمان کی چھت میں قمقموں کی طرح ٹنکے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن اس دن یہ شیرازہ بکھر جائے گا اور وہ ٹوٹ ٹوٹ کر ادھر ادھر پراگندہ ہو جائیں گے۔ سابق سورہ میں ان کے بے نور ہو جانے کا ذکر ہوا ہے اس لیے کہ سورج کی بساط لپیٹ دیے جانے کے باعث نظامِ شمسی ہی سے ان کا تعلق ختم ہو جائے گا۔ اس سورہ میں ان کے انتشار کا ذکر ہوا اس لیے کہ وہ شامیانہ ہی باقی نہیں رہے گا جس کی آرائش

کے لیے ان کو آویزاں کیا گیا تھا۔

وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۙ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ (۳-۴)

زمین کے سمندروں اور اس کی قبروں کا حال

آسمان اور اس کے ستاروں کا حال بیان کرنے کے بعد یہ زمین کی بھی دو چیزوں ـــــ سمندروں اور قبروں ـــــ کا حال بطور مثال بیان فرما دیا کہ اس دن سمندر اپنی حدوں کو توڑ کر بہ نکلیں گے اور قبروں میں جو دفن ہیں وہ بھی ان سے اگلوا لیے جائیں گے۔

سابق سورہ میں 'وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ' (۶) کے الفاظ آئے ہیں، یہاں وہی بات 'فُجِّرَتْ' کے لفظ سے بیان ہوئی ہے۔ دونوں میں بس یہ فرق ہے کہ پہلے لفظ سے سمندروں کا جوش و ہیجان نمایاں ہو رہا ہے اور دوسرے سے ان کی آزادی و بے قیدی۔ یعنی وہ موجودہ حد بندیوں سے بے قید ہو کر ہر طرف پھوٹ بہیں اور ہر نشیب و فراز پر چھا جائیں گے۔ سورۂ دھر کی آیت 'یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِیْرًا' (۱۳) کے تحت اس لفظ کی وضاحت ہو چکی ہے۔

'وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ'۔ 'بعثر الشیءُ' کے معنی ہوں گے، کسی شے کو پراگندہ و منتشر کر دیا۔ اس کو ادھیڑ ڈالا، اس کو کھول کر جو کچھ اس میں تھا برآمد کر لیا۔ اگرچہ یہاں خاص طور پر قبروں ہی کا ذکر ہے اس لیے کہ مقصد انذار کے پہلو سے زیادہ اہمیت انہی کے کھولے اور ان کے اندر سے لوگوں کے نکالے جانے کی تھی۔ لیکن قرآن کے دوسرے مقامات سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اس دن زمین اپنا سارا بار بوجھ نکال پھینکے گی۔ سورۂ زلزال میں ہے: 'وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا' (۲) (اور زمین اپنے بار بوجھ نکال پھینکے گی) اسی طرح سورۂ انشقاق میں ہے: 'وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۙ وَاَلْقَتْ مَا فِیْهَا وَتَخَلَّتْ' (۳-۴) (اور جب کہ زمین تان دی جائے گی اور جو کچھ اس میں ہے وہ اس کو نکال پھینکے گی اور خالی ہو جائے گی)۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ (۵)

یہ وہ اصل بات بیان ہوئی ہے جو اس دن سب کے سامنے آئے گی۔ یعنی جب اس کائنات میں یہ عظیم ہلچل برپا ہو گی جس کے بعض آثار مذکور ہوئے تب ہر شخص کو پتہ چلے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔ مطلب یہ ہے کہ آج جو لوگ پیغمبر کے انذار کا مذاق اڑا رہے ہیں وہ اس گھمنڈ میں نہ رہیں کہ یہی دن ہمیشہ رہیں گے بلکہ اس دن کی عظیم ہلچل کو سامنے رکھ کر اپنے انجام پر غور کریں جس سے سابقہ پیش آنے والا ہے اور جس سے کسی کو بھی پناہ نہیں ملنی ہے، نہ کسی چھوٹے کو نہ کسی بڑے کو۔

'قدّم' اور 'اخّر' کی تاویل

'مَا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ' کی تاویل اگر ان متکبرین کو سامنے رکھ کر کی جائے جو سورہ کے اول مخاطب ہیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ جو نہ کرنے کے کام اللہ و رسول کے خلاف انھوں نے کیے ان کا انجام بھی وہ دیکھیں گے اور جو کرنے کے کام انھوں نے نظر انداز کیے ان کی حسرت بھی چکھیں گے۔ سورۂ جمعہ میں یہود کے

متعلق فرمایا ہے کہ وَلَا یَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ (۷) (اور وہ ہرگز موت کی تمنا کرنے والے نہیں ہیں بوجہ اپنی کرتوتوں کے جو وہ کر گزرے ہیں) یعنی جو زادِ راہ آخرت کے لیے انھوں نے بھیجا ہے وہ اس سے اچھی طرح واقف ہیں اس وجہ سے یہ خدا کو منہ دکھانے کا حوصلہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح قرآن میں جگہ جگہ یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ کفار قیامت کے دن نہایت حسرت کے ساتھ کہیں گے کہ کاش، آخرت کی زندگی کے لیے انھوں نے کچھ کر لیا ہوتا۔ سورۂ فجر میں ان کا قول نقل ہوا ہے: یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ (۲۴) (وہ کہے گا، اے کاش! میں نے اپنی اُخروی زندگی کے لیے دنیا کی زندگی میں کچھ کر لیا ہوتا) اسی طرح سورہ مومنون میں ہے: حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۙ لَعَلِّیْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ (۹۹-۱۰۰) (یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آدھمکے گی وہ کہے گا اے رب! مجھے پھر واپس بھیج کہ جو مال و متاع میں دنیا میں چھوڑ کر آیا ہوں اس میں کچھ نیکی کی کمائی کر لوں)۔

اگرچہ ان حوالوں کی روشنی میں 'قَدَّمَ' اور 'اَخَّرَ' دونوں کا صحیح محل معین ہو جاتا ہے لیکن بعض لوگوں نے اس کا یہ مفہوم بھی لیا ہے کہ 'ما قدم من الخیر والشر وما لم یعمله' (یعنی جو نیکی یا بدی اس نے کی اور جو چھوڑی) اسی طرح بعض دوسروں نے یہ مطلب لیا ہے کہ 'ما قدم من ماله وما اخر للوارثین' (جو اس نے اپنے مال میں سے اپنی اخروی زندگی کے لیے بھیجا اور جو وارثوں کے لیے چھوڑا) اگرچہ آیت کے عموم میں یہ باتیں بھی داخل ہیں لیکن اس کے موقع و محل کے پہلو سے اس تاویل کو ہمارے نزدیک ترجیح حاصل ہے جو ہم نے اوپر بیان کی۔

یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ (۶)

خدا کی کریمی سے مہلک مغالطہ

'انسان' اگرچہ عام ہے لیکن یہاں روئے سخن انہی مکذبین قیامت کی طرف ہے جن کو اس سورہ میں انذار کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ آگے والی آیت میں ان کو براہِ راست مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّیْنِ (ہرگز نہیں، بلکہ تم لوگ جزا و سزا کو جھٹلا رہے ہو) یہ خاص مخاطب کو عام لفظ سے خطاب کرنے میں جو بلاغت ہے اس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں۔

'مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ' میں استفہامیہ اسلوب اظہار تعجب کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تمھارے رب کی اس کریمی نے تم کو جزا و سزا سے نچنت کیا کہ وہ تمھاری سرکشیوں پر فوراً گرفت نہیں کرتا اور برابر ڈھیل پر ڈھیل دیے جا رہا ہے تو تم نے اس کریمی سے بہت سخت دھوکا کھایا۔ ہونا تو یہ تھا کہ تم اس کے لطف و کرم کی قدر کرتے، اس کے شکر گزار بندے بنتے اور اپنے آپ کو اس کی مزید عنایات کا حق دار بناتے لیکن ہوا یہ کہ تم اس کے آگے بالکل ڈھیٹ بن گئے۔ اس کے انذار کا مذاق اڑانے لگے، اور یہ سمجھ بیٹھے کہ جو رفاہیت تمھیں حاصل ہے یہ تمھارا پیدائشی حق ہے اور رسول جس قیامت سے آگاہ کر رہا ہے یہ محض ایک ہوا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

اَلَّذِیۡ خَلَقَکَ فَسَوّٰىکَ فَعَدَلَکَ ۙ فِیۡۤ اَیِّ صُوۡرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ (۷-۸)

اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا حوالہ جو جزاء پر دلیل ہیں

یہ ربِّ کریم نے اپنی بعض ان صفات کا حوالہ دیا ہے جو خود انسان کی خلقت کے اندر ظاہر ہیں اور جو دلیل ہیں کہ جس رب نے انسان کے پیدا کرنے میں اپنی کاریگری، حکمت، قدرت اور اہتمام خاص کی شانیں دکھائی ہیں اس نے اس کو عبث نہیں پیدا کیا ہے کہ وہ شترِ بے مہار کی طرح چھوٹا پھرے۔ بلکہ ایک دن وہ لازماً اس کو اپنے حضور میں بلائے گا، اس کا محاسبہ فرمائے گا، پھر جن کو وہ اپنا فرمانبردار پائے گا ان کو ابدی رحمتوں سے نوازے گا اور جو اس کے باغی ہوں گے ان کو جہنم میں جھونک دے گا۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ سارا اہتمام بالکل بے معنی و بے مقصد ہو جاتا ہے جو انسان کے پیدا کرنے پر اس نے کیا اور اس کی اس قدرت و حکمت کی بھی نفی ہو جاتی ہے جو اس کے ہر فعل میں نمایاں ہے۔

'اَلَّذِیۡ خَلَقَکَ فَسَوّٰىکَ'۔ 'خلق' کے معنی ہیں کسی چیز کا خاکہ بنانا اور اس کو پیدا کرنا اور 'تسویۃ' کے معنی اس کی نوک پلک سنوارنے کے ہیں۔ گویا یہاں انسان کی پیدائش کے ابتدائی اور انتہائی دونوں مرحلوں کی طرف اشارہ فرما دیا کہ اسی ربِّ کریم نے تمھارا خاکہ بنایا اور اسی نے تمھارے نوک پلک سنوارے۔ 'فَعَدَلَکَ' اور اس طرح اس نے تمھیں ایک متوازن مخلوق بنایا۔

انسان کی خلقت میں حکمت کا پایا جانا دلیل ہے کہ وہ کھلونا نہیں ہے

مقصود اس بیان سے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، اس اہتمام و عنایت کی طرف توجہ دلانا ہے جو انسان کی تخلیق میں نمایاں ہے۔ یہ اہتمام و عنایت اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کوئی کھلونا نہیں ہے جس کو قدرت نے اپنا جی بہلانے کے لیے وقتی طور پر بنا لیا ہو اور پھر جب چاہے اس کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔ جس چیز پر جتنا ہی اہتمام صرف ہوتا ہے اس کے اندر اتنی ہی مقصدیت ہوتی ہے اور اسی اعتبار سے اس کو قدرت کے نظام میں اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ انسان برسات میں پیدا ہونے والے پتنگوں کی مانند نہیں ہے کہ پیدا ہوا اور فنا ہو جائے بلکہ وہ قدرت کی بہترین صنّاعی کا مظہر ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ وہ امتحانوں سے گزرتا ہوا اس مقام تک پہنچے جو اس کے لیے مقدّر ہے اور اگر وہ اس کا حوصلہ نہ کرے تو یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی پست حوصلگی کی سزا بھگتے۔

'فَعَدَلَکَ' میں اس اعتدال و توازن کی طرف اشارہ ہے جو 'لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ' (التین-۹۵:۴) والی آیت میں بیان ہوا ہے۔ انسان اپنی ظاہری شکل و صورت اور اپنی روحانی و معنوی صلاحیتوں کے اعتبار سے عالم کی تمام مخلوقات میں بالکل نقطۂ وسط پر ہے اس وجہ سے وہ اس بات کا اہل ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس کو زمین میں اپنا خلیفہ بنائے، اس کو امتِ وسط کے منصب پر سرفراز فرمائے اور اگر وہ زمین میں خدا کی خلافت کا حق ادا کرے تو آسمان کی ابدی بادشاہی کا بھی حق دار ٹھہرائے۔

'فِیۡۤ اَیِّ صُوۡرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ'۔ یعنی ایک طرف تو اپنے رب کے اس اہتمام اور اس کی

اس عنایت پر نظر کرو کہ اس نے ہر آدمی کے لیے الگ الگ شکل و صورت تجویز کی اور اپنے کمال قدرت سے جس کے لیے جو صورت پسند فرمائی اسی پر اس کو پیدا کر دیا۔ اس میں ذرا بھی اس کو مشکل پیش نہیں آئی۔ مجال نہیں کہ ہزاروں لاکھوں انسانوں کے اندر سے بھی کوئی دو آدمی ایسے نکالے جا سکیں جو بالکل ایک ہی شکل و صورت کے ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ جس خدا کی قدرت و عنایت کا یہ حال ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک دن وہ تمہارے نیکوں اور بدوں میں امتیاز کرے اور اس کام کے لیے تمھیں وہ مرنے کے بعد اٹھائے اور یہ کام اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالدِّينِ (۹)

مکذبین قیامت کو زجر — 'کَلَّا' یہاں مکذبین کے ان شبہات و اعتراضات کی نفی کے لیے ہے جو وہ قیامت کے خلاف پیش کرتے تھے اور جن کی تردید اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ کی ان صفات سے فرمائی گئی ہے جو خود انسان کی خلقت کے اندر موجود ہیں۔ ان کو پیش کرنے کے بعد ان دلیل بازوں کو زجر فرمایا ہے کہ 'کَلَّا' یعنی تمہارے ان تمام شبہات و اعتراضات کی ہرگز کوئی بنیاد نہیں ہے، یہ ساری باتیں بناوٹی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ تم جزا اور سزا کو ماننا نہیں چاہتے اس وجہ سے لایعنی شبہات پیش کر رہے ہو کہ بھلا مر کھپ جانے کے بعد وہ لوگ دوبارہ کیسے زندہ کیے جائیں گے؟ حالانکہ اگر جزا و سزا عقل، عدل، فطرت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و حکمت کی رو سے واجب ہے تو اس کے لیے انسانوں کو قبروں سے اٹھا کھڑا کرنا کیا مشکل ہے!

یہاں یہ بات یاد رکھیے کہ بعض اوقات انسان جھٹلانا تو کسی چیز کو چاہتا ہے لیکن اس کے خلاف کچھ کہنے کی گنجائش نہیں پاتا اس وجہ سے بعض غیر متعلق سوالات چھیڑتا ہے تاکہ اس کے باب میں کچھ شبہات پیدا کرنے کی راہ کھلے۔ قریش کے منکرین اسی طرح کی الجھن میں گرفتار تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جزا و سزا کو جھٹلانا ایک امر بدیہی کو جھٹلانا ہے لیکن اس کو ماننے کے لیے بھی تیار نہیں تھے اس وجہ سے بعض بناوٹی شبہات کی آڑ لے کر یہ نمائش کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ گویا ان کے پاس کچھ دلائل ہیں جن کی بنا پر وہ قرآن کے انذار کو نہیں مان رہے ہیں۔

وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ۙ كِرَامًا كَاتِبِينَ ۙ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ (۱۰-۱۲)

اوپر والی آیت میں جو جھڑکی ہے اس سے بھی اس کا تعلق ہے اور مکذبین قیامت کے اس شبہ پر، جو وہ آخرت کے حساب کتاب سے متعلق محض مصنوعی طور پر اٹھاتے تھے اس میں تنبیہ بھی ہے۔

اعمال کا ریکارڈ رکھنے والوں کی ذمہ داری — فرمایا کہ اس مغالطے میں نہ رہو کہ تمہاری جلوت و خلوت کی ساری باتوں سے کون باخبر ہو سکتا ہے کہ ایک دن ان کا محاسبہ کرنے بیٹھے! اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ہر ایک کے اوپر اپنے نگران بٹھا رکھے ہیں

جو تمھارے ہر قول و فعل کو نوٹ کر رہے ہیں۔ جو کچھ بھی تم کہتے ہو یا کرتے ہو اس کو سنتے اور جانتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ نہایت معزز ہیں۔

ان فرشتوں کی صفت 'کِرام' سے مقصود اس حقیقت کی یاددہانی ہے کہ یہ جس ڈیوٹی پر مامور ہیں اس کو نہایت فرض شناسی، پورے احساس ذمہ داری اور کامل غیر جانبداری کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ نہ کام چوروں کی طرح یہ اپنے فرض میں کوئی غفلت برتتے، نہ احساسِ ذمہ داری سے محروم لوگوں کی طرح کبھی دفع الوقتی اور مداہنت سے کام لیتے اور نہ کسی کے دباؤ یا اس کی خوشامد میں آنے والے ہیں کہ کسی کے ساتھ جانبداری برتیں۔

'یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ' یعنی جو کچھ تم کرتے ہو اور جہاں کہیں بھی کرتے ہو وہ سب ان پر واضح ہوتا ہے۔ یہاں صرف افعال کے جاننے کا ذکر ہے لیکن سورۂ قٓ میں فرمایا ہے کہ 'مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْہِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ' (قٓ - ۵۰ : ۱۸) (نہیں بولتا ہے وہ کوئی بات مگر ایک مستعد نگران اس کے پاس موجود ہوتا ہے)۔ سورۂ قٓ میں یہ وضاحت بھی ہے کہ یہ فرشتے دو ہوتے ہیں اور دائیں بائیں دونوں طرف سے نگرانی کرتے ہیں۔ احادیث سے یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ ان میں تقسیم کار ہوتی ہے۔ ایک نیکیاں لکھنے پر مامور ہوتا ہے دوسرا بدیاں۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۝ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ (۱۳-۱۴)

نتیجہ اس اہتمام و انتظام کا جو اوپر مذکور ہوا — یہ نتیجہ سامنے رکھ دیا ہے اس اہتمام و انتظام کا جو اوپر مذکور ہوا کہ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں اور بدکاروں کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ نہیں کرے گا بلکہ وہ نیکوں کو جنت میں داخل کرے گا اور بدوں کو دوزخ میں۔ جو نادان یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے، اس کے بعد نہ موت ہے نہ زندگی یا یہ خواب دیکھ رہے ہیں کہ اگر مرنے کے بعد زندگی ہوئی تو وہاں بھی وہ اپنے شرکاء کی سفارش سے اس سے اچھی زندگی حاصل کر لیں گے جو یہاں حاصل ہے، تو وہ اپنے دماغ کا علاج کرائیں۔ اس کائنات کا خالق نیکی و بدی کے معاملے میں بے حس اور غیر جانبدار نہیں ہے کہ سب کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ کرے، بلکہ وہ لازماً دونوں میں فرق کرے گا اور ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دے گا۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ العیاذ باللہ نیک اور بد دونوں اس کی نگاہ میں یکساں ہیں اور اس کی دنیا ایک اندھیر نگری ہے جس میں حق و عدل کا کوئی تصور نہیں ہے۔

یَصْلَوْنَهَا یَوْمَ الدِّیْنِ ۝ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِیْنَ (۱۵-۱۶)

اصل حقیقت کا مواجہہ — یعنی اس طرح کے لذیذ خوابوں میں زندگی گزارنے کے بجائے بہتر ہے کہ لوگ اصل حقیقت کا مواجہہ کریں۔ جزا کے دن تمام نابکار جہنم میں داخل ہوں گے اور پھر ان کو وہاں سے ایک پل کے لیے

بھی اوجھل ہونا نصیب نہ ہوگا۔ 'وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِيْنَ' کا اصل مدعا وہی ہے جو دوسرے مقامات میں 'خَالِدِيْنَ فِيْهَا أَبَدًا' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کے ذہن میں یہ خیال ہو کہ جگہ پسند نہ آئی تو وہاں سے فرار کی کوئی راہ ڈھونڈ لیں گے وہ یہ خیال دل سے نکال دیں۔ اس میں داخل ہونے کے بعد اس سے نکلنے کے تمام راستے بند ہو جائیں گے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۙ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (۱۷-۱۸)

یہ سوال اس جزا کے دن کی عظمت و اہمیت واضح کرنے کے لیے ہے اور اس کی تکرار نے اس کو مزید پرہول بنا دیا ہے۔ 'اَدْرٰىكَ' میں واحد کا خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہے بلکہ انہی لوگوں سے ہے جن سے 'مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ' اور اس کے بعد کی دوسری آیات میں ہے۔ جمع کو واحد کے صیغہ سے خطاب میں جو بلاغت ہے اس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ (۱۹)

سوال چونکہ جواب کے لیے نہیں بلکہ صرف اس دن کے ہول کا تصور پیدا کرنے کے لیے تھا اس وجہ سے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی جواب دے دیا کہ اس دن کوئی جان کسی دوسرے کے کام آنے والی نہیں بنے گی۔ سارا اختیار و اقتدار اس دن صرف اللہ وحدہٗ لاشریک ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس دن کوئی کسی کو کوئی نفع نہ پہنچا سکے گا۔ جن کو خدا کا شریک و شفیع سمجھا گیا اور اس امید پر ان کی عبادت کی گئی کہ وہ اپنے پوجنے والوں کو خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے وہ سب اس دن ہوا ہو جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فللہ الحمد علی احسانہ۔

رحمان آباد

۲۹- جولائی ۱۹۷۹ء

۴- رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ

تدبّرِ قرآن

۸۳

المطفّفين

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــــ الانفطار ـــــــ کا تکملہ و تتمہ ہے۔ دونوں کا عمود بنیادی طور پر ایک ہی ہے۔ سورۂ انفطار کے آخر میں ابرار اور فجار کی جو تقسیم ہے اس سورہ میں اسی کی تفصیل ہے۔ صرف استدلال کی بنیاد دونوں میں الگ الگ ہے۔ سابق سورہ میں استدلال اللہ تعالیٰ کی ان صفات سے ہے جو خود انسان کی خلقت کے اندر نمایاں ہیں۔ اس سورہ میں استدلال اس فطرت سے ہے جو فاطر نے انسان کے اندر ودیعت فرمائی ہے۔

اس استدلال کی تقریر بالاجمال یوں ہے کہ انسان بالطبع عدل اور خیر کو پسند کرنے والا اور ظلم و شر سے نفرت کرنے والا ہے۔ اس کی یہ پسند اور ناپسند اس بات کی شہادت ہے کہ فاطرِ فطرت عدل اور ظلم یا بالفاظ دیگر عادل اور ظالم میں فرق و امتیاز کرنے والا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ نیک اور بد دونوں اس کے نزدیک یکساں ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ انسان کی فطرت میں نیک اور بد میں یہ امتیاز کیوں رکھتا؟

رہا یہ سوال کہ انسان جب طبعاً نیکی پسند ہے تو وہ بدی کیوں کر گزرتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ بدی اس وجہ سے نہیں کرتا کہ یہی اس کو طبعاً مرغوب ہے۔ طبعاً تو اس کو مرغوب نیکی ہی ہے لیکن بسا اوقات نفس کے دوسرے داعیات سے وہ مغلوب ہو کر، اپنی فطرت کے خلاف بدی کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ اگر بدی اور ناانصافی اس کو طبعاً مرغوب ہوتی تو اس کا تقاضا یہ تھا کہ کوئی اس کے ساتھ ناانصافی کرتا تو وہ اس پر بھی راضی رہتا لیکن ہر شخص دیکھتا ہے کہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ وہی شخص جو دوسروں کے لیے ناپ اور تول میں بے ایمانی کرتا ہے جب دوسرے اس کے ساتھ یہی معاملہ کرتے ہیں تو وہ چیختا اور فریاد کرتا ہے۔

قرآن نے اس سورہ میں انسان کی اسی فطرت کو شہادت میں پیش کر کے یہ تذکیر فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ خود عادل ہے اور اس نے اپنے بندوں کے اندر بھی عدل اور خیر کی محبت ودیعت فرمائی ہے اس وجہ سے لازمی ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں ان لوگوں کو بھرپور انعام دے جو اپنی فطرت کے اس نور کی قدر کریں اور ان لوگوں کو سزا دے جو اس کی بے حرمتی کریں۔

قیامت کے حق میں یہ طریقِ استدلال قرآن نے جگہ جگہ اختیار کیا ہے اور ہم برابر اس کی وضاحت کرتے آ رہے ہیں۔ خاص طور پر سورۂ قیامہ میں نفسِ لوّامہ کی قسم اور بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ (القیٰمۃ - ۷۵: ۱۴-۱۵) (بلکہ انسان خود اپنے اوپر حجت ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذرات تراشے) کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۶) ان لوگوں کے حال پر افسوس جو اپنے لیے تو چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہونے پائے لیکن جب وہ دوسروں سے معاملہ کرتے ہیں تو ان کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں۔ حالانکہ عدل پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ جو بات وہ اپنے لیے پسند نہیں کرتے دوسروں کے لیے بھی پسند نہ کریں۔ ان کا یہ رویہ شاہد ہے کہ وہ اس عظیم دن کی توقع نہیں رکھتے جس دن لوگ اپنے رب کے حضور میں پیشی کے لیے اٹھائے جائیں گے۔

(۷-۱۷) ان فجّار کے انجام کی تفصیل جنھوں نے جزا و سزا کے دن کو جھٹلایا اور زندگی خدا کی نافرمانی میں گزاری۔

(۱۸-۲۸) ابرار کے انجام کا بیان جو روزِ جزا پر ایمان لائے اور جنھوں نے زندگی اس سے ڈرتے ہوئے گزاری۔

(۲۹-۳۶) اس انقلابِ حال کی تصویر جو ایک دن سب کے سامنے آنے والا ہے۔ آج کفار اپنے حال میں مگن ہیں اور اہلِ ایمان کا مذاق اڑا رہے ہیں، اس دن اہلِ ایمان اپنی فیروزمندی پر شادماں ہوں گے اور کفار کا مذاق اڑائیں گے۔

سُوْرَةُ الْمُطَفِّفِيْنَ

مَكِّيَّةٌ ———— اٰيات: ۳۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ
۱-۳۶ يَسْتَوْفُوْنَ ﴿۲﴾ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ﴿۳﴾
اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ﴿۴﴾ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵﴾
يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶﴾ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ
الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ﴿۷﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ﴿۸﴾ كِتٰبٌ
مَّرْقُوْمٌ ﴿۹﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۰﴾ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ
بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۱۱﴾ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ﴿۱۲﴾ اِذَا
تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾ كَلَّا بَلْ
رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ
يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴿۱۵﴾ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ
يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۷﴾ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ
الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿۱۸﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ﴿۱۹﴾ كِتٰبٌ
مَّرْقُوْمٌ ﴿۲۰﴾ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۱﴾ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿۲۲﴾

عَلَى الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ ﴿٢٣﴾ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ
النَّعِيمِ ﴿٢٤﴾ يُسْقَوْنَ مِنْ رَحِيقٍ مَخْتُومٍ ﴿٢٥﴾ خِتَامُهُ مِسْكٌ
وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ﴿٢٦﴾ وَمِزَاجُهُ مِنْ تَسْنِيمٍ ﴿٢٧﴾
عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ ﴿٢٨﴾ إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا
مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ ﴿٢٩﴾ وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ ﴿٣٠﴾
وَإِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمُ انْقَلَبُوا فَكِهِينَ ﴿٣١﴾ وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا
إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ ﴿٣٢﴾ وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَافِظِينَ ﴿٣٣﴾
فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ﴿٣٤﴾ عَلَى الْأَرَائِكِ
يَنْظُرُونَ ﴿٣٥﴾ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿٣٦﴾ ع ٣٦ ٨

ترجمۂ آیات ۱-۳۶

برا ہو، ناپ تول میں کمی کرنے والوں کا! جو دوسروں سے نپوائیں تو پورا نپوائیں اور جب ان کے لیے ناپیں یا تولیں تو اس میں کمی کریں ۔ کیا یہ لوگ یہ گمان نہیں رکھتے کہ ایک دن وہ اٹھائے جانے والے ہیں ۔ ایک عظیم دن کی حاضری کے لیے جس دن لوگ اٹھیں گے خداوندِ عالم کے حضور پیشی کے لیے ۔ ۱-۶

ہرگز نہیں، فاجروں کے اعمال نامے سجّین میں ہوں گے ۔ اور تم کیا جانو کہ سجّین کیا ہے! لکھا ہوا دفتر! اس دن تباہی ہے جھٹلانے والوں کی! جو روزِ جزا کو جھٹلا رہے ہیں ۔ اس کو تو وہی جھٹلاتے ہیں جو تعدّی اور حق تلفی کرنے والے ہوتے ہیں ۔ جب اس کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو اگلوں کے فسانے ہیں ۔ ہرگز نہیں، بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے ۔ ہرگز نہیں بلکہ اس دن

وہ اپنے رب سے اوٹ میں رکھے جائیں گے۔ پھر وہ جہنم میں پڑنے والے بنیں گے تب کہا جائے گا، یہ وہی چیز ہے جس کو تم جھٹلاتے رہے ہو۔ ۷-۱۷

ہرگز نہیں، بے شک اچھوں کے اعمالنامے عِلّیّین میں ہوں گے۔ اور تم کیا سمجھے کہ عِلّیّین کیا ہے! لکھا ہوا دفتر۔ مقرّبوں کی نگرانی میں۔ بے شک نیک بندے عیش میں ہوں گے۔ تختوں پر بیٹھے سیر دیکھتے۔ ان کے چہروں پر آسائش کی بشاشت جھلک رہی ہوگی۔ سربمہر شرابِ خالص ان کو پینے کو ملے گی۔ جس پر مشک کی مہر ہوگی۔ یہ چیز ہے جس کی طلب میں طالبوں کو سرگرم ہونا چاہیے! اور اس میں تسنیم کی ملونی ہوگی۔ ایک خاص چشمہ جس پر مقرّبین بیٹھ کر پئیں گے۔ ۱۸-۲۸

جو مجرم رہے ہیں وہ ان لوگوں کے حال پر ہنستے رہے ہیں جو ایمان والے تھے۔ اور جب ان کے پاس سے گزرتے تو کن انکھیوں سے اشارے کرتے اور اپنے لوگوں میں لوٹتے تو مگن ہو کر لوٹتے۔ اور جب ان کو دیکھتے تو کہتے کہ یہ بالکل گمراہ ہیں، یہ ان پر کوئی نگران بنا کر تو نہیں بھیجے گئے ہیں! پس آج ایمان والے کفار کے حال پر ہنسیں گے، تختوں پر بیٹھے، سیر دیکھتے ۔۔۔ کیوں پایا نا کفار نے اپنے کیے کا بدلا!! ۲۹-۳۶

الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ (۱)

ان لوگوں پر لعنت جو لینے کے باٹ اور اور دینے کے باٹ اور رکھیں

یہ جملہ صرف خبریہ نہیں ہے بلکہ اس کے اندر لعنت اور پھٹکار کا مضمون بھی مضمر ہے۔ 'تطفیف' کے معنی ناپ تول میں کمی کرنے کے ہیں یعنی جو لوگ ناپ اور تول میں کمی کرنے والے ہیں ان کے لیے تباہی اور ان پر خدا کی مار اور پھٹکار ہے۔

الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۝ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ (۲-۳)

یہ ان کمی کرنے والوں کی صفت بیان ہوئی ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہاں مجرد ناپنے اور تولنے میں کمی کرنا زیر بحث نہیں ہے بلکہ ایک خاص کردار زیر بحث ہے۔ وہ یہ کہ آدمی دوسروں سے اپنے لیے نپواتے اور تلواتے میں تو بڑا چوکس اور حساس ہو، ہرگز نہ چاہے کہ جو چیز اس کے لیے ناپی یا تولی جائے اس میں رتی برابر بھی کمی ہو لیکن وہی شخص جب دوسروں کے لیے ناپے اور تولے تو اس میں ڈنڈی مارنے کی کوشش کرے۔ یہ کردار اس امر پر شاہد ہے کہ انسان عدل کے تصور اور اس کے واجب ہونے کے شعور سے عاری نہیں ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ لینے کے باٹ اور دینے کے باٹ الگ الگ نہیں ہونے چاہئیں بلکہ ان کا ایک ہونا ضروری ہے۔ نیز وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ جو چیز اسے اپنے لیے پسند نہیں ہے وہ اسے دوسروں کے لیے بھی پسند نہیں کرنی چاہیے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی فطرت کے خلاف محض اپنی خود غرضی سے مغلوب ہو کر کرتا ہے اور یہ ایک کھلی ہوئی ناانصافی بھی ہے اور ایک سخت قسم کی دنائت بھی۔

عدل سے محبت کے باوجود ارتکاب ظلم کی وجہ

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے اندر فاطر فطرت نے عدل اور ظلم کے درمیان امتیاز کے لیے ایک کسوٹی بھی رکھی ہے اور عدل کے ساتھ محبت اور ظلم سے نفرت بھی ودیعت فرمائی ہے۔ اس کے باوجود وہ ظلم کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ عدل اور ظلم میں امتیاز سے وہ قاصر ہے یا ظلم کا ظلم ہونا اس پر واضح نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، محض یہ ہے کہ وہ اپنی کسی خواہش یا کسی جذبہ سے مغلوب ہو کر اپنے نفس کے توازن کو قائم نہیں رکھ پاتا۔

ایک چور جو دوسروں کے گھروں میں نقب لگاتا ہے وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ کوئی دوسرا اس کے گھر میں نقب لگائے، ایک قاتل جو دوسروں کو قتل کرتا ہے یہ نہیں پسند کرتا کہ کوئی اس کو یا اس کے کسی

عزیز و قریب کی جان کے درپے ہو، کوئی زانی جو دوسروں کی عزت و ناموس پر حملہ کرتا ہے اس بات پر راضی نہیں ہوتا کہ کوئی اس کی عزت و ناموس پر حملہ آور ہو۔ بلکہ انہی چوروں، انہی قاتلوں اور انہی زانیوں سے اگر ان کی غیر جانبدارانہ رائے معلوم کرنے کی کوئی شکل ہو تو وہ اس حقیقت کا بھی اعتراف کریں گے کہ چوروں، قاتلوں، زانیوں اور اس قبیل کے دوسرے مجرموں کے لیے معاشرے میں کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔ معاشرے میں جگہ انہی کے لیے ہونی چاہیے جو جان و مال اور ان کی عزت و ناموس کے اسی طرح حفاظت کرنے والے ہوں جس طرح وہ اپنی جان اور اپنی عزت کی حفاظت چاہنے والے ہیں۔

انسان کی فطرت سے ایک روزِ جزاء پر استدلال

انسان کا یہ طرزِ عمل اور اس کی فطرت کا یہ پہلو اس بات کی بدیہی شہادت ہے کہ نہ وہ نیک اور بد کو یکساں سمجھتا اور نہ اس بات پر راضی ہے کہ دونوں قسم کے لوگوں سے ایک ہی طرح کا معاملہ کیا جائے بلکہ اس کا غیر جانبدارانہ فیصلہ یہی ہے کہ دونوں کے ساتھ الگ الگ معاملہ ہونا چاہیے۔ یہ چیز اس بات کو بھی مستلزم ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسا دن لائے جس میں نیکوں اور بدوں کے ساتھ ان کے اعمال کے مطابق معاملہ کرے۔ اگر ایک ایسا دن نہ آئے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس دنیا کے خالق کے نزدیک نیک اور بد دونوں یکساں ہیں درآنحالیکہ یہ چیز اس فطرت کے منافی ہے جو فاطر نے انسان کے اندر ودیعت فرمائی ہے۔ یہاں انسان کی اسی فطرت سے ایک روزِ جزاء و سزا کے لازمی ہونے پر دلیل اور ان منکرینِ قیامت پر حجت قائم فرمائی ہے جو اپنی فطرت کی اس شہادت سے تو انکار نہیں کر سکتے تھے لیکن قرآن کے انذارِ قیامت کی تکذیب پر تلے ہوئے تھے۔

ایک ضعیف شانِ نزول

اس آیت کے تحت مفسرین نے ایک روایت نقل کی ہے کہ انصار میں ناپ تول میں کمی کی خرابی موجود تھی اس وجہ سے یہ آیت نازل ہوئی۔ لیکن اول تو یہ سورہ مکی ہے، مدنی نہیں ہے۔ پھر انصار میں یہ خرابی رہی بھی ہوگی تو اتنی ہی رہی ہوگی جتنی اہلِ مکہ میں رہی ہوگی بلکہ اہلِ مکہ کے اندر اس کے پائے جانے کے زیادہ امکان تھے اس لیے کہ وہ بالعموم تجارت پیشہ تھے جبکہ انصار کا اصل پیشہ زراعت تھا۔ پھر سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ یہ آیت ناپ تول میں کمی کرنے کی مذمت کے سیاق میں نہیں ہے بلکہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اس حقیقت کے بیان میں ہے کہ انسان عدل و ظلم میں امتیاز سے قاصر نہیں ہے۔ وہ برائی کرتا ہے تو اپنی فطرت کی شہادت کے خلاف محض اپنے نفس کی کسی خواہش کی پاسداری میں کرتا ہے۔ انسان کی یہ فطرت لازم کرتی ہے کہ ایک دن ایسا آئے جس میں نیکوں اور بدوں کے درمیان کامل امتیاز ہو۔ اگر وہ ایک ایسے دن کے آنے سے انکار کرتا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ جزاء و سزا کے مواجہے سے گریز کرنا چاہتا ہے حالانکہ یہ چیز اس کی اپنی فطرت کا مطالبہ ہے۔

أَلَا يَظُنُّ أُولَٰٓئِكَ أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ ۙ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ۙ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَٰلَمِينَ (۴-۶)

ان لوگوں کو ملامت جو اپنی فطرت کی شہادت سے کان بند کیے ہوئے ہیں

یہ اس طرح کے لوگوں کے حال پر اظہارِ تعجب بھی ہے اور ان کو سرزنش بھی کہ کیا یہ لوگ یہ گمان نہیں رکھتے کہ ایک ایسا عظیم دن آنے والا ہے جس میں لوگ اپنے رب کے حضور میں پیشی کے لیے اٹھائے جائیں گے؟ یعنی ایک ایسے دن کے ظہور کا اندیشہ ہر شخص کے دل کے اندر ہونا چاہیے اس لیے کہ اس کی شہادت ہر شخص کی فطرت کے اندر موجود ہے۔ اگر کسی کا دل اس اندیشہ سے خالی ہے تو وہ خود اپنی فطرت کی آواز سے اپنے کان بند کیے ہوئے ہے حالانکہ وہ دن کوئی معمولی دن نہیں ہوگا بلکہ ایک نہایت ہی عظیم دن ہوگا۔ اس دن لوگ اس لیے اٹھیں گے کہ خداوندِ کائنات کے سامنے پیش ہوں اور ان سے پرسش ہو کہ انھوں نے کیا بنایا اور کیا بگاڑا، پھر اپنے اعمال کے مطابق وہ جزا یا سزا پائیں۔

'رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ' کے اندر اس دن کی عظمت، ضرورت اور اس کے فیصلوں کے ناطق ہونے کی جو دلیلیں مضمر ہیں ان کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں ہو چکی ہے۔ ان کو ذہن میں تازہ کر لیجیے تب اس کا اصلی زور سمجھ میں آئے گا۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ (۷)

مخاطبوں کے زعم کی تردید

'کَلَّآ' مخاطبوں کے اس زعمِ باطل کی تردید کے لیے بطور زجر آیا ہے جس کا اشارہ اوپر والی آیت میں موجود ہے۔ یعنی وہ اس فکر سے بالکل نچنت ہیں کہ ان کے سامنے حساب کتاب اور جزا و سزا کا کوئی مرحلہ آنے والا ہے جس میں نیکوں اور بدوں کے درمیان اللہ تعالیٰ فرق کرے گا بلکہ وہ یہ گمان کیے بیٹھے ہیں کہ اول تو کوئی دن آنا نہیں ہے اور آیا بھی تو وہ اپنی خاندانی وجاہت اور اپنے دیوتاؤں کی بدولت وہاں بھی اس سے زیادہ عیش لوٹیں گے جو عیش یہاں لوٹ رہے ہیں۔ ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ہرگز نہیں، اس قسم کے طفلانہ خیالات میں اپنی عاقبت برباد نہ کرو۔ اس دن ابرار اور فجار میں مشرق و مغرب کی دوری ہوگی۔ 'فُجّار' کے اعمال نامے 'سجّین' میں ہوں گے اور ابرار کا ذکر آگے آ رہا ہے کہ ان کے اعمال نامے 'علّیین' میں ہوں گے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (۸-۹)

'سجّین' کی تحقیق

لفظ 'سِجِّیْنٌ' اوپر والی آیت میں لغوی مفہوم میں نہیں بلکہ بطور ایک نام کے آیا ہے اس وجہ سے قرآن نے خود ہی اس کی وضاحت بھی فرما دی ہے۔ اس طرح کے نام قرآن میں متعدد آئے ہیں اور ہر جگہ ان کی وضاحت بھی فرما دی گئی ہے۔ سورۂ دہر میں ان کی بعض مثالیں گزر چکی ہیں۔ آگے اس سورہ میں بھی 'عِلِّیُّوْنَ' اور 'تَسْنِیْمٌ' کے الفاظ اسی نوعیت سے آئے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ میں اصل اہمیت ان کے لغوی مفہوم کی نہیں بلکہ ان کے اصطلاحی مفہوم یا ان کے تسمیہ کی ہوتی ہے۔

'وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ' یہ اسلوب بیان 'سِجِّیْنٌ' کے ہول کو ظاہر کرنے کے لیے اختیار فرمایا گیا۔

ہے کہ تم کیا سمجھے کہ 'سِجِّیْن' کیا ہے! اس کو کوئی معمولی چیز نہ سمجھو! وہ تباہ ہوا جس کا نام یا جس کے اعمال اس میں درج ہوئے!

'کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ' وہ لکھا ہوا دفتر ہے۔ یعنی اس میں تمام مجرمین کا سارا ریکارڈ بشکل تحریر محفوظ کیا جاتا ہے۔ 'بشکلِ تحریر' کی قید سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ نہ اس میں کسی سہو و نسیان کا کوئی امکان ہے اور نہ اس کے حجّت ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش۔

معلوم ہوا کہ 'سِجِّیْن' اس دفتر کا نام ہے جس میں مجرموں کے اعمال کا سارا ریکارڈ تحریری صورت میں محفوظ کیا جا رہا ہے اور جس کی بنیاد پر قیامت کے دن فیصلہ ہوگا کہ کون دوزخ کے کس درجے میں داخل کیے جانے کا سزاوار ہے۔ 'سجّین' کا مادہ 'سجن' ہے جس کے معنی قید یا قید خانہ کے ہیں۔ اس مناسبت سے مستحقینِ سزا کے ریکارڈ آفس کا نام 'سجّین' رکھا گیا ہے۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (۱۰-۱۱)

یعنی اس گمان میں نہ رہو کہ جس طرح آج چھوٹے پھر رہے ہو اسی طرح برابر چھوٹے ہی پھرو گے، بلکہ جب وہ جزاء و سزا کا دن ظہور میں آئے گا تو ان لوگوں کی شامت آجائے گی جو اس کو جھٹلاتے رہے ہیں۔ اس دن وہ دیکھ لیں گے کہ ان کا کوئی قول و عمل نہ ریکارڈ ہونے سے رہ گیا ہے اور نہ اب اس کے وبال سے بچنے بچانے کی کوئی صورت ہی باقی رہی۔ مجرم اس کو دیکھ کر پکار اٹھیں گے:

'مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا'[1] (الکہف - ۱۸: ۴۹)۔

وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ (۱۲)

ان لوگوں کی نشاندہی جو تکذیبِ جزاء میں پیش پیش ہیں

اب یہ ان لوگوں کا سراغ دے دیا جو جزاء و سزا کے دن کو جھٹلانے میں پیش پیش ہیں۔ فرمایا کہ اس کی تکذیب وہی لوگ کر رہے ہیں جو حدود سے تجاوز کرنے اور حق تلفی کرنے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی تکذیب کرنے کی جرأت کوئی ایسا شخص نہیں کر سکتا جس کے اندر عدل اور رحم کی ادنیٰ رمق بھی ہو۔ اس کی شہادت ہر انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے اس وجہ سے کسی خارجی دلیل کی اس کے لیے کوئی حاجت نہیں۔ ہر شخص اس کو اپنے دل کے آئینہ میں دیکھ سکتا ہے۔ البتہ ان لوگوں کو یہ چیز نظر نہیں آتی جن کے دلوں پر تعدی اور حق تلفی کا زنگ چڑھ چکا ہو۔

'عدوان' اور 'اثم' کی حقیقت پر ہم اس کے محل میں گفتگو کر چکے ہیں۔ 'عدوان' اور 'اعتداء' یہ ہے کہ کوئی دوسروں کے حقوق پر دست درازی کرے اور 'اثم' یہ ہے کہ دوسروں کے جو حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں ان کو دبا بیٹھے۔ دوسروں کے حقوق غصب کرنے یا دبا بیٹھنے کی جن کو چاٹ

---

[1] عجیب ہے یہ کتاب کہ اس نے نہ کوئی چھوٹی بات لکھنے سے چھوڑی ہے نہ کوئی بڑی بات!

لگ جاتی ہے وہ جزا و سزا سے فرار کے لیے کوئی نہ کوئی راہ نکالنے کی ضرور کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کا ضمیر ان کی تعدیوں اور حق تلفیوں سے کوئی خلش نہ محسوس کرے۔

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ کسی حقیقت سے فرار انسان محض اس وجہ سے نہیں اختیار کرتا کہ اس کے حق میں اس کو کوئی دلیل نہیں ملی بلکہ اس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کو تسلیم کرنے سے اس کی خواہشوں اور عادتوں پر زد پڑتی ہے۔ جب ایک بات وہ ماننا نہیں چاہتا تو اپنے لیے کچھ عذرات تراشنے کی کوشش کرتا ہے اگرچہ وہ کتنے ہی لنگ ہوں۔ سورۂ قیامہ میں اسی حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے 'بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ' (القیٰمۃ - ۷۵: ۱۴-۱۵) (بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذرات تراشے)۔

اِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (۱۳)

یہ اسی طرح کے مکذبین کے طریقۂ تکذیب کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ لوگ ایک واضح حقیقت کی تکذیب اپنے ضمیر کے بالکل خلاف کرتے ہیں۔ ان کے پاس اس کے خلاف کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے دلیل کا جواب دلیل سے دینے کی جگہ محض اپنی ہٹ دھرمی اور مکابرت کا اظہار کرتے ہیں۔ فرمایا کہ جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتے ہیں: چلو میاں، سن لیا، اس میں ہے کیا، یہ تو محض اگلوں کے فسانے ہیں!

'اٰیٰتٌ' سے مراد وہ دلیلیں اور حجتیں ہیں جو قیامت اور جزاء و سزا کے حق میں ان کو قرآن کے ذریعہ سے سنائی گئیں۔ ان دلیلوں کا بیان پچھلی سورتوں میں بھی ہوا ہے اور آگے کی سورتوں میں بھی آ رہا ہے۔ ساتھ ہی ان میں ان قوموں کی تاریخ کا بھی حوالہ ہے جو انذارِ قیامت کی تکذیب کے نتیجہ میں تباہ ہوئیں۔ ان چیزوں کو سن کر وہ بس ایک ہی فقرے میں ان کی تکذیب کر دیتے کہ یہ سب اگلوں کے فسانے اور پچھلوں کے قصے ہیں۔ مطلب یہ کہ ان میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو لائقِ اعتنا ہو۔

کَلَّا بَلْ سکتۃ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (۱۴)

تکذیب کی اصل علت

یہ قرآن نے اصل حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ ان بد دماغوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ یہ اگلوں کے فسانے ہیں۔ یہ ہیں تو حقائق جن کے حق میں آفاق و انفس اور عقل و فطرت کے ناقابلِ انکار دلائل موجود ہیں لیکن ان کے اعمال کا زنگ اس طرح ان کے دلوں پر چڑھ گیا ہے کہ اب حق کی کوئی کرن ان کے اندر نفوذ ہی نہیں کرتی۔

'مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ' سے ان کے اسی طرح کے اعمال کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر اوپر معتدٍ اثیم کے تحت ہم کر چکے ہیں اور جن کے متعلق قرآن کی شہادت یہ ہے کہ جو ان کے مرتکب ہوتے ہیں وہ جزاء و سزا کی تکذیب کا کوئی بہانہ ضرور ڈھونڈھتے ہیں۔

'بَلْ ۜ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ' میں اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آرہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فطرت کے اندر جو دلائل ودیعت فرمائے ہیں اور عقل و دل کے اندر سوچنے سمجھنے کی جو صلاحیت بخشی ہے یہ چیزیں کام اسی صورت میں آتی ہیں جب انسان ان کی قدر کرے اور ان سے فائدہ اٹھائے۔ اگر ان سے فائدہ نہ اٹھائے بلکہ ان کے مقابل میں نفس کی خواہشوں ہی کو اپنا رہنما بنا لے اور ان اعلیٰ صلاحیتوں کو ٹھکرا دے تو آہستہ آہستہ آدمی کی بدعملیوں کا زنگ ان پر چڑھنا شروع ہوتا ہے اور بالتدریج اس طرح ان کا احاطہ کر لیتا ہے کہ ان کے اندر کسی صحیح چیز کے داخل ہونے کی کوئی گنجائش سرے سے باقی ہی نہیں رہ جاتی۔

كَلَّآ إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ (۱۵)

یعنی یہ لوگ اپنے دلوں میں یہ ارمان لیے جو بیٹھے ہیں کہ آخرت ہوئی تو جس طرح دنیا میں ان کو عزت و شرف حاصل ہے اسی طرح وہاں بھی ان کو اعلیٰ مدارج حاصل ہوں گے، ان کے یہ ارمان پورے ہونے والے نہیں ہیں بلکہ اپنے عقل و دل کے دیدے انھوں نے جو پھوڑ لیے ہیں اس کی سزا ان کو یہ ملے گی کہ وہ اپنے رب سے اس دن اوٹ میں ہوں گے۔ اوٹ میں ہونے سے مراد یہ ہے کہ یہ اس کے قرب، اس کی نظرِ عنایت، اس کے افضال و عنایات اور اس کے انوار و تجلیات کے مشاہدے سے بالکل محروم رہیں گے۔ ان کو اتنا موقع بھی نہیں ملے گا کہ اپنے رب سے کچھ عرض معروض ہی کر لیں۔

ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ ۝ ثُمَّ يُقَالُ هَٰذَا الَّذِي كُنتُم بِهِ تُكَذِّبُونَ (۱۶-۱۷)

پھر وہ جہنم میں پڑیں گے۔ اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ چیز جس کو تم جھٹلاتے رہے تھے۔ 'ثُمَّ' کی تکرار سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ بات ان سے خاص اہتمام کے ساتھ کہی جائے گی اور مقصود اس سے ان کی تفضیح ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی میں جس چیز کی پورے شد و مد سے مخالفت کی اب اس کو دیکھ لو اور اس کا مزا چکھو!

كَلَّآ إِنَّ كِتَٰبَ الْأَبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّينَ (۱۸)

'عِلّیُّوْنَ' کی تحقیق

'کَلَّا' یہاں بھی اسی طرح مکذبینِ قیامت کے زعمِ باطل کی تردید کے لیے ہے جس طرح آیت ۷ میں ہے۔ یعنی نیک و بد ہرگز یکساں نہیں ہوں گے بلکہ بدکاروں کے لیے جس طرح الگ رجسٹر اور الگ دفتر ہوگا اسی طرح نیکوکاروں اور وفاداروں کے لیے الگ رجسٹر اور الگ دفتر ہوگا۔ ان کے اعمال نامے 'عِلّیّین' میں ہوں گے۔

وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا عِلِّيُّونَ (۱۹)

جس طرح اوپر اسی اسلوب بیان میں 'سِجِّیْن' کا ذکر اس کے ہول کے اظہار کے لیے ہوا ہے اسی طرح یہاں اسی اسلوب میں 'عِلّیُّوْن' کا ذکر اس کی عظمت و شان کے اظہار کے لیے ہوا ہے۔ یعنی

اس کی عظمت و شان کا بھلا اس دنیا میں کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے! وہ عالی مقاموں کا دفتر ہے جس میں ان کے کارنامے درج ہوں گے۔

کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۙ یَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ (۲۰-۲۱)

لفظ 'عِلِّیُّوْنَ' چونکہ اپنے خاص لغوی مفہوم سے الگ ایک خاص اصطلاحی مفہوم میں استعمال ہوا ہے اس وجہ سے اس کی وضاحت فرما دی گئی ہے کہ یہ ایک دفتر ہے جس کی ہر چیز منبط تحریر میں آئی ہوئی ہے اور جس کی نگرانی بھی اللہ تعالیٰ کے خاص مقرّب فرشتے کرتے ہیں۔

'یَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ' کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دفتر چونکہ مقربین کے ریکارڈ کے لیے خاص ہوگا اس وجہ سے اس میں انہی کی آمد و شد ہوگی، دوسروں کی یہاں رسائی نہ ہوگی۔ آگے آیت ۲۸ میں مقربین کا ذکر ہے۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۙ عَلَی الْاَرَآئِکِ یَنْظُرُوْنَ (۲۲-۲۳)

ابرار کا انعام

یہاں نعمتوں کا ذکر آ رہا ہے جو ابرار کو حاصل ہوں گی۔ 'فِیْ نَعِیْمٍ' کے اسلوب بیان کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں کہ اس انداز میں جب بات کہی جاتی ہے تو مقصود یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ وہ ہر جانب سے نعمتوں میں گھرے ہوں گے، ان کی نگاہیں جدھر اٹھیں گی نعمت ہی نعمت ان کو نظر آئے گی۔

'عَلَی الْاَرَآئِکِ یَنْظُرُوْنَ' اوپر فجّار سے متعلق تو فرمایا ہے: 'کَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (۱۵)' اس کے بالکل برعکس ابرار کا حال یہ ہوگا کہ وہ اپنے تختوں پر بیٹھے ہوئے اللہ تعالیٰ کے افضال و عنایات اور اس کی شانیں اور جلوے دیکھ رہے ہوں گے۔ آگے یہ وضاحت بھی ہوئی ہے کہ تختوں پر بیٹھے بیٹھے ہی ان کو دشمنوں کا انجام بھی دکھایا جائے گا اور کہا جائے گا کہ کیوں، کافروں کو ان کے کیے کا بدلہ مل گیا نا! 'عَلَی الْاَرَآئِکِ یَنْظُرُوْنَ ۞ هَلْ ثُوِّبَ الْکُفَّارُ مَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ (۳۵-۳۶)'

تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ (۲۴)

'نَضْرَةٌ' اس تازگی و بشاشت کو کہتے ہیں جو نعمتوں میں گھرے ہوئے لوگوں کے چہروں پر جھلکتی ہے۔ فرمایا کہ جو بھی دیکھے گا ان کے چہروں پر نعمت کی تازگی و بشاشت پائے گا۔

یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۙ خِتٰمُهٗ مِسْکٌ ؕ وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۲۵-۲۶)

ان نعمتوں میں سے یہ ایک نعمت کا بطور مثال ذکر فرمایا کہ ان کو شراب خالص کے جام پلائے جائیں گے۔ یہ شراب سربمہر ہوگی جو اول اول انہی کے لیے کھولی جائے گی اور یہ مہر مشک کی ہوگی۔

ظاہر ہے کہ یہ چند صفات محض اس کا ایک اجمالی تصور دینے کے لیے بیان ہوئی ہیں۔ رہیں اس کی اصل صفات و کیفیات تو ان کا اندازہ انہی لوگوں کو ہو گا جو اس سے لطف اندوز ہوں گے۔ البتہ یہ فرما دیا کہ چاہنے کی چیز ہے تو یہ ہے جس کے لیے حوصلہ کرنے والوں کو حوصلہ کرنا چاہیے! یہ اہل ایمان کے لیے تشویق و ترغیب بھی ہے اور اس میں ان سگانِ دنیا پر طنز بھی ہے جو حیاتِ چند روزہ کی حقیر و فانی لذتوں کے حصول کی جدوجہد میں اپنے رات دن ایک کیے ہوئے ہیں اور چاہنے کی جو چیزیں ہیں ان کا چاہنے والا کوئی بھی نہیں ہے۔

وَمِزَاجُهُۥ مِن تَسۡنِيمٍ ۝ عَيۡنًا يَشۡرَبُ بِهَا ٱلۡمُقَرَّبُونَ (۲۷-۲۸)

'مِزَاجُ' سے مراد وہ ملونی ہے جو پینے والے پیتے وقت شراب میں اس کے کیف میں اضافہ یا اس کے اعتدال پیدا کرنے کے لیے ملا لیتے ہیں۔ فرمایا کہ اس شراب میں ملونی تسنیم کی ہو گی۔ پھر تسنیم کی وضاحت فرما دی کہ یہ ایک چشمہ ہے جس کے کنارے بیٹھ کر مقربین اس شراب سے لطف اندوز ہوں گے۔

'عَيۡنًا' کا نصب علیٰ سبیل الاختصاص ہے اور 'بِهَا' میں 'ب' میرے نزدیک ظرفیہ ہے۔ اس کی وضاحت 'عَيۡنًا يَشۡرَبُ بِهَا عِبَادُ ٱللَّهِ يُفَجِّرُونَهَا تَفۡجِيرًا' (الدھر-۷۶ : ۶) کے تحت کر چکا ہوں' مے نوشی کے لوازم میں سے ایک چیز اس کا لبِ جو ہونا بھی ہے۔ اس دنیا میں اس خانہ خراب کے رسیا تو جہاں پائیں اور جس طرح بھی پائیں پی لیتے ہیں، یہاں تک کہ پیالہ نہیں ملتا تو چلو ہی سے پی لیتے ہیں' لیکن یہ مقربین کی بزم مے نوشی ہے اس وجہ سے اس کے آداب اور ہیں۔

ہمارے مفسرین اور مترجمین پر اس 'ب' کی نوعیت واضح نہیں ہوئی ہے اس وجہ سے وہ یا تو اس سے کترا گئے ہیں یا اس کی غلط توجیہ پر راضی ہو گئے ہیں۔ مترجمین نے عام طور پر اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ 'اس سے پیتے ہیں'۔ لیکن یہ ترجمہ بالکل بے معنی ہے۔ اس کا مطلب اگر یہ سمجھا جائے کہ اس چشمہ میں سے پیتے ہیں تو یہ بات 'مِزَاجُهُۥ مِن تَسۡنِيمٍ' سے پوری ہو گئی اور نہایت واضح طور پر پوری ہو گئی پھر اس بات کو ایک بالکل مبہم انداز سے دہرانے کا فائدہ! یہ بات واضح رہے کہ ظرفیت کے لیے 'ب' کا استعمال اعلیٰ عربی میں معروف ہے، بالخصوص اس طرح کے مواقع میں تو ظرفیت کے سوا اور کوئی معنی لینے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

إِنَّ ٱلَّذِينَ أَجۡرَمُواْ كَانُواْ مِنَ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ يَضۡحَكُونَ (۲۹)

نتائج اعمال کے ظہور کے بعد انقلابِ حال

یہ اس انقلابِ حال کی تصویر ہے جو نیکوں اور بدوں کے درمیان اس وقت نمایاں ہو گا جب دونوں کے نتائج اعمال سامنے آ جائیں گے۔ پہلے اس صورتِ حال کی تصویر کھینچی ہے جس سے اہل ایمان' بالخصوص غریب مسلمان مغرور دولت مندوں کے ہاتھوں اس دنیا کی زندگی میں دوچار رہے ہیں۔ فرمایا کہ یہ مجرمین

جہاں ان کو پاتے اپنی فقرہ بازیوں اور پھبتیوں کا ہدف بنا لیتے۔

وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ (۳۰)

اور جب کبھی پاس سے گزرتے تو کن انکھیوں سے اشارہ کرتے۔

'مَرُّوا بِهِمْ' کا مطلب یہ بھی ہو سکتا کہ جب کبھی مسلمان ان کے پاس سے گزرتے اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جب کبھی ان فراعنہ کا گزر مسلمانوں کی طرف ہوتا تو کن انکھیوں کے اشاروں سے ان کے دلوں پر چرکے لگاتے۔ یہ امر واضح رہے کہ آنکھ کے اشاروں کے گھاؤ تبر اور تلوار کے گھاؤ سے بھی گہرے ہوتے ہیں اور تذلیل و تحقیر کا تو یہ خاص ہتھیار رہا ہے۔ ان شاء اللہ سورۂ ھُمَزَہ کی تفسیر میں اس کے بعض خاص پہلو زیر بحث آئیں گے۔

وَإِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمُ انْقَلَبُوا فَكِهِينَ (۳۱)

یعنی اہل ایمان کے ساتھ یہ بدتمیزیاں کر کے جب اپنے گھروالوں میں لوٹتے تو بہت مگن لوٹتے گویا کوئی بڑا میدان جیت کر لوٹے ہیں۔ یہ اشارہ ان کے سفلہ پن کی طرف ہے کہ بجائے اس کے کہ ان کو اپنی ان حرکتوں پر کچھ ندامت ہو وہ ان کا ذکر بڑے فخر سے اپنے گھروالوں میں کرتے کہ انھوں نے فلاں کے اس طرح لتے لیے اور فلاں کو یوں تاڑا۔ سورۂ قیامہ میں یہی بات یوں بیان ہوئی ہے: 'وَلَٰكِن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ۝ ثُمَّ ذَهَبَ إِلَىٰ أَهْلِهِ يَتَمَطَّىٰ' (القیٰمۃ ۔ ۷۵: ۳۲-۳۳)

یہاں وہ بات یاد رکھیے جو قرآن میں اہل ایمان کے کردار سے متعلق مذکور ہوئی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے اہل اور متعلقین کے اندر ایک محتاط آدمی کی طرح زندگی گزارتے ہیں کہ ان کے کسی رویہ سے ان کو کوئی غلط سبق نہ ملے جو قیامت کے دن اُن کے لیے تباہی اور اُن کے لیے رسوائی کا باعث ہو۔ اس کے برعکس ان اشرار کا یہ کردار بیان ہوا ہے کہ یہ باہر اہل ایمان کے ساتھ جو گنڈہ گردی کر کے لوٹتے ہیں اس کی داستان فخر کے ساتھ گھر والوں کو بھی سناتے ہیں تاکہ ان کی پوری نسل گنڈوں کی نسل بن جائے۔

وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ (۳۲)

اور ان کی یہ کوشش بھی ہوتی کہ ان اہل ایمان سے متعلق کسی کے اندر کسی نوعیت کا کوئی حسن ظن نہ پیدا ہونے پائے۔ چنانچہ جب بھی وہ ان کو دیکھتے اُن کے بارے میں لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے کہ یہ پکے گمراہ ہیں اس لیے کہ یہ دینِ آبائی کے دشمن ہیں اور اپنے سوا سب کو جہنم کا ایندھن سمجھتے ہیں۔ یہ امر یہاں پیش نظر رہے کہ مسلمانوں کے ذکر و فکرِ آخرت کو دیکھ کر بہت سے لوگوں کے ذہن متاثر ہونے لگے تو قریش کے لیڈروں نے ان کا یہ توڑ نکالا کہ ان کو گمراہ اور بے دین ثابت کرنا شروع کیا۔ اس کے لیے جو دلیلیں انھوں نے ایجاد کیں ان کی تفصیلات اپنے محل میں گزر چکی ہیں۔

وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَافِظِينَ (۳۳)

عام طور پر لوگوں نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ یہ کفار ان مسلمانوں پر کوئی نگران اور اتالیق تو نہیں مقرر کیے گئے تھے کہ ان کو ضالّ و مضلّ ٹھہرائیں اور ان کے اعمال و عقائد پر نکیر کریں' لیکن میرے نزدیک یہ کفار ہی کے قول کا ایک حصّہ نقل ہوا ہے یعنی پوری بات یوں ہے کہ جب وہ مسلمانوں کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ پکّے گمراہ ہیں، یہ ہمارے اعمال و عقائد کو کفر و شرک قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ ہمارے اوپر داروغہ مقرر کر کے نہیں بھیجے گئے ہیں کہ ہماری ہر چیز پر اعتراض اٹھائیں اور ہماری اصلاح کے مدّعی بن کر کھڑے ہوں۔

فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ (۳۴)

کفار کے رویہ کی تفصیل کے بعد اب یہ اس انقلابِ حال کا ذکر ہے جو قیامت کے دن واقع ہوگا۔ فرمایا کہ اب تک تو کفار مسلمانوں کے حال پر ہنستے رہے لیکن اب اہلِ ایمان کفار کے حال پر ہنسیں گے۔ اہلِ ایمان کا یہ ہنسنا بالکل جائز ہوگا۔ جب انھوں نے کفار پر حجت تمام کر دی اور انھوں نے کوئی اصلاح قبول کرنے کے بجائے الٹے انہی کو مجرم ٹھہرایا تو وہ اسی کے سزاوار ہوں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو کوئی ہمدردی نہ ہو۔

عَلَى الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ (۳۵)

یعنی وہ جس طرح اپنے تختوں پر بیٹھے بیٹھے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے جلوے دیکھتے ہوں گے اسی طرح اپنے تختوں پر بیٹھے ہی بیٹھے جب چاہیں گے جھانک کے دوزخ میں کفار کا حال بھی دیکھ لیں گے بلکہ ان سے سوال و جواب بھی کر لیں گے، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات میں تصریح ہے۔

هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (۳۶)

یہ سب کچھ دیکھ دکھا لینے کے بعد اہلِ ایمان سے بطور طلبِ تصدیق یہ سوال ہوگا کہ کیوں کفار کو اپنے کیے کا پورا پورا بدلا مل گیا نا!

'مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ' میں کفار کی وہ بدتمیزیاں بھی شامل ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ فضلہ واحسانہ۔

رحمان آباد
۱۴ - اگست ۱۹۷۹ء
۲۰ - رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ

تدبّرِ قرآن

۸۴

الانشقاق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

اس سورہ اور سابق سورہ ـــــ المطفّفین ـــــ میں نہایت واضح معنوی مشابہت موجود ہے۔ جزا و سزا کے منکروں کو جس طرح اس میں متنبہ کیا گیا ہے اسی طرح اس سورہ میں بھی اسی گروہ کو جھنجھوڑا گیا ہے۔ اس میں بیان فرمایا ہے کہ ایک ایسا دن لازماً آنا ہے جس میں اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کے ایمان اور عمل کی بنیاد پر الگ الگ گروہوں میں تقسیم کرے گا، جو خدا کے فرمانبردار و نیکوکار ہوں گے وہ ابدی بادشاہی میں داخل ہوں گے اور جو نافرمان و نابکار ہوں گے وہ ابدی ذلّت سے دوچار ہوں گے۔ اس سورہ میں بھی لوگوں کا دو گروہوں میں تقسیم ہونا بیان ہوا ہے۔ ایک وہ جن کو ان کے اعمال نامے دہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے اور وہ ابدی کامیابی حاصل کریں گے۔ دوسرے وہ جن کے اعمال نامے ان کے پیچھے ہی سے ان کے بائیں ہاتھ میں پکڑا دیے جائیں گے اور وہ ابدی ذلّت سے دوچار ہوں گے۔

دونوں میں اصل مخاطب وہ مترفین و اربابِ تنعّم ہیں جو یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ اول تو جزا و سزا کا کوئی دن آنے والا ہے نہیں اور اگر ہے بھی تو ان کو جو عزت و سرفرازی یہاں حاصل ہے وہ وہاں بھی حاصل رہے گی۔ ان کو بتایا گیا ہے کہ انسان کی فطرت عدل کے شعور سے عاری نہیں ہے اور خالق نے یہ دنیا اندھیر نگری نہیں بنائی ہے، اس وجہ سے لازم ہے کہ ایک دن ایسا آئے جس میں نیکوں اور بدوں کے درمیان امتیاز ہو۔ اس دن وہ لوگ ہلاک ہوں گے جو اس بدیہی حقیقت کو پس پشت ڈال کر زندگی گزاریں گے۔

استدلال کی بنیاد سابق سورہ میں، جیسا کہ وضاحت ہو چکی ہے، انسانی فطرت پر ہے اور اس سورہ میں، جیسا کہ آگے وضاحت ہو گی، آفاق کے بعض شواہد پر۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ میں مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱ - ۵) ظہورِ قیامت کے وقت آسمان و زمین میں جو ہلچل برپا ہوگی اس کا اجمالی تذکرہ اور اس امر کی وضاحت کہ اس دن نہ آسمان کی مجال ہوگی کہ وہ اپنے رب کے حکم سے سرتابی کر سکے اور نہ زمین کی۔ دونوں اپنے رب کی بے چون و چرا اطاعت کریں گے اور یہی ان کے لیے زیبا ہے۔ جب خدا نے ان کو پیدا کیا ہے تو ان پر یہ حق ہے کہ وہ اس کی اطاعت کریں۔

(۶ - ۱۵) انسان کو خطاب کر کے یہ تنبیہ کہ تجھے بھی کشاں کشاں اپنے رب سے ملنا اور اپنے انجام سے دوچار ہونا ہے۔ اس دن جن کے اعمال نامے ان کے داہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے وہ تو نہایت سستے چھوٹیں گے اور خوش خوش اپنے لوگوں سے ملیں گے۔ البتہ ان کی شامت ہے جنھوں نے اسی دنیا کو منزلِ مقصود بنا لیا اور اصل منزل سے غفلت سے زندگی گزاری۔ ان کو ان کے اعمالنامے ان کے پیچھے ہی سے پکڑا دیے جائیں گے۔ ان کے لیے ہر قدم پر ہلاکی ہی ہلاکی ہوگی۔

(۱۶ - ۲۱) اس کائنات کے بعض آثار کی شہادت اس بات پر کہ اس کی ہر چیز کے اندر ایک تدریج پائی جاتی ہے اور ہر چیز ہر لحظہ خدا کے قانون کی گرفت میں ہے۔ انسان بھی درجہ بدرجہ اپنے رب کی طرف بڑھ رہا ہے اور ایک دن اس کو اس سے دوچار ہونا ہے۔ اگر وہ قرآن کی اس بات کو نہیں مان رہا ہے تو یہ اس کی خرد باختگی ہے۔

(۲۲ - ۲۵) ان لوگوں کو وعید جو قرآن کی تکذیب پر اڑے ہوئے ہیں اور ان لوگوں کو بشارت جو اس کے انذار کی تصدیق کر کے ایمان و عملِ صالح کی راہ پر چل پڑے ہیں۔

سُورَةُ الْاِنْشِقَاقِ

مَكِّيَّةٌ ——————— آیات: ۲۵

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ ﴿۱﴾ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴿۲﴾ وَإِذَا آیات
الْأَرْضُ مُدَّتْ ﴿۳﴾ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ﴿۴﴾ وَأَذِنَتْ ۱-۲۵
لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴿۵﴾ يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ
كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ ﴿۶﴾ فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ﴿۷﴾ فَسَوْفَ
يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا ﴿۸﴾ وَيَنْقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا ﴿۹﴾
وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ ﴿۱۰﴾ فَسَوْفَ يَدْعُو
ثُبُورًا ﴿۱۱﴾ وَيَصْلَىٰ سَعِيرًا ﴿۱۲﴾ إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا ﴿۱۳﴾
إِنَّهُ ظَنَّ أَنْ لَنْ يَحُورَ ﴿۱۴﴾ بَلَىٰ إِنَّ رَبَّهُ كَانَ بِهِ بَصِيرًا ﴿۱۵﴾ معانقہ
فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿۱۶﴾ وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾ وَالْقَمَرِ إِذَا
اتَّسَقَ ﴿۱۸﴾ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾ فَمَا لَهُمْ لَا
يُؤْمِنُونَ ﴿۲۰﴾ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ ﴿۲۱﴾ السجدۃ
بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُكَذِّبُونَ ﴿۲۲﴾ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُوعُونَ ﴿۲۳﴾
فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿۲۴﴾ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

ع ۲۵ ۹ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿۲۵﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۲۵

جب کہ آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے خداوند کے حکم کی تعمیل کرے گا اور اس کے لیے یہی زیبا ہے۔ اور جب کہ زمین تان دی جائے گی اور وہ اپنے اندر کی چیزیں باہر ڈال کر فارغ ہو جائے گی اور وہ اپنے خداوند کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اس کو یہی چاہیے۔ ۱-۵

اے انسان، تو کشاں کشاں اپنے خداوند ہی کی طرف جا رہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے۔ تو جس کو اس کا اعمال نامہ اس کے دہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اس کا حساب تو نہایت [illegible] گا اور وہ اپنے لوگوں کے پاس نہایت شادمند لوٹے گا۔ رہا وہ جس کا اعمال نامہ اس کے [illegible] سے پکڑا دیا جائے گا تو وہ موت کی دہائی دے گا اور دوزخ میں پڑے گا۔ وہ اپنے لوگوں [illegible] نے گمان رکھا کہ اس کو کبھی لوٹنا نہیں ہو گا۔ ہاں، کیوں نہیں! اس کا رب تو [illegible] طرح دیکھ رہا تھا۔ ۶-۱۵

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں شفق کی اور رات کی اور [illegible] چیزوں کی جن کو وہ اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے اور چاند کی جب وہ پورا ہو جاتا ہے کہ تم کو لازماً چڑھنا ہے درجہ بدرجہ۔ ۱۶-۱۹

تو انھیں کیا ہو گیا ہے کہ ایمان نہیں لا رہے ہیں اور جب انھیں قرآن سنایا جاتا ہے تو سجدے میں نہیں گر پڑتے! بلکہ جنھوں نے کفر کیا وہ جھٹلا رہے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ جمع کر رہے ہیں تو ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ ہاں، جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے دائمی انعام ہے۔ ۲۰-۲۵

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۙ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ (۱-۲)

قیامت کے دن کی ہلچل — قیامت کے بعد جو جہانِ نو وجود میں آئے گا وہ نئے نوامیس و قوانین کے تحت وجود میں آئے گا اس وجہ سے اس میں یہ آسمان و زمین جو آج موجود ہیں، ختم ہو جائیں گے اور ان کی جگہ جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، دوسرے آسمان و زمین نمودار ہو جائیں گے۔

'اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ' کے الفاظ سے یہاں وہی مضمون بیان ہوا ہے جو سورۂ انفطار میں 'اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ (۱)' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ کائنات کے اس سب سے بڑے حادثہ کا آج کوئی اندازہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ قرآن نے اس ہلچل کا ذکر ان نادانوں کو جھنجھوڑنے کے لیے کیا ہے جو اپنے قلعوں اور محلوں پر بہت نازاں تھے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ بھلا ان میں کوئی دراڑ کہاں سے پڑ جائے گی؟ ان کو آگاہ فرمایا کہ قلعے اور گڑھیاں، ایوان اور محل تو درکنار سرے سے یہ آسمان و زمین ہی پاش پاش ہو جائیں گے جن کے اندر یہ گھروندے تم نے بنائے ہیں۔

'وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ'۔ 'اَذِنَ لَہٗ' کے معنی ہیں 'اِسْتَمَعَ لَہٗ' اس نے اس کی بات مان لی، اس کے حکم کی تعمیل کی، اس کے آگے سر جھکا دیا۔

'حُقَّ لَہٗ' کے معنی ہیں کہ اس کے لیے واجب ہے کہ وہ ایسا کرے، اس کے لیے یہی زیبا ہے کہ وہ یہ کام کرے۔

مطلب یہ ہے کہ اس جہالت میں نہ پھنسے رہو کہ بھلا آسمان و زمین جیسی چیزوں پر کس کا زور چل سکتا ہے کہ وہ ان کو پاش پاش کر کے رکھ دے۔ اس دن اپنے رب کے حکم سے یہ بھی پاش پاش ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو حکم دے گا اور بے چون و چرا وہ اس کے حکم کی تعمیل کریں گے۔

'وَحُقَّتْ' یعنی اس کے لیے یہی کرنا واجب ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا ہے تو اس کے لیے یہ کس طرح زیبا ہے کہ وہ اپنے خالق کی نافرمانی کرے!

ایک برمحل تنبیہ — یہ فقرہ یہاں ان مغروروں کی تنبیہ و تعلیم کے لیے آیا ہے جو بات بات پر اللہ اور رسول کے خلاف محاذ قائم کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ برسرِ موقع ان کو توجہ دلا دی گئی کہ آسمان تو اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں پاش پاش ہو جائے گا اور یہی اس کے لیے زیبا ہے۔ اب وہ نادان جن کی حیثیت اس آسمان کے نیچے بالکل ایک ذرۂ بے مقدار کی ہے سوچ لیں کہ ان کا یہ رویہ کس طرح جائز

ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے رب سے لڑنے اٹھیں اور اس زعم میں مبتلا ہوں کہ کوئی ان کو ان کی جگہ سے ہلا نہیں سکتا!

وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۙ وَاَلْقَتْ مَا فِیْهَا وَتَخَلَّتْ ۙ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ (۳-۵)

قیامت کے دن زمین کا حال

آسمان کے بعد یہ زمین پر جو کچھ گزرے گی اس کا حال بیان ہو رہا ہے کہ زمین تان دی جائے گی۔ یعنی آج تو زمین میں بہت سی شکنیں اور سلوٹیں ہیں، نشیب و فراز ہیں، وادیاں اور کہسار ہیں، دریا اور پہاڑ ہیں۔ اس کی اونچ نیچ اور اس کی تہوں میں بے شمار چیزیں چھپی ہوئی ہیں جو نظر نہیں آ رہی ہیں لیکن اس دن یہ ایک چادر کی طرح تان دی جائے گی اور جو کچھ اس کی سلوٹوں میں ہے وہ اس کو باہر نکال کر فارغ ہو جائے گی۔ یہ اشارہ اگرچہ خاص طور پر مُردوں کے اٹھائے جانے کی طرف ہے لیکن اسلوب بیان عام ہے۔ وہ ساری چیزیں اس میں داخل ہیں جو زمین میں دفن ہیں۔ یعنی ان سرمایہ داروں کے خزانے بھی جو اس سورہ میں خاص طور پر مخاطب ہیں۔

'وَاَلْقَتْ مَا فِیْهَا وَتَخَلَّتْ' کے اسلوبِ بیان سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ زمین ان چیزوں کے بوجھ سے اسی طرح بوجھل ہے جس طرح ایک حاملہ اپنے حمل سے بوجھل ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اس بوجھ سے فارغ ہونے میں وہی راحت و فراغت محسوس کرے گی جو ایک حاملہ وضعِ حمل کے بعد محسوس کرتی ہے۔

'وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ'۔ اس آیت کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آسمان اور زمین دونوں اس دن اپنے رب کے حکم کی اطاعت کریں گے اور یہ اطاعت ہی ان کے لیے زیبا ہے اور یہ بالکل رضامندانہ ہوگی۔ قرآن میں دوسری جگہ آسمان و زمین کی اس رضامندانہ اطاعت کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے۔ 'فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ کَرْهًا ۭ قَالَتَآ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ' (حٰمٓ السجدۃ ۴۱: ۱۱) (پس اس نے آسمان اور زمین دونوں کو حکم دیا کہ حاضر ہو، رضامندانہ خواہ مجبورانہ۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم حاضر ہیں رضامندانہ)۔

یٰٓاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰی رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ (۶)

دنیا کے فریفتہ داروں کو تنبیہ

خطاب باعتبارِ الفاظ اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن خاص طور پر انہی مغروروں کی طرف ہے جو اپنے عیش دنیا میں مگن اور آخرت سے بالکل بےفکر تھے۔ فرمایا کہ اے انسان تو بھی کشاں کشاں چلا اپنے رب ہی کی طرف جا رہا ہے اور بالآخر اسی کے حضور تیری پیشی ہونی ہے! تجھے اس کا شعور ہو یا نہ ہو۔

دنیا کے پرستار اپنی دنیوی کامیابیوں کے نشہ میں اپنی اصل منزل ہمیشہ بھولے رہتے ہیں۔ انھیں

کامیابیوں کے بعد کامیابیاں اور فتوحات کے بعد جو فتوحات حاصل ہوتی ہیں ان میں وہ اس طرح کھو جاتے ہیں کہ ان سے باہر ہو کر وہ کسی چیز پر غور ہی نہیں کر سکتے۔ ایک کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری کامیابی کے حصول کی بھاگ دوڑ میں انھیں کبھی اس سوال پر غور کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی کہ ان کی اصلی منزل ہے کیا؟ وہ اسی دنیا کی کسی کامیابی کو اپنی آخری منزل سمجھتے ہیں حالانکہ آخری منزل آخرت ہے جس کی طرف سب، خدا کے قانون کی زنجیر میں بندھے، نہایت بے بسی کے ساتھ، کشاں کشاں چلے جا رہے ہیں۔ اگر ان کی نظر زندگی کے اس پہلو پر بھی ہوتی تو وہ جادۂ مستقیم سے منحرف نہ ہوتے بلکہ کھلی آنکھوں سے دیکھتے کہ جتنی تیز روی کے ساتھ وہ اپنی مرغوباتِ دنیا کی راہ میں بڑھ رہے ہیں اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ ان کی زندگی محاسبۂ اعمال کے لیے خدا کی طرف بڑھ رہی ہے۔

ہر انسان کشاں کشاں خدا کی طرف جا رہا ہے

'اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا' 'كَدْحٌ' کے معنی کسی کام میں پوری مشقت کے ساتھ کوشش کرنے کے ہیں۔ یہ نہایت بلیغ تعبیر ہے اس حقیقت کی کہ انسان جس دن سے وجود میں آتا ہے اسی دن سے اس کا سفر خدا کی ٹھہرائی ہوئی منزل یعنی موت کی راہ میں شروع ہو جاتا ہے اور یہ سفر بلا کسی توقف کے جاری رہتا ہے۔ موسم سخت ہو یا نرم، آدمی مریض ہو یا صحت مند، حالات مساعد ہوں یا نامساعد، کسی حال میں بھی یہ منقطع نہیں ہوتا۔ ولادت سے لے کر موت تک بچپن، مراہقہ، جوانی، ادھیڑ پن، پیری اور ناتوانی کے مختلف مراحل آتے ہیں لیکن اس میں ایک منٹ بلکہ سکینڈ کے لیے بھی وقفہ نہیں ہوتا۔ انسان قانونِ قدرت کی زنجیروں میں ایسا جکڑا ہوا ہے کہ وہ اس راہ میں نہ بھی چلنا چاہے جب بھی اس کو چلنا پڑے گا اور اس بے بسی میں شاہ اور گدا، شریف اور وضیع، امیر اور مامور، نیک اور بد سب یکساں ہیں۔

'فَمُلٰقِيْهِ'۔ یہ اس سفر کی غایت بیان ہوئی ہے۔ فرمایا کہ انسان اس دنیا میں شتر بے مہار نہیں ہے اس وجہ سے ضروری ہوا کہ سب کشاں کشاں اپنے خالق کے حضور میں پہنچیں اور اس کے آگے پیش ہوں۔ اس پیشی کا مقصد ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس مقصد سے ان کو دنیا میں پیدا کیا اس سے متعلق ان سے سوال ہو کہ وہ انھوں نے پورا کیا یا نہیں، چنانچہ آگے اس کی تفصیل آ رہی ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا (۷-۸)

یہ اوپر کے اجمال کی تفصیل ہے۔ فرمایا کہ اس دن جن کے اعمال نامے ان کے دہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے وہ تو سستے چھوٹیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے اعمال ناموں کا ان کے دہنے ہاتھ میں دیا جانا ہی اس بات کا ضامن ہوگا کہ وہ نجات کے حق دار ہیں، ان کی نیکیاں ان کی بدیوں پر غالب اور وہ عفو و صفح

کے حق دار ہیں۔ معلوم ہوا کہ جہاں تک حساب کا تعلق ہے وہ تو ان کا بھی ہو گا لیکن ان کے نیک اعمال کا وزن زیادہ ہو گا۔ اس وجہ سے ان کی معمولی غلطیوں سے درگزر کی جائے گی برعکس اس کے جن کے برے اعمال کا وزن زیادہ ہو گا ان کی ایک ایک غلطی پر گرفت ہو گی اور وہ اس کی سزا بھگتیں گے۔

وَّیَنْقَلِبُ اِلٰٓی اَھْلِہٖ مَسْرُوْرًا (۹)

ایک جامع اسلوب اور اس کے مضمرات

یہ ایک جامع اسلوب میں ان کا صلہ بیان ہوا ہے کہ اس دن وہ اپنے اہل و عیال میں خوش خوش لوٹیں گے۔ اس اسلوب بیان میں کئی باتیں سمٹ آئی ہیں جو خود بخود ظاہر ہیں، مثلاً

—— یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کے باایمان اہل و عیال کو ان کے ساتھ جنت میں جمع کر دے گا اگرچہ اہل و عیال اس درجۂ بلند کے مستحق نہ ہوں جس کے وہ مستحق ہوئے تاکہ جنت کی کامیابیوں سے یک جا مسرور و شادمند ہوں۔ سورۂ طور آیت ۲۱ میں یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ اس یک جائی کے لیے اللہ تعالیٰ ان کے درجے کو نیچا نہیں کرے گا بلکہ ان کے اہل و عیال کے درجے بلند کر دے گا۔

—— یہ کہ انھوں نے اپنے اہل و عیال کے اندر ان کی عافیت سے بے فکر رہ کر زندگی نہیں گزاری بلکہ دنیا سے زیادہ ان کی اخروی کامیابیوں کی فکر رکھی۔ فکر آخرت سے غافلوں کا رویہ تو سابق سورہ میں یہ بیان ہوا ہے کہ جب وہ اپنے اہل و عیال میں ہوتے ہیں تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے کہ بھلا اس ہرے بھرے باغ پر خزاں کدھر سے آسکتی ہے! وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓی اَھْلِھِمُ انْقَلَبُوْا فَکِھِیْنَ (المطففین ۸۳: ۳۱) اس کے برعکس آخرت پر ایمان رکھنے والوں سے متعلق سورۂ طور آیات ۲۶-۲۷ میں یہ بیان ہوا ہے کہ قیامت کے دن جب وہ اپنے اہل و عیال کی یکجائی سے مسرور ہوں گے تو کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی فضل ہوا کہ ہم ان کی اخروی فلاح سے غافل نہیں بلکہ اس کے لیے برابر فکر مند رہے جس کا صلہ ہمیں یہ ملا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی ہمارے ساتھ جمع کر دیا۔ قَالُوْٓا اِنَّا کُنَّا قَبْلُ فِیْٓ اَھْلِنَا مُشْفِقِیْنَ ہ فَمَنَّ اللّٰہُ عَلَیْنَا وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ۔

—— یہ کہ جو شخص اپنے اہل و عیال سے محبت رکھتا ہے اس کی اس محبت کا اصلی تقاضا یہ ہے کہ وہ ان کی عاقبت سنوارنے کے لیے خود بھی فکرمند رہے اور ان کو بھی فکرمند رکھنے کی کوشش کرے۔ اسی فکرمندی سے آخرت میں یکجائی اور محبت کا اصلی سرور حاصل ہو گا۔ اگر آخرت کو نظر انداز کر کے اسی دنیا کے لیے محبت کی گئی تو وہ محبت بالآخر دونوں فریق کے لیے موجب وبال و خسران ہو گی اور قیامت میں دونوں باہم دگر مسرور ہوتے کے بجائے ایک دوسرے پر لعنت کریں گے۔

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَہٗ وَرَآءَ ظَھْرِہٖ (۱۰)

آخرت سے غافلوں کا انجام

یہ دوسرے گروہ یعنی ان لوگوں کا انجام بیان ہوا ہے جنھوں نے آخرت سے بالکل بے پروا رہ کر زندگی گزاری۔ فرمایا کہ ان کے اعمال نامے ان کے پیچھے ہی سے ان کے بائیں ہاتھ میں پکڑا دیے

جائیں گے۔ اگرچہ الفاظ میں بائیں ہاتھ کا کوئی ذکر نہیں ہے لیکن قرینہ اس پر دلیل ہے۔ جب پہلے گروہ سے متعلق یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ اس کے اعمال نامے بائیں ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے تاکہ ان کی اور ان کے اعمال نامے کی نامبارکی اس برتاؤ ہی سے واضح ہو جائے۔ علاوہ ازیں سورۂ حاقّہ آیت ۲۵ میں واضح لفظوں میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ اس گروہ کے اعمال نامے بائیں ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے۔ فرمایا ہے: 'وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ کِتٰبِیَهْ' (رہا وہ جس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا گیا تو وہ کہے گا، اے کاش! مجھے میرا اعمال نامہ دیا ہی نہ گیا ہوتا)۔

زیرِ بحث آیت سورۂ حاقّہ کی مذکورہ آیت کی روشنی میں دیکھیے تو اس سے مضمون میں یہ اضافہ ہو جائے گا کہ اس گروہ کو بیک وقت دو فضیحتوں سے سابقہ پیش آئے گا۔ ایک یہ کہ اس کے اعمال نامے بائیں ہاتھ میں دیے جائیں گے۔ دوسری یہ کہ یہ کام بھی اس طرح ہو گا کہ سامنے سے دیے جانے کے بجائے پیچھے ہی سے ان کو پکڑا دیے جائیں گے۔ مزید غور کیجیے تو یہ بات بھی اس سے نکلتی ہے کہ ان کے دونوں ہاتھ مجرموں کی طرح پیچھے کی طرف بندھے ہوں گے۔

فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۙ وَّیَصْلٰی سَعِیْرًا ۙ اِنَّهٗ کَانَ فِیْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا (۱۱-۱۳)

اوپر اہلِ ایمان کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کی طرف خوش خوش لوٹیں گے، اس کے ٹھیک مقابل میں ایک دوسرے گروہ کے بارے میں فرمایا کہ یہ موت اور ہلاکت کی دہائی دیں گے۔ یعنی جس دوزخ میں وہ داخل ہوں گے اس سے نجات کی واحد شکل ان کو صرف یہ نظر آئے گی کہ موت آ کر ان کا خاتمہ کرے لیکن وہ بھی ان کی پرسانِ حال نہ بنے گی۔

اگرچہ 'یَدْعُوْا ثُبُوْرًا' کو بظاہر 'یَصْلٰی سَعِیْرًا' کے بعد آنا چاہیے لیکن تقاضائے بلاغت مسبّب کو سبب پر مقدم کر دیا ہے تاکہ سابق گروہ کی شادمانی اور اس دوسرے گروہ کی بدبختی و حرماں نصیبی دونوں کا ذکر ایک دوسرے کے بالمقابل ہو۔

'اِنَّهٗ کَانَ فِیْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا' یعنی یہ اہل و عیال کے ساتھ یکجائی کے سرور سے اس وجہ سے محروم رہیں گے کہ ان کو جتنا اس سے حظ اٹھانا تھا دنیا میں اٹھا چکے۔ جب دنیا میں نہ اپنی عاقبت کے لیے وہ فکر مند ہوئے نہ ان کی عاقبت کے لیے تو آخرت میں وہ کس طرح حق دار ہوں گے کہ جنت میں ان کی یکجائی کے سرور سے محظوظ ہوں۔ آخرت میں ہر نعمت سے بہرہ مند ہونے کے لیے ضروری ہے کہ دنیا میں اس کی خاطر قربانی دی گئی ہو۔

اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ (۱۴)

یعنی وہ اس گمان میں رہے کہ مرنے کے بعد نہ انھیں جینا ہے نہ کسی کی طرف لوٹنا ہے تو آخر وہ اپنا یا اپنے متعلقین کا عیش کیوں مکدر کرتے؟ انھوں نے زندگی اور اس کے وسائل سے جو حظ اٹھانا تھا اٹھا لیا۔ نہ آخرت کے لیے انھوں نے کوئی فکر ہی کی اور نہ اس میں ان کا کوئی حصہ ہی ہے۔

بَلٰٓی ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا (۱۵)

ایک برسرموقع استدراک

یہاں کے اس ظن پر، جس کا اوپر حوالہ ہے، برسرموقع استدراک ہے کہ انھوں نے یہ گمان جو کیا تو بالکل غلط کیا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کا رب ان کو دیکھ رہا تھا، تو جب دیکھ رہا تھا تو آخر یہ کس طرح روا تھا کہ وہ ان کو اپنے حضور میں پیشی کے لیے نہ بلاتا؟ یہ بات تو اس کی قدرت، حکمت، عدل اور رحمت سب کے منافی ہوتی! قیامت اور جزا و سزا کے حق میں یہ دلیل قرآن میں جگہ جگہ بیان ہو چکی ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۙ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۙ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۙ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۱۶-۱۹)

اوپر کے دعوے پر بطریق قسم شہادت

اب آخر میں تین چیزوں کو بصورت قسم شہادت میں پیش کر کے اسی دعوے کو ثابت کیا ہے جو اوپر آیت ۶ میں گزر چکا ہے کہ اے انسان، تو کشاں کشاں اپنے رب ہی کی طرف جا رہا ہے اور تجھے اس کے آگے پیش ہونا ہے۔ ان قسموں کا مُقسم علیہ 'لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ' ہے جس سے یہ بات نکلی کہ تیرا خدا کے آگے پیش ہونا ہے تو ایک امر شدنی لیکن یہ کام ایک ترتیب و تدریج کے ساتھ ہوگا اس لیے کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کی یہی سنت جاری ہے کہ ہر چیز اپنی غایت و نہایت کو ایک تدریج کے ساتھ پہنچتی ہے۔

اس خلاصۂ بحث کو سامنے رکھ کر اب اجزائے کلام پر غور کیجیے۔

'فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۙ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ' قسم سے پہلے یہاں 'لا' اسی طرح آیا ہے جس طرح 'لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ' اور متعدد دوسری قسموں سے پہلے آیا ہے۔ ہم اس کی وضاحت بار بار کر چکے ہیں کہ نہ یہ زائد ہوتا ہے اور نہ قسم کی نفی کے لیے بلکہ یہ قسم سے پہلے مخاطب کے اس زعم باطل کی پیشگی نفی کے لیے آتا ہے جس کی تردید قسم سے مقصود ہوتی ہے۔ اس اسلوب میں یہ بلاغت ہے کہ متکلم مخاطب کے زعم باطل کی تردید میں اتنا توقف بھی گوارا کرنے پر تیار نہیں ہے کہ دلیل بیان کرنے کے بعد اس کی تردید کرے بلکہ کلام کا آغاز ہی اس کی تردید سے کرتا ہے۔ یہ اسلوب ایک فطری اسلوب ہے اور ہر قابل ذکر زبان میں موجود ہے۔

رات اور اس کے تضمنات کی قسم

یہاں پہلے 'شَفَق' کی قسم کھائی ہے، پھر رات اور اس کے تضمنات کی۔ 'شَفَق' اس سرخی کو کہتے ہیں

جو غروبِ آفتاب کے معاً بعد افق پر نمودار ہوتی ہے۔ یہی سرخی رات کی تمہید ہوتی ہے۔ جب تک یہ باقی رہتی ہے اس وقت تک سرِ شام ہے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ غائب ہوتی اور رات دنیا پر اپنا قبضہ جما لیتی ہے۔

'وَمَا وَسَقَ'۔ رات کے بعد یہ ان چیزوں کی قسم کھائی ہے جن کو رات اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ اس کی تشریح اہلِ لغت نے 'مَا جَمَعَ وَضَمَّ اِلَیْهِ' سے کی ہے، یعنی وہ چیزیں جن کو رات اپنے اندر جمع کر لیتی ہے۔ ہمارے مفسرین نے اس سے عام طور پر حیوانات وغیرہ کو مراد لیا ہے اس لیے کہ رات میں وہ آرام کے لیے اس کے دامن میں پناہ گیر ہو جاتے ہیں۔ بعض نے اس سے دریاؤں، پہاڑوں اور درختوں وغیرہ کو مراد لیا ہے کہ رات ان سب پر اپنی چادر اڑھا دیتی ہے لیکن ان چیزوں کا تعلق اس مُقسم علیہ سے سمجھ میں نہیں آتا جو اوپر مذکور ہوا درآنحالیکہ قسم کھائی جاتی ہی ہے مقسم علیہ کو ثابت کرنے کے لیے۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک اس سے وہ کواکب و نجوم مراد ہیں جو رات میں نمودار ہوتے اور جن سے اس کی بزم آراستہ ہوتی ہے۔ یہ چیزیں اول تو رات ہی کے مخصوصات میں سے ہیں اس وجہ سے ان کے لیے 'وَمَا وَسَقَ' کی تعبیر نہایت موزوں ہے۔ دوسرے قرآن نے جگہ جگہ ان کے طلوع و غروب، ان کے عروج و محاق اور ان کے سجود و رکوع کو اس حقیقت کی شہادت میں پیش کیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں مسخر ہیں، اسی کے حکم سے طلوع ہوتے ہیں، پھر ایک معین راستہ پر ایک خاص تدریج کے ساتھ ان کا ارتقاء ہوتا ہے، پھر بالتدریج ان کا زوال شروع ہوتا ہے یہاں تک کہ بالآخر وہ اپنے اسی خالق کی طرف لوٹ جاتے ہیں جس کے حکم سے وہ نمودار ہوتے ہیں۔ گویا ان کے اندر اس قانونِ الٰہی کی بے پناہ گرفت کی نہایت واضح شہادت موجود ہے جس سے انسان کو 'اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا' کے الفاظ سے آگاہ فرمایا گیا ہے۔

'وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ'۔ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ 'وَمَا وَسَقَ' تو تمام کواکب و نجوم اور تمام ثوابت و سیارات پر مشتمل ہے لیکن قمر کو ان کے خاص فرد یا گلِ سرسبد کی حیثیت سے منتخب کر کے اس کے عروج و محاق اور کمال و زوال کو خاص طور پر نمایاں فرمایا اس لیے کہ 'یٰٓاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا' (۶) اور 'لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ' کی حقیقت کا مظاہرہ جس طرح اس کے کمال و زوال میں ہوتا ہے اس طرح کسی دوسری چیز میں نمایاں ہو کر سامنے نہیں آتا۔ چنانچہ قرآن نے دوسرے مقام میں اس کے اس پہلو کی طرف خاص طور پر اشارہ فرمایا بھی ہے: 'وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ کَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ' (یٰسٓ - ۳۶ : ۳۹) (اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں ٹھہرا رکھی ہیں، وہ ان کے طے کرنے میں ایسا ہو جاتا ہے جس طرح کھجور کی پرانی ٹہنی ہو)۔

'اِذَا اتَّسَقَ' کے معنی ہیں جب کہ وہ پورا ہو جاتا ہے۔ یہاں اشارہ اس کے پورے ہونے کی طرف فرمایا ہے کہ دیکھو کس طرح درجہ بدرجہ اس کو چڑھائی چڑھنی پڑتی ہے۔ مجال نہیں ہے کہ اس سے سرِمُو انحراف کر سکے اور اس نقطۂ کمال پر پہنچ کر اس کے اختیار میں یہ نہیں ہے کہ وہیں ٹھک جائے بلکہ اسی طرح منزل کے بعد منزل طے کرتے ہوئے اسے اترنا بھی پڑتا ہے اور اس سے بھی اس کو مفر نہیں ہے۔

'لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ' یہ ان قسموں کا مقسم علیہ ہے۔ فرمایا کہ جس طرح یہ چیزیں خدا کے قانون میں بندھی ہوئی سب اسی کی طرف رواں دواں ہیں اسی طرح انسان بھی ایک مرحلہ کے بعد دوسرا مرحلہ طے کرتا ہوا کشاں کشاں جاتا خدا ہی کی طرف ہے۔ نہ یہ ممکن ہے کہ اپنی جگہ ہی پر ٹکا رہ جائے اور نہ اس کا امکان ہے کہ کسی اور سمت میں نکل جائے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ کام اللہ تعالیٰ کی اسی سنت کے مطابق، جو اس پوری کائنات میں جاری ہے، درجہ بدرجہ اور مرحلہ بہ مرحلہ ہوگا اس وجہ سے نہ اس کو عجلت کرنی چاہیے اور نہ کسی حقیقت کی اس بنا پر تکذیب کرنی چاہیے کہ وہ اس کی طلب پر اس کو دکھائی نہیں گئی۔

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۲۰)

یہ ان لوگوں کی حالت پر اظہارِ تعجب ہے کہ اتنے واضح شواہد کے بعد بھی آخر ان کی کیا مت ماری ہوئی ہے کہ یہ آخرت اور جزاء و سزا پر ایمان نہیں لا رہے ہیں!

وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ (۲۱)

انسان کی ناسپاسی پر اظہارِ تعجب

یعنی حق تو یہ تھا کہ جب قرآن ان کو ایسی عظیم حقیقت سے آگاہ کر رہا ہے تو جب وہ ان کو سنایا جاتا تو وہ اس کی عظمت کے اعتراف اور اس کی بیان کردہ حقیقت کی تصدیق کے لیے بطورِ شکر اپنے رب کے آگے سجدہ میں گر پڑتے، لیکن ان کا رویہ اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ اکڑتے اور اس کی تکذیب کرتے ہیں۔

یہاں عرب اور اہلِ مصر کی یہ روایت پیشِ نظر ہے کہ جب وہ کسی کی بات کی عظمت اور صداقت کا سچے جوش و جذبہ کے ساتھ اعتراف کرنا چاہتے تو اس کو دیکھتے یا سنتے ہی بے تحاشا سجدے میں گر پڑتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لیے فرعون نے جن ساحروں کو اکٹھا کیا تھا انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت اور ان کے معجزات کی عظمت کا اعتراف اسی طرح کیا۔ مشہور شاعر لبید کے قصیدے کے ایک شعر پر بھی وقت کے مشہور شعرائے عرب نے سجدہ کیا جس کی بنا پر ان کا قصیدہ خانہ کعبہ میں آویزاں کیا گیا اور وہ وقت کے ملک الشعراء قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ قرآن اپنی بلاغت و صداقت میں ان چیزوں سے بدرجہا بلند ہے لیکن جو لوگ اس کی قدر و قیمت سے ناآشنا تھے وہ

سجدہ کرنے کے بجائے اکڑتے اور اس کا مذاق اڑاتے تھے۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ (۲۲)

یہ اس صورتِ حال کا بیان ہے جو عملاً تھی۔ یعنی سجدہ کرنا تو درکنار، جو قیامت کے منکر ہیں وہ قرآن کی تکذیب کر رہے ہیں کہ یہ محض پیش کرنے والے کا اپنا گھڑا ہوا کلام ہے جو قیامت کے ڈراوے سنا کر ہمیں مرعوب کرنا چاہتا ہے۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ (۲۳)

یعنی اس گہر کو پھینک کر جو پشیز اور خزف ریزے یہ لوگ جمع کرنے میں لگے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ اس کو اچھی طرح جانتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کے نقدِ عاجل نے ان کو قرآن کی تکذیب پر آمادہ کیا لیکن یہ جو کچھ جمع کر رہے ہیں اس کی اصل حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ اس کی حقیقت سے اللہ تعالیٰ ہی واقف ہے۔ جس دن ان کا اندوختہ اپنی اصل صورت میں ان کے سامنے آئے گا تب انھیں پتہ چلے گا کہ انھوں نے کس چیز کو پھینکا اور کس چیز کے انبار جمع کیے! 'بِمَا يُوْعُوْنَ' کے اجمال میں ان کی دولت بھی داخل ہے، ان کے اعمال بھی شامل ہیں اور ان کے وہ نتائجِ اعمال بھی جو لازماً ظہور میں آنے والے ہیں لیکن ان کا حقیقی علم اس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں ہوگا۔

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (۲۴-۲۵)

یعنی اگر یہ محبتِ دنیا میں پھنس کر، قرآن کی بتائی ہوئی راہ اختیار کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تو ان کو اس دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو جس کے تمام اسباب انھوں نے فراہم کر لیے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ نجات کی خوش خبری سننے پر آمادہ نہیں ہیں تو عذاب کی خوش خبری تو انھیں سنا ہی دو۔ اس عذاب سے صرف وہی محفوظ رہیں گے جو ایمان اور عملِ صالح کی وہ راہ اختیار کر لیں گے جس کی دعوت قرآن دے رہا ہے۔ ان لوگوں کے لیے بے شک ایک دائمی اجر ہوگا!

ان سطور پر بتوفیقِ ایزدی اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ السعی منی والاتمام من اللہ و بیدہ الفضل کلہ وھو علی کل شئ قدیر۔

رحمان آباد
۱۰۔ ستمبر ۱۹۷۹ء
۱۷۔ شوال ۱۳۹۹ھ

تدبرِ قرآن

۸۵

البروج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا زمانۂ نزول اور مضمون

یہ سورہ دعوت کے اس دور میں نازل ہوئی جب کفارِ قریش اول اول اسلام لانے والوں کو اس غصہ میں ہر قسم کے مظالم کا تختۂ مشق بنائے ہوئے تھے کہ انھوں نے آبائی دین چھوڑ کر یہ نیا دین کیوں اختیار کر لیا؟ ان کو اس میں آگاہ کیا گیا ہے کہ اگر وہ اس ظلم و ستم سے باز نہ آئے تو بہت جلد خدا کی ایسی سخت پکڑ میں آجائیں گے جس سے کبھی نہ چھوٹ سکیں گے۔ ساتھ ہی مظلوم مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ ان مظالم سے وہ ہراساں نہ ہوں بلکہ دینِ حق پر جمے رہیں۔ حالات بظاہر کتنے ہی نامساعد ہوں لیکن جس رب پر وہ ایمان لائے ہیں وہ ہر چیز پر قادر ہے، اس کے ارادوں میں کوئی بھی مزاحم نہیں ہو سکتا۔ آخر میں کفار کو یہ تنبیہ بھی فرما دی گئی ہے کہ اس قرآن کو، جو ان کو اس خطرے سے آگاہ کر رہا ہے، سحر و نجوم اور کہانت و شاعری کے قسم کی کوئی چیز نہ سمجھیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ کلام ہے اور اس کا منبع لوحِ محفوظ ہے۔ اس کی ہر بات پوری ہو کے رہے گی۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۴) برجوں والے آسمان اور روزِ قیامت کی قسم اس بات پر کہ قیامت شدنی ہے اور ان لوگوں کے لیے ابدی تباہی ہے جو جہنم کے گڑھوں میں پھینکے جائیں گے۔

(۵-۱۱) جو اہلِ ایمان اس بنا پر ستائے گئے کہ آسمان و زمین کے رب پر ایمان لائے ان کی دادرسی کا وعدہ اور جنت کی بشارت بشرطیکہ ان مظالم کے باوجود وہ اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے۔ ساتھ ہی ان ظالموں کو عذاب کی وعید جنھوں نے مسلمانوں کو ستایا اور اس جرم سے توبہ کی توفیق انھیں حاصل نہیں ہوئی۔

(۱۲-۱۶) ظالموں کے لیے خدا کی پکڑ کی بے پناہی اور اس جرم سے توبہ کرنے والوں کے لیے اس کی رحمت و مغفرت کی وسعت کا بیان، صفاتِ جلال و جمال کی روشنی میں۔

(۱۷-۱۸) ماضی کی بعض جبّار قوموں کی طرف اشارہ جو اہلِ ایمان پر اسی طرح کے مظالم کی مرتکب ہوئیں جس کے مرتکب قریش ہو رہے تھے اور جس کی پاداش میں وہ خدا کی پکڑ میں آ گئیں۔

(۱۹-۲۲) قریش کی بدبختی پر افسوس کہ وہ قرآن کے انذار کی تکذیب پر اڑے ہوئے اور نشۂ اقتدار میں مست ہیں۔ حالانکہ یہ انذار ایک حقیقت ہے جس سے مفر نہیں۔ وہ خدا کی گرفت سے باہر نہیں ہیں۔ اس نے ہر طرف سے ان کا احاطہ کر رکھا ہے۔ قرآن کوئی شاعری اور کہانت کے قسم کی چیز نہیں ہے، جیسا کہ انھوں نے گمان کر رکھا ہے، بلکہ یہ نہایت ہی اشرف و اعلیٰ کلام ہے جو خدا نے اتارا ہے اور اس کا سرچشمہ لوحِ محفوظ ہے۔

سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ

مَكِّيَّةٌ ______ آيات: ۲۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱ - ۲۲
وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ① وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ② وَشَاهِدٍ
وَّمَشْهُوْدٍ ③ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ④ النَّارِ ذَاتِ
الْوَقُوْدِ ⑤ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ⑥ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ
بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ⑦ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا
بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ⑧ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ⑨ اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا
الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ
وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ⑩ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ⑪ آیۃ حبیبۃ ۱۲
اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ⑫ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ⑬ وَهُوَ
الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ⑭ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ⑮ فَعَّالٌ لِّمَا
يُرِيْدُ ⑯ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ⑰ فِرْعَوْنَ وَ
ثَمُوْدَ ⑱ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ⑲ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ

۲۲ مُّحِيطٌ ۝٢٠ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝٢١ فِىْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝٢٢ ع
۱۰

ترجمۂ آیات ۱ - ۲۲

قسم ہے برجوں والے آسمان اور وعدہ کیے ہوئے دن کی اور دیکھنے والے اور دیکھی ہوئی کی۔ ہلاک ہوئے ایندھن بھری آگ کی گھاٹی والے جب کہ وہ اس پر بیٹھے ہوں گے اور جو کچھ وہ اہلِ ایمان سے کرتے رہے اس کو دیکھیں گے۔ ۱-۷

اور انھوں نے ان پر محض اس وجہ سے غصہ نکالا کہ وہ ایمان لائے اس خدائے عزیز و حمید پر جس کی ہی بادشاہی ہے آسمانوں اور زمین میں اور اللہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔ ۸-۹

جن لوگوں نے مومن مردوں اور مومنہ عورتوں کو ستایا، پھر توبہ نہ کی، ان کے لیے لازماً جہنم کی سزا اور جلنے کا عذاب ہے۔ البتہ جو پختہ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے باغ ہوں گے جن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ بڑی کامیابی دراصل یہ ہے! ۱۰-۱۱

بے شک تیرے رب کی پکڑ بڑی ہی سخت ہے۔ وہی آغاز کرتا ہے اور وہی لوٹائے گا۔ اور وہ بخشنے والا پیار کرنے والا ہے۔ عرش بریں کا مالک۔ جو چاہے کر ڈالنے والا۔ ۱۲-۱۶

تجھے لشکروں کی خبر پہنچی ہے؟ فرعون اور ثمود کے لشکروں کی؟ لیکن یہ کفار جھٹلانے ہی میں لگے رہیں گے۔ اور خدا ان کو ان کے آگے پیچھے سے گھیرے ہوئے ہے۔ (یہ جھٹلانے کی چیز نہیں) بلکہ یہ بڑے مرتبہ کا کلام ہے۔ یہ لوحِ محفوظ کے اندر ہے۔ ۱۷-۲۲

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ (۱)

لفظ بروج کی تحقیق

لفظ 'بروج' قلعوں اور گڑھیوں کے لیے آتا ہے۔ عربی زبان اور قرآن دونوں میں یہ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ آسمان کی صفت کے طور پر یہ جہاں آیا ہے اس سے مراد آسمان کے وہ قلعے اور دیدبان ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے فرشتے برابر مامور رہتے ہیں کہ وہ خدا کی ملکوت میں شیاطین کو ایک خاص حد سے آگے یعنی ملاءِ اعلیٰ کے حدود میں داخل نہ ہونے دیں۔ اگر اس حد سے وہ آگے بڑھنے کی جسارت کرتے ہیں تو جیسا کہ آپ مختلف سورتوں میں پڑھ چکے ہیں، ان پر شہاب ثاقب کی مار پڑتی ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی جن یا انسان ملاءِ اعلیٰ کے حدود میں داخل یا غیب کے اسرار کی کچھ سن گن لے سکے۔

قسم کی نوعیت

قسم یہاں، جیسا کہ جگہ جگہ وضاحت ہو چکی ہے، بطورِ شہادت یا اس دعوے پر بطور دلیل کھائی گئی ہے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ اس سورہ میں مخاطب، جیسا کہ ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں، مکہ اور طائف کے وہ فراعنہ ہیں جو نشۂ اقتدار میں کمزور مسلمانوں کو مظالم کا ہدف بنائے ہوئے تھے اور اپنے قلعوں اور ایوانوں پر ان کو اتنا ناز تھا کہ ان کو کبھی خیال بھی نہ ہوتا تھا کہ جس خدائے علیم و قدیر پر ایمان لانے کے انتقام میں وہ اس کے کمزور بندوں پر ستم ڈھا رہے ہیں وہ کوئی کمزور ہستی نہیں ہے بلکہ وہی برجوں والے آسمان کا خالق و مالک ہے۔ وہ اپنی پیدا کی ہوئی اس دنیا سے غافل نہیں ہے بلکہ آسمانی قلعوں اور دیدبانوں سے اس کے کارندے ہر گوشہ کی نگرانی کر رہے ہیں۔ وہ جب چاہے آسمانی برجوں سے اپنی افواجِ قاہرہ بھیج کر یا زمین ہی سے کوئی آفتِ ارضی ابھار کر سارے قلعوں، گڑھیوں، ایوانوں کو مسمار اور ان پر ناز کرنے والوں کے غرور کو پامال کر کے رکھ دے۔

وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ (۲)

قیامت کی قسم خود قیامت پر

یہ اس روزِ قیامت کی قسم ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کر رکھا ہے۔ جس طرح سورۂ قیامہ میں اس کی قسم کھائی ہے اسی طرح یہاں بھی قسم کھائی ہے۔ قیامت کی قسم خود قیامت ہی سے ڈرانے کے لیے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے جس سے کسی ذی ہوش کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے کہ اس کی شہادت خود انسان کے نفس ہی کے اندر موجود ہے، اس کو ثابت کرنے کے لیے کسی خارجی شہادت کی ضرورت نہیں ہے۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَۃٌ ۙ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ (القیمۃ - ۷۵ : ۱۴ - ۱۵) (بلکہ انسان خود اپنے اوپر حجت ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذرات تراشے)۔

وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ (۳)

قیامت کے ان تمام شواہد کی طرف اشارہ جو آفاق ہی موجود ہیں

نکرہ یہاں تعمیم کے لیے ہے جس سے قیامت اور جزاء و سزا کے ان تمام دلائل و شواہد کی طرف اشارہ ہو گیا ہے جو آفاق کے ہر گوشے میں موجود ہیں بشرطیکہ انسان آنکھیں اور عبرت پذیر دل رکھتا ہو۔ مثلاً

—— اس کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز خالق کی قدرت، حکمت، رحمت، ربوبیت اور دوسری اعلیٰ صفات کی گواہی دیتی ہے۔ ان صفات کا بدیہی تقاضا، جیسا کہ قرآن نے وضاحت فرمائی ہے، یہ ہے کہ یہ دنیا نہ یوں ہی چلتی رہے اور نہ یوں ہی ایک حادثہ کے طور پر تمام ہو جائے بلکہ واجب ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں اللہ تعالیٰ اس کے نیکوں اور بدوں میں امتیاز کرے۔ جنھوں نے اس کے منشاء کے مطابق زندگی گزاری ہو وہ انعام پائیں اور جنھوں نے شترِ بے مہار کی زندگی گزاری ہو وہ اس کی سزا بھگتیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کائنات کے خالق کے نزدیک خیر اور شر، نیک اور بد میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔

—— قرآن نے جا بجا رسولوں اور ان کی قوموں کی کشمکش اور اس کشمکش کے نتیجہ کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں اور یہ دکھایا ہے کہ اس نے کس طرح ان لوگوں کو پامال کیا جنھوں نے اس کے رسولوں کی تکذیب کی اگرچہ وہ بڑی قوت و شوکت رکھنے والی قومیں تھیں۔ پھر ان کے آثار سے لوگوں کو سبق حاصل کرنے کی دعوت دی اور فرمایا ہے کہ ہم نے یہ آثار زمین میں محفوظ کیے ہی اس لیے ہیں کہ لوگ ان کو دیکھیں اور ان سے عبرت پکڑیں کہ اللہ نے جو کچھ ان کے ساتھ کیا ہے وہی ان کے ساتھ بھی کرے گا اگر انھوں نے بھی انہی کی روش اختیار کی اور انہی کی طرح اکڑ دکھائی۔

اس استدلالی پہلو کے ساتھ ساتھ 'شاھد' اور 'مشھود' کے الفاظ کے اندر ایک تخویف کا پہلو بھی ہے جو قیامت کے دن لوگوں کے سامنے آئے گا۔ وہ یہ کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ جو کچھ وہ دنیا میں کر رہا ہے ان میں سے کوئی چیز خدا سے مخفی ہے بلکہ وہ جو کچھ کرے گا ایک ایک ایک کر کے وہ اس کے سامنے آئے گا اور ہر چیز وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ اس کے اعضاء و جوارح خود اس کے ہر قول و فعل کی گواہی دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے 'کراماً کاتبین' اس کے جملہ نیک و بد اعمال و اقوال کی رپورٹ پیش کریں گے، حضرات انبیاء علیہم السلام اور صالحین و مصلحین بھی گواہی دیں گے کہ انھوں نے کیا بتایا اور سکھایا اور لوگوں نے ان کے اور ان کی تعلیمات کے ساتھ کیا سلوک کیا۔

قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ۙ النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ (۴-۵)

منکرینِ قیامت کو تنبیہ

یہ مذکورہ قسموں کا جواب نہیں ہے بلکہ سورۂ قٓ اور بعض دوسری سورتوں میں جس طرح جوابِ قسم حذف ہو گیا ہے اسی طرح یہاں بھی جوابِ قسم حذف کر کے اس کی جگہ منکرینِ قیامت کے لیے تذکیر و تنبیہ کی آیتیں رکھ دی گئی ہیں۔ یہ طریقہ ان مواقع میں اختیار کیا جاتا ہے جہاں جوابِ قسم اس قدر واضح ہو کہ ذکر کے بغیر بھی ذہن اس کی طرف بے تکلف منتقل ہو سکے۔ اس سے کلام میں ایجاز بھی پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ساری بات جوابِ قسم کی حیثیت سے محذوف بھی مانی جا سکتی ہے جس کے لیے کلام کا سیاق و سباق مقتضی ہو۔ یہاں مذکورہ قسموں کی روشنی میں مقسم علیہ کو کھولیے تو یہ ہو گا کہ قیامت شدنی ہے، اللہ تعالیٰ کے احاطۂ قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے، اس دن ہر شخص اپنے کیے کا انجام دیکھے گا۔

'اُخۡدُوۡد' کے معنی کھڈ، کھائی اور گڑھے کے ہیں۔ اس کی وضاحت 'النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ' سے فرما دی گئی ہے۔ یعنی یہ گڑھے ایندھن والی آگ سے بھرے ہوں گے۔ ایندھن والی آگ کی صفت سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اس آگ کے برابر بھڑکتے رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے وافر ایندھن فراہم کر رکھا ہے، کوئی یہ توقع نہ رکھے کہ ایندھن کی کمی کے سبب سے کبھی یہ دھیمی پڑ جائے گی۔ اس ایندھن کی نوعیت سورۂ بقرہ آیت ۲۴ میں یوں واضح فرمائی گئی ہے: 'فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ' (پس اس آگ سے بچو جس کے ایندھن لوگ بنیں گے اور پتھر)۔

اصحٰب الاخدود

'اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ' کے تحت مفسرین نے ایک بادشاہ کا قصہ نقل کیا ہے لیکن اس کا کوئی نام یا زمانہ نہیں بتایا ہے۔ بس اتنا ہی بتاتے ہیں کہ اس نے اپنے دور کے بہت سے باایمان نصاریٰ کو محض اس جرم میں آگ کے گڑھوں میں پھنکوا دیا کہ انھوں نے اس کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ اہلِ کتاب کی عقائدی چپقلش کے دور میں ایک دوسرے کو جلانے کے بعض واقعات تاریخوں میں مذکور ہیں لیکن خاص اس واقعہ سے متعلق مفسرین نے جو عجیب و غریب باتیں نقل کی ہیں وہ کسی طرح بھی قابلِ اعتبار نہیں ہیں، اس وجہ سے ہم ان سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ یہاں مخاطب، جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں، قریش کے فراعنہ ہیں جو کمزور مسلمانوں کو ظلم و ستم کا ہدف بنائے ہوئے تھے۔ وہ ایک ایسے مجہول بادشاہ کے انجام سے کیا سبق حاصل کرتے جس کا نام تک نہ ان کو معلوم تھا نہ مفسرین کے علم میں ہے۔ علاوہ ازیں یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ کے لیے یہاں جو زجر اور وعید ہے وہ آخرت سے متعلق ہے نہ کہ اس دنیا سے متعلق۔ اگر اس کو اس دنیا سے متعلق مانیے تو اس سے ان کے ظلم کی ایک ہلکی سی تصویر تو ضرور سامنے آتی ہے لیکن ان کا کوئی ایسا عبرت انگیز انجام قرآن نے نہیں بتایا ہے جو قریش کے لیے سبق آموز ہو سکتا۔ یہ بات کہ ان کی بھڑکائی ہوئی آگ نے خود ان کو اور ان کی بستیوں کو جلا کر راکھ بنا دیا صرف مفسرین

نے بیان کی ہے۔ قرآن نے کوئی اشارہ اس کی طرف نہیں کیا حالانکہ پیشِ نظر مقصد کے لیے اصل ظاہر کرنے کی بات یہی تھی۔

ہمارے نزدیک یہ قریش کے ان فراعنہ کو، جو مسلمانوں کو ایمان سے پھیرنے کے لیے طرح طرح کی اذیتوں کا تختۂ مشق بنائے ہوئے تھے، جہنم کی وعید ہے۔ ان کو خبردار کیا گیا ہے کہ اگر وہ اس شقاوت سے باز نہ آئے تو وہ جہنم کی اس خندق میں پھینکے جائیں گے جو کبھی نہ بجھنے والی آگ سے بھری ہوگی۔

إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُودٌ ۝ وَهُمْ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ (۶-۷)

اشقیاء کے انجام کی تصویر

یہ تصویر ہے ان اشقیاء کے انجام کی۔ فرمایا کہ یہ اس وقت کو یاد رکھیں جب وہ اس خندق کے کنارے بیٹھیں گے اور جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ کر رہے ہیں اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے ان کو اس آگ بھری خندق کے کنارے پر بٹھایا جائے گا تاکہ وہ اپنا ٹھکانا دیکھ لیں اور پھر وہ اپنی ایک ایک ظالمانہ حرکت کا مزہ چکھیں گے۔ گویا لفظ 'شھود' یہاں نتیجۂ فعل کے مفہوم میں ہے، جس کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مجرم کو اس کا اصل ٹھکانا اگر پہلے سے دکھا دیا جائے اور پھر اس کو اس کا مزہ چکھایا جائے تو اس کا عذاب دونا ہو جاتا ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ اس بات کا اشارہ موجود ہے کہ مجرموں کو پہلے جہنم کے کناروں پر بٹھایا جائے گا تاکہ وہ دیکھ لیں کہ ان کو کہاں جانا ہے اور پھر ان کو اس میں پھینک دینے کا حکم دیا جائے گا۔ فرعون اور آلِ فرعون کے متعلق بھی قرآن میں یہ ذکر ہے کہ عالمِ برزخ سے ان کو صبح و شام دوزخ کی سیر کرائی جاتی ہے۔

ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ حرف 'اِذْ' گزرے ہوئے زمانہ کے کسی واقعہ کی یاددہانی کے لیے آتا ہے اور ہم نے مستقبل میں پیش آنے والی صورتِ حال کے بیان کے مفہوم میں لیا ہے' لیکن اس شبہ کا ازالہ یوں ہو جاتا ہے کہ قرآن میں احوالِ قیامت کی تفصیل جابجا ماضی کے صیغوں سے کی گئی ہے جس کی توجیہ علماء نے یہ کی ہے کہ مستقبل کی تعبیر ماضی کے اسلوب میں اس کی قطعیت کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔

وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ (۸)

ایمان والوں کی سب سے بڑی نیکی کافروں کے نزدیک سب سے بڑا گناہ ہے

یعنی مسلمانوں پر یہ غیظ و غضب اس وجہ سے نہیں ہے کہ ان سے کوئی قصور صادر ہوا ہے، بلکہ ان کی سب سے بڑی نیکی ان اشقیاء کے نزدیک ان کا سب سے بڑا جرم ہے جس کے سبب سے وہ سزاوارِ تعذیب قرار پائے ہیں۔ ان کو سزا اس گناہ کی دی جا رہی ہے کہ یہ خدائے عزیز و حمید پر ایمان لائے۔ حالانکہ خدائے عزیز و حمید پر ایمان لا کر اللہ کے ان بندوں نے وہ سب سے بڑا حق ادا کیا ہے جو ان کے خالق و مالک کی طرف سے ان پر عائد ہوتا ہے۔ ان کا یہ اقدام لائقِ اعتراف

اکرام اور قابلِ تقلید تھا نہ کہ سزاوارِ عناد و انتقام لیکن جن کی مت ماری جاتی ہے وہ اپنے خیر خواہوں کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں۔

صفاتِ عزیز و حمید کے تقاضے

یہاں اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے دو صفتوں ــــــ عزیز اور حمید ــــــ کا حوالہ ہے۔ صفت 'عزیز' اس کی عزت، قدرت، شان اور عظمت و جلال کو ظاہر کرتی ہے اور 'حمید' سے اس کی رحمت، ربوبیت اور سزاوارِ حمد و شکر ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کے حوالہ سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ جو ذات ان صفات سے متصف ہے وہی حق دار ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے۔ جو اس پر ایمان لائے انھوں نے اس کا سہارا لیا ہے جس کا سہارا ہی اصل سہارا ہے اور وہی فلاح پانے والے ہوں گے۔ اس میں ضمناً مظلوم مسلمانوں کے لیے جو بشارت اور ان کے درپئے آزار کفار کے لیے جو وعید مضمر ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔

اَلَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ (۹)

یہ مذکورہ بالا بشارت اور وعید دونوں پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جس کی بادشاہی ہے وہی حقدار ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور جو اس پر ایمان لائے ان کے لیے اسی کی پناہ کافی ہے۔

'وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ'۔ یعنی جو مسلمان اعدائے ایمان کے ہاتھوں دکھ اٹھا رہے ہیں وہ اطمینان رکھیں کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک ان کے مصائب سے بے خبر نہیں ہے بلکہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ تو جب وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے تو اپنی بادشاہی میں اپنے باایمان بندوں پر اعدا کے ظلم و ستم کو کب تک گوارا کرے گا! ساتھ کفار کے لیے اس میں وعید ہے کہ خدا کی ڈھیل سے مغرور نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کی ستم رانیوں سے بے خبر نہیں ہے۔ وہ سارا تماشا دیکھ رہا ہے۔ وہ وقت دور نہیں ہے جب وہ اپنے مظلوم بندوں کا انتقام لے گا اور بھرپور انتقام لے گا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَتُوْبُوْا فَلَہُمْ عَذَابُ جَہَنَّمَ وَلَہُمْ عَذَابُ الْحَرِیْقِ (۱۰)

مسلمانوں کو ستانے والوں کو واضح الفاظ میں وعید

اوپر جو وعید اشارات کے پردے میں سنائی گئی ہے اس آیت میں وہ بالکل بے نقاب کر دی گئی ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ ایمان لانے والے مردوں اور ایمان لانے والی عورتوں کو دین سے پھیرنے کے لیے نشانۂ ستم بنائیں گے اور پھر توبہ نہیں کریں گے وہ یاد رکھیں کہ ان کے لیے جہنم کا عذاب، خاص کر آگ کا عذاب ہے۔

لفظ فتنہ یہاں خاص کر اس ظلم و ستم کے لیے آیا ہے جو کسی پر اس کے دین سے اس کو پھیرنے کے لیے کیا جائے۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن میں بار بار آیا ہے جس کی وضاحت ہو چکی ہے۔

'مُؤْمِنِیْنَ' کے پہلو بہ پہلو 'مُؤْمِنٰتِ' کا ذکر یہاں خاص اہتمام سے اس لیے ہوا ہے کہ جس دورِ ابتلاء سے یہ آیات متعلق ہیں اس میں سب سے زیادہ ظلم کمزور عنصر ہونے کے سبب سے عورتوں، بالخصوص لونڈیوں پر ڈھائے گئے۔ ان ظلم ڈھانے والوں کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ سلامتی مطلوب ہے تو جلد سے جلد توبہ اور اصلاح کر لیں ورنہ یاد رکھیں کہ اسی حال میں اگر ان کا خاتمہ ہوا تو سیدھے جہنم میں اتریں گے۔

'عَذَابُ جَهَنَّمَ' کے ذکر کے بعد بظاہر 'عَذَابُ الْحَرِيقِ' کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی لیکن یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ 'جہنّم' عذاب کی جملہ اقسام و انواع کا مرکز ہے جس میں سب سے بڑا عذاب جلنے کا عذاب ہے۔ گویا ان لوگوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ جہنم کے دوسرے عذابوں کے ساتھ ساتھ ان کو جلنے کے عذاب کا بھی مزا چکھنا پڑے گا۔ اس انجام کو اچھی طرح سوچ رکھیں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ (۱۱)

ثابت قدم رہنے والوں کو بشارت

یہ ان اہلِ ایمان کی حوصلہ افزائی ہے جو ان پُرمحن حالات کے باوجود اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے۔ فعل 'اٰمَنُوْا' قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اپنے حقیقی اور کامل معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ظالموں کے ان مظالم کے علی الرغم جو اہلِ ایمان اپنے ایمان پر جمے اور عمل صالح کی روش پر قائم و دائم رہیں گے ان کے لیے بے شک ایسے باغ ہوں گے جن میں نہریں بہ رہی ہوں گی۔

'ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ' یعنی کوئی اس کامیابی کو معمولی کامیابی نہ سمجھے۔ یہ دائمی اور ابدی کامیابی ہے، جس کو حاصل ہو گی وہی جانے گا کہ اس نے چند دنوں کی آزمائشوں کے صلے میں کیسی عظیم بادشاہی حاصل کی۔

إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ۝ إِنَّهُ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيدُ ۝ وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ ۝ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ۝ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ (۱۲-۱۶)

مذکورہ باتوں کی تائید میں صفاتِ الٰہی کا حوالہ

اوپر کی آیات میں اہلِ ایمان کے ستانے والے کفار کو جو دھمکیاں اور مظلوم مسلمانوں کو جو بشارتیں دی گئی ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی مزید صفات کی یاددہانی سے ان کو مزید مؤکد و مدلّل کر دیا ہے۔

'إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ' فرمایا کہ تیرے رب کی پکڑ بڑی ہی سخت ہے۔ کوئی اس مغالطہ میں نہ رہے کہ وہ اپنی جماعت و جمعیت یا اپنے شرکاء و شفعاء کے بل پر اس سے اپنے کو بچا لے گا۔ اللہ کی پکڑ سے نہ کوئی بچ سکتا نہ اس کو کوئی بچانے والا بن سکتا۔

'رَبِّكَ' کا خطاب اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مانا جائے تو یہ خطاب آپ سے ان مظلوموں کے وکیل کی حیثیت سے ہو گا۔

اِنَّہٗ ھُوَ یُبۡدِئُ وَ یُعِیۡدُ ۔ ظالموں کو اوپر جس عذابِ جہنم کی دھمکی دی گئی ہے یہ اس کی دلیل بیان کر دی گئی ہے کہ کوئی اس مغالطہ میں بھی نہ رہے کہ آخرت اور جزاء و سزا کا ڈراوا محض ڈراوا ہے، مرنے کے بعد نہ کوئی زندگی ہے نہ کوئی موت ۔ فرمایا کہ خدا ہی ہے جو لوگوں کو اس دنیا میں پیدا کرتا ہے اور جب وہ پیدا کرتا ہے تو وہ از سرِ نو ان کا اعادہ بھی کر سکتا ہے ۔ جب پہلی بار اس کو پیدا کرنے میں کوئی مشکل نہیں پیش آئی تو دوبارہ یہ کام اس کے لیے کیوں مشکل ہو جائے گا؟

وَھُوَ الۡغَفُوۡرُ الۡوَدُوۡدُ ۙ ذُو الۡعَرۡشِ الۡمَجِیۡدُ ۙ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ ۔ یعنی بخشنے والا اور محبت کرنے والا تنہا وہی ہے جس کو لو لگانی ہو تنہا اسی سے لگائے ۔ کوئی اور نہیں ہے جو کسی کے کچھ کام آ سکے ۔ عرش کا مالک اور عظمت والا وہی ہے ۔ کوئی اس کے اقتدار اور اس کی عظمت میں شریک نہیں ہے ۔ وہ جو چاہے کر ڈالنے والا ہے ۔ نہ وہ کسی کا محتاج ہے نہ کوئی اس کے کسی ارادے میں مزاحم ہو سکتا ۔

هَلۡ اَتٰىكَ حَدِیۡثُ الۡجُنُوۡدِ ۙ فِرۡعَوۡنَ وَ ثَمُوۡدَ (۱۷ - ۱۸)

تاریخ سے بعض مثالوں کا حوالہ

انہی حقائق کو ثابت کرنے کے لیے جو اوپر مذکور ہوئے یہ تاریخ کی بعض مثالوں کی طرف اشارہ فرما دیا ۔ خدا کی پکڑ میں آنے والی جن قوموں کی سرگزشت قرآن نے سنائی ہے ان میں قومِ ثمود اور فرعون کے جبر و ظلم اور طغیان و فساد کا ذکر خاص اہتمام سے فرمایا ہے ۔ قریش کے لیڈروں پر ان دونوں قوموں کی عظمت و شوکت کی بڑی دھاک تھی ۔ ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ دیکھ لو، جب خدا نے ان کو پکڑا تو چشم زدن میں وہ صفحۂ ہستی سے مٹ گئے اور کوئی ان کو بچانے والا نہ بن سکا!

بَلِ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا فِیۡ تَكۡذِیۡبٍ (۱۹)

انکار کا اصل سبب ضد ہے

اس 'بَلۡ' سے پہلے کلام کا کچھ حصہ بربنائے قرینہ محذوف ہے ۔ اس کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہو گی کہ جو کچھ ان کو سنایا جا رہا ہے، ہے تو یہ حرف حرف حق ۔ کسی کے لیے بھی اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے لیکن یہ قیامت کے منکرین جان بوجھ کر جھٹلانے کے درپے ہیں اور اب ایسی پخ آ پڑی ہے کہ کسی طرح اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں ۔

وَّ اللّٰہُ مِنۡ وَّرَآئِہِمۡ مُّحِیۡطٌ (۲۰)

لفظ 'وَرَآءَ' آگے اور پیچھے دونوں معنوں میں آتا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جھٹلانے ہی پر بضد ہیں تو اپنی ضد پر اڑے رہیں لیکن یاد رکھیں کہ ان کی تکذیب سے حقیقت جھوٹ نہیں ہو جائے گی ۔ اللہ ان کے آگے پیچھے ہر طرف سے احاطہ کیے ہوئے ہے ۔ وہ اس سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے ۔

بَلۡ ھُوَ قُرۡاٰنٌ مَّجِیۡدٌ ۙ فِیۡ لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظٍ (۲۱ - ۲۲)

اس 'بَلْ' سے پہلے بھی بربنائے وضاحتِ قرینہ کچھ محذوف ہے۔ اس کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ یہ قرآن جس انجام سے تمھیں ڈرا رہا ہے یہ ایک حقیقت ہے۔ یہ ایک بزرگ و برتر کلام ہے۔ یہ شاعروں اور کاہنوں کے کلام کی طرح کی کوئی ہوائی چیز نہیں ہے بلکہ یہ خدا کی نازل کردہ وحی ہے اور اس کا منبع لوحِ محفوظ ہے جس تک کسی جن و انس کی رسائی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہٖ۔

لاہور

۱۱۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء

۱۸۔ ذوالقعدہ ۱۳۹۹ھ

تدبّرِ قرآن

٨٦

الطارق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ کی توام ہے۔ دونوں کا عمود بالکل ایک ہے۔ صرف اسلوبِ بیان اور منہجِ استدلال الگ الگ ہیں۔ تمہید اور خاتمہ کے پہلو سے بھی دیکھیے تو دونوں میں حیرت انگیز مشابہت پائی جاتی ہے۔ آفاق و انفس کے شواہد اور خالقِ کائنات کی صفات کی روشنی میں یہ حقیقت ان میں مبرہن فرمائی گئی ہے کہ قرآن جس روزِ جزاء و سزا سے ڈرا رہا ہے اس کو ہنسی مسخری نہ سمجھو۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس کے ظہور میں جو دیر ہو رہی ہے تو اس کو تکذیب کا بہانہ نہ بناؤ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمھارے لیے ڈھیل ہے کہ اس کی حجت تمام ہو جائے اور تم اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لو۔ خدا کی تدبیر نہایت محکم ہوتی ہے اس وجہ سے وہ سرکشوں کو پکڑنے میں عجلت نہیں کرتا۔ لیکن جب پکڑتا ہے تو کوئی اس کے پنجۂ عذاب سے چھوٹ نہیں سکتا۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۴) آسمان اور اس کے ستاروں کی شہادت اس بات پر کہ خدا کی نگاہوں سے کوئی چیز بھی اوجھل نہیں۔ اس نے ہر جان پر پہرے بٹھا رکھے ہیں۔ جن ہوں یا انسان سب کی نگرانی ہو رہی ہے۔ وہ جس کو جب چاہے پکڑ سکتا اور سزا دے سکتا ہے کوئی اس کے قابو سے باہر نہیں ہے۔

(۵-۸) منکرینِ قیامت کو اس حقیقت پر غور کرنے کی دعوت کہ انسان کی خلقت کسی ایسے نایاب جوہر سے نہیں ہوئی ہے جو خدا کی دسترس سے باہر ہو بلکہ وہ پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوتا ہے جو اسی کے اندر سے نکلتی ہے۔ جب اسی کے اندر سے ٹپکی ہوئی ایک بوند کو اللہ تعالیٰ اپنی صنعت گری سے انسان بنا دینے پر قادر ہے تو اس کو دوبارہ پیدا کرنے اور اٹھا کھڑے کرنے سے کیوں عاجز رہ جائے گا!

(۹-۱۰) اس حقیقت کا اظہار کہ خدا ہر ایک کے ہر قول و فعل بلکہ دلوں کے بھیدوں اور پس پردہ

رازوں سے بھی اچھی طرح باخبر ہے۔ ایک دن سارے راز پرکھے اور جانچے جائیں گے۔ اس دن کسی کے پاس نہ اس کی اپنی کوئی قوت وجمعیت ہوگی جو اس کے کام آسکے اور نہ کسی کی سعی وسفارش اس کو کچھ نفع پہنچانے والی بنے گی۔

(۱۱-۱۴) ایک عام آفاقی شہادت کا حوالہ اس امر کے حق میں کہ قرآن جس قیامت سے ڈرا رہا ہے وہ کوئی ہنسی مسخری کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے جو پیش آکے رہے گی۔ لوگوں کو چاہیے کہ اس کے لیے تیاری کریں نہ کہ اس کا مذاق اڑائیں۔

(۱۵-۱۷) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ مخاطبین تمھاری تکذیب کے لیے جو جو چالیں چل رہے ہیں اس سے مایوس نہ ہو بلکہ ان کو ابھی کچھ دن مہلت دو۔ تمھارے رب نے ان کے لیے استدراج کا جو دام بچھایا ہے یہ اس میں پھنس چکے ہیں۔ ان کا انجام اب ان کے سامنے آیا ہی چاہتا ہے۔

سُوْرَةُ الطَّارِقِ

مَكِّيَّةٌ ـــــــــــ آيات : ۱۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۱۷
وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۙ﴿۱﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۙ﴿۲﴾ النَّجْمُ
الثَّاقِبُ ۙ﴿۳﴾ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ؕ﴿۴﴾ فَلْيَنْظُرِ
الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ؕ﴿۵﴾ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۙ﴿۶﴾ يَّخْرُجُ مِنْ
بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ؕ﴿۷﴾ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ؕ﴿۸﴾ يَوْمَ
تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۙ﴿۹﴾ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ؕ﴿۱۰﴾ وَالسَّمَآءِ
ذَاتِ الرَّجْعِ ۙ﴿۱۱﴾ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۙ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ
فَصْلٌ ۙ﴿۱۳﴾ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ؕ﴿۱۴﴾ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۙ﴿۱۵﴾ وَّ
اَكِيْدُ كَيْدًا ۚ﴿۱۶﴾ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ﴿۱۷﴾ ع ۱۷/۱

ترجمۂ آیات ۱-۱۷
شاہد ہیں آسمان اور رات میں نمودار ہونے والے اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہیں
رات میں نمودار ہونے والے! دمکتے تارے! کہ کوئی جان نہیں کہ اس پر نگہبان
نہیں۔ ۱-۴

انسان غور کرے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے! وہ پیدا کیا گیا ہے
ذرا سے اچھلتے پانی سے جو نکلتا ہے ریڑھ اور پسلیوں کے بیچ سے۔ بے شک

وہ اس کے لوٹا سکنے پر پوری طرح قادر ہے - ۵-۸

اس دن ساری چھپی باتیں پرکھی جائیں گی تو اس وقت اس کے پاس کچھ زور نہ ہوگا اور نہ کوئی مددگار - ۹-۱۰

شاہد ہے آسمان، پُر از باراں اور زمین، پُر شگاف کہ یہ دو ٹوک بات ہے اور یہ کوئی ہنسی مسخری نہیں - ۱۱-۱۴

وہ چال رہے ہیں ایک چال اور میں بھی کر رہا ہوں ایک داؤ۔ تو ان کافروں کو مہلت دے، ان کو چھوڑ ذرا دیر کو - ۱۵-۱۶

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۙ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۙ النَّجْمُ الثَّاقِبُ (۱-۳)

آسمان اور ستاروں کی قسم

جس طرح سابق سورہ میں برجوں والے آسمان کی قسم کھائی ہے اسی طرح اس سورہ میں آسمان اور اس کے دمکتے ستاروں کی قسم کھائی ہے اور یہ قسم، جیسا کہ وضاحت ہو چکی ہے، بطور شہادت اس دعوے پر دلیل پیش کرنے کے لیے کھائی ہے جو آگے آ رہا ہے۔

'طَارِق' کے لغوی معنی تو شب میں آنے والے کے ہیں لیکن یہاں اس سے مراد شب میں نمودار ہونے والے ستارے ہیں۔ اس کی وضاحت خود قرآن ہی نے 'اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ' کے الفاظ سے کر دی ہے۔

'وَمَآ اَدْرٰىكَ' کا سوال اس شہادت کی عظمت و اہمیت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی اس شہادت کو معمولی شہادت نہ گمان کرے۔ یہ بہت بڑی شہادت ہے بشرطیکہ غور کرنے والے اس پر غور کریں اور سمجھیں، اس کو مذاق بنانے کی کوشش نہ کریں۔

'اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ' سے کوئی خاص ستارہ مراد نہیں ہے بلکہ جس طرح 'وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ' (النحل - ۱۶: ۱۶) اور بعض دوسری آیات میں یہ لفظ جنس کے مفہوم میں آیا ہے اسی طرح یہاں بھی یہ جنس ہی کے مفہوم میں ہے۔ البتہ 'ثَاقِبٌ' کی صفت سے یہ اشارہ فرما دیا ہے کہ اس سے مراد وہی ستارے ہیں جن کی روشنی از خود ہم تک پہنچتی ہے اور جن کی جستجو کے لیے ہمیں ترقی یافتہ دوربینوں کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ ہر دیکھنے والا ان کو دیکھ اور ان سے وہ سبق حاصل کر سکتا ہے جو قرآن یہاں دینا چاہتا ہے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ ستارے صرف اتنے ہی نہیں ہیں جتنے ہمیں نظر آتے ہیں۔ یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کون جان سکتا ہے کہ کتنے جہان اور کتنے ستارے ہیں!

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (۴)

ستاروں کی شہادت اس دعوے پر کہ ہر جان پر خدا کے نگران ہیں

یہ مقسم علیہ یا اصل دعویٰ ہے جس کو ثابت کرنے کے لیے مذکورہ بالا قسم کھائی گئی ہے۔ 'لَمَّا' کا استعمال یہاں ذرا نادر ہے اس وجہ سے اس کی توجیہ میں اہل نحو نے اختلاف کیا ہے۔ ہم اس کی تحقیق سورۂ ہود آیت ۱۱۱ اور سورۂ زخرف آیت ۳۵ کے تحت بیان کر چکے ہیں۔

ستاروں کی شہادت اس دعوے پر کہ اللہ تعالیٰ نے ہر جان پر نگران مقرر کر رکھے ہیں ایک تو اس پہلو سے ہے کہ انسان سوچے کہ جس خدا کی مقرر کی ہوئی اتنی ان گنت آنکھیں رات بھر جاگتی اور

ٹکٹکی لگائے زمین والوں کو گھورتی رہتی ہیں کس کی مجال ہے کہ اس کے دام سے بچ کے نکل سکے سائنس کی ایجاد کردہ بڑی سے بڑی دوربینوں کے اندر بھی وہ طاقت نہیں ہے جو آسمان کے معمولی سے معمولی ستاروں کے اندر ہے جن کی روشنی تہ بہ تہ فضاؤں کو چیرتی ہوئی زمین تک پہنچ جاتی ہے۔ جو خدا اپنی قدرت کی یہ شان ہر شب میں ہمیں دکھا رہا ہے اس کے متعلق یہ تصور کہ اس کی نگاہوں سے کوئی چیز بھی اوجھل رہ سکتی ہے صرف اس شخص کے اندر پیدا ہو سکتا ہے جو عقل سے بالکل عاری ہو۔

دوسرا پہلو اس کا وہی ہے جس کی طرف ہم سابق سورہ میں بھی اشارہ کر چکے ہیں اور جو قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی بیان ہوا ہے کہ انہی ستاروں کے اندر خدا نے ایسے برج بنائے ہیں جہاں سے ان شیاطین پر شہابِ ثاقب کی مار پڑتی ہے جو خدا کے ممنوعہ حدود میں دراندازی کی جسارت کرتے ہیں۔ قدرت کا یہ انتظام اس بات پر شاہد ہے کہ یہ دنیا بے راعی کا گلہ نہیں ہے بلکہ اس کے چپہ چپہ پر خدا نے اپنے پہرہ دار بٹھا رکھے ہیں جو شب و روز ہر چیز کی نگرانی کر رہے ہیں اس وجہ سے لازماً اس کے بعد ایک یوم الحساب آنا ہے جس کے احتساب سے کوئی بھی اپنے کو بچا نہ سکے گا۔

فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝ یَّخْرُجُ مِنْ بَیْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۝ اِنَّهٗ عَلٰی رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ (۵-۸)

انسان کا وجود خود شاہد ہے کہ خدا اس کو دوبارہ اٹھا سکتا ہے

یہ اس احساسِ ذمہ داری کی طرف توجہ دلائی ہے جو ہر اس انسان کے اندر پیدا ہونا چاہیے جو اس حقیقت کو پا گیا ہے کہ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے بلکہ اس کا خالق ایک ایک چیز پر نگاہ رکھے ہوئے ہے اور جب وہ نگاہ رکھے ہوئے ہے تو لازم ہے کہ وہ ایک ایسا دن بھی لائے جس میں نیکوں کے سامنے ان کی نیکی اور بدوں کے سامنے ان کی بدی اپنے حقیقی نتائج کی صورت میں بے نقاب ہو۔

فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ یہ انسان کو خود اس کے وجود کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر وہ اپنی ہی خلقت پر غور کرے تو خدا کی قدرت، حکمت اور اس کی صنعت گری کی ایسی شانیں ظاہر ہوں گی کہ وہ پکار اٹھے گا کہ جو خدا پانی کی ایک حقیر بوند سے اس کو ان اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کر سکتا ہے وہ مرنے کے بعد اس کو دوبارہ اٹھا سکنے پر بھی قادر ہے۔

جزا و سزا کے منکرین کا سب سے بڑا شبہ یہی تھا کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کیے جانے کو بعید از امکان تصور کرتے تھے۔ ان کے اس شبہ کو دور کرنے کے لیے قرآن نے جگہ جگہ ان کو خود ان کی خلقت پر غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ سورۂ عبس میں اسی طرح کے لوگوں کو ان الفاظ میں تنبیہ فرمائی ہے:

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَکْفَرَهٗ ۝ مِنْ اَیِّ انسان غارت ہو کتنا ناشکرا ہے اس کو خدا

شَیۡءٍ خَلَقَهٗ ؕ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ؕ	نے کس چیز سے پیدا کیا؟ پانی کی ایک بوند سے
خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۙ ثُمَّ السَّبِیۡلَ	اس کو پیدا کیا، پھر اس کے لیے ایک
یَسَّرَهٗ ۙ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقۡبَرَهٗ ۙ	اندازہ ٹھہرایا، پھر اس کے لیے راہ آسان کی،
ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنۡشَرَهٗ ؕ	پھر اس کو موت دی اور اس کو قبر میں رکھوایا۔
(عبس - ۸۰: ۱۷ - ۲۲)	پھر جب چاہے گا اس کو اٹھا کھڑا کرے گا۔

'خُلِقَ مِنۡ مَّآءٍ دَافِقٍ ۙ یَّخۡرُجُ مِنۡۢ بَیۡنِ الصُّلۡبِ وَ التَّرَآئِبِ'۔ یہ اس پانی کی نوعیت، اس کے خروج کی صورت اور اس کی جگہ کے حدود اربعہ کی وضاحت فرما دی تاکہ انسان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ یہ پانی نہ کوئی جوہر نایاب ہے اور نہ یہ کسی ایسی ولایت سے آتا ہے جو خدا کی خدائی کے حدود سے باہر ہو بلکہ انسان ہی کی ریڑھ اور اس کی چھاتیوں کے بیچ سے اچھلتا ہے اور قدرت اسی کو اپنے سانچے میں جس شکل و صورت پر چاہتی ہے ڈھالتی ہے اور پھر اس کو بطن مادر سے باہر لاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس خدا کی اس عظیم قدرت و حکمت کا مشاہدہ ہر شخص خود اپنے وجود کے اندر کر رہا ہے کیا اس کے لیے اس کو دوبارہ زندہ کرنا ناممکن ہو جائے گا! اسی حقیقت کی طرف سورۂ انفطار میں یوں توجہ دلائی ہے:

یٰۤاَیُّهَا الۡاِنۡسَانُ مَا	اے انسان، تجھے تیرے اس رب کریم کے باب
غَرَّکَ بِرَبِّکَ الۡکَرِیۡمِ ۙ	میں کس چیز نے مغالطے میں ڈال رکھا ہے؟ جس
الَّذِیۡ خَلَقَکَ فَسَوّٰىکَ	نے تیرا خاکہ بنایا، پھر تیرے نوک پلک سنوارے
فَعَدَلَکَ ۙ فِیۡۤ اَیِّ	اور تجھے بالکل ٹھیک ٹھاک کیا، اور جس شکل
صُوۡرَةٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ ؕ	پر چاہا تجھے متشکل کر دیا! (اس خدا کی قدرت
کَلَّا بَلۡ تُکَذِّبُوۡنَ	کے باب میں کسی شک کی گنجائش) ہرگز نہیں
بِالدِّیۡنِ ۙ	ہے لیکن تم جزاء و سزا کو جھٹلانا چاہتے ہو
(الانفطار - ۸۲: ۶ - ۹)	(اس وجہ سے اس قسم کے شبہات ایجاد کر رہے ہو)۔

'اِنَّهٗ عَلٰی رَجۡعِهٖ لَقَادِرٌ'۔ یعنی جس خدا نے انسان کو پیدا کرنے میں اپنی قدرت و حکمت کی یہ شانیں دکھائی ہیں وہ اس کے مرکھپ جانے کے بعد اس کو دوبارہ پیدا کرنے پر بھی ضرور قادر ہے۔ 'رَجۡعِهٖ' میں ضمیر کا مرجع انسان ہے جس کو آیت 'فَلۡیَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ مِمَّ خُلِقَ' (۵) میں غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ اگرچہ لفظ عام استعمال ہوا ہے لیکن اصل روئے سخن قریش ہی کی طرف ہے جو اس قسم کے لاطائل شبہات پیدا کر کے قرآن کے انذار کو غیر مؤثر بنا دینا چاہتے تھے۔

یَوۡمَ تُبۡلَی السَّرَآئِرُ (۹)

آخرت کے احتساب کی نوعیت — اس دن جس طرح کے احتساب سے لوگوں کو سابقہ پیش آئے گا یہ اس کا بیان ہے۔ فرمایا کہ اس دن مخفی باتیں بھی جانچی اور پرکھی جائیں گی۔ یعنی صرف ظاہری اقوال و اعمال ہی زیر بحث نہیں آئیں گے بلکہ مخفی اعمال، دلوں کے کھوٹ اور نیتوں کے فساد بھی پرکھے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے پاس ایسے آلات ہیں جو مخفی سے مخفی گوشوں میں کیے ہوئے اعمال و اقوال کا بھی کھوج لگائیں گے، اور ہر عمل کو پرکھ کر بتا دیں گے کہ کس کے اندر کتنا کھوٹ ہے اور کتنا اخلاص۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس دن آدمی کے اعضاء و جوارح بھی ان تمام اعمال کی گواہی دیں گے جو انسان نے کیے ہوں گے تو جب اعضاء و جوارح بھی گواہ بن کر اٹھ کھڑے ہوں گے تو کسی راز کے راز رہنے کا کیا امکان باقی رہا۔

فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ (۱۰)

اس دن آدمی کے پاس نہ اس کی اپنی ذاتی قوت ہوگی جس سے وہ مدافعت کر سکے اور نہ اس کے اعوان و انصار اور شرکاء و شفعاء میں سے کوئی اس کی حمایت کے لیے اٹھے گا۔ ہر ایک کا ظاہر و باطن کھلی کتاب کی طرح سامنے ہوگا اور صرف خدائے علیم و خبیر ہی کا فیصلہ بے چون و چرا نافذ ہوگا۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۙ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ (۱۱-۱۲)

حیات بعد الموت پر آفاقی شہادت — اوپر حیات بعد الموت اور روز جزا پر انسان کی خلقت سے شہادت پیش کی ہے۔ اب اسی دعوے پر ایک آفاقی دلیل کی طرف توجہ دلائی ہے۔

'رَجْعٌ' کی تشریح اہل لغت نے 'المطر بعد المطر' سے کی ہے۔ یعنی وہ بارش جو یکے بعد دیگرے ہوتی اور زمین کو زندگی و شادابی بخشتی ہے۔

'صَدْعٌ' کے معنی پھٹنے کے ہیں۔ یعنی جب بارش ہوتی ہے تو زمین کے مسامات کھل جاتے ہیں اور وہ پانی جذب کر کے پھول جاتی اور دیکھتے دیکھتے لہلہا اٹھتی ہے۔ اگرچہ یہاں لہلہا اٹھنے کا ذکر لفظوں میں نہیں ہے لیکن قرینہ اس پر دلیل ہے۔ اسلوب قسمیہ ہے اس وجہ سے بات اشاروں میں کہہ دی گئی ہے۔

قرآن کے دوسرے مقامات میں مختلف اسلوبوں سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ مرنے کے بعد لوگوں کو از سر نو زندہ کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ جو لوگ اس بات میں شک کر رہے تھے اُن کو ملامت کی گئی ہے کہ تم ایک ایسی بات میں شک کر رہے ہو جس کا مشاہدہ آئے دن تمہیں ہوتا رہتا ہے۔ سورۂ انبیاء میں اسی طرح کے شکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا — کیا جنھوں نے قیامت کا انکار کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین دونوں بند

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (الانبیآء - ۲۱ : ۳۰)　　ہوتے ہیں پس ہم ان کو کھول دیتے ہیں اور ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندہ کیا۔

اس آیت کی تفسیر اس کے محل میں دیکھ لیجیے۔ آسمان و زمین کے بند ہونے سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ نہ آسمان سے پانی برستا نہ زمین سبزہ اگاتی لیکن جب اللہ تعالیٰ آسمان کے دریچے کھول کر پانی برسا دیتا ہے تو زمین بھی اپنے خزانوں کے دروازے کھول دیتی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ جب چاہے گا زمین سے ان سارے لوگوں کو زندہ اٹھا کھڑے گا جو اس میں دفن ہیں۔

إِنَّهُ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۙ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (۱۳-۱۴)

مکذبینِ قیامت کو تنبیہ

جس طرح سابق سورہ کے آخر میں مکذبینِ قیامت کو متنبہ فرمایا ہے کہ قرآن کے اس انذار کا مذاق نہ اڑاؤ، یہ لوحِ محفوظ سے اترا ہوا نہایت برتر کلام ہے، اسی طرح اس سورہ کے آخر میں بھی ایک نئے اسلوب سے آگاہ فرمایا کہ یہ قرآن جس روزِ حساب سے تمھیں آگاہ کر رہا ہے وہ ایک امرِ قطعی اور اٹل ہے جس سے تمھیں لازماً سابقہ پیش آنا ہے تو اس کو مذاق کا موضوع نہ بناؤ بلکہ دانشمندی اور عاقبت بینی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو توجہ سے سنو، سمجھو اور آنے والے دن کی تیاری کرو۔

إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا ۙ وَأَكِيدُ كَيْدًا (۱۵-۱۶)

پیغمبر صلعم کو تسلی

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمھارے انذار کا مذاق اڑانے کے لیے لوگ جو سخن سازیاں کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کے دل میں فی الواقع کچھ شبہات ہیں جو کسی جواب یا کسی معجزہ دکھا دینے سے دور ہو جائیں گے۔ یہ شبہات محض حقیقت سے فرار کے لیے گھڑے جا رہے ہیں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ نہ یہ خود تمھاری بات مانیں نہ اپنے عوام کو ماننے دیں تاکہ ان کی سیادت قائم رہے اور اپنی جن خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں بدستور ان کی پیروی کرتے رہیں۔

'وَأَكِيدُ كَيْدًا' فرمایا کہ ان کی اس چال کے توڑ کے لیے میں بھی ایک چال چل رہا ہوں۔ وہ یہ کہ ان کو پکڑنے میں جلدی کرنے کے بجائے ان کو ڈھیل دے رہا ہوں تاکہ یہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں اور جب پکڑے جائیں تو ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔ یہ نادان اس ڈھیل کو اپنی کامیابی گمان کر رہے ہیں لیکن حقیقت میں یہ خدا کے استدراج کے پھندے میں اس طرح پھنسے ہوئے ہیں کہ جتنی ہی ان کی رسی دراز ہو رہی ہے اتنی ہی اس کی گرفت مضبوط ہو رہی ہے۔ یہ گویا اسی بات کی دوسرے الفاظ میں وضاحت ہے جو سابق سورہ میں 'وَاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ' (البروج - ۸۵ : ۲۰) کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے۔

فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ أَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا (۱۷)

یعنی جب یہ ہر طرف سے اللہ تعالیٰ کے گھیرے میں ہیں تو خواہ ان کو کتنی ہی ڈھیل ملے اس بات

کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ یہ خدا کی گرفت سے باہر نکل جائیں گے تو تم بھی ان کو ڈھیل ہی دو یعنی ان کے طعنوں اور مطالبات سے تنگ آ کر یہ تمنا نہ کرو کہ اب ان کو کوئی نشانیِ عذاب دکھا ہی دی جائے یا سرے سے ان کا قصہ ہی پاک کر دیا جائے۔

'اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا' یہ اوپر کے ٹکڑے ہی کی وضاحت ہے کہ اس ڈھیل سے یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی غیر محدود مدت کے لیے ان کو ڈھیل دی جائے بلکہ بس ذرا سی ان کی رسی دراز کر دی جائے تاکہ جو کچھ لیں یہ کرنی چاہتے ہیں کر لیں بالآخر ان کو اپنے انجام سے دوچار ہونا ہی ہے۔

یہاں کلام کا یہ پہلو خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ ڈھیل دینے کی ہدایت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمائی جا رہی ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اب ان کی قسمت کی باگ درحقیقت پیغمبر ہی کے ہاتھ میں خدا نے دے دی ہے۔ البتہ وہ پسند یہ فرماتا ہے کہ پیغمبر ان کو ذرا سی ڈھیل مزید دے دیں۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی اِحْسَانِهٖ۔

لاہور

۲۳۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء

یکم ذوالحجہ ۱۳۹۹ھ

تدبرِ قرآن

۸۷

الاعلیٰ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سابق سورہ ——— الطارق ——— نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقینِ صبر و انتظار پر ختم ہوئی ہے۔ آپ کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جو لوگ تمہاری تکذیب پر اڑے ہوئے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے استدراج کے پھندے میں پھنس چکے ہیں، اب ان کے دن گنتی کے ہیں جو وہ پورے کر رہے ہیں۔ ان کو تھوڑی سی مہلت اور دو۔ ان کے طغیان کا انجام ان کے سامنے آیا ہی چاہتا ہے۔ اطمینان رکھو کہ یہ خدا کے قابو سے باہر نہیں جا سکتے۔ وہ ہر طرف سے ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اب اس سورہ میں قریش کے ہٹ دھرموں سے صرفِ نظر کر کے براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرمایا ہے اور آپ کو یہ بشارت دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں ایک ترتیب و تدریج ہے اور یہ ترتیب و تدریج تمام تر اس کی حکمت پر مبنی ہے تو اپنے رب پر بھروسہ رکھو۔ جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ تمہاری سعی بامراد اور اللہ کی نعمت تم پر تمام ہوگی اور راہ کی ساری رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ خطاب کی یہ تبدیلی آگے کی سورتوں میں (کم از کم دس سورتوں تک) نمایاں ہے۔ ان میں مخالفین سے کوئی بات کہی گئی ہے تو ضمناً۔ اصل خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہے اور مختلف اسلوبوں سے آپ کی وہ تمام الجھنیں دور فرمائی گئی ہیں جو دعوت کے اس مرحلے میں پیش آئیں یا جن کے پیش آنے کا امکان تھا۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی برابر تسبیح کرتے رہنے کی ہدایت اور اس کی ان صفات کی یاددہانی جو اس بات کی دلیل ہیں کہ اس کے ہر کام میں ایک ترتیب و تدریج ہوتی ہے۔ جس طرح زمین کی نباتات آہستہ آہستہ ہی گنجان و سرسبز ہوتی ہیں۔ اسی طرح انسان کی جسمانی و عقلی صلاحیتیں بھی تدریج کے ساتھ ہی کمال کو پہنچتی ہیں۔

(۶-۸) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت کہ تورات کے اسی قانون کے مطابق آپ کے ساتھ بھی معاملہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی جو نعمت، وحی کی صورت میں نازل ہو رہی ہے وہ درجہ بدرجہ نازل ہوگی اور اس اہتمام کے ساتھ آپ کو تعلیم دی جائے گی کہ اس چیز کے سوا جس کو اللہ ہی نظر انداز کرانا چاہے آپ ایک حرف بھی نہ بھولیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہر سرّ و علانیہ سے باخبر ہے۔ آپ کو جن حالات سے سابقہ ہے یا پیش آئے گا۔ وہ ان سے اچھی طرح واقف ہے۔ مشکلات کے اندر سے آپ کے لیے آسان راہ وہ نکالے گا۔

(۹-۱۳) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ ضدیوں اور ہٹ دھرموں کے زیادہ درپے ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو سننا نہیں چاہتے ان کو سنانا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ صرف وہ سنیں گے جو اللہ اور آخرت سے ڈرنے والے ہیں۔ جو محروم القسمت ہیں وہ اس سے گریز ہی کریں گے اور اپنا انجام دیکھیں گے۔

(۱۴-۱۵) ان خوش بختوں کو بڑی فائز المرامی کی بشارت جنھوں نے اپنے کو پاک کیا اور اپنے رب کو یاد کیا اور اس کی نماز پڑھی۔

(۱۶-۱۹) کفار کو خطاب کر کے یہ تنبیہ کہ تمھاری اصلی بیماری یہ ہے کہ تم دنیا کی زندگی اور اس کی لذات کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو اس وجہ سے تمھارے دلوں میں پیغمبر کی باتیں نہیں اترتی ہیں۔ حالانکہ بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والی زندگی آخرت ہی کی زندگی ہے۔ تمام اگلے نبیوں اور صحیفوں کی تعلیم یہی ہے۔

سُوْرَةُ الْاَعْلٰی

مَکِّیَّةٌ ——— اٰیات: ۱۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیات ۱ - ۱۹ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝۱ الَّذِىْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝۲ وَالَّذِىْ
قَدَّرَ فَهَدٰى ۝۳ وَالَّذِىْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۝۴ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً
اَحْوٰى ۝۵ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝۶ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ
يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۝۷ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝۸ فَذَكِّرْ
اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝۹ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝۱۰ وَيَتَجَنَّبُهَا
الْاَشْقَى ۝۱۱ الَّذِىْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ۝۱۲ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ
فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ۝۱۳ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝۱۴ وَذَكَرَ اسْمَ
رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝۱۵ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝۱۶ وَ
الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝۱۷ اِنَّ هٰذَا لَفِى الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝۱۸
صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝۱۹ ع ۱ / ۱۲

ترجمۂ آیات ۱ - ۱۹ اپنے خداوند برتر کے نام کی تسبیح کر جس نے خاکہ بنایا پھر نوک پلک سنوارے جس نے مقدّر کیا اور ہدایت بخشی اور جس نے نباتات اگائیں پھر ان کو گھنی سرسبز و شاداب بنایا۔ ۱ - ۵

ہم تمھیں پڑھائیں گے تو تم نہیں بھولو گے مگر وہی جو خدا چاہے گا۔ وہ جانتا ہے علانیہ کو بھی اور اس کو بھی جو چھپا ہوتا ہے۔ اور ہم تمھیں لے چلیں گے آسان راہ۔ ۶-۸

پس تم یاددہانی کرو اگر یاددہانی کچھ نفع پہنچائے۔ فائدہ اٹھالے گا وہ جس کو ڈر ہوگا اور گریز کرے گا وہ جو بدبخت ہوگا۔ وہ پڑے گا بڑی آگ میں۔ پھر نہ اس میں مرے گا اور نہ جیے گا۔ ۹-۱۳

کامیاب ہوا جس نے اپنے کو پاک کیا اور اپنے خداوند کا نام یاد کیا اور نماز پڑھی۔ ۱۴-۱۵

پر تم لوگ تو دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر اور پائدار ہے۔ یہی تعلیم اگلے صحیفوں میں بھی ہے۔ موسیٰ اور ابراہیم کے صحیفوں میں۔ ۱۶-۱۹

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى (۱)

اللہ تعالیٰ کی یاد کی اہمیت

ہم جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ لفظ 'تَسْبِیْح' میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو ان تمام باتوں سے پاک اور برتر قرار دینا جو اس کی اعلیٰ شان کے منافی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا صحیح تصور ہی تمام علم و معرفت اور تمام قوت و اعتماد کا سرچشمہ ہے۔ اگر اس میں کوئی خلل پیدا ہو جائے تو انسان صحیح معرفت کی شاہراہ سے ہٹ جاتا اور شیطان کے پیچھے پڑ جاتا ہے جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلتا ہے کہ اس کا دل ایمان و توکل کی نعمت، طمانیت و شرح صدر کے نور اور عزیمت و استقامت کی قوت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت اور اس کی یاد ہی ہے جو دل کو پابرجا اور مستقیم و مطمئن رکھتی ہے 'اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ' (الرعد - ۱۳ : ۲۸)۔

'تسبیح' کی سب سے اعلیٰ اور معیاری شکل تو، جیسا کہ ہم جگہ جگہ بیان کر چکے ہیں، نماز، بالخصوص شب کی نماز ہے لیکن جس طرح سانس انسان کی مادی زندگی کے لیے ہر وقت ضروری ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی یاد اس کی روحانی زندگی کے لیے ہر وقت ضروری ہے۔ اس وجہ سے صرف نمازوں کے اوقات ہی میں نہیں بلکہ زندگی کی دوسری سرگرمیوں کے اندر بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے دل کو آباد رکھنا چاہیے تاکہ شیطان کو اس پر غلبہ پانے کا موقع نہ ملے۔ سورۂ مزمل کی آیت 'اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا' کے تحت اس حقیقت کی ہم وضاحت کر چکے ہیں۔ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت صبر و استقامت کے حصول کے لیے فرمائی گئی ہے اس وجہ سے یہ اپنے جامع مفہوم ہی میں ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰى (۲)

اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں ایک تدریج ہوتی ہے جو اس کی حکمت پر مبنی ہوتی ہے

اب اس آیت اور آگے کی چند آیات میں خدائے بزرگ کی چند صفات کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے جن سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس کے ہر کام میں ایک ترتیب و تدریج ہوتی ہے جو کیسر اس کی حکمت پر مبنی ہوتی ہے اس وجہ سے بندے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے رب کے احکام کی تعمیل میں صبر و استقامت کے ساتھ لگا رہے اور یہ امید رکھے کہ جس راہ پر چلنے کا اس نے حکم دیا ہے اس کی آخری منزل اپنی تمام برکتوں کے ساتھ، بالآخر آ کے رہے گی۔ اس میں جو دیر ہو گی وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی ہو گی اور جو مشکلیں پیش آئیں گی ان کے اندر بھی دنیا اور آخرت دونوں کی مصلحتیں مضمر ہوں گی۔

خلق

'خَلَقَ' کے معروف معنی تو پیدا کرنے کے ہیں لیکن کسی چیز کا خاکہ یا پتلا بنانے کے معنی میں بھی یہ آیا

ہے، مثلاً أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ (آل عمران - ۳:۴۹) (میں تمہارے لیے پرندے کی شکل پر ایک پتلا مٹی سے بناؤں گا پھر اس میں پھونک ماروں گا تو اللہ کے حکم سے وہ سچ مچ پرندہ بن جائے گا) یہاں یہ اسی معنی میں ہے۔

تسویہ

'تسویۃ' کے معنی ہیں کسی شے کو ٹھیک ٹھاک کرنا، اس کو ہموار کرنا، اس کے نوک پلک سنوارنا۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ یہ اسی آخری مفہوم میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اگر اپنی خلقت ہی پر غور کرے تو اس کو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو یک بیک نہیں بنا کھڑا کیا ہے بلکہ اس قطرے کو گہر بنانے تک بہت سے مرحلوں سے گزارنا پڑا ہے۔ ایک دور وہ ہوتا ہے جب اس کا ابتدائی خاکہ بنتا ہے پھر آہستہ آہستہ وہ دور آتا ہے جب قدرت اس خاکے میں رنگ بھرتی اور اس کا موقلم اس کے نوک پلک سنوارتا ہے۔

وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ (۳)

'قدّر فھدیٰ' کا وسیع مفہوم

یہی حال اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کے نشوونما اور اس کے مادی و عقلی عروج و کمال کا بھی ہے۔ قدرت نے اس کی زندگی کو جن چیزوں کا محتاج بنایا ہے ان کے تقاضے بھی اس کے اندر رکھے ہیں، اس کے اسباب بھی فراہم کیے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھانے کا اس کو سلیقہ بھی الہام فرمایا ہے، مثلاً بچے کو دودھ کا محتاج بنایا ہے تو اس کی ماں کی چھاتی میں دودھ بھی پیدا کیا ہے اور پھر بچے کو یہ رہنمائی دی ہے کہ وہ ماں کی چھاتی کو چوسے اور اس سے اپنی غذا حاصل کرے۔

بعد کے ادوار میں جب اس کی ضروریات کا دائرہ وسیع ہوتا ہے تو ہر ضرورت کے لیے زمین میں ذخیرے محفوظ ہیں اور خالق نے انسان کو عقل دی ہے کہ وہ ان ذخائر کا سراغ لگائے، ان کے حاصل کرنے کی راہیں کھولے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے طریقے ایجاد کرے۔

اسی طرح اس کی روحانی و اخلاقی ترقی کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر خیر و شر کا شعور ودیعت فرمایا ہے اور پھر اس کی رہنمائی کے لیے اپنے نبیوں اور رسولوں کو بھیجا کہ وہ بتائیں اور سکھائیں کہ زندگی کا کون سا طریقہ اس کی فطرت کے تقاضوں کے مطابق اور اس کے اختیار کرنے میں اس کی فلاح ہے اور کون سا طریقہ اس کی فطرت سے بے جوڑ اور اس پر چلنے میں اس کی تباہی ہے۔

ولادت سے لے کر موت تک زندگی کے سارے مراحل و مقامات، تمام اطوار و ادوار اور جملہ امتحانات و عقبات بھی اللہ تعالیٰ نے مقدر فرما دیے ہیں جو لازماً پیش آکے رہتے ہیں۔ پھر ان سے عہدہ برآ ہونے کا طریقہ بھی اس نے بتا دیا ہے۔ اگر انسان وہ طریقہ اختیار کرتا ہے تو اس کا سفینۂ حیات ہر منجدھار سے سلامتی کے ساتھ گزر جاتا ہے اور اگر وہ اس سے ہٹ کر اپنی خواہشوں کے پیچھے لگ جاتا ہے تو یہی چیز اس کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے ـــــ 'اَلَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى' کے دو

لفظوں کے اندر یہ تمام معانی مضمر ہیں اور ان کی تفصیل بہت طویل ہے جس کو سمیٹنا ممکن نہیں ہے۔ سورۂ طٰہٰ کی آیت ۵۰ قَالَ رَبُّنَا الَّذِیٓ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰی کے تحت بھی ہم اسی مضمون کی وضاحت کر چکے ہیں۔

وَالَّذِیٓ اَخۡرَجَ الۡمَرۡعٰی ۙ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحۡوٰی (۴-۵)

اس ٹکڑے میں ایک ادبی اشکال ہے اس کو پہلے سمجھ لیجیے تب اس کا صحیح موقع و محل واضح ہوگا۔ ایک ادبی اشکال کا حل

'غُثَآءً اَحۡوٰی' کا ترجمہ عام طور پر لوگوں نے کالا کوڑا یا سیاہ خس و خاشاک کیا ہے لیکن عربی میں لفظ 'غثاء' تو بے شک جھاگ اور خس و خاشاک کے معنی میں بھی آتا ہے لیکن 'اَحۡوٰی' ہرگز اس سیاہی کے لیے نہیں آتا جو کسی شے میں اس کی کہنگی، بوسیدگی اور پامالی کے سبب سے پیدا ہوتی ہے، بلکہ یہ اس سیاہی مائل سرخی یا سبزی کے لیے آتا ہے جو کسی شے پر اس کی تازگی، شادابی، زرخیزی اور جوشِ نمو کے سبب سے نمایاں ہوتی ہے۔ یہ نباتات اور پاملوں کی صفت کے طور پر بکثرت استعمال ہوا ہے اور بلا استثناء ہر جگہ ان کی سرسبزی کی شدت اور گھنے پن کو ظاہر کرنے ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ پھر یہیں سے بطور استعارہ یہ کڑیل، صحت مند گُل تر کی صورت کھلے ہوئے جوان کے لیے بھی استعمال ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن کی صحت بہت اچھی اور ان کے بدن میں خون وافر ہو ان کے ہونٹوں پر سیاہی مائل سرخی نمایاں ہو جاتی ہے چنانچہ مشہور جاہلی شاعر تابط شرا اپنے ممدوح کی تعریف میں کہتا ہے؏

مسبل فی الحی احوی رفل ۔۔۔ واذا یغزو فلیث ابسل

(یوں قبیلہ کے اندر تو وہ ایک خوش پوش، سرخ و سپید بانکا چھبیلا بنا رہتا ہے لیکن جب میدان جنگ میں اترتا ہے تو شیر نیستاں بن جاتا ہے)

لفظ 'غثاء' اگرچہ مکھن کے جھاگ اور سیلاب کے خس و خاشاک کے لیے بھی آتا ہے لیکن اس سبزہ کے لیے بھی اس کا استعمال معروف ہے جو زمین کی زرخیزی کے سبب سے اچھی طرح گھنا اور سیاہی مائل ہو گیا ہو۔ استاذ امام فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب 'مفردات القرآن' میں اس کی تائید میں شعرائے جاہلیت کے متعدد اشعار نقل کیے ہیں۔ ہم بقیدِ اختصار صرف قطامی کا ایک شعر، جو اس نے ایک وادی کی تعریف میں کہا ہے، پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے؏

حلوا باخضر قد مالت سرارته ۔۔۔ من ذی غثاء علی الاعراض ألضاد

(وہ ایک سرسبز و شاداب وادی میں اترے جس کے بیچ گھنے اور شاداب سبزے اس کے کناروں پر باہم دگر گتھم گتھا اور ایک دوسرے پر تہ بہ تہ گرے ہوئے تھے)

آیت زیر بحث میں چونکہ 'غُثَاءً' کی صفت 'اَحْوٰی' آئی ہے اس وجہ سے لازماً یہ اس دوسرے معنی ہی میں استعمال ہوا ہے ورنہ صفت اور موصوف میں نہایت بھونڈی قسم کی بے ربطی پیدا ہو جائے گی اس لیے کہ 'اَحْوٰی'، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، اس سیاہی کے لیے ہرگز نہیں آتا جو کسی چیز میں اس کی کہنگی، فرسودگی اور پامالی کے سبب سے پیدا ہوتی ہے۔ کلامِ عرب میں اس کی کوئی نظیر موجود نہیں ہے۔ علاوہ ازیں یہاں موقع کلام بھی، جیسا کہ آگے وضاحت آرہی ہے، اس مفہوم سے اباء کر رہا ہے۔

پس 'اَلَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی' کا صحیح مطلب یہ ہوگا کہ اس خداوند کی تسبیح کرو جو نباتات کو زمین سے نازک سوئیوں کی شکل میں نکالتا ہے پھر ان کو گھنی اور سیاہی مائل سرسبز و شاداب بناتا ہے۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓی ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰی (۶-۷)

حقیقت جو پیغمبر کو سمجھائی گئی

یہ وہ اصل مدعا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھانے کے لیے اوپر کی تمہید بیان ہوئی ہے یعنی قدرت کا جو قانونِ تدریج و ترتیب انسان کے خلق اور اس کی تکمیل میں، ترقیوں اور صلاحیتوں کو مقدّر کرنے اور ان کو بروئے کار لانے میں، سبزے کو اگانے اور اس کو پروان چڑھانے میں کارفرما ہے اسی قانون کے تحت اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ بھی معاملہ کرے گا۔ اس نے تمہیں جس منصب پر سرفراز فرمایا ہے اور جس وحی آسمانی سے نوازا ہے اس کے مرحلے بالتدریج طے ہوں گے اور جلد وہ وقت آئے گا کہ تم دیکھو گے کہ جس راہ پر تمہیں چلنے کا حکم دیا گیا اس کے تمام عقبات طے ہو گئے اور آخری منزل آگئی۔

وحی الٰہی کے باب میں آنحضرت کو ایک خاص ہدایت

'سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓی' یہ آیت بالکل اسی محل میں آئی ہے جس میں سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۱۴ 'لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓی اِلَيْكَ وَحْيُهٗ'[1] یا سورۂ قیامہ کی آیت ۱۶ 'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ'[2] آئی ہیں۔ ہم ان آیات کے تحت نہایت تفصیل سے واضح کر چکے ہیں کہ دعوت کے اس دور میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جن مخالفتوں اور مزاحمتوں سے سابقہ تھا ان میں آپ کے لیے واحد سہارا وہ آسمانی کمک ہی تھی جو وحی الٰہی کی صورت میں آپ پر نازل ہوتی۔ اسی سے آپ کو قوت و عزیمت کا زادِ راہ ملتا، اسی سے آگے کے لیے رہنمائی حاصل ہوتی، اسی میں مخالفین کے اعتراضات و مطالبات کے جواب ہوتے۔ ان گوناگوں وجوہ سے آپ کو ہر وقت وحی کا انتظار رہتا اور جب وہ

---

[1] تم قرآن کے لیے اپنی طرف اس کی وحی پوری کیے جانے سے پہلے جلدی نہ کرو۔

[2] تم جلدی کے خیال سے قرآن کے پڑھنے پر اپنی زبان نہ چلاؤ۔

نازل ہوتی تو اس کے اخذ کرنے میں آپ قدرتاً اس بے قراری اور اضطراب و عجلت کا اظہار کرتے جو ایک بھوکا بچہ اس وقت کرتا ہے جب ماں اس کو چھاتی سے لگاتی ہے۔ فرطِ شوق میں آپ چاہتے کہ پوری وحی ایک ہی سانس میں آپ کے سینہ میں اتر جائے اور چونکہ یہ خالقِ کائنات کی ایک عظیم امانت بھی تھی جو آپ کی تحویل میں دی جا رہی تھی اس وجہ سے آپ اس کا حرف حرف اپنی زبانِ مبارک سے دہراتے بھی کہ مبادا کوئی لفظ حافظہ کی گرفت سے باہر رہ جائے۔

آپ کے اس اضطراب و شوق اور اس عجلت و بے قراری پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلّی دی کہ اس وحی کے لیے تم جلد بازی نہ کرو۔ اس کے اترنے کے لیے جو پروگرام ہم نے مقرر کیا ہے اسی کے مطابق یہ اترے گی اور اسی میں حکمت و مصلحت ہے۔

ساتھ ہی یہ تسلی بھی دے دی کہ اس کی حفاظت کے لیے بھی تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ خود اس کی حفاظت کا ایسا سامان کرے گا کہ تم اس میں سے ایک حرف بھی نہیں بھولوگے۔ سورۂ قیامہ میں یہی بات یوں فرمائی ہے:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ	تم عجلت کے خیال سے اس پر زبان نہ چلاؤ۔
بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝	ہمارے ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو پڑھ
فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝	کر سنانا تو جب ہم اس کو پڑھ کے سنا دیں
ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝	تو اس سنانے کی پیروی کرو۔ پھر ہمارے ہی
(القیٰمۃ - ۷۵: ۱۶-۱۹)	ذمہ ہے اس کی وضاحت۔

'اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ' یعنی اس کلیہ سے مستثنیٰ صرف وہ چیزیں ہیں جو وقتی اور ہنگامی نوعیت کی ہیں۔ ان کی مدت پوری ہو جانے کے بعد خود اللہ تعالیٰ ہی بتا دے گا کہ ان کی مدت پوری ہو گئی۔ یہ اشارہ ان احکام کی طرف ہے جو وقتی اور عارضی تھے اور جو بعد میں منسوخ ہو گئے۔

صحیح توکل کی تعلیم کے لیے خدا کے محیطِ کل علم کا حوالہ

'اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى' یعنی یہ گمان نہ کرو کہ تم جن حالات و مسائل سے دوچار ہو تمھارا رب ان سے بے خبر ہے۔ وہ بے خبر نہیں ہے بلکہ ان باتوں کو بھی وہ جانتا ہے جو ظاہر ہیں اور ان باتوں سے بھی آگاہ ہے جو پوشیدہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمھاری پریشانیاں اور دعائیں سبھی اس کے علم میں ہیں اور دشمنوں کی کھلی ہوئی شرارتیں اور ان کی مخفی سازشیں بھی اس کے علم میں ہیں تو جب سب کچھ اس کے علم میں ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت اور اختیار بھی رکھتا ہے تو اطمینان رکھو کہ تمھیں جس قسم کی مدد اور رہنمائی کی ضرورت ہو گی اس سے محروم نہیں رہو گے۔ یہی مضمون سورہ طٰہٰ میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ فرمایا ہے:

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ	اسی کے اختیار میں ہے جو آسمانوں اور زمین میں

وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝ وَإِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَإِنَّهُ يَعْلَمُ السِّرَّ وَأَخْفٰى ۝ (طٰهٰ - ۲۰ : ۶ - ۷)

اور ان کے درمیان اور جو کچھ زیر زمین ہے وہ بھی۔ چاہے تم بلند آواز سے بات کہو یا پوشیدہ طور پر وہ ظاہر، پوشیدہ اور پوشیدہ تر باتوں کو بھی جانتا ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ پر صحیح توکل و اعتماد اس کے محیط کل علم اور اس کی ہمہ گیر قدرت کے استحضار ہی سے پیدا ہوتا ہے۔

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى (۸)

یسریٰ کی منزل کی بشارت

یہ نہایت واضح لفظوں میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت ہے کہ یہی دن ہمیشہ نہیں رہیں گے بلکہ ہم ان مشکلات سے نکال کر جلد تمہیں آسان راہ پر لے چلیں گے۔ 'یُسْرٰی'، صفت ہے جس کا موصوف 'طَرِیْقَۃ' یا اس کا ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔ لفظ 'تیسیر' کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے کہ یہ کسی چیز کو کسی برتر مقصد کے لیے تیار کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ اس سے یہاں یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اس وقت تم جن مشکلات میں ہو یہ تمہاری تربیت کے لیے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے ان افضال و عنایات کا اہل اور حق دار بنائے جن سے تمہیں مستقبل میں وہ بہرہ مند فرمانے والا ہے۔ اوپر 'قَدَّرَ فَهَدٰى' اور 'اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۝ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى' میں اپنی جس سنت کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہ اسی کا اقتضا بیان ہوا ہے کہ اس وقت راہ میں جو عقبات حائل ہیں وہ سنت الٰہی کے تحت بغرض امتحان و تربیت ہیں۔ آگے راہ صاف ہے۔ اپنے رب کی رہنمائی پر بھروسہ رکھو۔ یُسر کی منزل عُسر کے بعد ہی آتی ہے۔

فَذَكِّرْ إِنْ نَفَعَتِ الذِّكْرٰى (۹)

ہدایت اور ضلالت کے باب میں سنت الٰہی

یعنی لوگوں کی مخالفتوں اور ناقدریوں سے بددل اور مایوس نہ ہو۔ لوگوں کے دلوں میں بات اتار دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے کہ ان کے پیچھے پڑو۔ تمہارا فرض صرف تذکیر ہے۔ جب دیکھو کہ سننے کی طرف مائل ہیں تو سناؤ ورنہ ان کو ان کی تقدیر کے حوالہ کرو۔

سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَخْشٰى ۝ وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَى ۝ الَّذِي يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ۝ ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيٰى ۝ (۱۰ - ۱۳)

یہ بتایا ہے کہ کون آپ کی بات پر کان دھریں گے اور کس مزاج کے لوگ اس سے گریز کریں گے۔ فرمایا کہ جن کے دلوں میں خدا اور آخرت کا کچھ خوف ہوگا وہ آپ کی بات سنیں گے اور جن کے دل اس خوف سے خالی ہیں ان پر آپ کا انذار بے اثر ہی رہے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جو آپ کی دعوت سے بدک رہے ہیں ان کے بدکنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس دعوت میں یا اس کے داعی میں کوئی خرابی ہے بلکہ ان

ہدکنے والوں کے دلوں میں ہی خرابی ہے۔ وہ اسی دنیا کی زندگی کو کل زندگی سمجھے بیٹھے ہیں۔ آخرت کا کوئی اندیشہ ان کے اندر سرے سے ہے ہی نہیں۔ ایسے محروم القسمت لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ یہ اس بڑی آگ میں پڑیں گے جو ان کے لیے تیار ہے۔ پھر اس میں نہ یہ مریں گے، نہ جئیں گے بلکہ اس کے ابدی عذاب میں گرفتار رہیں گے۔ اس میں وہ موت کی تمنا کریں گے لیکن وہ بھی ان کی پرسانِ حال نہیں ہوگی۔

یہاں اس سنتِ الٰہی کو ذہن میں تازہ کر لیجیے جس کی وضاحت اس کتاب میں بار بار ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطرت کے اندر جو نور ودیعت فرمایا ہے جو لوگ اس کو باقی رکھتے ہیں ان کو پیغمبر کی دعوت اپنے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہ نور کچھ ضعیف بھی ہو چکا ہوتا ہے جب بھی دیر سویر پیغمبر کے جھنجھوڑنے سے وہ جاگ پڑتے ہیں لیکن جن کے اندر یہ نور بالکل بجھ چکا ہوتا ہے وہ مردوں کے حکم میں ہیں، ان کو صورِ اسرافیل کے سوا اور کوئی چیز بھی نہیں جگا سکتی۔

مذکورہ آیات میں جو مضمون بیان ہوا ہے وہ بعد والی سورہ ـــــ الغاشیۃ ـــــ میں جو اس کی مثنیٰ ہے، زیادہ وضاحت سے آیا ہے۔ فرمایا ہے:

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ ۝	تو یاد دہانی کرو، تم تو بس ایک یاد دہانی
لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ۝	کر دینے والے ہو۔ تم ان پر کوئی داروغہ تو
إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ۝	نہیں ہو (جو ایمان لائے گا وہ فلاح پائے گا)
فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ	رہے جو پیٹھ پھیریں گے اور کفر کریں گے تو
الْأَكْبَرَ ۝ إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ۝	اللہ ان کو عذاب دے گا بڑا عذاب۔ ہماری
ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۝	ہی طرف ان کا لوٹنا ہے۔ پھر ہمارے ہی
(الغاشیۃ - ۸۸: ۲۱-۲۶)	اوپر ان کا حساب لینا ہے۔

یہ بات یاد رکھیے کہ یہاں 'اَلْعَذَابَ الْاَكْبَرَ' آیا ہے اور آیتِ زیرِ بحث میں 'اَلنَّارَ الْكُبْرٰى' ہے۔ یہ ایک ہی بات دونوں توام سورتوں میں ذرا مختلف الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔ اس کی وضاحت، ان شاء اللہ اگلی سورہ میں آئے گی۔

قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّىٰ ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ (۱۴-۱۵)

ان لوگوں کا انجام جن کے دل زندہ ہیں

اوپر کی آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے گریز اختیار کرنے والوں کا انجام بیان فرمایا۔ اب یہ ان لوگوں کا انعام بیان ہو رہا ہے جن کا ذکر اوپر 'سَيَذَّكَّرُ مَن يَخْشَىٰ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔ فرمایا کہ بے شک ان لوگوں نے فلاح پائی جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تذکیر سے فائدہ اٹھایا اور اپنے آپ کو کفر و شرک کی آلودگی سے پاک کر لیا۔ ان کے لیے دنیا میں بھی فلاح کے دروازے

کھلیں گے اور آخرت میں بھی یہ اپنے رب کی رحمت و رضوان سے نوازے جائیں گے۔

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ‘ یہ اس تزکیہ کی اولین علامت بھی ہے اور اس کا اصل طریقہ بھی۔

دین میں نماز کی اہمیت ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ تمام علم کا سرچشمہ درحقیقت اسمائے الٰہی ہیں۔ انہی سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہمارے رب کی صفات کیا ہیں اور پھر انہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان صفات کی روشنی میں ہمارے عقائد کیا ہونے چاہئیں اور وہ عقائد ہمارے اوپر ہمارے رب اور اس کے بندوں سے متعلق کیا حقوق و فرائض عائد کرتے ہیں۔ گویا نماز کا ذکر یہاں ایمان باللہ کے اولین مظہر کی حیثیت سے ہوا ہے۔ ہم اس کتاب میں جگہ جگہ اس نکتہ کی وضاحت کر چکے ہیں کہ ایمان کا اولین مظہر نماز ہے اور پھر یہی چیز تمام شریعت کی اساس بھی ہے اور اس کی محافظ بھی۔ اس نکتہ کی مزید تفصیل مطلوب ہو تو سورۂ مومنون کی ابتدائی آیات کی تفسیر تدبر قرآن میں پڑھ لیجیے۔

بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ (۱۶-۱۷)

مخالفین کی مخالفت کی اصل علت یہ آخر میں مخالفین یعنی قریش کے لیڈروں کو خطاب کر کے ان کے اصل سببِ مخالفت سے پردہ اٹھا دیا کہ تمھاری ساری مخالفت کی علت محض تمھاری دنیا پرستی ہے۔ تم آخرت کو ماننے اور اس کی خاطر اپنے ناجائز دنیوی مفادات قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہو اس وجہ سے بے بنیاد شبہات ایجاد کرتے اور ان کو پھیلاتے ہو تاکہ اپنے عوام کو یہ فریب دے سکو کہ تمھارے گریز کے لیے فی الواقع کچھ وجوہ ہیں لیکن نادانو، یاد رکھو کہ تم اس دنیا کی چند روزہ زندگی کی محبت میں پھنس کر ابدی بادشاہی کھو رہے ہو! بہتر اور پائیدار چیز آخرت ہے۔ اگر تمھارے اندر سمجھ ہے تو اس کے طالب بنو!

إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ۝ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ (۱۸-۱۹)

قرآن کی تعلیم تمام نبیوں کی تعلیم ہے یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ تمھیں بتا رہے ہیں یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں ہے۔ تمام اگلے نبیوں اور رسولوں نے بھی یہی تعلیم دی ہے کہ اصل زندگی آخرت ہی کی زندگی ہے اور وہاں آدمی کا اپنا ہی عمل کام آئے گا، کوئی دوسرا اس کا بوجھ اٹھانے والا نہیں بنے گا۔ سورۂ نجم میں یہی حقیقت یوں بیان ہوئی ہے:

أَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَىٰ ۝ وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّىٰ ۝ أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۝ (النجم-۵۳: ۳۶-۳۸)	کیا اس کو اس تعلیم کی خبر نہیں ملی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہے اور ابراہیم کے جس نے ہر بات پوری کر دکھائی کہ کوئی جان بھی کسی دوسری جان کا بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے دوسرے متعدد نبیوں کے صحیفے اسفارِ تورات کی شکل میں موجود ہیں۔ ان میں اگرچہ بہت سی تحریفیں واقع ہو چکی ہیں اور ان کی حیثیت تاریخ کی کتابوں سے زیادہ نہیں ہے تاہم ان سب میں توحید اور قیامت کی تعلیم نہایت واضح اور مؤثر الفاظ میں اتنی کثرت سے موجود ہے کہ جس صحیفہ کو بھی پڑھیے ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریت کو جو تعلیم دی اگرچہ وہ صحیفہ کی شکل میں نہیں تھی بلکہ زبانی تعلیم و تلقین کی صورت میں تھی، لیکن ان کی ذریت کی ایک شاخ یعنی بنی اسرائیل نے اس کو اپنے صحیفوں میں تحریری شکل میں بھی محفوظ کیا اور ان کے انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے دور میں برابر اس کی یاد دہانی بھی کرتے رہے جس کی ناقابلِ تردید شہادت آج بھی ان کے صحیفوں میں موجود ہے اور قرآن نے بھی جا بجا اس کا حوالہ دیا ہے۔

آپ کی ذریت کی دوسری شاخ ——— بنی اسمٰعیل ——— نے اس کو تحریری شکل میں محفوظ نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ تحریر و کتابت سے ناآشنا امّی تھے۔ انھوں نے روایات کی صورت میں اس کو کچھ مدت تک باقی رکھا لیکن امتدادِ زمانہ سے اس پر رفتہ رفتہ ذہول کا پردہ پڑ گیا اور بدعات کے غلبہ نے اس کو بالکل ہی نسیاً منسیا کر دیا۔ البتہ نبی امّی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اس کی نہ صرف از سرِ نو تجدید ہوئی بلکہ اس کی تکمیل بھی ہوئی اور وہی اس دینِ کامل کی اساس قرار پائی جو اب قیامت تک کے لیے اللہ کا حقیقی دین ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی توفیق سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہ۔

لاہور
۲۰- نومبر ۱۹۷۹ء
۱۱- ذوالحجہ ۱۳۹۹ھ

تدبرِ قرآن

۸۸

الغاشية

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ــــ الاعلیٰ ــــ کی مثنیٰ ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ جس طرح سابق سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے اسی طرح اس میں بھی آپ کو تسلی دی گئی ہے۔ البتہ اندازِ خطاب، طریقِ استدلال اور تفصیل و اجمال کے پہلو سے دونوں میں فرق ہے۔ اس میں پہلے وہ فرق و اختلاف واضح فرمایا گیا ہے جو قیامت کے دن نیکوں اور بدوں، نا عاقبت اندیشوں اور عاقبت بینوں کے نتائجِ اعمال اور ان کی زندگیوں میں رونما ہوگا اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس کا رونما ہونا اس کائنات کے خالق کی صفاتِ قدرت، ربوبیت اور رحمت کا بدیہی تقاضا ہے۔ پھر آخر میں اس مضمونِ تسلی کی وضاحت فرما دی گئی ہے جو سابق سورہ کی آیت: فَذَكِّرْ إِن نَّفَعَتِ الذِّكْرَىٰ (الاعلیٰ - ۸ : ۹) میں اجمال کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ آپ کی ذمہ داری لوگوں تک صرف حق پہنچا دینے کی ہے۔ یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگ اس کو لازماً قبول بھی کر لیں۔ جو ہٹ دھرم اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں ان کے درپے ہونے کی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کیجیے۔ وہ ان سے نمٹنے کے لیے کافی ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱ - ۶) جو لوگ قیامت سے بے فکر ہو کر زندگی گزار رہے ہیں، قیامت کے دن ان کو جس صورتِ حال سے سابقہ پیش آنے والا ہے، اس کا بیان۔

(۷ - ۱۶) جو لوگ قیامت سے ڈرتے ہوئے زندگی گزاریں گے ان کو اس دن جو ابدی شادمانی و فائز المرامی حاصل ہوگی اس کی تصویر۔

(۱۷ - ۲۰) آفاق کی بعض نمایاں نشانیوں کی طرف اشارہ جو شہادت دیتی ہیں کہ اس کائنات کا خالق بڑی عظیم قدرت و حکمت والا، نہایت ہی مہربان، نہایت ہی کریم و بندہ نواز ہے۔ اس کی

اس قدرت، حکمت، رحمت اور ربوبیت کا بدیہی تقاضا ہے کہ وہ ایک روزِ عدل لائے جس میں نیکوں کو ان کی نیکیوں کا صلہ اور بدوں کو ان کی بدیوں کی سزا دے۔ اگر اس کے بغیر یہ دنیا یوں ہی چلتی رہے یا یوں ہی ایک دن تمام ہو جائے تو اس سے نہ صرف ان تمام صفات کی نفی ہو جاتی ہے بلکہ العیاذ باللہ یہ بات نکلتی ہے کہ اس نے ایک بالکل اندھیر نگری بنائی ہے اور اس کے نزدیک خیر و شر اور نیکی و بدی دونوں یکساں ہیں۔

(۲۱-۲۶) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تلقین کہ آپ جس چیز سے لوگوں کو ڈرا رہے ہیں وہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ اس کی نشانیاں بالکل واضح ہیں۔ ہٹ دھرموں کی روش سے آپ بددل اور مایوس نہ ہوں۔ آپ کا فرض صرف لوگوں تک حق کو پہنچا دینا ہے، لوگوں کے کفر و ایمان کے باب میں آپ مسئول نہیں ہیں۔ جو آپ کی بات سننے کو تیار نہیں ہیں ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کیجیے۔ بالآخر ان کی واپسی خدا ہی کی طرف ہوتی ہے اور وہ ان کا حساب کر کے رہے گا۔

سُوْرَةُ الْغَاشِيَةِ

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيات : ٢٦

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ﴿١﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ﴿٢﴾ آیات ١-٢٦
عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ﴿٣﴾ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ﴿٤﴾ تُسْقٰى مِنْ
عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ﴿٥﴾ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ﴿٦﴾ لَّا
يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ﴿٧﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ﴿٨﴾
لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ﴿٩﴾ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿١٠﴾ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا
لَاغِيَةً ﴿١١﴾ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ﴿١٢﴾ فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ﴿١٣﴾ وقف لازم
وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ﴿١٤﴾ وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ﴿١٥﴾ وَّزَرَابِيُّ
مَبْثُوْثَةٌ ﴿١٦﴾ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿١٧﴾
وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿١٨﴾ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ
نُصِبَتْ ﴿١٩﴾ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿٢٠﴾ فَذَكِّرْ اِنَّمَآ
اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴿٢٢﴾ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى
وَكَفَرَ ﴿٢٣﴾ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ﴿٢٤﴾ اِنَّ اِلَيْنَآ
اِيَابَهُمْ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ﴿٢٦﴾ ع ١ ٢٦ ١٣

ترجمۂ آیات ۱-۲۶

کیا تمھیں چھا جانے والی آفت کی خبر پہنچی ہے! اس دن کتنے چہرے اترے اور تھکے ہارے ہوں گے۔ وہ دہکتی آگ میں پڑیں گے۔ کھولتے چشمہ کا پانی پلائے جائیں گے۔ ان کے کھانے کو صرف جھاڑ کانٹے ہوں گے جو نہ موٹا کریں گے نہ بھوک ہی کو ماریں گے۔ ۱-۷

کتنے چہرے اس دن شگفتہ ہوں گے۔ اپنی کوشش پر شاد و مطمئن۔ اونچے باغ میں۔ جس میں کوئی لغو بات نہیں سنیں گے۔ اس میں چشمہ ہو گا رواں۔ اس میں تخت ہوں گے اونچے بچھے۔ آبخورے قرینے سے دھرے اور غالیچے ترتیب سے لگے اور تکیے ہر طرف پڑے۔ ۸-۱۶

کیا وہ اونٹوں پر نگاہ نہیں کرتے، وہ کیسے بنائے گئے! اور آسمان کو نہیں دیکھتے، کیسا اونچا کیا گیا! اور پہاڑوں پر نظر نہیں ڈالتے، کس طرح کھڑے کیے گئے اور زمین کو نہیں دیکھتے، کس طرح بچھائی گئی! ۱۷-۲۰

تم یاددہانی کر دو، تم بس ایک یاددہانی کر دینے والے ہو۔ تم ان پر داروغہ نہیں مقرر ہو۔ رہا وہ جو منہ موڑے اور انکار کرے گا تو اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا۔ بےشک ہماری ہی طرف ان کی واپسی ہے، پھر ہمارے ہی ذمہ ان سے حساب لینا ہے! ۲۱-۲۶

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ (۱)

قیامت اور احوالِ قیامت کی تصویر

اس انداز میں جو سوال ہوتا ہے وہ طلبِ جواب کے لیے نہیں بلکہ کسی چیز کے ہول و ہیبت یا اس کی عظمت و شان کے اظہار کے لیے ہوتا ہے۔ یہاں جو خطاب ہے اگرچہ عام بھی ہو سکتا ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں چنانچہ اسی پر عطف کر کے آگے فرمایا ہے: فَذَكِّرْ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُذَكِّرٌ (۲۱) (تم یاد دہانی کر دو، تم تو صرف ایک یاد دہانی کر دینے والے ہو)۔

'غَاشِیَة' کے معنی ڈھانک لینے والی اور چھا جانے والی کے ہیں۔ یہاں یہ لفظ قیامت کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی آفت ایک ہمہ گیر آفت ہو گی جو سب پر چھا جائے گی، کسی کو بھی اس سے مفر نہیں ہو گا۔ اس کا احوال (حدیث) یہاں سنایا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گیا ہے لیکن مقصود، جیسا کہ آگے کی آیات سے واضح ہو گا، ان کفار کو آگاہ کرنا ہے جو اول تو آخرت کو مانتے ہی نہیں تھے اور اگر کسی درجہ میں مانتے بھی تھے تو اپنے اس گمان کی بنا پر اس سے بالکل نچنت تھے کہ ان کو جو کچھ یہاں حاصل ہے اس سے بڑھ کر وہاں حاصل ہو گا۔

وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۙ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ (۲-۳)

ان لوگوں کا حال جو قیامت سے نچنت رہے

اوپر کا سوال، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، طلبِ جواب کے لیے نہیں بلکہ صرف تنبیہ کے لیے تھا کہ سننے والے اس کو اچھی طرح سن لیں۔ اس کے بعد قرآن نے خود ہی اس کا جواب دیا کہ اس دن کتنے چہرے بالکل اترے اور تھکے ہارے ہوں گے۔

'خَاشِعَة' کے معنی جھکے ہوئے، پست اور اداس کے ہیں، 'عَامِلَة' کے معنی محنت سے نڈھال اور 'نَاصِبَة' کے معنی تھکے ہارے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس دن جب ان کی توقع کے برعکس یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ ان کو اپنے اعمال کی پاداش میں جہنم میں پڑنا ہے تو ان کے چہرے فق ہو جائیں گے، ان پر ہوائیاں اڑنے لگیں گی۔

'وُجُوْه' سے مراد اگرچہ اشخاص ہیں لیکن ان کو تعبیر 'وُجُوْه' سے اس لیے کیا ہے کہ مقصود ان کی اندرونی کیفیات کو ظاہر کرنا ہے اور کیفیات کا اظہار سب سے زیادہ نمایاں طریقہ پر چہروں ہی سے ہوتا ہے۔

تَصْلٰى نَارًا حَامِیَةً ۙ تُسْقٰى مِنْ عَیْنٍ اٰنِیَةٍ (۴-۵)

یہ اس چیز کا بیان ہے جو اس بدحواسی کا سبب بنے گی جو اوپر مذکور ہوئی یعنی وہ دوزخ کی بھڑکتی

آگ میں پڑیں گے اور کھولتے چشمے کا پانی پئیں گے۔ 'اٰنِیَۃٌ' کے معنی ہیں جس کی گرمی اپنے آخری نقطہ پر پہنچی ہوئی ہو۔

قرآن مجید کے دوسرے مقامات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہاں مجرموں کی جس بدحواسی و پریشان حالی کا ذکر ہے اس کا تعلق اس وقت سے ہے جب ان پر یہ حقیقت واضح ہوگی کہ وہ دوزخ میں ڈالے جانے والے ہیں۔ سورۂ قیامہ میں تصریح ہے کہ

وَوُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍۭ بَاسِرَۃٌ ۙ تَظُنُّ اَنْ یُّفْعَلَ بِہَا فَاقِرَۃٌ ؕ (القیٰمۃ ۷۵: ۲۴-۲۵)

اور اس دن بہت سے چہرے بگڑے ہوئے ہوں گے۔ وہ گمان کرتے ہوں گے کہ ان پر کمر توڑ دینے والی مصیبت ٹوٹنے والی ہے۔

عام طور پر لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہ ان کے دوزخ میں پڑنے کے بعد کے حالات بیان ہو رہے ہیں لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ دوزخ میں پڑنے کے بعد چہرے اداس ہی نہیں ہوں گے بلکہ وہ آگ پر گھسیٹے جائیں گے اور مزید وہ سب کچھ ہوگا جو دوزخ کے احوال سے متعلق قرآن میں بیان ہوا ہے۔

لَیْسَ لَہُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِیْعٍ ۙ لَّا یُسْمِنُ وَلَا یُغْنِیْ مِنْ جُوْعٍ (۶-۷)

دوزخیوں کی غذا

پانی کے بعد یہ اس کھانے کا ذکر ہے جو دوزخ میں ان کو ملے گا۔ فرمایا کہ ان کو کھانے کی کوئی چیز وہاں میسر نہیں آئے گی، صرف ضریع چابیں گے اور اس پر کھولتا ہوا پانی پئیں گے۔ 'ضَرِیْعٌ' ایک خاردار زہریلی جھاڑی ہے جس کو کوئی جانور نہیں چھوتا۔

مقصودِ کلام یہاں حصر نہیں ہے کہ ان کا کھانا صرف 'ضریع' ہوگا۔ بلکہ یہ استثنائے منقطع ہے۔ حصر کا مضمون اس صورت میں پیدا ہوتا جب 'ضریع' کسی درجے میں بھی کوئی کھانے کی چیز ہوتی۔ جب وہ سرے سے طعام میں داخل ہی نہیں ہے تو استثناء سے صرف یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کھانے کی کوئی چیز جب انھیں میسر نہیں آئے گی تو بھوک سے بے بس ہو کر وہ 'ضریع' زہر مار کریں گے جو دوزخیوں کے لیے وہاں موجود ہوگی۔ اس سے اسی نوع کی بعض دوسری چیزوں کی نفی نہیں ہوتی جو وہاں موجود ہوں گی اور دوزخی ان کو کھانے پر مجبور رہوں گے۔ چنانچہ دوسرے مقام میں مذکور ہے کہ ان گنہ گاروں کا کھانا 'زقوم' بھی ہوگا:

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۙ طَعَامُ الْاَثِیْمِ ۚ (الدخان ۴۴: ۴۳-۴۴)

بے شک زقوم کی جھاڑی گنہگاروں کی غذا ہوگی۔

اسی طرح ایک مقام میں 'غسلین' کا بھی ذکر آیا ہے:

وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِیْنٍ ۙ

اور ان کی غذا زخموں کا دھوون ہوگی۔

لَا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ ۝ جس کو صرف گنہگار ہی کھا سکیں گے۔
(الحاقۃ - ۶۹ : ۳۶-۳۷)

اس سے واضح ہوا کہ دوزخیوں کو کوئی چیز کھانے کی نہیں ملے گی، صرف وہ چیزیں ملیں گی جو نہ صرف یہ کہ کھانے کی ہیں نہیں بلکہ وہ ایسی ہیں کہ دوزخیوں کے سوا کوئی ان کو نگل بھی نہیں سکتا۔

'لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ' غذا کے اصل فائدے دو ہیں۔ جسم کی توانائی کو قائم رکھنا اور بھوک کی اذیت کو رفع کرنا۔ اس سے نہ جسم میں توانائی آئے گی اور نہ بھوک ہی رفع ہو گی۔ گویا صرف اس کے چبانے اور نگلنے کی اذیت ان کے حصے میں آئے گی۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ۝ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ۝ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ (۸-۱۰)

اہلِ ایمان کا بیان

اب یہ دوسرے گروہ، یعنی اہلِ ایمان، کا بیان ہے۔ فرمایا کہ بہت سے چہرے اس دن شگفتہ و شاداب ہوں گے۔

یہی بات سورۂ قیامہ میں وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (۲۲-۲۳) کے الفاظ میں گزر چکی ہے۔ اوپر منکرینِ قیامت کے چہروں کی مایوسی، افسردگی اور تھکاوٹ کا ذکر ہوا، یہ ان کے مقابل میں ان لوگوں کا بیان ہے جنھوں نے دنیا کو آخرت کے لیے برتا اور اس امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ ان کے چہروں پر ابدی فتح مندی کی بشاشت اور شگفتگی جھلک رہی ہو گی۔

'لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ' یہ بشاشت ان کے چہروں پر اس وجہ سے نمایاں ہو گی کہ انھوں نے دنیا میں آخرت کے لیے جو کمائی کی اس کا حاصل ان کے سامنے ہو گا اور وہ اس سے پوری طرح مطمئن ہوں گے کہ ان کے ہر عمل کا صلہ ان کو بھرپور ملا اور ان کے رب نے جو وعدے ان سے کیے وہ سب پورے کیے۔ اس کی تفصیل آگے کی آیات میں بھی موجود ہے اور اس کے بعد والی سورہ میں بھی اس کا ایک خاص پہلو بیان ہوا ہے۔ وہاں ان شاء اللہ ہم اس کے بعض دقیق مضمرات پر روشنی ڈالیں گے۔

'فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ' یہ آخرت میں ان کے مستقر و مقام کا پتہ دیا ہے کہ وہ اونچے باغ میں ہوں گے۔ اونچے باغ، یعنی وہ باغ بلندی پر ہوں گے۔ ایک اچھے باغ کا تصور اہلِ عرب کے ہاں یہ ہے کہ باغ بلندی پر ہو، اس کے حاشیہ پر کھجوروں کے اونچے درخت ہوں تاکہ وہ دور ہی سے دلکش بھی معلوم ہو اور سموم و سیلاب وغیرہ سے محفوظ بھی رہے۔

لَا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً (۱۱)

اہلِ جنت کی مجلس ہر شر سے محفوظ ہو گی

اہلِ دوزخ سے متعلق قرآن میں یہ بات جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ دوزخ کے باڑے میں پہنچتے ہی وہ ایک دوسرے پر لعنت کریں گے کہ فلاں نے ہم کو گمراہ کیا، وہ گمراہ نہ کرتا تو ہم ہدایت پر رہتے۔

لیڈروں اور ان کے پیروؤں میں تو تکار رہو گی۔ پیرو لیڈروں کے لیے دونے عذاب کا مطالبہ کریں گے کہ انھوں نے ان کی راہ ماری اس وجہ سے یہ دگنے عذاب کے سزاوار ہیں۔ لیڈر جواب دیں گے کہ ہم نے تم کو وہی بنایا جو ہم خود تھے، تم نے خود اپنی شامت بلائی کہ جان بوجھ کر ہماری پیروی کی۔ اس کے برعکس اہلِ جنت کا یہ حال بیان ہوا ہے کہ وہ جنت میں داخل ہونے کے بعد ایک فتح مند ٹیم کی طرح ایک دوسرے کا خیر مقدم تحیت و سلام سے کریں گے، آپس میں مبارک سلامت کے تبادلے ہوں گے، نہایت خوش گوار موڈ میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھیں گے۔ ان کی مجلس محبت و اخلاص کی عطر بیزیوں سے معمور ہو گی۔ سورۂ واقعہ میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے:

لَا یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡهَا لَغۡوًا وَّلَا تَاۡثِیۡمًا ۙ اِلَّا قِیۡلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿الواقعۃ - ۵۶: ۲۵-۲۶﴾

وہ اس میں کوئی لغو یا گناہ کی بات نہیں سنیں گے۔ بس ہر طرف مبارک سلامت ہی کا چرچا ہو گا۔

یہ امر بھی یہاں ملحوظ رہے کہ اہلِ جنت کی شراب بھی فتورِ عقل اور ہذیان پیدا کرنے والی نہیں ہو گی کہ اس کے نشہ میں وہ اتنے از خود رفتہ ہو جائیں کہ زبان سے کوئی ناشائستہ کلمہ نکل جائے۔

فِیۡهَا عَیۡنٌ جَارِیَۃٌ ﴿۱۲﴾

جنت کے خوش نما مناظر

جنت کے خوش گوار ماحول کے بعد یہ اس کے خوش نما مناظر کی طرف اشارہ ہے کہ اس میں چشمہ جاری ہو گا۔ یہ صرف اس چشمہ کا ذکر ہے جو باغ کی شادابی کے لیے ہو گا۔ اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ چشمہ ایک ہی ہو گا۔ چنانچہ سورۂ دہر میں ایک سے زیادہ چشموں اور ان سے نکلی ہوئی متعدد شاخوں کا ذکر ہے لیکن ان رحمتوں کی نوعیت، جیسا کہ ان کی وضاحت ہو چکی ہے، بالکل مختلف ہو گی۔ ان دونوں بیانوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

فِیۡهَا سُرُرٌ مَّرۡفُوۡعَۃٌ ﴿ۙ۱۳﴾ وَّ اَکۡوَابٌ مَّوۡضُوۡعَۃٌ ﴿ۙ۱۴﴾ وَّ نَمَارِقُ مَصۡفُوۡفَۃٌ ﴿ۙ۱۵﴾ وَّ زَرَابِیُّ مَبۡثُوۡثَۃٌ ﴿ؕ۱۶﴾ (۱۳-۱۶)

جنت کا سامانِ آسائش

یہ اس سامانِ آرائش و زیبائش کا ذکر ہے جو اہلِ جنت کی آسائش کے لیے موجود ہو گا۔ اس کی تفصیلات بھی مختلف سورتوں میں مختلف الفاظ میں بیان ہوئی ہیں۔ یہ اختلاف زیادہ تر تو اجمال و تفصیل کی نوعیت کا ہے لیکن بعض مقامات میں وہ تفاوت بھی ملحوظ ہے جو اہلِ جنت کے درجات و مراتب میں ہو گا۔ نیز ان کو پڑھتے ہوئے یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھیے کہ یہ چیزیں تمثیل کی صورت میں بیان ہوئی ہیں۔ عالمِ غیب کی نادیدہ حقیقتیں تمثیل ہی کے پیرائے میں بیان ہو سکتی ہیں اور ان کے لیے الفاظ اسی زبان اور اسی تہذیب و تمدن سے مستعار لینے پڑتے ہیں جس سے مخاطب فی الجملہ آشنا ہوں۔

'سُرُرٌ مَّرۡفُوۡعَۃٌ' - ان کے بیٹھنے کے لیے اونچے تخت ہوں گے۔ اس زمانے کے امراء و سلاطین کی نشست اونچے تختوں ہی پر ہوتی تھی اس وجہ سے تمثیل میں اسی کا ذکر ہوا ہے لیکن جنت ہر جنتی کی خواہش کے مطابق ہوگی۔ وہ جس شکل میں جنت کی آرائش چاہے گا اس کی جنت اسی شکل میں آراستہ ملے گی۔

'وَّاَکۡوَابٌ مَّوۡضُوۡعَۃٌ' - 'اَکۡوَابٌ' جمع ہے 'کُوۡبٌ' کی۔ 'کُوۡبٌ' اور کپ، (CUP) ایک ہی چیز ہے۔ یہ پیالے، آب خورے، جام سب کے لیے آتا ہے۔ 'مَوۡضُوۡعَۃٌ' کے معنی ہیں قرینہ سے رکھے ہوئے۔

'وَّنَمَارِقُ مَصۡفُوۡفَۃٌ' - 'نَمَارِقُ' قالینوں اور غالیچوں کے معنی میں آتا ہے۔ یعنی ان کی ہر نشست گاہ میں قالین اور غالیچے ترتیب سے باہمدگر پیوستہ بچھے ہوں گے۔ کوئی جگہ خالی نہیں ہوگی۔

'وَّزَرَابِیُّ مَبۡثُوۡثَۃٌ' - 'زَرَابِیُّ' جمع ہے 'زُرۡبِیَّۃٌ' کی، یہ تکیوں اور نہالچوں کے معنی میں آتا ہے یعنی قالینوں پر تکیے اور نہالچے ہر طرف بکھرے پڑے ہوں گے۔ بیٹھنے والا جہاں بیٹھے وہ اس کے لیے آسائش کا باعث ہوں گے۔ آج صوفوں کا دور ہے لیکن ان پر بھی گدیاں اور تکیے رکھنے کا رواج ہے۔

اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ ﴿۱۷﴾ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیۡفَ رُفِعَتۡ ﴿۱۸﴾ وَاِلَی الۡجِبَالِ کَیۡفَ نُصِبَتۡ ﴿۱۹﴾ وَاِلَی الۡاَرۡضِ کَیۡفَ سُطِحَتۡ (۱۷-۲۰)

قیامت کی بعض آفاقی نشانیوں کی یاددہانی

یہ ان لوگوں کو جو مذکورہ جزا و سزا سے بالکل بےخوف زندگی گزار رہے تھے، آفاق کی بعض نہایت نمایاں نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے کہ آخر وہ ان چیزوں پر کیوں غور نہیں کرتے جو خالق کی صفاتِ ربوبیت وقدرت اور اس کی حکمت وعظمت کی اس طرح شہادت دے رہی ہیں کہ جس کے اندر ذرا بھی حق پسندی ہو وہ قیامت اور جزاء و سزا کا انکار نہیں کر سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ ان نشانیوں کے ہوتے وہ اس بات پر کیوں اڑے ہوئے ہیں کہ کوئی نشانیٔ عذاب ظاہر ہو یا قیامت آجائے تب ہی وہ پیغمبر کی بات مانیں گے۔

اونٹ کی طرف اشارہ

'اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ' - سب سے پہلے اونٹ کی طرف توجہ دلائی کہ آخر وہ اپنے سفر و حضر کے سب سے زیادہ خدمت گزار، وفاشعار اور جاں نثار ساتھی اونٹ ہی پر کیوں نہیں غور کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کن صفات و خصوصیات کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ کس طرح اس کو ان کا مطیع بنا دیا ہے کہ ایک عظیم الجثہ اور طویل القامت جانور ہونے کے باوجود اس کی ناک میں نکیل ڈال کر وہ جدھر چاہیں لیے پھرتے ہیں اور وہ بے چون وچرا ان کی اطاعت کرتا ہے۔ وہ حضر میں ان کا رات دن کا ساتھی ہے، سفر میں ان کا باربردار رفیق، صحرا میں ان کا سفینہ

ہے۔ ہفتہ ہفتہ بھر وہ بھوک سے اور پیاس کا مقابلہ کرتا ہے۔ خار دار جھاڑیوں سے اپنا پیٹ بھر لیتا ہے اور کسی بڑی سے بڑی مشقت سے بھی انکار نہیں کرتا۔ اس کا گوشت، پوست، دودھ، ہر چیز مالک کے کام آتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا بول و براز بھی رائگاں جانے والی چیز نہیں ـــــ اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اتنے گوناگوں فوائد و مصالح کے ساتھ یہ جانور آپ سے آپ پیدا ہو گیا اور انسان نے اس کو اتفاق سے پکڑ کر اپنے لیے سازگار بنا لیا ہے یا ربِّ کریم نے اپنی قدرت و حکمت سے اس کو پیدا کیا اور اس کو انسان کی خدمت میں لگایا ہے۔ ظاہر ہے کہ عقل اس دوسری بات ہی کی گواہی دیتی ہے۔ اگر یہ دوسری ہی بات قابلِ قبول ہے تو کیا انسان پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ وہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بن کر زندگی گزارے جس نے اس کے لیے بغیر کسی استحقاق کے زندگی کی یہ آسائشیں فراہم کی ہیں ورنہ ایک دن اپنے رب کے آگے جواب دہی اور اپنے کفرانِ نعمت کی سزا بھگتنے کے لیے تیار رہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اونٹ کا ذکر بطورِ مثال محض ان خصوصیات کی بنا پر ہوا ہے جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔ مقصود ان تمام جانوروں کی طرف توجہ دلانا ہے جو قدرت نے انسان کے لیے مسخر کیے ہیں اور جن پر اس کی معاش و معیشت کا انحصار ہے۔ دوسرے مقامات میں قرآن نے ان کا حوالہ بھی دیا ہے اور مدعا اس حوالہ سے اس حقیقت کو انسان پر واضح کرنا ہے کہ ہر نعمت منعم کا شکر واجب کرتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ ایک ایسا روز آئے جس میں شکر گزار اپنی شکر گزاری کا انعام پائیں اور ناشکرے اپنے کفرانِ نعمت کی سزا بھگتیں۔ ان شاء اللہ سورۂ عادیات کی تفسیر میں اس پر مفصل بحث آئے گی۔

آسمان کی طرف اشارہ

'وَاِلَی السَّمَآءِ کَیۡفَ رُفِعَتۡ'۔ چونکہ مقصود یہاں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، نمایاں چیزوں کی طرف متوجہ کرنا ہے اس وجہ سے اونٹ جیسے طویل القامت جانور کا ذکر آیا تو وہیں سے آسمان کی طرف توجہ دلا دی ہے کہ وہ آسمان پر کیوں نہیں غور کرتے کہ کس طرح یہ چھت بلند کی گئی! یعنی ایسی ناپیدا کنار چھت بلند تو ہو گئی لیکن کسی کو وہ ستون نظر نہیں آتے جن پر یہ قائم ہے۔ پھر اس سے بھی عجیب یہ ماجرا ہے کہ نہیں معلوم کہ کب سے یہ قائم ہے، لیکن کوئی ماہر سے ماہر انجینئر کسی بڑی سے بڑی دوربین کی مدد سے بھی، اس میں کسی معمولی سے معمولی رخنہ یا خلا کی نشان دہی نہیں کر سکتا۔ پھر اس سے بھی عجیب تر ماجرا یہ ہے کہ ہے تو یہ زمین سے اتنی دور کہ اس کی مسافت کا علم کسی کو نہیں لیکن اسی کے سورج، چاند ستارے اور سیارے زمین کی رونق اور اس کے لیے روشنی، حرارت اور زندگی کا ذریعہ ہیں۔ اسی سے بارش نازل ہوتی ہے جس سے زمین کی تمام مخلوقات کو روزی حاصل ہوتی ہے۔

انسان سوچے کہ جس خالق کی قدرت و حکمت کا یہ حال ہے کہ وہ آسمان کو بنا سکتا ہے، کیا اس کے مرکھپ جانے کے بعد دوبارہ اس کو اٹھا کھڑا کرنا اس کے لیے مشکل ہو جائے گا! چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ یہ سوال اللہ تعالیٰ نے کیا ہے کہ بتاؤ، تمہارا پیدا کیا جانا زیادہ مشکل ہے یا آسمان کا؟

زمین کے عجائبات کی طرف اشارہ

'وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ': آسمان اور اس کے عجائبات کی سیر کرانے کے بعد نگاہ کو پھر زمین کی طرف توجہ دلائی اور اس کی اس نشانی کی طرف اشارہ فرمایا جو زمین و آسمان کے مابین خالق کائنات کی قدرت و حکمت کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ فرمایا کہ پہاڑوں کو دیکھو کہ وہ کس طرح نصب کیے گئے ہیں۔ وہ زمین کے توازن کو قائم رکھے ہوئے ہیں کہ مبادا وہ سب کے سمیت کسی سمت کو لڑھک جائے۔ وہ ہواؤں اور بادلوں کو بھی کنٹرول کرتے ہیں تاکہ بارش کی تقسیم قدرت کی حکمت اور اس کے منشا کے مطابق ہو۔ ہیں تو یہ پتھر کے لیکن قدرت نے ان کے اندر سے خلق کی سیرابی کے لیے شیریں پانی کے سوتے جاری کر رکھے ہیں۔ وہ قدرت کے بے شمار قیمتی خزانوں کے امین ہیں جن کو انسان برابر دریافت کرتا اور ان کو اپنے تمدن کی تعمیر و ترقی میں صرف کرنے میں رات دن سرگرم ہے۔ ان میں ایسے پہاڑ بھی ہیں جو ناقابل عبور ہیں لیکن قدرت نے ان کے اندر درّے اور راستے نکال دیے ہیں تاکہ وہ قوموں اور قوموں کے درمیان حجاب بن کے نہ رہ جائیں۔ انسان غور کرے کہ کیا یہ خالق کی عظیم قدرت، عظیم حکمت، اور اس کی عالم گیر ربوبیت پر شاہد نہیں ہیں! اور پھر غور کرے کہ کیا جو خالق ان صفات سے متصف ہے وہ انسان کو اس دنیا میں شتر بے مہار بنا کے چھوڑے رکھے گا، کوئی ایسا دن نہیں لائے گا جس میں وہ سب کا حساب کرے اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا یا سزا دے؟ کیا یہ اس کی ربوبیت اور اس کی حکمت کا بدیہی تقاضا نہیں ہے؟ کیا کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہ اس کی قدرت کے دائرہ سے خارج اور بعید از امکان ہے!!

پہاڑوں کے بعد ہموار زمین پر

'وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ': اب یہ نگاہ کو پہاڑوں سے زمین پر اتارا اور دعوت دی کہ زمین کو دیکھیں کہ کس طرح یہ ان کے قدموں کے نیچے بچھائی گئی ہے۔ کس طرح اس کو گوشے گوشے میں ان کی پرورش کے لیے ضرورت کی چیزیں پیدا کی گئی ہیں۔ اس کی مسطح زمینوں پر یہ اپنے گھر بنا لیتے ہیں۔ اس کے میدانوں میں ان کے کھیت اور ان کے باغ و چمن ہیں۔ اس کی نہریں، اس کے کنوئیں اور اس کے چشمے ان کے کھیتوں اور باغوں کو شاداب رکھتے ہیں، اس کے جنگلوں اور اس کی وادیوں میں ان کے چوپایوں اور گلوں کے لیے پیٹ بھرنے کے غیر محدود وسائل موجود ہیں۔ ان ساری چیزوں کو دیکھیں اور سوچیں کہ جس نے ان کو اس بنے بنائے گھر میں اتارا اور اس کی ساری چیزیں وہ برت رہے ہیں کیا اس کو اس امر سے کوئی بحث نہیں ہے کہ کون گھر کے مالک کی پسند کے مطابق زندگی گزارتا ہے اور کون اس کو اپنے اب و جد کی میراث سمجھ کر اس میں اکڑتا اور ادھم مچاتا ہے؟ ظاہر ہے کہ عقل یہی کہتی ہے کہ اس کو اس سے بحث ہے اور ہونی چاہیے۔ اگر یہ نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ العیاذ باللہ یا تو وہ بے حس و بلید اور خیر و شر کے شعور سے عاری ہے یا بالکل بے بس و مجبور ہے لیکن جس ذات کی قدرت، حکمت، ربوبیت اور عظمت کی وہ نشانیاں آپ نے دیکھی ہیں، جن کا ذکر اوپر ہوا،

اس کو نہ بے حمیت و بے شعور فرض کیا جا سکتا نہ عاجز و بے بس تو لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ وہ اس گھر میں انسان کو آباد کر کے دیکھ رہا ہے کہ وہ کیا بناتا ہے۔ بالآخر ایک دن اس امتحان کی مدت پوری ہو گی اور وہ سب کو اپنے حضور میں جمع کر کے ان کی نیکی اور بدی ان کے سامنے رکھے گا۔ جس کی روش اس کی پسند کے مطابق رہی ہو گی اس کو وہ اپنی رحمت سے نوازے گا اور جس نے اس گھر میں فساد مچایا ہو گا وہ اپنے کیے کی سزا بھگتے گا۔

'کَیْفَ خُلِقَتْ' اور 'کَیْفَ رُفِعَتْ' وغیرہ کے لفظوں میں جو سوالات کیے گئے ہیں ان کے اندر اجمال ہے، اس کی تفصیل قرآن کی دوسری سورتوں میں بیان ہوئی ہے۔ ہم نے اوپر جو وضاحت کی ہے انہی سورتوں کی روشنی میں کی ہے اور صرف اسی حد تک کی ہے جس حد تک اس سورہ میں ضروری تھی۔ مذکورہ چیزوں سے قرآن نے اپنے جن جن دعاوی پر دلیل قائم کی ہے اگر کوئی ان سب کو سمجھنا چاہے تو وہ قرآن کے ان تمام مقامات کا جائزہ لے جہاں زمین، آسمان، پہاڑ اور اونٹ کسی پہلو سے زیر بحث آئے ہیں۔

ترتیب بیان کی ندرت

یہاں ترتیب بیان میں بھی ایک خاص ندرت ہے کہ اس کے اندر صعودی اور ہبوطی دونوں ترتیبیں جمع ہو گئی ہیں۔ مقصود تو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، چند نمایاں نشانیوں کی طرف توجہ دلانا ہے تاکہ ضدیوں کو فرار کی کوئی راہ نہ ملے۔ چنانچہ سب سے قریب کی نمایاں چیز اونٹ کی طرف پہلے اشارہ فرمایا جس کی نفع بخشی سے مخاطبوں میں سے کسی کے لیے مجالِ انکار نہیں تھی۔ اونٹ کی طرف اشارہ کرنے کے بعد وہیں سے آسمان کی طرف توجہ دلا دی کہ ایک نظر اس کو بھی دیکھیں۔ پھر زمین کی طرف بازگشت ہوئی تو بیچ میں پہاڑ آ گئے، ان کی طرف توجہ دلا دی۔ پہاڑوں کے بعد سطحِ زمین توجہ کے لیے اپنے اندر قدرتی کشش رکھتی ہے۔

ان میں سے دو نشانیاں ـــــ اونٹ اور زمین ـــــ ربوبیت کے پہلو سے زیادہ نمایاں ہیں اور دو ـــــ آسمان اور پہاڑ ـــــ خالق کی قدرت و حکمت کے پہلو سے۔ خالق کی انہی صفتوں پر قیامت، معاد اور جزاء و سزا کے پورے فلسفہ کی بنیاد ہے جس کی وضاحت اس کتاب میں ہم برابر کرتے آ رہے ہیں۔ اب دیکھیے اس ترتیب بیان نے نگاہ کی ایک ہی گردش میں کس طرح ان تمام نمایاں آثار کو سامنے کر دیا ہے جو اس فلسفہ کے حق ہونے کی گواہی دے رہے ہیں۔

فَذَكِّرْ ۚ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ ‎۝ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ (۲۱-۲۲)

نبی صلعم کی طرف التفات

انذار کے حق میں دلائل بیان کرنے کے بعد یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آپ کو تسلی دینے کے لیے التفات ہے کہ جو لوگ تمہارے انذار کو جھٹلا رہے ہیں وہ اس وجہ سے نہیں جھٹلا رہے ہیں

کہ تمھارے انذار کے حق میں دلائل نہیں ہیں۔ دلائل تو زمین سے لے کر آسمان اور آسمان سے لے کر زمین تک چپہ چپہ پر ہیں لیکن ان سے فائدہ وہی اٹھاتے ہیں جن کے اندر خشیت ہوتی ہے۔ انہی لوگوں کی طرف سابق سورہ میں 'سَیَذَّکَّرُ مَنْ یَّخْشٰی' (الاعلیٰ - ۸۷: ۱۰) کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ رہے وہ لوگ جن کے دلوں پر قساوت چھا چکی ہے وہ ان نشانیوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے چنانچہ سابق سورہ میں فرمایا ہے: 'وَیَتَجَنَّبُھَا الْاَشْقَی' (الاعلیٰ - ۸۷: ۱۱) مطلب یہ ہے کہ آپ ان کے رد و قبول سے بے نیاز ہو کر اپنی تذکیر و تبلیغ جاری رکھیں اور مطمئن رہیں کہ آپ کا فرض صرف تبلیغ و تذکیر ہی ہے۔ یہ ذمہ داری آپ پر نہیں ہے کہ لازماً آپ ان کے دلوں میں ایمان اتار ہی دیں۔ اللہ نے آپ کو یاددہانی کر دینے والا بنا کر بھیجا ہے۔ ان کے ایمان کا ٹھیکہ دار بنا کر نہیں بھیجا ہے کہ ایمان نہ لانے کی پرسش آپ سے ہو۔

اِلَّا مَنْ تَوَلّٰی وَکَفَرَ ۙ فَیُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَکْبَرَ (۲۳-۲۴)

یہاں حرفِ استثناء سے پہلے کلام میں کچھ حذف ہے جو قرینہ سے سمجھا جاتا ہے۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ جو صاحب توفیق ہوں گے وہ آپ کی دعوت سے فیض پائیں گے، رہے وہ جو منہ موڑیں اور کفر کریں گے تو اللہ ان کو سب سے بڑے عذاب کا مزا چکھائے گا۔

'اَلْعَذَابَ الْاَکْبَرَ' سے مراد جہنم کا عذاب ہے جو دنیا کے تمام عذابوں سے بڑا ہوگا۔ اس دنیا کا کوئی عذاب نہ شدت میں اس کا مقابلہ کر سکتا نہ پائیداری میں۔ سابق سورہ میں اس کو 'النَّارَ الْکُبْرٰی' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے لیکن مدعا ایک ہی ہے۔

اِنَّ اِلَیْنَآ اِیَابَهُمْ ۙ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا حِسَابَهُمْ (۲۵-۲۶)

یعنی کوئی اس مغالطہ میں نہ رہے کہ یہ محض ایک دھمکی ہے۔ بلکہ یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ ہر جان کی واپسی ہماری ہی طرف ہوتی ہے کسی اور کی طرف نہیں ہوتی ہے اور یہ بھی ہم پر واجب ہے کہ ہم لوگوں کا حساب کریں اور ان کے اعمال کے مطابق ان کو جزا اور سزا دیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دنیا ایک بازیچۂ اطفال اور ایک بالکل بے مقصد و بے حکمت کارخانہ ہے حالانکہ خالق کا کوئی کام بھی نہ حکمت سے خالی ہے نہ ہو سکتا ہے۔

بفضلِ ایزدی ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وھو الموفق للخیر والسداد۔

لاہور

۱۱- نومبر ۱۹۷۹ء

۲۰- ذوالحجہ ۱۳۹۹ھ

تدبّرِ قرآن

٨٩

الفجر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱- سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلّق

سابق سورہ آسمان و زمین کی بعض نمایاں نشانیوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اس مضمون پر ختم ہوئی کہ جس خالق نے ان چیزوں کو وجود بخشا اس کی عظیم قدرت و حکمت اور اس کی غیر محدود ربوبیت سے کسی عاقل کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ مقصود اس سے اس حقیقت کو سامنے لانا ہے کہ جب وہ عظیم قدرت و حکمت رکھنے والا بھی ہے اور اس وسعت کے ساتھ اس نے اپنا خوانِ کرم بھی بچھا رکھا ہے تو اس کی ان صفات کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ ایک ایسا دن بھی لائے جس میں ان لوگوں سے باز پرس کرے جنھوں نے اس کی نعمتیں پا کر اس کی دنیا میں دھاندلی مچائی اور ان لوگوں کو انعام دے جنھوں نے شکر گزاری اور اطاعت شعاری کی زندگی بسر کی۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو یہ اس کی رحمت و ربوبیت کے بھی منافی ہے اور اس کی قدرت و حکمت کے بھی۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ تم جس چیز سے لوگوں کو آگاہ کر رہے ہو اس کے دلائل و شواہد آسمان و زمین کے چپہ چپہ پر موجود ہیں۔ اگر ان لوگوں کو نظر نہیں آ رہے ہیں تو تم اپنا فرضِ انذار ادا کر دو۔ اندھوں کو راہ دکھانا تمھارا کام نہیں ہے۔

اس سورہ میں آفاق اور تاریخ کے بعض نہایت نمایاں آثار و واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ ثابت فرمایا ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز کی باگ اس کے خالق و مالک کے ہاتھ میں ہے۔ وہی جس کو جس حد تک چاہتا ہے ڈھیل دیتا ہے اور جہاں چاہتا ہے روک دیتا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی شے اس کی مقرر کی ہوئی حد سے آگے بڑھ سکے۔ قوموں کے ساتھ بھی اس کا یہی معاملہ ہے۔ ان کو جو ڈھیل ملتی ہے اس کے اذن سے ملتی ہے اور جب ان پر گرفت ہوتی ہے تو اس کے حکم سے ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھ ہر وقت قوموں کی نبض پر رہتے ہیں۔ اس دنیا میں ہر ایک کا امتحان ہو رہا ہے کہ وہ نعمت پا کر شکر کی روش اختیار کرتا ہے یا فخر و استکبار کی۔ اسی طرح مشکل حالات میں صبر و ثابت قدمی کا ثبوت دیتا ہے یا مایوسی و دل شکستگی کا۔ پہلی روش ابدی فتح و فیروز مندی کی ضامن ہے اور دوسری دائمی خسران و نامرادی کی۔ اللہ کا مبارک بندہ وہ ہے جو نفسِ مطمئنہ کے ساتھ اپنے رب کی طرف لوٹا۔ نہ نعمت پا کر مغرور ہوا اور نہ فقر کی آزمائش سے دل شکستہ۔ انھی کو

رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً کی بادشاہی حاصل ہوگی۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی تقسیم اس طرح ہے:

(۱-۵) آفاق کی بعض نشانیوں کی طرف اشارہ جو اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اس کائنات کی ہر چیز کی باگ اس کے خالق کے ہاتھ میں ہے۔ وہی جس حد تک چاہتا ہے اس کو ڈھیل دیتا ہے اور جہاں چاہتا ہے روک لیتا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی شے اس کی مقرر کی ہوئی حد سے آگے بڑھ سکے یا پیچھے ہٹ سکے۔

(۶-۱۴) تاریخ کی بعض عظیم قوموں کا حوالہ اس حقیقت کے ثبوت میں کہ خالق کی یہی نگرانی دنیا کی قوموں پر بھی قائم ہے۔ جب وہ اپنے اختیار سے غلط فائدہ اٹھا کر خدا کے حدود کو لانگنے کی جسارت کرتی ہیں تو ان کو بس ایک خاص حد ہی تک ڈھیل ملتی ہے۔ اس کے بعد لازماً ان کی پکڑ ہوتی ہے اور ایسی سخت پکڑ ہوتی ہے کہ وہ اپنی تمام عظمت و شوکت کے باوجود اس کے آگے سپر انداز ہو جاتی ہیں۔

(۱۵-۲۰) انسان کی اس گمراہی کی طرف اشارہ کہ جب اس کو نعمت ملتی ہے تو وہ اس کو اپنا حق سمجھتا اور اس مغالطہ میں پڑ جاتا ہے کہ وہ خدا کی نظروں میں عزت و شرف رکھنے والا ہے اس وجہ سے اس کی عزت افزائی ہوئی ہے۔ اسی طرح اگر وہ نعمت سے محروم ہو جاتا ہے تو سمجھتا ہے کہ خدا نے اس کی ناقدری کی ہے۔ حالانکہ نعمت ملے یا تنگیٔ رزق سے سابقہ پیش آئے، دونوں ہی حالتیں بطور امتحان پیش آتی ہیں۔ پہلی حالت میں اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ انسان نعمت پا کر شکر کرنے والا اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے والا بنتا ہے یا اکڑنے والا اور دوسروں کے حقوق غصب کرنے والا بن کے رہ جاتا ہے۔ دوسری صورت میں یہ دیکھتا ہے کہ وہ اپنے رب کی اس تقسیم پر قانع و صابر، راضی و مطمئن رہتا ہے یا خدا سے مایوس، شاکی اور پست ہمت بن جاتا ہے۔ حالانکہ خدا سے شاکی اور مایوس ہونے کے بجائے اسے اپنے اعمال پر نظر ڈالنی چاہیے کہ خدا کی نعمت پا کر یتیموں اور غریبوں کے ساتھ اس کا سلوک کیا ہونا چاہیے تھا اور اس نے مال کی اندھی بہری محبت میں مبتلا ہو کر ان کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا!

(۲۱-۲۶) قیامت کے دن ان لوگوں کی حسرت و مایوسی کی تصویر جو خدا کے بخشے ہوئے مال کو پا کر اس کے پجاری بن کر بیٹھ رہے، اس کو اپنی آخرت سنوارنے کا ذریعہ نہیں بنایا۔

(۲۷-۳۰) ان لوگوں کی خوش حالی و فیروزمندی کا بیان جو یُسر و عُسر اور تنگی و فراخی دونوں میں اپنے رب سے راضی و مطمئن رہے۔ نعمت ملی تو اس پر مغرور ہونے کے بجائے اپنے رب کے شکر گزار اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے والے رہے اور اگر تنگیٔ رزق سے آزمائے گئے تو مایوس و دل شکستہ ہونے کی جگہ اپنی حالت پر صابر و قانع اور اپنے رب کے فیصلہ پر راضی رہے۔

سُورَةُ الْفَجْرِ

مَكِّيَّةٌ ـــــــــ آيات: ۳۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۳۰

وَالْفَجْرِ ﴿١﴾ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ﴿٢﴾ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ﴿٣﴾ وَالَّيْلِ
إِذَا يَسْرِ ﴿٤﴾ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ﴿٥﴾ أَلَمْ
تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ﴿٦﴾ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ﴿٧﴾ الَّتِيْ لَمْ
يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ﴿٨﴾ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ
بِالْوَادِ ﴿٩﴾ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ﴿١٠﴾ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي
الْبِلَادِ ﴿١١﴾ فَأَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ﴿١٢﴾ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ
رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ﴿١٣﴾ إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿١٤﴾ فَأَمَّا
الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَأَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ
رَبِّيْ أَكْرَمَنِ ﴿١٥﴾ وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ
فَيَقُوْلُ رَبِّيْ أَهَانَنِ ﴿١٦﴾ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿١٧﴾ وَلَا
تَحٰضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿١٨﴾ وَتَأْكُلُوْنَ التُّرَاثَ
أَكْلًا لَّمًّا ﴿١٩﴾ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿٢٠﴾ كَلَّا إِذَا دُكَّتِ
الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿٢١﴾ وَّجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿٢٢﴾

وَجِایْٓءَ یَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ ۙ۬ یَوْمَئِذٍ یَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ
وَاَنّٰی لَهُ الذِّكْرٰی ﴿۲۳﴾ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ ﴿۲۴﴾
فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُعَذِّبُ عَذَابَهٗۤ اَحَدٌ ﴿۲۵﴾ وَّلَا یُوْثِقُ وَثَاقَهٗۤ
اَحَدٌ ﴿۲۶﴾ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِیْۤ اِلٰی
رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ﴿۲۹﴾
ع ۱ ۱۴ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ﴿۳۰﴾

ترجمۂ آیات ۱-۳۰

شاہد ہے فجر اور دس راتیں اور جفت و طاق اور رات جب وہ چل کھڑی ہو۔ کیوں، ان میں تو ہے ایک عاقل کے لیے عظیم شہادت! (۱-۵)

دیکھا نہیں، کیا کیا تیرے خداوند نے عاد کے ساتھ! ــــ ستونوں والے ارم کے ساتھ ــــ جن کا ثانی نہ ہوا ملکوں میں۔ اور ثمود کے ساتھ جنھوں نے وادی میں پتھر تراشے اور فرعون میخوں والے کے ساتھ! انھوں نے ملکوں میں سر اٹھائے اور ان میں بڑی اودھم مچائی تو تیرے خداوند نے ان پر عذاب کے کوڑے برسائے۔ ــــ بے شک تیرا خداوند گھات میں رہتا ہے (۶-۱۵)

لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا خداوند اس کا امتحان کرتا اور اس کو عزت و نعمت بخشتا ہے تو وہ خیال کرتا ہے کہ میرے رب نے میری شان بڑھائی ہے اور جب اس کو جانچتا اور رزق میں کمی کرتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے خداوند نے مجھے ذلیل کر ڈالا۔ ہر گز نہیں، بلکہ تم یتیموں کی قدر نہیں کرتے اور نہ مسکینوں کو کھلانے پر ایک دوسرے کو ابھارتے اور وراثت کو سمیٹ کر ہڑپ کرتے ہو۔ اور مال کے عشق

میں متوالے ہو۔ (۱۶-۲۰)

ہرگز نہیں، اس وقت کو یاد رکھیں جب زمین کوٹ کوٹ کر برابر کر دی جائے گی اور تیرا خداوند صف در صف فرشتوں کے جلو میں نمودار ہو گا اور جہنم حاضر کی جائے گی۔ اس دن انسان سوچے گا مگر کیا حاصل اس سوچنے کا! کہے گا، کاش میں نے اپنی زندگی کے لیے کچھ کر رکھا ہوتا! پس اس دن نہ اس کا سا عذاب کوئی دے سکتا اور نہ اس کا سا باندھنا کوئی باندھ سکتا۔ (۲۱-۲۶)

اے وہ جس کا دل (اپنے رب پر) جما رہا، چل اپنے رب کی طرف، تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔ مل جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری بہشت میں۔ (۲۷-۳۰)

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالْفَجْرِ ۝ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝ وَالَّيْلِ إِذَا يَسْرِ (۱-۴)

ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں کہ یہاں جو قسمیں کھائی گئی ہیں وہ اس دعوے پر شہادت کے لیے کھائی گئی ہیں کہ اس کائنات کا مدبرِ حقیقی اللہ وحدہٗ لا شریک ہے۔ اسی کے ہاتھ میں ہر چیز کی باگ ہے۔ وہی جب چاہتا ہے ایک چیز کو نمودار کرتا ہے اور جب چاہتا ہے اس کو اوجھل کر دیتا ہے۔ وہی جس کو جس حد تک چاہتا ہے ڈھیل دیتا ہے اور جہاں چاہتا ہے روک دیتا ہے، مجال نہیں ہے کہ کوئی شے اس کی مقرر کی ہوئی حد سے آگے بڑھ سکے یا اس کے اختیار میں مداخلت کر سکے۔

فجر کی شہادت سے مقصود

'وَالْفَجْرِ'۔ 'فَجْرٌ' سے مراد وہ وقت ہے جب رات کی تاریکی کا پردہ چاک ہوتا اور دن کی روشنی مشرقی افق سے نمودار ہوتی ہے۔ روزے کے احکام کے ضمن میں سورۂ بقرہ میں فرمایا ہے: 'كُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ' (البقرۃ - ۲: ۱۸۷) (اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ فجر کی سفید دھاری شب کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے)۔ لفظ 'فجر' کے مقابل میں لفظ 'صبح' سے مراد جو وقت ہے وہ نہ صرف فجر پر بلکہ طلوعِ آفتاب کے بعد کے وقت پر بھی محیط ہے۔ اس لیے 'وَالْفَجْرِ' کے ہم معنی صبح کے لفظ سے جہاں قسم کھائی گئی ہے وہاں وضاحت کے لیے الفاظ بڑھائے گئے ہیں، مثلاً 'وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ' (التکویر - ۸۱: ۱۸) (شاہد ہے صبح جب وہ سانس لیتی ہے) یا 'وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ' (المدثر - ۷۴: ۳۴) (شاہد ہے صبح جب وہ ہویدا ہو جائے)۔

یہ معین ہونے کے بعد کہ فجر سے مراد آغازِ صبح کا وہ وقت ہے جب شب کی تاریکی کا پردہ چاک ہو جاتا ہے اس آیت میں قسم کا موقع ٹھیک وہی قرار پاتا ہے جو سورۂ مدثر میں مذکور الفاظ وارد ہوا ہے: 'وَالَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ۝ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ ۝ إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ' (المدثر - ۷۴: ۳۲-۳۴) (شاہد ہے رات جب وہ منہ موڑ چکے اور صبح جب وہ نمودار ہو جائے کہ یہ (قیامت) عظیم حوادث میں سے ہے)۔

ہم نے سورۂ مدثر کی تفسیر میں مذکورہ آیت کے ذیل میں واضح کیا ہے کہ رات کی تاریکی جب اپنے ڈیرے ڈالے ہوتی ہے تو اس میں صبح کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ فجر کا وقت ایک بڑے

تغیر کا پیغام لاتا ہے جس میں تاریکی کی بساط لپیٹ دی جاتی اور عالم ایک نیا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ ٹھیک یہی حال قیامت کے ظہور کا بھی ہوگا۔ یہ دنیا رات کے مانند ہے جس کی تاریکی صبح قیامت کو ڈھانکے ہوئے ہے۔ جس طرح رات کے بعد فجر ایک متعین نظام الاوقات کے تحت نمودار ہوتی ہے اسی طرح ایک وقت آئے گا جب قیامت اچانک وارد ہو جائے گی۔ اس وقت سب دیکھ لیں گے کہ جس چیز کو وہ ناممکن سمجھتے تھے وہ سامنے آگئی۔

یہاں 'وَالْفَجْرِ' کی قسم سے قرآن نے متنبہ کیا ہے کہ فجر کا وقت ہر روز ظہورِ قیامت کا مشاہدہ ایک تمثیلی رنگ میں کراتا ہے۔ جس طرح تم رات میں سوتے اور صبح کو آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھتے ہو اسی طرح مر جانے کے بعد تمھارے اوپر وہ وقت بھی آئے گا جب صور پھونکا جائے گا اور تم صبحِ قیامت کو اٹھ بیٹھو گے اور ایسا محسوس کرو گے کہ ابھی سوئے تھے ابھی جاگ پڑے ہو۔ لہٰذا قیامت کے ظہور کو بعید از امکان نہ سمجھو۔ احادیث میں صبح کو اٹھنے کی جو دعا سکھائی گئی ہے اس میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

'وَلَيَالٍ عَشْرٍ' دس راتوں سے کون سی راتیں مراد ہیں؟ اس سوال کے مختلف جواب ہمارے مفسرین سے منقول ہیں لیکن ان میں سے کسی قول کی کوئی قابلِ قبول دلیل ان سے منقول نہیں ہے۔ ان کی بنیاد محض اس مفروضہ پر ہے کہ یہاں ان کی قسم کھائی گئی ہے اور جس چیز کی قسم کھائی جائے ضروری ہے کہ وہ کوئی مقدس چیز ہو حالانکہ یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے۔ قرآن میں جو قسمیں وارد ہوئی ہیں ان میں سے بیشتر کسی دعوے پر دلیل کے طور پر کھائی گئی ہیں۔ ان کے اندر تقدس تلاش کرنے کے بجائے ہمیشہ ان کے استدلالی پہلو پر نظر جمانی اور دیکھنا یہ چاہیے کہ زیرِ بحث دعویٰ کیا ہے اور قسم کس پہلو سے اس پر شہادت ہے۔ نیز قرآن مجید کے ان دوسرے مواقع کو نگاہ میں رکھنا چاہیے جن میں اسی قسم کا مضمون انہی الفاظ یا ان کے ملتے جلتے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ دس راتوں سے مراد

اس سورہ کے عمود کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر غور کیا جائے تو عمود سے مطابقت رکھنے والی بات ہو سکتی ہے تو یہ ہو سکتی ہے کہ 'لَيَالٍ عَشْرٍ' سے چاند کے عروج و محاق کی دس راتیں مراد لی جائیں۔ چونکہ یہاں یہ لفظ نکرہ کی صورت میں ہے اس وجہ سے ایک ہی ساتھ دس راتیں عروج کی بھی مراد لی جا سکتی ہیں اور دس راتیں زوال کی بھی۔ گویا اس قسم میں چاند کے تدریجی عروج و زوال کی پوری تصویر سامنے رکھ دی گئی ہے۔ سادہ اسلوب میں یہ مضمون سورۂ یٰسٓ میں یوں بیان ہوا ہے:

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ — اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں ٹھہرا رکھی ہیں
حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ — یہاں تک کہ (ان منازل کو طے کرتے ہیں) وہ کھجور

کی سوکھی ٹہنی کے مانند ہو کر رہ جاتا ہے۔ (یٰس - ۳۶ : ۳۹)

اس آیت میں چاند کی تصویر چشم تخیل کے سامنے اس طرح آتی ہے گویا وہ ایک فرمانبردار ناقہ ہے جس کی نکیل ایک غیبی ساربان کے ہاتھ میں ہے جو اس کو منزل بہ منزل ایک معین بلندی تک چڑھاتا اور پھر وہاں سے اس کو درجہ بدرجہ اسی طرح اتارتا ہے یہاں تک کہ قطع منازل کے اس پر مشقت سفر میں وہ سوکھ کر کانٹا بن کے رہ جاتا ہے۔

قسم کے اسلوب میں یہی حقیقت یوں بھی وارد ہوئی ہے:

وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ ۝ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (الانشقاق - ۸۴ : ۱۸-۱۹) شاہد ہے چاند جب وہ کامل ہو جائے کہ تم بھی درجہ بدرجہ چڑھو گے۔

یہاں قیامت کے لیے جلدی مچانے والوں کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نشانی کے ظہور کے لیے ایک معین پروگرام اور تدریجی ارتقاء ہوتا ہے۔ قیامت اللہ تعالیٰ کے عدل کا بدیہی مقتضیٰ ہے۔ اس کا ظہور تو لازماً ہوگا لیکن ہوگا اپنے وقت پر۔

ان نظائر کی روشنی میں اگر آیت کی توجیہ کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قرآن نے چاند کے عروج و زوال کی ان دس دس راتوں کا حوالہ دیا ہے جن میں چاند کا تغیر نہایت نمایاں ہوتا ہے اور وہ دن پر دن سابقہ حالت سے مختلف نظر آتا ہے۔ یہ تغیر اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے شئون حوادث کے ظہور کے لیے ایک تدریج رکھی ہے۔ حاملہ کی بارآوری اور وضع حمل میں ایک متعین مدت صرف ہوتی ہے۔ کفار و مکذبین کے جرائم پر اللہ تعالیٰ فوری گرفت نہیں کرتا، بلکہ ان کی رسی دراز کرتا جاتا ہے اور جب یہ مہلت ختم ہوتی ہے تبھی ان پر عذاب آتا ہے۔ اسی طرح بحیثیت مجموعی دنیا بھی قیامت کی منزل کی طرف رواں دواں ہے اور بالتدریج اس کی طرف پہنچے گی اور یہ ٹھیک اس نظام الاوقات کے مطابق ہوگا جو خدا نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہے۔

'وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ'۔ 'شَفْعٌ' کے معنی جفت اور 'وَتْرٌ' کے معنی طاق کے ہیں۔ جفت اور طاق سے کیا مراد ہے؟ اس کے جواب میں مفسرین سے اتنے اقوال منقول ہیں کہ ان کا استقصار مشکل ہے۔ اقوال کی اس کثرت کی وجہ ہمارے نزدیک وہی ہے کہ لوگوں نے نظم کلام اور سیاق و سباق کو پیش نظر رکھنے کے بجائے ساری توجہ صرف اس امر پر مرکوز رکھی کہ کسی مقدس چیز کو ان الفاظ کا مصداق بنائیں۔ حالانکہ اگر نظر شہادت کے پہلو پر ہوتی تو غور کرنے اور صحیح نتیجہ تک پہنچنے کی آسان راہ یہ بھی کہ ان مقامات پر نظر ڈالی جاتی جہاں قرآن نے ہر شے کے جوڑے جوڑے پیدا کیے جانے کا ذکر کیا ہے اور اس سے حکمت کے نہایت اہم حقائق کی طرف توجہ دلائی ہے مثلاً فرمایا ہے

(جفت اور طاق سے مراد)

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (الذٰریٰت - ۵۱ : ۴۹) (اور ہم نے ہر چیز کے اندر سے

جوڑے پیدا کیے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو)۔

ہر جوڑا دو طاقوں سے مل کر تشکیل پاتا ہے جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ ہر چیز ایک پہلو سے طاق ہے اور دوسرے پہلو سے جفت۔ اس امرِ واقعی کا حوالہ دیتے ہوئے قرآن نے اس کائنات کے متعدد جوڑوں ـــــ زمین و آسمان، ظلمت و نور، دھوپ اور چھاؤں، نر اور مادہ ـــــ کی طرف توجہ دلائی ہے اور اس سے نہایت اہم نتائج کی، جیسا کہ 'لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ' سے اشارہ نکلتا ہے یاددہانی فرمائی ہے، مثلاً اس حقیقت کی یاددہانی کہ جب ہر چیز اپنے وجود کے اندر ایک ایسا خلا رکھتی ہے جو اس جوڑے سے مل کر ہی بھرتا ہے، اس کے بغیر وہ اپنی غایت کو نہیں پہنچتی تو لازماً ایک ایسی کامل الوجود اور ہر نقص سے پاک ہستی ان اجزائے مختلفہ سے بالاتر موجود ہے جس کی حکمت و قدرت ان کے اندر ربط و اتصال اور سازگاری و ہم آمیزی پیدا کرتی اور ان کو باغایت و بامقصد بناتی ہے۔ اس ہستی کا اپنے وجود میں کامل اور ہر نقص سے پاک ہونا لازمی ہے۔ اگر اس میں کوئی کمی ہوگی تو وہ اپنے سے بالاتر کی محتاج بن جائے گی اور یہ سلسلہ کہیں منقطع نہیں ہوگا۔ دوسرے اس حقیقت کی یاددہانی کہ ہماری یہ دنیا بھی بحیثیتِ مجموعی اپنے وجود کے اندر اسی طرح ایک خلا رکھتی ہے جس طرح اس کے تمام اجزائے مختلفہ اپنے اندر رکھتے ہیں اور یہ خلا اس وقت تک نہیں بھرتا جب تک اس کے ساتھ آخرت کو نہ مانیے۔ اس کو نہ مانیے تو یہ دنیا ایک حکیم کا بنایا ہوا کارخانہ نہیں بلکہ ایک کھلنڈرے کا کھیل اور نہایت ظالمانہ کھیل بن کے رہ جاتی ہے۔

جفت و طاق کا ذکر دس راتوں کے ذکر کے بعد آیا ہے اور دس راتیں ہمارے نزدیک چاند کے عروج و محاق کی ہیں جو اس حقیقت کی شہادت دیتی ہیں کہ ہر چیز کی باگ اللہ وحدہٗ لاشریک کے ہاتھ میں ہے اس لیے کہ بعض مہینوں میں یہ راتیں جفت ہوتی ہیں بعض میں طاق لیکن کسی کے امکان میں نہیں کہ وہ جفت کو طاق یا طاق کو جفت بنا دے خواہ اس کی کتنی ہی تمنا رکھتا ہو۔ عید کے چاند کے لیے لوگ نہ جانے کیا کیا جتن کرتے ہیں کہ انتیس کو نظر آ جائے لیکن وہ تعمیل اپنے رب ہی کے حکم کی کرتا ہے، لوگوں کے جذبۂ شوق اور جوشِ استقبال کی اسے ذرا پروا نہیں ہوتی۔

وَالَّيْلِ إِذَا يَسْرِ (۴)

رات کی شہادت

یہ آخر میں رات کی شہادت پیش کی ہے اور اس کے ساتھ 'اِذَا یَسْرِ' کی قید ہے۔ یعنی خاص طور پر اس کے اس وقت کی طرف توجہ دلائی ہے جب وہ رخصت ہونے کے لیے چل کھڑی ہوتی ہے اور افق میں فجر کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ اس پر قرآن کے نظائر کی روشنی میں غور کیجیے تو یہ نہایت اہم حقائق کی یاددہانی کرتی ہے۔

ایک تو اس حقیقت کی یاددہانی کہ اس کائنات کے تمام عناصرِ مختلفہ خالقِ کائنات کے ہاتھ میں مسخر ہیں۔ رات آتی ہے تو بظاہر اس کا تسلط ایسا ہمہ گیر ہوتا ہے کہ کسی طرف سے دن کے نمودار ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا لیکن بالآخر اس تاریکی کے اندر سے ایک سفید دھاری مشرق سے نمایاں ہونی شروع ہوتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ رات پر اس طرح چھا جاتی ہے کہ سورج نمودار ہو جاتا ہے اور ظلمتِ شب کو اپنا بوریا بستر سنبھالنا پڑتا ہے۔ رات کے بس میں یہ نہیں ہے کہ اس کی راہ روک کر کھڑی ہو جائے۔

دوسری یہ کہ رات کے رخصت ہونے اور دن کے جلوہ نما ہونے میں ان لوگوں کے لیے ظہورِ قیامت کی ایک تمثیل ہے جو قیامت کو بعید از امکان سمجھتے ہیں۔ اس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

تیسری ان لوگوں کو، جو قیامت کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ اگر یہ آنے والی ہے بھی تو ابھی اتنی دور ہے کہ اس کا خوف ذہنوں پر مسلّط کر لینا کوئی دانش مندی نہیں، اس حقیقت کی یاددہانی کہ خدا کے ہاں یہ دنیا اپنے انجام کے اسی طرح قریب آ لگی ہے جس طرح سحر کے وقت بس اتنی سی کسر رہ جاتی ہے کہ کب سپیدۂ صبح نمودار ہو اور رات کی گیرائی ختم ہو جائے۔ انسان اس معاملہ کو اپنی محدود نظر سے دیکھتا اور اپنے منٹ سکنڈ کے پیمانے سے ناپتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس دنیا پر جو نہیں معلوم کب سے انسان و حیوان، چرند و پرند سب کو ایک گہوارہ مہیا کیے ہوئے ہے، کوئی ایسی آفت آ سکتی ہے جو اس کے نظام ہی کو تہ و بالا کر کے رکھ دے۔ لیکن خدا کے نظام میں صورتِ حال بالکل مختلف ہے، وہ قیامت کو دنیا کے پشتِ پا پر دیکھ رہا ہے۔ اس کے پیمانوں کے لحاظ سے قیامت بس آیا ہی چاہتی ہے۔ اسی حقیقت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے کہ میں اور قیامت ساتھ ساتھ کی دو انگلیوں کی طرح ہیں۔

علاوہ ازیں اِذَا یَسۡرِ کے الفاظ کے اندر ایک لطیف شہادت بھی ہے کہ کسی آزمائش کو بھی ایسی بلا نہ سمجھو جو کبھی جان چھوڑے گی ہی نہیں۔ اس دنیا میں جس طرح فجر کا طلوع ہونا اور رات کا آنے کے بعد چلا جانا مشاہدہ کرتے ہو اور دیکھتے ہو کہ قدرت ان میں سے کسی کو بھی اس سے زیادہ ٹکنے کا موقع نہیں دیتی جتنا اس کی دنیا کی مصلحت کے لیے ضروری ہے اسی طرح یُسر اور عُسر، رنج اور راحت کی صورت میں جو آزمائشیں پیش آتی ہیں وہ بھی انسان کی ذہنی و اخلاقی تربیت کے لیے پیش آتی ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو بس اتنی ہی دیر کے لیے مہلت دیتا ہے جتنی بندے کی تربیت کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ انسان کو ان میں سے نہ کسی سے مایوس ہونا چاہیے نہ مغرور، بلکہ ان کا مواجہہ صبر اور شکر کے ساتھ کرنا چاہیے اور یہ امید رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر آزمائش میں اس کے لیے خیر مضمر ہے۔

آیات ا تا ۴ پر مزید غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ 'وَالْفَجْرِ' اور 'وَالَّيْلِ إِذَا يَسْرِ' کی دونوں قسمیں دو متقابل چیزوں کی ہیں اور بیچ کی دو قسموں —— 'وَلَيَالٍ عَشْرٍ' اور 'وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ' —— کا تعلق ان دو متقابل چیزوں کے درمیان کی دو عظیم نشانیوں سے ہے جو اس دعوے پر دلیل ہیں جس کی طرف ہم نے آغازِ فصل میں اشارہ کیا ہے۔ چونکہ ان آیات میں بنیادی حیثیت پہلی اور آخری دو قسموں کو حاصل ہے، باقی دو قسموں کی حیثیت ان کے توابع کی ہے، اس وجہ سے بحث کی تکمیل کے لیے ہم ان دعاوی کی یاددہانی بھی ضروری سمجھتے ہیں جن پر قرآن نے رات اور دن، صبح اور شام، تاریکی اور روشنی کے تضادات سے استدلال کیا ہے۔

اضداد کی شہادت

• —— ان اضداد سے پہلی دلیل تو قرآن نے توحید پر قائم کی ہے اور جگہ جگہ یہ دکھایا ہے کہ یوں بظاہر تو یہ دنیا اپنے ہر گوشے میں اضداد کی ایک رزم گاہ ہے جس کا فطری نتیجہ یہ نکلنا تھا کہ یہ وجود میں آ ہی نہیں سکتی اور آ بھی جاتی تو فوراً درہم برہم ہو جاتی لیکن تدبر و تفکر کی نظر سے دیکھیے تو یہ حقیقت بالکل روشن ہے کہ ان اضداد کے اندر باہم دگر نہایت گہری موافقت و سازگاری ہے۔ اسی کا یہ کرشمہ ہے کہ اس کے متضاد عناصر باہمی تفاعل و تعاون سے نہایت صالح نتائج پیدا کرتے ہیں جو اس کے قیام و بقا کا ذریعہ ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ان اضداد میں یہ توافق کون پیدا کرتا ہے؟ اس کا واحد صحیح جواب یہی ہو سکتا ہے کہ ایک علیم و خبیر، حکیم و بصیر اور قوی و مقتدر ہستی ان اضداد سے بالاتر ہے جو ان کو باہم دگر جوڑتی، ایک حکیمانہ تناسب سے ان میں باہم تالیف و امتزاج پیدا کرتی اور پھر ان سے وہ صالح نتائج وجود میں لاتی ہے جو اس دنیا کے قیام و بقا کا ذریعہ ہیں اور لازماً وہ ایک ہی ہے اس لیے کہ اگر دوسرے ارادے بھی اس کی مزاحمت کرنے والے موجود ہوتے تو یہ دنیا تباہ ہو جاتی۔ 'لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا' (الانبیاء ۲۱: ۲۲)۔

• —— دوسری دلیل اس سے قرآن نے قیامت پر قائم فرمائی ہے۔ مختصر الفاظ میں وہ یوں ہے کہ اس دنیا میں اس کے خالق نے ہر چیز جوڑے جوڑے پیدا کی ہے اور ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر ہی اپنی غایت کو پہنچتی ہے۔ بغیر اس کے نہ وہ اپنی غایت کو پہنچتی اور نہ اس کے بدون اس کے وجود کی کوئی معقول توجیہ ہو سکتی بلکہ اس کے اندر ایسا خلا محسوس ہوتا ہے کہ ایک عاقل مجبور ہو جاتا ہے کہ اس پر وہ ایک کارِ عبث ہونے کا حکم لگائے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہی حکم اس دنیا پر بھی لگ سکتا ہے اگر اس کے ساتھ آخرت کو نہ ملائیے کیونکہ اس کے اندر ایک ایسا خلا رہ جاتا ہے جو آخرت کو مانے بغیر کسی طرح بھی نہیں بھرتا۔ اس میں نیکی اور بدی، عدل اور ظلم میں ہر وقت، جو کشمکش برپا ہے اس کا فطری مطالبہ یہ ہے کہ اس کے لیے ایک ایسا روز انصاف آئے

جس میں اس کا خالق پورے اقتدار، کامل علم اور کامل عدل کے ساتھ لوگوں کا محاسبہ کرے۔ پھر اپنے اچھے بندوں کو صلہ دے اور وہ لوگ اپنے کیفر کردار کو پہنچیں جنھوں نے اس کی دنیا میں دھاندلی مچائی۔ اگر اس کے بغیر یہ دنیا یوں ہی چلتی رہے، ایک دن یوں ہی ختم ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کے خالق کے نزدیک خیر اور شر، نیک اور بد دونوں یکساں ہیں اور اس کا پیدا کیا جانا کوئی حکیمانہ فعل نہیں بلکہ ایک کارِ عبث اور کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر قیامت کے جھٹلانے والوں کے سامنے یہ سوال رکھا گیا ہے کہ اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ کَالۡمُجۡرِمِیۡنَ ۝ مَا لَکُمۡ ۟ کَیۡفَ تَحۡکُمُوۡنَ (القلم - ۶۸: ۳۵-۳۶) (کیا ہم اپنے اطاعت شعار بندوں اور مجرموں کو یکساں کر دیں گے، تم کو کیا ہو گیا ہے، کیسے بے عقلی کے فیصلے کرتے ہو!) اس مسئلہ پر سورۂ مدثر کی آیاتِ قسم کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

○ تیسری حقیقت اس سے اللہ تعالیٰ نے یہ واضح فرمائی ہے کہ جس طرح انسان کے مادی وجود کی بقا کے لیے دن کی روشنی اور حرارت بھی ضروری ہے اور رات کی خنکی اور تاریکی بھی، اسی طرح اس کی اخلاقی و روحانی تربیت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ یُسر و عُسر، تنگی و فراخی، صحت اور مرض کی آزمائشوں سے گزارا جائے تاکہ اس کے صبر و شکر کی تربیت ہو اور وہ 'رَاضِیَۃً مَّرۡضِیَّۃً' کا مقام حاصل کرنے کا اہل بنے۔ قرآن میں یہ حکمت جگہ جگہ بیان ہوئی ہے۔ آگے اس سورہ میں بھی اس کی وضاحت آ رہی ہے اور خدا نے چاہا تو ہم سورۂ ضحیٰ میں 'وَالضُّحٰی ۝ وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی ۝' (۱-۲) کے تحت بھی اس مسئلہ پر بحث کریں گے۔

○ چوتھی حقیقت ان سے یہ واضح فرمائی گئی ہے کہ ان اضداد میں سے کسی کو بھی خدا نے بگٹٹ نہیں چھوڑا ہے بلکہ ہر ایک کی باگ اس کے ہاتھ میں ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی اپنے حدود سے سرِمو تجاوز کر سکے۔ وہ خود اپنے وجود سے شہادت دیتے ہیں کہ وہ آزاد نہیں بلکہ خلق کے ہاتھ میں مسخر ہیں۔ رات آتی ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ڈیرے ڈال دے اور خلق کو دن کی روشنی اور آفتاب کی حرارت سے محروم رکھے بلکہ ایک مقررہ وقت کے اندر منٹ اور سیکنڈ کی پابندی کے ساتھ لازماً اسے اپنے ڈیرے اٹھانے اور دن کی روشنی کے لیے جگہ خالی کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح سورج طلوع ہوتا ہے تو اسے بھی لازماً متعین گھنٹوں کے بعد افق سے غائب ہونا پڑتا ہے، وہ یہ نہیں کر سکتا کہ ہمیشہ کے لیے ہمارے سروں پر مسلّط ہو جائے، شب کی خنکی اور اس کے سکون سے ہمیں محروم کر دے۔ یہ مشاہدہ ہر شخص کرتا ہے اور یہ بدیہی شہادت ہے اس بات کی کہ اس کائنات کی ہر چیز خدا کے کنٹرول میں ہے، وہی اس کو کھولتا بھی ہے اور وہی باندھتا بھی ہے، اس سے یہ بدیہی نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ کسی کو بھی، خواہ وہ کتنا ہی زور و اثر رکھنے والا ہو، خدا کی ڈھیل

سے اس گھمنڈ میں نہیں پڑنا چاہیے کہ وہ اس کی گرفت سے باہر ہے۔ جب سورج اور چاند، رات اور دن اس کے کنٹرول سے باہر نہیں تو انسان کی کیا حقیقت ہے کہ وہ اپنے کو اس کے حیطۂ اقتدار سے باہر سمجھے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے۔ سورۂ قصص میں اس کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے:

قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ جَعَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکُمُ الَّیۡلَ سَرۡمَدًا اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ مَنۡ اِلٰہٌ غَیۡرُ اللّٰہِ یَاۡتِیۡکُمۡ بِضِیَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسۡمَعُوۡنَ ﴿۷۱﴾ قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ جَعَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکُمُ النَّہَارَ سَرۡمَدًا اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ مَنۡ اِلٰہٌ غَیۡرُ اللّٰہِ یَاۡتِیۡکُمۡ بِلَیۡلٍ .... (القصص - ۲۸: ۷۱-۷۲)	کہہ دو، بتاؤ اگر اللہ تم پر قیامت تک برابر رات ہی مسلط کیے رکھے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمہارے لیے ذرا سی روشنی لا سکے! تو کیا تم سنتے نہیں!! پوچھو، اگر اللہ تمہارے اوپر دن کو برابر قیامت تک کے لیے مسلط کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمہارے لیے ایک ہی رات لا سکے۔

اس سورہ کی قسموں میں، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، یہ پہلو زیادہ نمایاں ہے اس وجہ سے اس کو خاص طور پر نگاہ میں رکھیے۔

هَلۡ فِیۡ ذٰلِکَ قَسَمٌ لِّذِیۡ حِجۡرٍ (۵)

انسان کے ذی عقل ہونے کا فطری تقاضا

'حِجۡر' کے معنی عقل کے ہیں۔ لفظ 'حجر' اور 'عقل' دونوں کا لغوی مفہوم قریب قریب ایک ہی ہے۔ ان دونوں ہی کے اندر روکنے اور باندھنے کے معنی پائے جاتے ہیں۔ عقل انسان کو ان چیزوں سے باز رکھنے کے لیے ایک باطنی لگام ہے جو اس کے شایانِ شان نہیں ہیں اس وجہ سے اس کو 'حجر' سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

اس آیت کا استفہامیہ اسلوب اپنے اندر زجر و ملامت کا مفہوم بھی رکھتا ہے اور اتمام حجت کا بھی۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کو جب اللہ تعالیٰ نے عقل جیسی عظیم نعمت عطا فرمائی ہے تو اس کے شایانِ شان بات یہ ہے کہ وہ ان نشانیوں سے سبق حاصل کرے جو اس کے گرد و پیش پھیلی ہوئی زبانِ حال سے اصلی راہ اور منزل کی نشان دہی کر رہی ہیں نہ کہ اس بات پر ضد کرے کہ جب وہ منزل سامنے آ جائے گی تب وہ مانے گا کہ بے شک جن لوگوں نے اس سے خبردار کیا تھا انھوں نے سچ کہا تھا۔ اس وقت ماننا بھی تو حسرت کے سوا اس کو اس سے کیا فائدہ پہنچے گا! یہ مضمون اسی سورہ کی آیات ۲۳-۲۴ میں آگے آ رہا ہے، وہاں، ان شاء اللہ، اس کی وضاحت ہو گی۔

اتمامِ حجت کا پہلو یہ ہے کہ نشانیاں تو بے شمار ہیں جن کی طرف ان کو توجہ دلائی جا چکی ہے لیکن

ان میں سے کوئی نشانی بھی ان کو قائل کرنے والی نہ بنی۔ اب یہ وہ نشانیاں ان کے سامنے رکھی گئی ہیں جو سب سے زیادہ واضح اور قریب ہیں اور اہلِ عقل کے لیے ان کے اندر بہت بڑی شہادت موجود ہے۔ لیکن یہ ہٹ دھرم ان سے بھی فائدہ اٹھانے والے نہیں ہیں۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ (۶-۸)

تاریخ کی شہادت

اوپر کی آفاقی نشانیوں کی شہادت کے بعد یہ قوموں کی تاریخ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس کی شہادت بھی یہی ہے کہ اس دنیا کا خالق اس میں ابھرنے والی قوموں کے رویہ سے بے تعلق نہیں رہتا بلکہ وہ برابر گھات لگائے ان کی نگرانی کرتا رہتا ہے۔ جب وہ بے راہ ہوتی ہیں تو وہ اپنی حکمت کے تحت ایک خاص مدت تک ان کو مہلت تو ضرور دیتا ہے تاکہ وہ اپنی اصلاح کرلیں، اگر اصلاح کرنی چاہیں ورنہ اپنا پیمانہ بھرلیں۔ پھر وہ ان کو پکڑتا ہے اور اس طرح پکڑتا ہے کہ ان کی ہستی ہی مٹا کر رکھ دیتا ہے۔ قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ اس بات کی صاف شہادت ہے کہ اس مجموعی دنیا کے لیے بھی ایک روزِ حساب آئے گا جس میں ایک ایک فرد اپنی انفرادی حیثیت میں اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہوگا۔ پھر جو انعام کے مستحق ہوں گے وہ بھرپور انعام پائیں گے اور جو سزا کے مستحق ٹھہریں گے وہ اپنے کیے کی سزا بھگتیں گے۔

'عاد' کا ذکر پچھلی سورتوں میں، بار بار مختلف پہلوؤں سے گزر چکا ہے، یہاں ان کا ذکر 'اِرَم' کی نسبت کے ساتھ ہوا ہے۔ 'اِرَم' ان کے ان اجداد میں سے ہیں جن سے ان کی عسکری اور تعمیری ترقیوں کا آغاز ہوا۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ سامی نسل کی اس شاخ سے تعلق رکھتے ہیں جو ارم بن سام بن نوحؑ سے چلی۔

'عِمَاد' اونچے ستونوں کو کہتے ہیں۔ یہ ان کی تعمیری ترقیوں کی تعبیر کے لیے اسی طرح کا کنایہ ہے جس طرح سورۂ سبا میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے جود و کرم کی تعبیر 'جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ'[1] (سبا-۳۴: ۱۳) کے الفاظ سے کی گئی ہے۔

قومِ عاد نے سنگ تراشی کے آرٹ میں بہت ترقی کی۔ پہاڑوں کو ترشوا کر ان کے اندر انھوں نے نہایت خوبصورت ایوان و محل بنوائے۔ ان کے امراء کا خاص ذوق یہ تھا کہ ہر اونچی جگہ پر ان کی کوئی یادگار تعمیر ہو جائے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام نے ان کے اس مسرفانہ اور نمائش پسندانہ شوقِ تعمیر پر ان کو ملامت بھی فرمائی۔

---

[1] حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس حوضوں کے مانند لگن اور لنگر انداز رہنے والی دیگوں کا ذکر ان کی فیاضی اور غرباء پروری کی شہادت کے طور پر ہوا ہے۔

۔ اَلَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُھَا فِی الْبِلَادِ، تعمیری ترقیوں کے ساتھ ساتھ یہ لوگ اپنے قد و قامت اور زور و قوت کے لحاظ سے بھی نہایت نمایاں تھے۔ ان سے پہلے یا ان کی معاصر قوموں میں سے کوئی قوم ان کی برابری نہ کر سکی۔

وَثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ (۹)

عاد کے بعد یہ بالاجمال ثمود کی طرف بھی اشارہ فرما دیا۔ یہ لوگ عاد ہی کے بقایا میں سے تھے اور تعمیر و تمدن کے شوق میں ان کے وارث ہوئے۔ چنانچہ ان کو عادِ ثانیہ بھی کہا گیا ہے۔ 'دا القریٰ' ان کا مسکن تھی۔ اس کے پہاڑوں میں انھوں نے اپنے اسلاف کے طریقہ پر پہاڑوں کو تراش تراش کر اپنے لیے گھر بنائے جس کی طرف 'جَابُوا الصَّخْرَ' کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔

وَفِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ (۱۰)

اقوامِ بائدہ کی تباہی کے بعد یہ فرعون اور اس کی فوجوں کی تباہی کی طرف توجہ دلائی۔ 'ذِی الْاَوْتَادِ' کے لفظی معنی تو میخوں والے کے ہیں لیکن یہاں 'اوتاد' بطریقِ کنایہ فرعون کی فوجوں کی تعبیر کے لیے آیا ہے۔ فوجیں بالعموم خیموں میں رہتی ہیں اور خیمے میخوں سے نصب کیے جاتے ہیں اس وجہ سے عربی میں یہ تعبیر معروف ہے۔ فرعون کی فوجوں کی کثرت کا ذکر تورات میں بھی ہے اور قرآن میں بھی جگہ جگہ مثلاً ـــــ یونس، طٰہٰ، القصص اور الذّٰریٰت ـــــ میں آیا ہے۔ قدیم زمانے میں مستقل فوجیں رکھنے کا رواج نہیں تھا۔ حملہ یا دفاع کی ضرورت کے لیے قبیلوں اور خاندانوں کے نوجوان بالکل وقت کے وقت اپنی خدمات پیش کرتے اور ضرورت پوری ہو جانے کے بعد منتشر ہو جاتے لیکن فرعون نے، تورات سے معلوم ہوتا ہے، ملک کی حفاظت کے لیے مستقل فوج قائم کی جو مملکت کے مختلف حصوں میں برابر، اپنے ڈیروں خیموں کے ساتھ گشت کرتی رہتی۔ اس نے اپنے نوابوں اور امراء پر بھی یہ پابندی عائد کر رکھی تھی کہ ایک خاص تعداد میں اسلحہ، گھوڑے اور رتھ تیار رکھیں تاکہ ضرورت پڑنے پر حکومت کی مؤثر خدمت کر سکیں۔ اسی خصوصی امتیاز کی بنا پر فرعون کو 'ذُو الْاَوْتَادِ' کہا گیا۔

اَلَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ ۝ فَاَکْثَرُوْا فِیْھَا الْفَسَادَ ۝ فَصَبَّ عَلَیْھِمْ رَبُّکَ سَوْطَ عَذَابٍ (۱۱-۱۳)

قوموں کا طغیان — یہ ان قوموں کے اس رویہ کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی حکومت اور اس کے عطا کیے ہوئے وسائل و ذرائع کو پا کر اپنے اپنے ملکوں میں اختیار کیا۔ فرمایا کہ انھوں نے طغیان کی روش اختیار کر لی۔ یعنی وہ خدا سے بالکل بے نیاز و بے خوف ہو کر اس گھمنڈ میں مبتلا ہو گئیں کہ انھیں جو کچھ حاصل ہے یہ ان کی اپنی ذاتی قابلیت و کارکردگی کا کرشمہ ہے جس میں

وہ ہر قسم کے تصرف کی مجاز ہیں۔ مال و جاہ نہ ان کو کسی کا بخشا ہوا ملا ہے، نہ اس کو کوئی ان سے چھین سکتا اور نہ اس کے باب میں وہ کسی کے آگے مسئول ہیں۔

'فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ' یہ مذکورہ بالا طغیان کا نتیجہ بیان ہوا ہے کہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہو جانے کے بعد ان کے قدم زندگی کی صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے۔ انھوں نے اپنی باگ نفس اور شیطان کے ہاتھ میں پکڑا دی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں فساد پھیل گیا۔

قوموں کے باب میں سنت الٰہی

'فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ' یہ اس فساد کے غلبہ کا انجام بیان ہوا ہے کہ جب ان کے ہر شعبۂ زندگی میں فساد سرایت کر گیا تو اس کا قدرتی انجام ان کے سامنے اس شکل میں آیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب کے کوڑے برسا دیے۔ یہ عذاب جن جن شکلوں میں آیا اس کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ جب کسی قوم کو اپنی زمین میں اقتدار و اختیار بخشتا ہے تو اس کو شترِ بے مہار کی طرح چھوڑ نہیں دیا کرتا بلکہ وہ اس کی نگرانی کرتا رہتا ہے کہ وہ اس اقتدار کو کس طرح استعمال کرتی ہے۔ اگر وہ اس کو خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر استعمال کرتی ہے تو اس کو اس سے بہرہ مند ہونے کی سعادت حاصل ہوتی ہے اور اگر وہ طغیان میں مبتلا ہو کر خدا کے حدود سے باہر نکل جاتی ہے تو اس کو اصلاح یا اتمامِ حجت کے لیے ایک خاص حد تک مہلت ملتی ہے۔ اگر اس مہلت سے وہ فائدہ نہیں اٹھاتی بلکہ اس کا طغیان و فساد بڑھتا ہی جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو فنا کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا وجود نہ خود اس کے لیے نافع رہ جاتا نہ دوسروں کے لیے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ بالکل اٹل ہوتا ہے۔ جب یہ صادر ہو جاتا ہے تو کوئی قوم، خواہ وہ کتنے ہی وسائل و ذرائع کی مالک ہو، نہ اس کی راہ روک سکتی نہ اس کا رخ ہی بدل سکتی۔ تاریخ گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتنی ہی قوموں کو ان کے دورِ عروج میں پکڑا اور پکڑ کر اس طرح مسل دیا کہ ان کا نام و نشان ہی صفحۂ دہر سے مٹ گیا۔

اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (۱۴)

خلاصۂ بحث

یہ ان تمام قسموں کا جو سورہ کی تمہید میں آئی ہیں اور ان تاریخی سرگزشتوں کا جن کی طرف اوپر اشارہ فرمایا ہے، خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے۔ گویا موقع و محل اور مدعا کے اعتبار سے اس آیت کو سورہ میں مقسم علیہ کی حیثیت حاصل ہے جس کی تائید آفاق کے آثار بھی کر رہے ہیں اور تاریخ کے واقعات بھی۔

'مِرْصَادٌ' گھات لگانے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آفاق اور تاریخ دونوں کے

شواہد اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ کائنات کا خالق اس کو پیدا کر کے اس سے الگ تھلگ نہیں جا بیٹھا ہے بلکہ اس کی نگاہ ایک ایک چیز کی نگرانی کر رہی ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی چیز اس سے اوجھل ہو سکے۔ ہر چیز کی باگ اس کے ہاتھ میں ہے۔ اگر کوئی قوم طغیان کی روش اختیار کرتی ہے تو وہ اس کو مہلت تو ضرور دیتا ہے لیکن اس کی ایک خاص حد مقرر ہوتی ہے جس کو لانگنے کی اجازت وہ نہیں دیتا۔ کوئی قوم اگر اس کو لانگنے کی جسارت کرتی ہے تو وہ فوراً اس کو دھر لیتا ہے اور پھر کسی کی طاقت نہیں ہے کہ اس کی گرفت سے چھوٹ سکے۔

یہ صورت حال اس امر کی نہایت واضح دلیل ہے کہ یہ دنیا کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے بلکہ ایک حکیم و قدیر کا بنایا ہوا، ایک با مقصد و با غایت کارخانہ ہے۔ اس کی ایک ایک چیز کے ساتھ اس کے خالق کو جو تعلق ہے اور اس کے اندر قوموں کے عزل و نصب کا جو ضابطہ اس نے جاری کر رکھا ہے وہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے ساتھ ایک روز جزا و سزا ہے جو لازماً ظہور میں آئے گا اور اس دن ہر شخص جس نے اپنی زندگی اپنے رب کے احکام کے تحت گزاری اپنے رب کی خوشنودی سے نوازا جائے گا اور جس نے اس کو ایک بازیچۂ اطفال سمجھ کر اس میں فساد مچایا وہ اپنے کیے کی سزا بھگتے گا۔

فَاَمَّا الۡاِنۡسَانُ اِذَا مَا ابۡتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكۡرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوۡلُ رَبِّىۡۤ اَكۡرَمَنِ ؕ وَاَمَّاۤ اِذَا مَا ابۡتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيۡهِ رِزۡقَهٗ ۙ فَيَقُوۡلُ رَبِّىۡۤ اَهَانَنِ (۱۵-۱۶)

انسان کا ایک مغالطہ

یہ اس مغالطہ سے پردہ اٹھایا جس میں مبتلا ہونے والے نعمت پا کر طغیان و فساد کی راہ اختیار کر لیتے ہیں اور جو نعمت سے محروم رہتے ہیں وہ یاس و ناامیدی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ مغالطہ یہ ہے کہ اس دنیا میں جس کو نعمت کی فراخی حاصل ہوتی ہے وہ یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں بڑی قدر و قیمت والا ہے اس وجہ سے اس نے اس کی شان بڑھا رکھی ہے۔ اس کے برعکس جو تنگیٔ رزق میں مبتلا ہوتا ہے وہ گمان کرتا ہے کہ خدا کی نظروں میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے اس وجہ سے اس نے اس کو ذلتیں جھیلنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ اس مغالطہ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پہلا فخر و غرور میں مبتلا ہو کر طغیان و فساد کی راہ پر چل پڑتا ہے اور دوسرا مایوسی و نامرادی کا شکار ہو کر یا تو صحیح زندگی بسر کرنے کا حوصلہ ہی کھو بیٹھتا ہے یا قسمت آزمائی کی ایسی راہیں اختیار کر لیتا ہے جو اس کو خدا سے نہایت ہی دور لے جا پھینکتی ہیں اور وہ بالکل شیطان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ حالانکہ اس دنیا میں انسان کو تنگی کی حالت پیش آئے یا فراخی کی، جو حالت بھی پیش آتی ہے، نہ اس کی سرفرازی کی خاطر پیش آتی نہ اس

کی تذلیل و توہین کے لیے، بلکہ یہ دونوں ہی بطورِ امتحان پیش آتی ہیں۔ کسی کو اللہ فراخی بخشتا ہے تو اس سے مقصود اس کے شکر کو جانچنا ہوتا ہے کہ دیکھے وہ نعمتیں پا کر مغرور و متکبر اور دوسروں کو حقیر خیال کرنے والا بن جاتا ہے یا اپنے رب کا شکر گزار، فرماں بردار اور اس کے بندوں کا خدمت گزار بن کے زندگی بسر کرتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کا رزق تنگ کر دیتا ہے تو اس سے مقصود اس کے صبر کا امتحان ہوتا ہے کہ دیکھے وہ اپنے رب کے فیصلہ پر قانع و مطمئن، حالات کے مقابلہ کے لیے مضبوط و استوار اور اپنے کردار میں پختہ و پائدار ثابت ہوتا ہے یا حوصلہ ہار کر بیٹھ جاتا ہے۔ انسان کے صبر و شکر کی پختگی ہی پر اس کے تمام دین کی پختگی کا انحصار ہے۔ اس وجہ سے ان دونوں چیزوں کا امتحان برابر ہوتا رہتا ہے جس نے اپنے اندر یہ دونوں صفتیں پیدا کر لیں تو اس کو نفسِ مطمئنہ کی دولتِ گراں مایہ حاصل ہو گئی اور آگے آپ دیکھیں گے کہ اسی کو اللہ تعالیٰ کے ہاں 'رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً' کی بادشاہی حاصل ہوگی۔

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝ وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا ۝ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۱۷-۲۰)

مغالطہ کا ازالہ

اوپر بات اصولی رنگ میں فرمائی ہے لیکن ان آیات میں مکّہ اور طائف کے مالداروں کو براہِ راست خطاب کر کے تنبیہ کی گئی ہے کہ تمھارا یہ گمان بالکل بے بنیاد ہے کہ جس کو مال کی فراوانی حاصل ہوتی ہے یہ اس کی عزت افزائی کی دلیل ہے۔ یہ عزت افزائی کے لیے نہیں بلکہ امتحان کے لیے ہوتی ہے کہ وہ خدا کی بخشی ہوئی نعمت پا کر اپنی عزت کے پندار میں مبتلا ہو جاتا ہے یا اس کو یتیموں، مسکینوں کی خدمت اور ان کے اکرام و تواضع کا ذریعہ بناتا ہے۔ یہ محض تمھاری سفاہت ہے کہ تم خدا کے فضل و احسان کا بالکل الٹا مفہوم لیتے ہو۔ ہونا تو یہ تھا کہ تم اپنے رب کے شکر گزار بنتے، یتیموں اور مسکینوں کی خدمت خود بھی کرتے اور دوسروں کو بھی اس پر ابھارتے لیکن تمھارا حال یہ ہے کہ تم اپنی عزت کے گھمنڈ میں مبتلا ہو کر یتیموں کو حقیر سمجھتے اور مسکینوں کی مدد سے جی چراتے ہو۔

سوسائٹی میں یتیموں کا مقام

یتیموں کے لیے یہاں لفظ 'اکرام' استعمال ہوا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مطلوب صرف یہ نہیں ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں مالدار لوگ ان کی کچھ مدد کر دیا کریں بلکہ اصل مطلوب یہ ہے کہ سوسائٹی میں ان کو عزت کا مقام حاصل ہو۔ وہ دھکے کھاتے نہ پھریں بلکہ جہاں بھی جائیں لوگ ان کو احترام سے دیکھیں اور یہ عقیدہ رکھیں کہ خدا نے ان کو جو مال عطا فرمایا ہے اس کی کوئی وقعت خدا کے ہاں ہے تو اسی شکل میں ہے جب یتیموں کی خدمت کر کے ان کا مال اپنے لیے شرف کا مقام پیدا کرے۔ ورنہ وہ شرف کا ذریعہ نہیں بلکہ وبال اور رسوائی ہے۔

'تَحٰٓضُّوۡنَ' کے معنی ایک دوسرے کو کسی کام پر ابھارنے اور اکسانے کے ہیں۔ یعنی مسکینوں کے معاملے میں عند اللہ مطلوب صرف یہ نہیں ہے کہ لوگ ان کے آگے کچھ ڈال لے پھینک دیں بلکہ سوسائٹی کے اندر ان کی خدمت کے لیے یہ سرگرمی ہونی چاہیے کہ ہر صاحب مقدرت خود بھی ان کی خدمت کرے اور دوسروں کو بھی ابھارے۔ یہ نہ ہو کہ نہ خود دے اور نہ دوسروں کو کچھ دینے دے تاکہ اس کی بخیلی پر پردہ پڑا رہے۔

لفظ 'طعام' یہاں محدود معنوں میں نہیں بلکہ وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے اور اس معنی میں اس کا استعمال معروف ہے۔ مقصود ان کی ضروریات کا اہتمام ہے۔

عرب جاہلیت میں زور آور عصبات کا کردار

'وَتَاۡكُلُوۡنَ التُّرَاثَ اَكۡلًا لَّمًّا'۔ 'لَمٌّ' کے معنی جمع کرنے اور سمیٹنے کے ہیں اور 'تَاۡكُلُوۡنَ' یہاں ہڑپ کر جانے کے معنی میں ہے۔ یعنی مال کی محبت میں تم اس قدر اندھے ہو گئے ہو کہ تمھارے اندر جو زور آور عصبات ہیں ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مورث کی چھوڑی ہوئی املاک و جائداد سب سمیٹ کر وہ تنہا ہڑپ کر جائیں، دوسرے کمزور وارثوں، یہاں تک کہ مورث کے یتیم بیٹوں بیٹیوں کو بھی اس میں سے حصہ نہ ملے۔ عرب جاہلیت میں بھی اگرچہ تقسیم وراثت کا ایک ضابطہ تھا لیکن جس طرح اس زمانے میں اسلام کے نہایت واضح ضابطے کے باوجود زور و اثر رکھنے والے افراد دھاندلی سے باز نہیں آتے بلکہ کھلم کھلا کمزور وارثوں کی حق تلفی کرتے ہیں اسی طرح اس زمانے میں بھی زور آور لوگوں نے ایک من مانا ضابطہ بنا لیا تھا جس میں سارا حق اس کا تھا جو قوی ہو، کمزوروں کے لیے اس میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔

'وَّتُحِبُّوۡنَ الۡمَالَ حُبًّا جَمًّا'۔ اس گھنونے کردار کی تہ میں جو چیز چھپی ہوئی ہے یہ اس کا سراغ دیا ہے۔ فرمایا کہ تمھارے اندر ساری قدر و قیمت بس مال کی رہ گئی ہے۔ اس کے علاوہ انسانیت، شرافت، عدل اور رحم کے جتنے اقدار بھی ہیں وہ سب اس کے نیچے دب کر دم توڑ چکے ہیں۔ مال کی محبت تمھارے دلوں پر اس طرح چھا گئی ہے کہ اب کسی اور اعلیٰ قدر کی اس کے اندر راہ پانے کی کوئی گنجائش باقی ہی نہیں رہ گئی ہے۔

كَلَّاۤ اِذَا دُكَّتِ الۡاَرۡضُ دَكًّا دَكًّا ۙ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالۡمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۚ وَجِایۡٓءَ يَوۡمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوۡمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الۡاِنۡسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكۡرٰى ؕ يَقُوۡلُ يٰلَيۡتَنِىۡ قَدَّمۡتُ لِحَيَاتِىۡ (۲۱-۲۴)

مال کے پرستاروں کو تنبیہ

یہ مال کے پرستاروں کو اس دن کی یاددہانی کی گئی ہے جب وہ چیتیں گے اور حسرت کریں گے کہ کاش انھوں نے اپنے مال کو اس دن کی تیاریوں میں صرف کیا ہوتا لیکن اس وقت کا چیتنا بالکل بے سود ہو گا۔ وہ وقت چیتنے کا نہیں بلکہ نتائج اعمال کے بھگتنے کا ہو گا۔

'كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا'۔ 'کَلَّا' یہاں ان کے اس زعم کی تردید کے لیے ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ جس کو مال ملتا ہے وہ اس خبط میں پڑ جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی سرفرازی اور عزت افزائی ہوئی ہے حالانکہ اس دنیا کی کوئی چیز بھی کسی کو ملتی ہے تو سرفرازی کے لیے نہیں بلکہ صرف امتحان کے لیے ملتی ہے۔ ایک دن آئے گا کہ ہر چیز نیست و نابود کر دی جائے گی اور انسان کو صرف اپنے نتائجِ اعمال سے سابقہ پیش آئے گا۔

'دَكَّ الْاَرْضَ' کے معنی ہیں 'سَوّٰى صَعُوْدَهَا وَهُبُوْطَهَا' زمین کی ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر اس کے تمام نشیب و فراز اور اونچ نیچ برابر کر دیے۔ قیامت کے دن زمین کا جو حال ہوگا اس کی تصویر سورۂ کہف میں یوں کھینچی گئی ہے:

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ	زمین کے اوپر جو کچھ بھی ہے ہم نے اس کے لیے
زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ	اس کو سنگھار بنایا ہے تاکہ ہم امتحان کریں کہ
اَحْسَنُ عَمَلًا ۝ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا	لوگوں میں سے کون اچھا عمل کرتا ہے اور ایک
عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ۝	دن ہم اس سب کو جو اس کے اوپر ہے صفا چٹ
(الکھف - ۱۸: ۷-۸)	میدان کر دینے والے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اس زمین کے اوپر جو کچھ بھی ہے محض وقتی سنگھار کے طور پر ہے مقصود اس سے لوگوں کا امتحان ہے کہ لوگ اسی پر ریجھ کر رہ جاتے ہیں یا اس کے ساتھ جو آخرت لگی ہوئی ہے اس کی فکر بھی کچھ کرتے ہیں۔ بالآخر ایک دن ایسا آنے والا ہے جب اس کا یہ سارا سنگھار چھین جائے گا۔ نہ اس کے دریا اور پہاڑ باقی رہیں گے، نہ وادی و کہسار، نہ باغ و چمن رہیں گے اور نہ ایوان و محل، صرف صفا چٹ میدان رہ جائے گا۔

'وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا'۔ یعنی آج تو اللہ تعالیٰ پسِ پردہ بیٹھا ہوا لوگوں کا امتحان کر رہا ہے لیکن اس دن یہ پردہ اٹھا دیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے کروبیوں کے جلو میں نمودار ہوگا۔ اس وقت اصل حقیقت بالکل بے نقاب ہو کر اس طرح لوگوں کے سامنے آ جائے گی کہ کسی کے لیے بھی اس میں کسی شک کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ کا نمودار ہونا کس طرح ہوگا تو اس کا تعلق احوالِ آخرت سے ہے جس کی تفصیلات متشابہات میں داخل ہیں۔ ان پر اجمالی ایمان ہی کافی ہے۔ ان کی زیادہ کھوج کرید کی جائے تو اندیشہ فتنہ میں پڑ جانے کا ہوتا ہے۔

'وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۢ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى'۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ظہور کے ساتھ وہ جنت اور دوزخ بھی بے نقاب کر دی جائیں گی جو جزا اور

سزا کے لیے پہلے سے تیار رہیں۔ سورہ میں اصل خطاب چونکہ معاندین سے ہے اس وجہ سے پہلے جہنم کا ذکر فرمایا کہ وہ لائی جائے گی۔ اس کو دیکھتے ہی وہ سارے لوگ، جو آخرت سے بے پروا رہے اپنی محرومی پر سر پیٹ لیں گے اور حسرت سے کہیں گے کہ کاش ہم نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ کر لیا ہوتا۔ فرمایا کہ یہ چیز پہلے ہی سوچنے اور کرنے کی تھی۔ جب وہ یہاں اس کو نہ چیت سکیں گے تو اتنی دور جا کر وہ اس کو چیتیں گے تو اس سے حسرت کے سوا اور کیا حاصل ہو گا!

'یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ' یہ وضاحت ہے اس چیتنے کی جس کی طرف اوپر والی آیت میں 'یَتَذَکَّرُ الْاِنْسَانُ' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے کہ اس دن وہی لوگ جو آج قیامت سے آگاہ کرنے والوں کو بے وقوف ٹھہرا رہے ہیں نہایت حسرت و اندوہ کے ساتھ کہیں گے کہ کاش، اپنی اس زندگی کے لیے ہم نے دنیا کی زندگی میں کچھ کر لیا ہوتا! مطلب یہ ہے کہ وہ اس دن حسرت تو کریں گے لیکن ان کی یہ حسرت بے سود رہے گی۔ اس کی تلافی کا وقت گزر چکا ہو گا۔

فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُعَذِّبُ عَذَابَهٗۤ اَحَدٌ ۝ وَّلَا یُوْثِقُ وَثَاقَهٗۤ اَحَدٌ (۲۵-۲۶)

یہ اس دن کے عذاب کی شدت اور بے پناہی کا بیان ہے کہ اس دن اللہ تعالیٰ جو عذاب دے گا اس طرح کا عذاب کوئی نہیں دے سکتا اور جس طرح کا باندھنا وہ باندھے گا اس طرح کا باندھنا کوئی نہیں باندھ سکتا ـــــ یہ حقیقت نفس الامری کا بیان ہے۔ اس لیے کہ اس دنیا کی نعمتوں اور لذتوں کی طرح اس کی تکلیفیں اور اذیتیں بھی فانی اور وقتی ہیں۔ بڑی سے بڑی تکلیف بھی کوئی دے گا تو موت بہرحال اس کو ختم کر سکتی ہے اسی طرح طویل سے طویل قید میں بھی کوئی ڈالے گا تو موت کا فرشتہ اس سے بھی رہائی دلا سکتا ہے لیکن آخرت کے عذاب اور اس کی قید سے رہائی دلانے کے لیے وہاں موت بھی نہیں ہو گی۔

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۝
فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۝ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (۲۷-۳۰)

اس دن مستحقین جنت کو جو بشارت براہِ راست ربِ کریم کی طرف سے ملے گی یہ اس کی طرف اشارہ ہے۔ یہاں خاص توجہ کی چیز 'یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ' کا خطاب ہے جس سے جنت کے مستحقین کو نوازا جائے گا۔ اس خطاب سے ان کے نفس کی اس خاص صفت پر روشنی پڑ رہی ہے جس کی بنا پر وہ جنت کے حقدار قرار پائیں گے۔ اوپر آیات ۱۵-۱۶ میں ان تنگ ظرفوں اور تھڑدلوں کا حال بیان ہوا تھا جن کو نعمت ملتی ہے تو وہ بہک کر اترانے اور فخر کرنے والے بن جاتے ہیں اور جب ذرا تنگیٔ رزق کی آزمائش پیش آ جائے تو بالکل دل شکستہ ہو کر خدا سے مایوس اور ناشکرے بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کا انجام بیان ہوا۔ اب اس کے مقابل میں ان لوگوں کا حال اور انجام بیان

مستحقین جنت کو براہِ راست بشارت

ہو رہا ہے جن کے قدم تنگی اور فراخی دونوں طرح کے حالات میں جادۂ حق پر استوار رہتے ہیں نعمت ملتی ہے تو وہ اس کو اپنے شکر کا امتحان سمجھتے ہیں اور طغیان و فساد میں مبتلا ہونے کے بجائے کوشش کرتے ہیں کہ اپنے رب کے امتحان میں پورے اتریں اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان فرمایا ہے وہ بھی اللہ کے بندوں پر احسان کریں۔ اسی طرح اگر ان کو تنگیٔ رزق سے سابقہ پیش آتا ہے تو بے حوصلہ اور اپنے رب سے مایوس ہونے کے بجائے اس کو وہ اپنے صبر کا امتحان سمجھتے ہیں اور جان کی بازی لگا کر کوشش کرتے ہیں کہ اس امتحان سے سرخرو نکلیں، نہ دنیا میں ان کو اپنے ضمیر کے آگے شرمندہ ہونا پڑے نہ آخرت میں اپنے رب کے آگے۔ ان لوگوں کا دل چونکہ عُسر و یُسر اور نرمی و سختی دونوں طرح کے حالات میں اپنے رب سے راضی و مطمئن اور ڈانواں ڈول ہونے سے محفوظ رہتا ہے اس وجہ سے اس کو نفسِ مطمئنہ سے تعبیر فرمایا ہے اور یہی لوگ ہیں جو جنت کے وارث ہوں گے۔

'اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً'۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحسین و آفرین کا کلمہ ہے۔ ان لوگوں کو خطاب کر کے ارشاد ہو گا کہ شاباش! تمھارے رب نے جس میدانِ امتحان میں تمھیں اتارا اس میں تمھاری بازی نہایت کامیاب رہی۔ اب تم اپنے رب کی طرف اس سرخروئی کے ساتھ لوٹو کہ تم نے ثابت کر دیا کہ تم ہر طرح کے نرم و گرم حالات میں اپنے رب سے راضی و مطمئن رہے اور ساتھ ہی تمھیں یہ سرفرازی بھی حاصل ہوئی کہ تم اپنے رب کی نظروں میں بھی پسندیدہ ٹھہرے۔ جس طرح تم اپنے رب سے کسی مرحلے میں گلہ مند نہیں ہوئے اسی طرح تمھارے رب نے تم کو بھی کسی مرحلے میں اپنے معیار سے فروتر نہیں پایا۔ تم اس سے راضی وہ تم سے راضی!

'فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۝ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ'۔ یعنی تم امتحان پاس کر کے جنت کے مستحق ٹھہرے تو اب میرے خاص بندوں کے زمرے میں اور میری جنت میں داخل ہو جاؤ۔

توفیقِ ایزدی ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہٖ۔

لاہور
۱۴- دسمبر ۱۹۷۹ء
۲۴- محرم الحرام ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

۹۰

البلد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــ الفجر ـــــ کی توام ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ سابق سورہ میں انسان کی اس غلط فہمی پر تنبیہ فرمایا گیا ہے کہ جب اس کو نعمت ملتی ہے تو وہ یہ خیال کر کے اکڑنے اور اترانے لگتا ہے کہ یہ اس کا حق ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی عزت افزائی فرمائی ہے اور اگر کوئی آزمائش پیش آجاتی ہے تو مایوس و دل شکستہ ہو جاتا ہے کہ یہ اس کی حق تلفی ہوئی ہے اور خدا نے اس کو ذلیل کر دیا ہے۔ حالانکہ ان میں سے کوئی حالت بھی نہ عزت افزائی کے لیے پیش آتی نہ ذلیل کرنے کے لیے بلکہ ان کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ بندے کے شکر یا صبر کا امتحان کرتا ہے۔ انسان کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ نہ نعمت پا کر اکڑنے والا بنے نہ اس سے محروم ہو کر دل شکستہ و مایوس ہو بلکہ نعمت ملے تو اپنے رب کا شکرگزار بندہ بنے اور اس نعمت میں اللہ کے دوسرے حاجتمند بندوں کو شریک کرے اور اگر کوئی افتاد پیش آئے تو اپنی محرومی کا رونا رونے اور خدا کو کوسنے کے بجائے فیصلۂ تقدیر پر صابر و راضی رہے۔ جو بندہ یہ روش اختیار کرتا ہے اس کا نفس 'نفسِ مطمئنہ' ہے اور آخرت میں اس کو 'رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً' کی بادشاہی حاصل ہوگی۔

اس سورہ میں اسی کلیہ کو قریش پر منطبق کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ یہ سرزمین ـــــ سرزمینِ مکہ ـــــ اس زمانے میں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یہاں بسایا ہے، رزق کے وسائل سے بھی محروم تھی اور امن سے بھی۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی ذرّیت کے لیے رزق اور امن کی جو دعا فرمائی اس کی برکت سے یہاں رزق کی بھی فراوانی ہوئی اور امن کے اعتبار سے بھی اس علاقے کا یہ حال ہوا کہ یہاں کسی انسان تو درکنار کسی جانور کو بھی دکھ پہنچانا گناہ ٹھہرا۔ اسی امن اور رزق کا یہ فیض ہے کہ اولادِ اسمٰعیل یہاں خوب پھلی پھولی اور اس پورے ملک پر اس کو سیادت و قیادت حاصل ہوئی۔ لیکن یہ نعمتیں پا کر اپنی پچھلی تاریخ یہ لوگ بھول بیٹھے۔ اب یہ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ یہ جو کچھ ان کو

حاصل ہے ان کا پیدائشی حق ہے۔ خدا کی راہ میں خرچ کرنا ان کے دلوں پر بہت گراں گزرتا ہے۔ ان کی آنکھیں عبرت نگاہی سے محروم اور زبانیں حق وصبر اور نیکی واحسان کے ذکر سے گنگ ہو چکی ہیں۔ اب ان کا مال ان کی اپنی عیاشیوں اور فضول خرچیوں کے لیے ہے۔ کوئی نہیں ہے جو یتیموں اور مسکینوں کی خدمت کی راہ میں کوئی قربانی پیش کرنے اور آخرت کی ابدی فائز المرامی حاصل کرنے کا حوصلہ کرے بلکہ سب نے جہنم کی راہ اختیار کر لی ہے۔

یہ سورتیں چونکہ بالکل ابتدائی دور کی ہیں اس وجہ سے ان میں خطاب بھی بالعموم یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ سے ہے اور ان میں جو دعوت یا اپیل ہے وہ بھی تمام تر انسانیت اور اس کے فطری مبادی پر مبنی ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۴) سرزمینِ حرم اور بنی اسمٰعیل کی ابتدائی تاریخ سے اس بات کی شہادت کہ یہ علاقہ بالکل بے آب و گیاہ تھا جس میں زندگی نہایت مشقت کی زندگی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور بیت اللہ کی برکت سے یہ ایک پُرامن علاقہ بن گیا اور اس کے باشندوں کو رزق و مال کی فراوانی حاصل ہوئی۔

(۵-۷) اللہ تعالیٰ کے اس فضل و احسان کا حق یہ تھا کہ لوگ اس کے شکر گزار اور اس کے غریب بندوں کے ہمدرد و مددگار بنتے لیکن حال یہ ہے کہ اگر راہِ خدا میں ان کو انفاق کی دعوت دی جائے تو کہتے ہیں کہ کہاں تک کوئی خرچ کرے؟ ڈھیروں مال تو اڑا چکے! گویا ان کو گمان ہے کہ خدا ان کی ان شاہ خرچیوں کو دیکھ نہیں رہا ہے!

(۸-۱۷) ان زر پرستوں کو ملامت کہ اللہ نے ان کو آنکھیں دی تھیں کہ ان سے عبرت حاصل کرتے، زبان اور ہونٹ دیے تھے کہ ان سے لوگوں کو یتیموں اور مسکینوں کی اعانت پر ابھارتے، نیکی اور بدی کا انتیاز دیا تھا کہ بدی کی ترغیبات کا مقابلہ کر کے نیکی کے کام کرتے، یتیموں اور مسکینوں کی مدد کرتے، ایمان والوں اور صبر و ہمدردی کی دعوت دینے والوں میں سے بنتے لیکن یہ سب کچھ پا کر وہ اپنے رب کے شکر گزار بننے کے بجائے اپنے نفس اور مال کے پرستار بن کر بیٹھ رہے۔

(۱۸-۲۰) حالانکہ اگر یہ راہ اختیار کرتے تو اللہ کے ہاں بڑے اجر کے مستحق ٹھہرتے لیکن انھوں نے اللہ کی آیات کا انکار اور اپنے لیے دوزخ کی آگ کا سامان کیا۔

سُوۡرَةُ الۡبَلَدِ

مَكِّيَّةٌ ـــــــــــ اٰیات: ۲۰

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آیات ۱-۲۰ لَآ اُقۡسِمُ بِهٰذَا الۡبَلَدِ ۙ﴿۱﴾ وَاَنۡتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الۡبَلَدِ ۙ﴿۲﴾ وَ
وَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۙ﴿۳﴾ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ كَبَدٍ ؕ﴿۴﴾
اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ یَّقۡدِرَ عَلَیۡهِ اَحَدٌ ۘ﴿۵﴾ یَقُوۡلُ اَهۡلَكۡتُ وقف لازم
مَالًا لُّبَدًا ؕ﴿۶﴾ اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّمۡ یَرَهٗۤ اَحَدٌ ؕ﴿۷﴾ اَلَمۡ نَجۡعَلۡ
لَّهٗ عَیۡنَیۡنِ ۙ﴿۸﴾ وَلِسَانًا وَّشَفَتَیۡنِ ۙ﴿۹﴾ وَهَدَیۡنٰهُ النَّجۡدَیۡنِ ۚ﴿۱۰﴾
فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَةَ ۫ۖ﴿۱۱﴾ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡعَقَبَةُ ؕ﴿۱۲﴾ فَكُّ
رَقَبَةٍ ۙ﴿۱۳﴾ اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِیۡ یَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَةٍ ۙ﴿۱۴﴾ یَّتِیۡمًا
ذَا مَقۡرَبَةٍ ۙ﴿۱۵﴾ اَوۡ مِسۡكِیۡنًا ذَا مَتۡرَبَةٍ ؕ﴿۱۶﴾ ثُمَّ كَانَ
مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡمَرۡحَمَةِ ؕ﴿۱۷﴾
اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ الۡمَیۡمَنَةِ ؕ﴿۱۸﴾ وَالَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰیٰتِنَا هُمۡ
ع ۱ ۲۰ ۱۵ اَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَةِ ؕ﴿۱۹﴾ عَلَیۡهِمۡ نَارٌ مُّؤۡصَدَةٌ ﴿۲۰﴾

ترجمۂ آیات ۱-۲۰ نہیں! میں قسم کھاتا ہوں اس سرزمین کی ـــــ اور تم اسی میں مقیم ہو ـــــ اور باپ اور اس کی ذریت کی کہ ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا۔ ۱-۴

کیا وہ گمان رکھتا ہے کہ اس پر کسی کا زور نہیں! کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال اڑا دیا! کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس کو کسی نے دیکھا نہیں! ۵-۷

کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے اور اس کو دونوں راہیں نہیں سجھا دیں! پر اس نے گھاٹی نہیں پار کی اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہے وہ گھاٹی! گردن کو چھڑانا یا بھوک کے زمانے میں کسی قرابت مند یتیم یا کسی خاک آلود مسکین کو کھلانا ـــــ پھر وہ بنے ان میں سے جو ایمان لائے اور جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر اور ہمدردی کی نصیحت کی۔ یہی خوش بخت لوگ ہیں۔ اور جنھوں نے ہماری آیات کا انکار کیا وہ کم بختی والے ہیں۔ وہ آگ میں موندے ہوئے ہوں گے۔ ۸-۲۰

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَآ اُقۡسِمُ بِھٰذَا الۡبَلَدِ (۱)

قسم سے پہلے 'لا' کا محل استعمال

یہاں 'لَا' اسی طرح آیا ہے جس طرح 'لَآ اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ' (القیمۃ - ۷۵: ۱) اور بعض دوسرے مقامات میں آیا ہے۔ اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہ قسم سے پہلے مخاطب کے اس خیالِ باطل کی تردید کے لیے ہے جس کا سابق سورہ میں حوالہ ہے۔ سابق سورہ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ لوگوں کو جب مال و جاہ کی نعمت ملتی ہے تو اس کو اپنی تدبیر و تدبّر کا کرشمہ سمجھ بیٹھتے اور اترانے ہیں کہ وہ خدا کی نظروں میں بلند مرتبہ ہیں اس وجہ سے اس نے دوسروں کے مقابل میں ان کو یہ سرفرازی بخشی ہے۔ اس خیالِ باطل کی تردید سابق سورہ میں ایک دوسرے پہلو سے ہوئی ہے۔ اِس سورہ میں اس کی تردید ایک اور پہلو سے آرہی ہے جس کا آغاز قسم سے ہوا ہے اور اس قسم سے پہلے 'لَا' ان کے زعمِ باطل کی تردید کے لیے ہے۔ گویا ان لوگوں کا یہ خیال اس قدر بے بنیاد اور لغو ہے کہ اس کی تردید میں اتنے توقف کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ دلیل بیان کر لینے کے بعد اس کی نفی کی جائے۔ یہ اسلوبِ کلام ہر زبان میں پایا جاتا اور اس موقع پر اختیار کیا جاتا ہے جب مقصود مخاطب کے خیال کی لغویت کا اظہار ہو۔

اصل دعویٰ جس پر قسم کھائی گئی ہے۔

قسم یہاں بطورِ شہادت اصل دعوے کی تائید میں کھائی گئی جو آگے 'لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ کَبَدٍ' (۴) کے الفاظ میں مذکور ہے۔

'بِھٰذَا الۡبَلَدِ' سے مراد سرزمینِ مکّہ ہے۔ سورۂ تین میں بھی اس کی قسم 'وَھٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِیۡنِ' (التین - ۹۵: ۳) کے الفاظ سے کھائی گئی ہے۔ قرآن مجید کی دوسری قسموں کی طرح یہ قسم بھی، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، سرزمینِ حرم کے تقدّس کے پہلو سے نہیں بلکہ اس دعوے پر دلیل کے پہلو سے کھائی گئی ہے جو آگے مذکور ہے۔

وَاَنۡتَ حِلٌّۢ بِھٰذَا الۡبَلَدِ (۲)

ایک برمحل جملہ معترضہ

یہ جملہ قسم کے بیچ میں، بطور جملہ معترضہ، قسم کی تائید و تصویب کے طور پر ہے۔ ضمیرِ خطاب کے مخاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہو سکتے ہیں اور قریش بھی۔ دونوں ہی صورتوں میں اصل مدّعا کے اعتبار سے کچھ زیادہ فرق نہیں ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کسی ایسے دور دراز علاقے کی شہادت نہیں پیش کی جا رہی ہے جس کے حالات کا اندازہ کرنے اور جس کی تاریخ کا علم حاصل کرنے

کے لیے کوئی زحمتِ سفر اٹھانی پڑے بلکہ تم یہاں مقیم اور اس کے ماضی و حاضر سے اچھی طرح باخبر ہو۔ یہ تمھارا مامن و مستقر اور تمھارا محبوب وطن ہے۔ اس کی تاریخ تمھاری اپنی ہی تاریخ ہے۔ اس کے گرم و سرد اور خشک و تر دونوں سے تم گزرے ہوئے ہو۔ اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہو کہ جو بات کہی جا رہی ہے وہ حرف حرف حق ہے یا اس میں کوئی مبالغہ یا آورد ہے۔

وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ (۳)

حضرت ابراہیمؑ اور ان کی ذریت کی شہادت

جملہ معترضہ کے بعد یہ ٹکڑا قسم سے متعلق اور اس کی تکمیل ہے۔ سرزمین مکہ کی قسم کے بعد اس میں بسنے والے باپ اور اس کی ذریت کی قسم ہے۔ 'وَالِدٍ' سے مراد ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام اور 'وَمَا وَلَدَ' سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ذریت ہے جو سرزمینِ مکہ میں آباد ہوئی اور پھر تمام عرب میں پھیلی۔ لفظ 'وَالِدٍ' کی تنکیر تفخیم شان کے لیے بھی ہو سکتی ہے اور اس کا یہ فائدہ بھی ہے کہ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی مراد لیے جا سکتے ہیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی۔ اسی طرح 'وَمَا وَلَدَ' میں جو تعمیم ہے وہ تمام بنی اسماعیل پر حاوی ہے، خواہ ان کا تعلق بنی اسماعیل کی کسی شاخ سے بھی ہو۔

سرزمین مکہ کی پچھلی تاریخ کی طرف اشارہ

'لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ' (۴) 'کبد' کے معنی مشقت اور شدت کے ہیں۔ لفظ 'اِنْسَان' اگرچہ عام ہے اور اس کے عام ہونے کے کئی فائدے ہیں لیکن یہاں اس عام سے مراد خاص طور پر قرآن کے اولین مخاطب بنی اسماعیل بالخصوص قریش ہیں۔ سرزمین حرم میں ان کے بزرگ اجداد کی آمد اور سکونت اور ان کی ذریت کی ابتدائی تاریخ کا حوالہ دے کر قریش کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ آج اس سرزمین میں تم کو جو فراخیٔ رزق و رفاہیت حاصل ہے یہ نہ سمجھو کہ یہی حال ہمیشہ سے رہا ہے یا یہ حالت تمھاری ذہانت و قابلیت کی بدولت ہوئی ہے۔ جس زمانے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بسایا ہے اس وقت یہ علاقہ ایک بالکل بنجر، بے آب و گیاہ اور غیر مامون علاقہ تھا۔ یہاں کے لوگوں کی زندگی خانہ بدوشانہ اور نہایت مشقت کی زندگی تھی۔ معاش کا انحصار گلہ بانی پر تھا اور ہر شخص اپنی زندگی اور اپنے گلے کی حفاظت کا ذمہ دار خود تھا۔ لوگوں کی حفاظت کے لیے کوئی نظامِ عدل اور قانون موجود نہیں تھا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یہاں بسایا تو ان کے اور ان کی اولاد کے لیے یہ دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ اس وادیٔ غیر ذی زرع میں ان کو رزق و فضل سے بھی بہرہ مند فرمائے اور امن سے بھی متمتع رکھے۔ یہ اسی دعا کی برکت ہے کہ رزق کے دروازے بھی کھلے اور بیت اللہ کی تولیت اور شہرِ حرم کی امن بخشی کی بدولت سفر اور تجارت کی راہیں بھی فراخ ہوئیں جس سے ان کی معاشی حالت مشقت کی جگہ رفاہیت و خوش حالی میں

تبدیل ہوگئی یہاں تک کہ آج تم اس کے غرور میں نہ خدا کو خاطر میں لا رہے ہو نہ اس کے رسول کو بلکہ یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ یہ جو کچھ تمھیں حاصل ہے یہ تمھارا پیدائشی حق ہے، تم اس میں ہر قسم کے تصرف کے مجاز ہو، کسی کی طاقت نہیں ہے کہ تمھارے اس عیش اور اس آزادی میں خلل انداز ہو سکے۔

قریش کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے قرآن نے جگہ جگہ حرم کی اس تاریخ کی یاددہانی کر کے ان کو متنبہ فرمایا ہے کہ اگر وہ اللہ کی بخشی ہوئی نعمت پا کر طغیان میں مبتلا ہو گئے تو یاد رکھیں کہ وہ خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے ہی پاؤں میں کلہاڑی ماریں گے۔ سورۂ ابراہیم میں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے:

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ رَبِّ	اور جب کہ دعا کی ابراہیم نے اے میرے رب!
اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّ	اس سرزمین کو پُرامن سرزمین بنا اور مجھ
اجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ أَنْ نَّعْبُدَ	کو اور میری اولاد کو بچا کہ ہم بتوں کی پرستش
الْأَصْنَامَ ؕ رَبِّ إِنَّهُنَّ	کی چھوت سے آلودہ ہوں۔ اے میرے رب!
أَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ	ان بتوں نے تو لوگوں کے اندر سے ایک خلقِ
فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَإِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ	کثیر کو گمراہ کر رکھا ہے۔ تو جو میری پیروی کرے
وَمَنْ عَصَانِيْ فَإِنَّكَ غَفُوْرٌ	وہ تو مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے
رَّحِيْمٌ ۝ رَبَّنَآ إِنِّيْٓ أَسْكَنْتُ	تو تو مغفرت فرمانے اور رحم کرنے والا ہے
مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ	اے ہمارے رب! میں نے اپنی ذریت میں
ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ	سے بعض کو ایک بن کھیتی کی زمین میں
الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ	بسایا ہے، تیرے محترم گھر کے پاس، اے
فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ	رب! اس لیے کہ یہ نماز کا اہتمام کریں تو
تَهْوِيْٓ إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ	لوگوں کے دل ان کی طرف توجہ مائل کر دے
الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝	اور ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما کہ یہ
(ابراہیم ۱۴: ۳۵-۳۷)	شکر گزاری کریں۔

ان آیات پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو ان سے مندرجہ ذیل حقائق سامنے آئیں گے:

قریش کو چند حقائق کی یاددہانی

— یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد میں سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ایک غیر آباد اور بنجر علاقے میں جو بسایا تو اس لیے کہ اس کو مشرکانہ ماحول سے دور اور محفوظ رکھیں۔

— اس علاقہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر فرمائی تاکہ ان کی ذریت

اس کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا مرکز بنائے اور ساتھ ہی یہ دعا بھی فرمائی کہ اس مرکز اور ان کی ذریت کو خلق کی مرجعیت حاصل ہو۔

ـــــ یہ علاقہ اس وقت زمینی پیداوار اور امن سے بالکل محروم علاقہ تھا۔ اس وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے باشندوں کے لیے روزی کی فراخی کی بھی دعا فرمائی اور علاقہ کے لیے امن کی بھی۔

مقصود اس تفصیل سے اس حقیقت کا اظہار ہے کہ آج قریش کو جو مال وجاہ اور جو سطوت و اقتدار بھی حاصل ہے اس میں نہ ان کی ذاتی سعی و تدبیر کو کوئی دخل ہے اور نہ ان کے خاندانی استحقاق کو بلکہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور بیت اللہ کی برکت ہے جس سے وہ بہرہ مند ہو رہے ہیں اور یہ برکت ان کے لیے غیر مشروط نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بندگی، بیت اللہ کے مقصد کی تکمیل اور ان کے اندر مبعوث ہونے والے رسول پر ایمان کے ساتھ مشروط ہے۔[1] اگر وہ ان شرطوں کے پابند رہیں گے تو ان کو یہ عزت و سرفرازی حاصل رہے گی ورنہ یہ سب چھن جائے گی۔

اسی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے قریش سے سورۂ قریش میں مطالبہ فرمایا ہے کہ اگر بیت اللہ کی برکتوں سے وہ بہرہ مند رہنا چاہتے ہیں تو اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ اس گھر کے خداوند کی عبادت کریں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اس گھر پر قابض اور اس کی برکتوں کے حقدار بنے رہیں۔ فرمایا ہے:

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۙ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ۚ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ ۙ الَّذِیْۤ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ ڏ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۠ (القریش ۱۰۶ : ۱-۴)	بوجہ اس کے کہ قریش کو الفت بخشی گئی جاڑے اور گرمی کے سفر کی تو ان کو چاہیے کہ اس گھر کے خداوند کی عبادت کریں جس نے قحط میں کھلایا اور خطرے سے بے خوف کیا۔

اَیَحْسَبُ اَنْ لَّنْ یَّقْدِرَ عَلَیْهِ اَحَدٌ (۵)

مطلب یہ ہے کہ جن کو اس سرزمین کی ابتدائی تاریخ معلوم ہے ان کے لیے تو اس کی موجودہ رفاہیت سے اس غلط فہمی میں پڑنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اب ان کی جڑیں اتنی مضبوط ہو چکی

---

[1] بعض دوسری آیات سے یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے امامت و سیادت کا جو وعدہ فرمایا تھا وہ مشروط بشرائط تھا۔ وہ لوگ اس سے مستثنیٰ کر دیے گئے تھے جو ان کے طریقہ کو چھوڑ بیٹھیں۔

ہیں کہ کوئی ان کو اکھاڑ نہیں سکتا۔ جس نے ان کو ایک بے آب وگیاہ زمین میں یہ فراوانی رزق بخشی وہ ان کو جب چاہے تباہ بھی کر سکتا ہے بالخصوص جب کہ انھوں نے اس مقصد کو بھی برباد کر دیا ہے جس کے لیے ان کو یہاں آباد کیا گیا اور جس کی خاطر ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے دعا فرمائی۔

يَقُولُ أَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ۝ أَيَحْسَبُ أَن لَّمْ يَرَهُ أَحَدٌ (۶-۷)

فاسد ذہنیت سے فاسد کردار

اوپر کی آیت میں ان کی اس ذہنیت سے پردہ اٹھایا گیا ہے جس میں مال وجاہ کی فراوانی نے ان کو مبتلا کر دیا تھا۔ اس آیت میں ان کے اس کردار سے پردہ اٹھایا جا رہا ہے جو اس فاسد ذہنیت نے ان کے اندر پیدا کیا۔

جن کے اندر یہ گھمنڈ پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کو جو مال وجاہ حاصل ہے یہ ان کا پیدائشی حق اور ان کی قابلیت وہنر کا کرشمہ ہے، ان کے اندر انفاق کا جذبہ بالکل مردہ ہو جاتا ہے اس لیے کہ ان کو نہ خدا کی پروا رہ جاتی نہ آخرت کی۔ اس طرح کے لوگ اپنی نجالت پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے مستحقین کے سامنے ہمیشہ اپنے وسیع مصارف کا رونا روتے رہتے ہیں اور اس طرح ان کو باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ انھیں ذاتی مصارف کے علاوہ قومی واجتماعی مصارف پر اتنا خرچ کرنا پڑتا ہے کہ وسیع ذرائع آمدنی رکھنے کے باوجود مشکل ہی سے کچھ پس انداز ہوتا ہے۔ یہی طریقہ وہ ان لوگوں کو چپ کرنے کا اختیار کرتے ہیں جو ان کو خدا اور آخرت کے نام پر انفاق کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کو وہ جواب دیتے ہیں کہ آخر کہاں تک خرچ کیے جائیں! ڈھیروں مال تو اسی طرح کے مصارف پر اٹھا چکے ہیں! 'مَالًا لُّبَدًا' کے معنی ہیں کثیر اور ڈھیروں مال۔

'أَيَحْسَبُ أَن لَّمْ يَرَهُ أَحَدٌ'۔ یہ اس طرح کے شیخی بگھارنے والوں کو جواب ہے کہ یہ لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ان کی ان فیاضیوں کو کوئی دیکھ نہیں رہا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ دیتے دلاتے کوڑی بھی نہیں لیکن اپنی شاہ خرچیوں کا اشتہار بہت دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک دن ان کا یہ تمام زبانی جمع خرچ ان کے آگے بھی آجائے گا اور خلق کے سامنے بھی۔

نعمتوں کا صحیح مصرف

أَلَمْ نَجْعَل لَّهُ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ ۝ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (۸-۱۰)

یعنی یہ لوگ مال ودولت پا کر اسی میں کھو کے گئے حالانکہ اللہ نے ان کو اس سے بھی بڑی نعمتیں دی تھیں، اگر یہ ان کے بھی قدر دان ہوتے تو اس طرح خزف ریزوں کے عشق میں اندھے ہو کر اس ابدی بادشاہی کو نہ گنوا بیٹھتے جو اس فانی دولت کے ذریعے وہ حاصل کر سکتے تھے۔ فرمایا کہ وہ غور کریں کہ کیا ہم نے ان کو دو آنکھیں نہیں دیں کہ وہ ان سے اپنے گرد وپیش کا جائزہ لیں اور

دیکھیں کہ ایک طرف تو ہم نے ان کو مال و جاہ سے نوازا اور دوسری طرف ان کے آگے پیچھے ایسے یتیم و نادار، غریب و لاچار اور کمزور و بیمار رکھے ہیں جو نانِ شبینہ کو محتاج، تن ڈھانکنے سے مجبور، آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کی نعمت سے محروم ہیں۔ ہم نے آنکھیں دے کر ان کو یہ منظر اس لیے دکھایا کہ وہ اس سے عبرت حاصل کریں اور اپنے رب کے شکرگزار بنیں کہ اس نے محض اپنے فضل سے ان کو اس طرح کی کسی آزمائش سے محفوظ رکھا اور پھر اس شکرگزاری کا حق یوں ادا کریں کہ پوری فیاضی سے ان ضرورت مندوں پر اپنا وہ مال صرف کریں جو ان کے رب نے اس طرح کے لوگوں کے حق کی حیثیت سے ان کی تحویل میں دیا۔

مطلب یہ ہے کہ آنکھوں کا کوئی صحیح مصرف ہے تو یہی عبرت نگاہی اور اثر پذیری ہے۔ اگر وہ یہ کام نہ کریں تو ان کے ہونے سے نہ ہونا بہتر ہے۔

وَلِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ یعنی آنکھوں کے ساتھ اس نے انسان کو ایک زبان اور دو ہونٹ بھی عنایت فرمائے تاکہ وہ جو کچھ دیکھے اور محسوس کرے اس پر خود بھی عمل پیرا ہو اور اپنی زبان سے دوسروں کو بھی اس پر ابھارے تاکہ اس کی تشویق و ترغیب سے دوسروں کے اندر بھی وہ نیکی پھیلے۔ سابق سورہ میں اسی چیز کی طرف وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (الفجر - ۸۹: ۱۸) (اور تم مسکینوں کو کھلانے پر لوگوں کو نہیں ابھارتے) کے الفاظ سے توجہ دلائی ہے۔ اور اس سورہ میں آگے اسی مضمون کی تکمیل ان الفاظ میں کی ہے: ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (۱۷) (پھر وہ بنے ان لوگوں میں سے جو ایمان لائے اور جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر اور ہمدردی کی نصیحت کی)۔

اس آیت سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ انسان جس نیکی کا احساس کرے اس کے انجام دینے کے لیے خود بھی اقدام کرے اور دوسروں کو بھی اس کے لیے ابھارے۔ یہ چیز اس کے فرائض میں داخل ہے ورنہ اس کی نیکی ادھوری رہ جائے گی۔ معاشرہ سے متعلق بھی ہر شخص پر اس کی صلاحیت کے اعتبار سے ذمہ داری عائد ہوتی ہے جس کو ادا کیے بغیر کوئی شخص عند اللہ بری نہیں ہو سکتا۔ یہاں اشارے پر قناعت کیجیے، ان شاء اللہ سورۂ عصر کی تفسیر میں وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (العصر - ۱۰۳: ۳) کے تحت اس پر مفصل بحث آئے گی۔

ایک خاص نکتہ

یہاں ایک ضمنی نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ وہ یہ کہ زبان کے ساتھ دو ہونٹوں کا ذکر فرمایا ہے جو زبان کو اوپر اور نیچے دونوں طرف سے محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ جو چیز جتنی ہی قیمتی، جتنی ہی اثر آفرین اور جتنے ہی گہرے اور دور رس نتائج پیدا کرنے والی ہوتی ہے وہ اتنی ہی احتیاط سے محفوظ کی جاتی ہے تاکہ اس کے استعمال میں کوئی بے احتیاطی اور بے پروائی راہ نہ پائے۔

زبان بھی انسان کے نہایت قیمتی اور مؤثر اسلحہ میں سے ہے۔ یہ ایک شمشیر جوہر دار ہے اس وجہ سے قدرت نے اس کو میان میں چھپا کر انسان کو پکڑا یا تاکہ وہ اس کو وہیں میان سے باہر نکالے جہاں وہ ضرورت پیش آئے جس کے لیے قدرت نے اس کو بنایا ہے لیکن یہ عجیب بدقسمتی ہے کہ بالعموم لوگ اس سے اصل کام لینے کے بجائے گھاس کاٹنے کی درانتی کا کام لیتے ہیں۔

نیکی اور بدی کا شعور انسان کی فطرت میں ہے

'وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ'۔ یعنی شاہدہ و شعور اور نطق و بیان کی صلاحیت دینے کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر یہ فضل بھی فرمایا کہ اس کو دونوں راستے بھی دکھا دیے۔ دونوں راستے' سے اشارہ انہی دونوں راستوں کی طرف ہے جن کا ذکر سورۂ دہر میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے:

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ٥ (الدهر - ۷۶: ۳)	ہم نے اس کو راہ بھی دکھا دی، چاہے وہ شکر کرنے والا بنے یا ناشکرا بنے۔

اس سے زیادہ واضح لفظوں میں سورۂ شمس میں فرمایا ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ (الشمس - ۹۱: ۷-۸)	اور شاہد ہے نفس اور اس کی اعلیٰ ساخت، پس ہم نے اس کو الہام کر دی اس کی بدی اور نیکی۔

یہ اسی حقیقت کا بیان ہے جس کی وضاحت ہم سورۂ قیامہ کی تفسیر میں کر چکے ہیں کہ بدی کا بدی ہونا اور نیکی کا محبوب ہونا اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر ودیعت فرما دیا ہے۔ انسان اگر بدی کرتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ بدی کے شعور سے محروم ہے بلکہ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر بدی کو بدی جانتے ہوئے اس کا ارتکاب کرتا ہے۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ (۱۱-۱۲)

نعمتوں کی ناقدری پر اظہار افسوس

اب یہ مخاطبوں کی ناقدری و ناشکری کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو شعور و ادراک، نطق و بیان اور ہدایت کی روشنی سے جو نوازا تو اس کا حق یہ تھا کہ یہ نیکی اور ہمدردیٔ خلق کی راہ کے عقبات عبور کرنے کی کوشش، اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں میں شامل ہونے کا شرف اور 'رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً' کی بادشاہی حاصل کرتے لیکن یہ اپنی زرپرستی اور پست ہمتی کے سبب سے یہ حوصلہ نہ کر سکے بلکہ ان کا مال ان کے لیے زنجیر پا بن گیا۔

نیکی اور بدی کے مزاج میں فرق

'عَقَبَةٌ' کے معنی گھاٹی اور 'اِقْتِحَامٌ' کے معنی چڑھائی چڑھنے یا کوئی مشکل کام کرنے کے ہیں۔ یہاں اس لفظ سے نیکی کے ان کاموں کی طرف اشارہ ہے جو ہمدردیٔ خلق اور بندگیٔ رب کے نہایت اعلیٰ کام ہیں اور جن کی بعض مثالیں آگے مذکور ہیں۔ ان کاموں کو انجام دینے کے لیے چونکہ انسان کو ایثار و قربانی سے کام لینا پڑتا ہے جو انسان پر شاق ہے اس وجہ سے اس کو 'اقتحام عقبۃ'

(گھاٹی پار کرنے سے) تعبیر فرمایا۔ یہاں وہ حقیقت ملحوظ رہے جس کی طرف ہم جگہ جگہ اشارہ کر چکے ہیں کہ جتنے بھی اعلیٰ کام ہیں ان کے لیے چونکہ نفس کو اس کی نقد لذتوں سے موڑ کر بالکل مختلف سمت میں لے جانا پڑتا ہے اس وجہ سے وہ بہت شاق گزرتے ہیں۔ اس کے برعکس ادنیٰ کاموں کی لذتیں نقد ہیں اس وجہ سے نفس ان کی طرف فوراً چل پڑتا ہے۔ اس حقیقت کو سیدنا مسیحؑ نے یوں واضح فرمایا ہے کہ نیکی کی راہ تنگ اور اس پر چلنے والے تھوڑے ہیں اور بدی کی راہ فراخ اور اس پر چلنے والے بہت ہیں۔ یہی حقیقت 'حفّت الجنۃ بالمکارہ' (جنت مشکلات سے گھیر دی گئی ہے) والی حدیث میں بھی واضح فرمائی گئی ہے۔

خدا کے مقرب بننے کے لیے بازیاں کھیلنی پڑتی ہیں

'وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ' میں جو اسلوب ہے اس کی وضاحت ہم جگہ جگہ کر چکے ہیں کہ یہ اندازِ سوال کسی چیز کی عظمت و شان یا اس کی ہولناکی کے اظہار کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ یہاں مقصود مخاطبوں کو یہ بتانا ہے کہ تم صرف چند رسوم ادا کر کے خدا کے مقرب اور چہیتے بننے کے خواب دیکھ رہے ہو حالانکہ اس منزل تک پہنچنے کے لیے گھاٹیاں پار کرنی اور بازیاں کھیلنی پڑتی ہیں۔ مال کے پجاری بن کر تم اس مقام کو حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر یہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو آؤ سنو کہ اس کے لیے تمھیں کیا کیا کام کرنے ہیں۔

فَكُّ رَقَبَةٍ ۙ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۙ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۙ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ (۱۳-۱۶)

غلاموں کی آزادی اسلام کی سرفہرست نیکیوں میں ہے

اس سلسلہ میں سب سے پہلے 'فَكُّ رَقَبَةٍ' (گردن آزاد کرنے) یعنی غلام آزاد کرنے کا ذکر فرمایا۔ یہاں وہ بات پیش نظر رکھیے جس کی طرف ہم تمہیدی بحث میں اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ سورتیں بالکل ابتدائی دور کی ہیں اس وجہ سے ان میں اہل عرب سے خطاب بھی بیشتر نقطۂ 'انسان' سے ہوا ہے اور جن باتوں کے ان سے مطالبے کیے گئے ہیں وہ بھی تمام تر انسانیت اور فطرت کے بدیہی تقاضوں پر مبنی ہیں۔ غلاموں کو آزاد کرنا اور کرانا بھی ان نیکیوں میں سے ہے جن کے نیکی ہونے میں کسی معقول آدمی کو شک نہیں ہو سکتا۔ اہل عرب بھی اس کو ایک نہایت اعلیٰ نیکی کا کام سمجھتے رہے ہیں۔ قرآن نے اپنی دعوت کے بالکل ابتدائی دور ہی سے اس انسانی خدمت کو اپنی سرفہرست نیکیوں میں شامل کر لیا اور اس وقت کر لیا جب دنیا کے دوسرے گوشوں میں لوگ اس نیکی کے لیے بیدار نہیں ہوئے تھے۔ ہم نے سورۂ نور کی تفسیر میں تفصیل سے بتایا ہے کہ قرآن نے کس طرح ابتدا ہی سے اس نیکی کی تبلیغ شروع کی اور پھر کس طرح بالتدریج اپنے نظام کے اندر غلامی کا خاتمہ کر دیا۔

اس کے بعد یتیموں اور مسکینوں کو کھلانے کا ذکر فرمایا۔ 'کھلانا' ظاہر ہے کہ اپنے محدود مفہوم میں نہیں بلکہ وسیع معنوں یعنی مایحتاج پوری کرنے کے مفہوم میں ہے۔ اس کے ساتھ 'فِيْ يَوْمٍ

ذِیْ مَسْغَبَۃٍ' (بھوک اور قحط کے زمانے میں) کی قید اپیل کو مؤثر بنانے کے لیے ہے۔ یہ کام ہے تو ہمیشہ نیکی کا لیکن قحط کے زمانے میں اس کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ 'یَتِیْمًا' کے ساتھ 'ذَا مَقْرَبَۃٍ' (قرابت مند) کی قید بھی دعوت کو مؤثر بنانے ہی کے لیے ہے۔ یوں حقدار تو ہر یتیم مدد کا ہے لیکن قرابت دار یتیم کا حق خاص طور پر دوچند ہو جاتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس 'مِسْکِیْنًا' کے ساتھ 'ذَا مَتْرَبَۃٍ' (خاک آلود) کی صفت بھی اس تلقین کو مؤثر بنانے ہی کے لیے ہے۔

ثُمَّ کَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَۃِ (۱۷)

یہ آگے کا قدم ہے جو ان لوگوں کو اٹھانا چاہیے۔

نیکی کرنے والوں کو نیکی کا داعی بھی بننا چاہیے

جن کی آنکھوں میں عبرت نگاہی اور دلوں میں اثر پذیری ہوتی ہے ان سے اوپر بیان کی ہوئی نیکیوں کی بھی توقع کی جاتی ہے اور یہ توقع بھی ان سے کی جانی چاہیے کہ وہ ایمان لانے والوں اور صبر اور ہمدردئ خلق کی دعوت دینے والوں میں سے بنیں گے۔ اگر وہ نہ بنیں تو یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ان کے روحانی و اخلاقی ارتقار کی راہ میں کوئی غیر فطری رکاوٹ ہے جس کو وہ عبور نہ کر سکے۔

نیکی کے کاموں کا خاص مزاج اور اس کے لیے صبر کی ضرورت

یہاں 'مَرْحَمَۃ' (ہمدردی) کے ساتھ 'صبر' کا ذکر اسی طرح آیا ہے جس طرح سورۂ عصر میں 'حق' اور 'صبر' کا ذکر ایک ساتھ آیا ہے۔ اس کی وجہ نیکی کے کاموں کا وہ مزاج ہے جس کی طرف ہم 'اقتحام عقبۃ' کی وضاحت کرتے ہوئے اشارہ کر چکے ہیں کہ نیکی کے کام بالعموم نفس کی خواہشوں کے خلاف ہیں اس وجہ سے ان کے انجام دینے کے لیے انسان کو نفس کی مزاحمت کرنی اور ایک چڑھائی سی چڑھنی پڑتی ہے۔ یہ چڑھائی وہی لوگ چڑھ سکتے ہیں جن کے اندر 'صبر' کی خصلت مستحکم ہو۔ 'صبر' کا اصل مفہوم عزیمت و استقامت ہے۔ جن کے اندر یہ وصف نہ ہو وہ کوئی کام بھی پامردی کے ساتھ نہیں کر سکتے اس وجہ سے ضروری ہوا کہ جن کو نیکی کا درس دیا جائے ان کو ساتھ ہی صبر و استقامت کی بھی تلقین کی جائے۔ یہاں اشارے پر قناعت کیجیے، سورۂ عصر کی تفسیر میں ان شاء اللہ اس کے تمام اطراف بحث میں آئیں گے۔

اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَۃِ ۝ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا ھُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَۃِ ۝ عَلَیْھِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَۃٌ (۱۸-۲۰)

نیکوں اور بدوں کے انجام کا فرق

یہ آخر میں ان لوگوں کا انجام بیان فرمایا جو نیکی کے مذکورہ کاموں کا حوصلہ کریں گے اور جو ان سے محروم رہیں گے۔ فرمایا کہ جو لوگ یہ کام کریں گے تو وہ خوش بخت اور بامراد ہیں اور جو اللہ کی باتوں کی تکذیب ہی پر اڑے رہیں گے وہ بدبخت و نامراد ہیں، وہ آگ کے اندر بند کر دیے جائیں گے۔ یہاں تقابل کے اصول پر پہلے ٹکڑے میں اتنی بات محذوف ہے کہ 'اصحب المیمنۃ' جنت

کے بالاخانوں میں ہوں گے۔

لفظ 'مَيْمَنَة' 'يمين' (داہنے) سے بھی ہو سکتا ہے اور 'يمن' (مبارکی اور خوش بختی) سے بھی لیکن یہاں یہ 'مَشْئَمَة' کے مقابل میں آیا ہے جو لازماً 'شوم' (نحوست اور بدبختی) سے ہے۔ اس وجہ سے اس کو بھی 'یمن' سے لینا پڑے گا۔ میں نے ترجمہ میں اسی پہلو کو اختیار کیا ہے۔ ویسے یہ فرق محض لفظی ہوگا، اصل مدعائے کلام کے اعتبار سے کوئی بڑا فرق نہیں ہوگا۔ قرآن میں ان دونوں گروہوں کو 'اَصْحَابُ الْيَمِيْنِ' اور 'اَصْحَابُ الشِّمَالِ' سے بھی تعبیر فرمایا گیا ہے۔ سورۂ 'حاقّہ' میں اس تعبیر کی وجہ بھی بتا دی گئی ہے کہ نیکوں کو ان کے اعمال نامے ان کے داہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے اور بدوں کو ان کے بائیں ہاتھ میں۔ ان دونوں تعبیروں میں بس یہ فرق ہے کہ ایک میں ان کی ظاہری تقسیم کا اعتبار ہے، دوسری میں ان کی معنوی تقسیم کا۔ جن کو ان کے اعمال نامے ان کے داہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے ظاہر ہے کہ وہ خوش بخت ہوں گے اور جن کو ان کے اعمال نامے ان کے بائیں ہاتھ میں پکڑا دیے جائیں گے ان کی بدبختی اور محرومی بھی امرِ بدیہی ہے۔

'عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ'۔ 'اوصد الباب' کے معنی ہیں 'دروازہ بند کر دیا'۔ مطلب یہ ہوا کہ ان کو آگ میں موند کر اوپر سے دروازے بند کر دیے جائیں گے۔ اعاذنا اللہ من ذلک۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فللہ الحمد۔

لاہور

۳۱- دسمبر ۱۹۷۹ء

۱۱- صفر ۱۴۰۰ھ

تدبّرِ قرآن

91

الشّمس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُورہ کا عمود، سابق سُورہ سے تعلّق اور مطالب کا تجزیہ

سابق سورہ ـــــ البلد ـــــ میں قریش کے لیڈروں کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ جب تم اس وادیٔ مکہ میں بسائے گئے اس وقت یہاں زندگی نہایت مشقت کی زندگی تھی۔ یہ ایک بے آب و گیاہ علاقہ تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور بیت اللہ کی برکت سے یہاں تم کو رزق و فضل کی فراوانی حاصل ہوئی اور تم پھلے پھولے۔ تو یہ نعمتیں پاکر خدا سے اکڑنے والے اور اس کی زمین میں فساد برپا کرنے والے نہ بنو ورنہ یاد رکھو کہ جو خدا یہ سب کچھ دے سکتا ہے وہ جب چاہے اس کو چھین بھی سکتا ہے اور کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔

اس سورہ میں ان کو طغیان و سرکشی کے انجام سے ڈرایا ہے۔ اس کی تمہید یوں استوار فرمائی ہے کہ دیکھتے ہو کہ کائنات بظاہر اضداد کی ایک رزم گاہ ہے لیکن خدائے قادر و قیوم ان اضداد میں سے کسی کو ان کے حدود سے تجاوز نہیں کرنے دیتا جس کا فیض یہ ہے کہ یہ اضداد نہ صرف، یہ کہ آپس میں ٹکراتے نہیں بلکہ پوری سازگاری کے ساتھ اس کائنات کی خدمت کرتے ہیں اور ان کی اس سازگاری ہی پر اس کے بقا کا انحصار ہے ورنہ یہ دنیا چشم زدن میں درہم برہم ہو جاتی۔

اس کے بعد نفسِ انسانی کی تشکیل کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جو حال اس عالمِ اکبر کا ہے وہی حال عالمِ اصغر یعنی نفسِ انسانی کا بھی ہے۔ یہ بھی خیر و شر کے متضاد داعیات و محرکات سے مرکب ہے اور خالق نے انسان کی فطرت میں خیر و شر کا امتیاز بھی ودیعت فرمایا ہے اور خیر سے محبت اور شر سے نفرت کا ذوق بھی بخشا ہے۔ اس کا اقتضاء یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کے توازن کو قائم رکھے اور برے داعیات کو خیر کے داعیات پر غلبہ نہ پانے دے ورنہ وہ طغیان و فساد میں مبتلا ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ اپنی دنیا میں طغیان و فساد کو پسند نہیں کرتا۔ اس کو وہ اسی حد تک ڈھیل دیتا ہے جس حد تک وہ اس دنیا کی مصلحت کے مطابق پاتا ہے۔ جب یہ اس حد سے متجاوز ہونے لگتا ہے تو خالقِ کائنات اس کا سر کچل دیتا ہے اور ان لوگوں سے اپنی دنیا کو پاک کر دیتا ہے جن کا وجود بحیثیتِ مجموعی اس کے لیے زہرناک بن جاتا ہے۔

آخر میں اپنی اس سنت کے ظہور کی شہادت کے طور پر عرب کی پچھلی قوموں میں سے ایک ایسی قوم کی تباہی کا ذکر فرمایا ہے جس کی شوکت وصولت سے قریش واقف تھے اور جس کے طغیان و فساد کا ذکر ان کے لٹریچر میں موجود تھا۔ ان کی مثال سے قریش کو عبرت حاصل کرنے کی دعوت دی ہے اور ڈرایا ہے کہ اگر انہی کی طرح تمہارا مزاج بھی فاسد ہو گیا تو تم بھی خدا کے بے امان عذاب کی زد میں آ جاؤ گے اور پھر کوئی تمہاری مدد کے لیے نہیں اٹھے گا۔

اس روشنی میں پوری سورہ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

سُوْرَةُ الشَّمْسِ

مَكِّيَّةٌ ——— آيات : ۱۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آيات ۱-۱۵ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا (۱) وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا (۲) وَالنَّهَارِ اِذَا
جَلّٰهَا (۳) وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا (۴) وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا (۵)
وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا (۶) وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا (۷) فَاَلْهَمَهَا
فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (۸) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (۹) وَقَدْ
خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۱۰) كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَا (۱۱) اِذِ انْبَعَثَ
اَشْقٰهَا (۱۲) فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا (۱۳)
فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ
ع ۱ ۱۵ ۱۶ فَسَوّٰهَا (۱۴) وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا (۱۵)

ترجمۂ آیات ۱-۱۰ شاہد ہے آفتاب اور اس کا چڑھنا اور چاند جب اس کے پیچھے لگے اور دن جب اسے چمکا دے اور رات جب اسے ڈھانک لے اور شاہد ہے آسمان اور جیسا کچھ اس کو اٹھایا اور زمین اور جیسا کچھ اس کو بچھایا اور نفس اور جیسا کچھ اس کو سنوارا۔ پس اس کو سمجھ دی اس کی بدی اور نیکی کی۔ کامیاب ہوا جس نے اس کو پاک کیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو آلودہ کیا۔ ۱-۱۰

ثمود نے جھٹلایا اپنی سرکشی کے باعث۔ جب کہ اٹھ کھڑا ہوا ان کا سب سے بڑا بدبخت تو اللہ کے رسول نے آگاہ کیا کہ اللہ کی اونٹنی اور اس کے پینے کی باری سے خبردار! تو انھوں نے اس کو جھٹلا دیا اور اونٹنی کی کوچیں کاٹ دیں تو اللہ نے ان کے گناہ کی پاداش میں ان پر اپنا عذاب الٹ دیا اور ان کا ستھراؤ کر دیا اور وہ نہیں ڈرتا کہ اس کے پیچھے کیا ہو گا۔ ۱۱-۱۵

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۝ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۝ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۝ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا (۱-۴)

اضداد کی باہمی سازگاری کا درس

یہ آفاق کی بعض نمایاں نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو باہم دگر جوڑے جوڑے ہونے یا دوسرے الفاظ میں زوجین کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اشیاء کے جوڑے جوڑے ہونے سے قرآن نے توحید، معاد اور جزاء و سزا پر جو دلیلیں قائم کی ہیں ان کی وضاحت پچھلی سورتوں میں ہو چکی ہے۔ یہاں جس خاص پہلو کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ہر چند سورج اور چاند، دن اور رات میں سے ہر چیز کی شکل و صورت، ان کے ظہور کے طریقے، ان کے مزاج اور اس کائنات پر ان کے اثرات میں بڑا فرق ہے جس کے سبب سے یہ دنیا اضداد کی ایک رزم گاہ معلوم ہوتی ہے لیکن مدبّرِ کائنات نے ان اضداد کو اس طرح اس عالم کی مشین میں فٹ کیا ہے کہ مجال نہیں کہ کہیں ان میں کسی قسم کا تصادم واقع ہو بلکہ یہ نہایت سازگاری کے ساتھ اپنے اپنے دائروں میں کائنات کی مجموعی مصلحت میں رات دن سرگرم ہیں۔ نہ سورج چاند کے حدود میں مداخلت کرتا، نہ چاند اپنے وقت سے پہلے ظہور میں آنے کے لیے زور لگاتا، نہ دن کی یہ تاب کہ وہ اپنے وقت سے پہلے برآمد ہو جائے اور نہ رات کی یہ مجال کہ وہ دن کو اس کی ڈیوٹی پوری کرنے سے پہلے ہی برخاست کر دے: لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ (یٰسٓ - ۳۶ : ۴۰) (نہ سورج کے لیے روا کہ وہ چاند کو جا لے اور نہ رات ہی دن سے سبقت کرنے والی بن سکتی)۔

ان اضداد کی یہ باہمی سازگاری ہی ہے جس پر اس کائنات کے بقاء کا انحصار ہے۔ اگر اس سازگاری و فرمانبرداری کے بجائے ان کے اندر طغیان و سرکشی پیدا ہو جائے تو یہ عالم چشم زدن میں درہم برہم ہو جائے۔ اس وجہ سے خالقِ کائنات نے ان کو ان کے حدود کا پابند کر رکھا ہے اور یہ اپنے وجود سے زمین پر بسنے والوں کو یہ درس دیتے ہیں کہ وہ بھی خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پابندی کریں۔ اگر وہ اس کی خلاف ورزی کریں گے تو زمین میں فساد برپا کریں گے اور زمین کا خداوند ان لوگوں کو گوارا نہیں کرے گا جو اس کے ملک میں فساد برپا کریں۔

وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ۝ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا (۵-۶)

آسمان و زمین کی ساخت میں انسان کے لیے سبق

یہ آسمان اور زمین کی ساخت، ان کی عظمت اور ان کی فیض بخشی کی طرف توجہ دلائی کہ یہ بھی

اپنے بنانے والے کی عظیم قدرت، بے نہایت حکمت اور غیر محدود ربوبیت کی شہادت دیتے ہیں. کوئی بڑے سے بڑا کام بھی اس کے لیے ناممکن نہیں ہے، اس کی حکمت اتھاہ اور اس کی رحمت و ربوبیت ہمہ گیر ہے۔ اس کی اس قدرت، حکمت اور ربوبیت کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ لوگوں کو اس میں شترِ بے مہار بنا کے نہ چھوڑے بلکہ دیکھے کہ جن کے لیے اس نے یہ سب کچھ بنایا وہ اس میں کیا بنا رہے ہیں اور پھر ان کے رویہ کے مطابق ان کو جزا یا سزا دے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کی یہ تمام قدرت و حکمت اور یہ ساری ربوبیت و رحمت بے معنی اور یہ سارا کارخانہ ایک کارِ عبث بن کے رہ جائے گا۔

'ما' موصولہ اور 'ما' مصدریہ

'وَمَا بَنٰىهَا' اور 'وَمَا طَحٰىهَا' میں 'مَا' سے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مصدریہ ہے یا موصولہ؟ ہمارے نزدیک یہ مصدریہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو موصولہ مانئے تو اس سے خدا کو مراد لینا پڑے گا درآنحالیکہ یہ قسمیں خدا کی نہیں بلکہ اس کی آیاتِ قدرت و حکمت کی ہیں اور خاص طور پر ان کے ان پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو انسان کے اندر اس عبرت نگاہی کو پیدا کریں جو اس تعلیم کے قبول کرنے کے لیے راہ کھولے جو سورہ میں دی گئی ہے۔ اوپر کی قسمیں سورج، چاند، دن اور رات کی ہیں اور ان کے ساتھ 'اِذَا تَلٰىهَا'، 'اِذَا جَلّٰىهَا'، 'اِذَا يَغْشٰىهَا' وغیرہ کی قیدیں نگاہ کے زاویہ کو ٹھیک رکھنے کے لیے لگائی گئی ہیں۔ اس سیاق میں اگر یہ بات کہی جائے کہ 'اور میں قسم کھاتا ہوں آسمان کی اور اس اللہ کی جس نے اس کو بنایا'، تو اس قسم کی نوعیت اوپر کی قسموں سے بالکل مختلف ہو جائے گی۔ اس کا ایک ٹکڑا تو شہادت کے مفہوم میں اور دوسرا تعظیم و تقدیس کے مفہوم میں لینا پڑے گا جس کا یہاں کوئی محل نہیں ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات کی شہادت پیش کی ہے، اپنی ذات کی شہادت نہیں پیش کی ہے۔ علاوہ ازیں 'مَا' اللہ تعالیٰ کے لیے موزوں بھی نہیں ہے۔

'مَا' مصدریہ کے متعلق یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ یہ فعل کو صرف مصدر کے معنی میں کر دینے ہی کے لیے نہیں آتا بلکہ اس فعل میں جو قدرت، جو شان، جو حکمت، جو فیض بخشی، جو ندرت اور جو حیرت انگیز صنعت گری مضمر یا ظاہر ہوتی ہے ان سب کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ مثلاً آسمان کے ساتھ 'وَمَا بَنٰىهَا' جو فرمایا تو اس کے معنی ہوں گے 'اور شاہد ہے آسمان اور اس کی حیرت انگیز ساخت'، اور اس کے اندر آسمان کے وہ تمام عجائب اور کرشمے مضمر ہوں گے جن کی طرف قرآن نے گوناگوں اسلوبوں سے توجہ دلائی اور اپنے مختلف بنیادی دعاوی پر ان سے دلیل قائم کی ہے۔ ظاہر ہے کہ 'مَا' موصولہ کے اندر ان استدلالی پہلوؤں کی طرف توجہ دلانے کی کوئی صلاحیت نہیں ہوتی۔ 'مَا' مصدریہ، کی اسی وسعت و جامعیت کے سبب سے اردو میں

اس کا ترجمہ نہایت مشکل ہے۔ عربیت کا ذوق رکھنے والے بعض فاضل مترجموں نے اس کا مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اردو میں یہ اسلوب موجود نہ ہونے کے سبب سے پورا مفہوم ادا نہیں ہو سکا۔ میں نے بھی اپنے ترجمہ میں اس کی کوشش کی ہے لیکن مجھے اپنی تقصیر کا اعتراف ہے کہ میں بھی اس کا حق ادا نہیں کر سکا۔

'وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا' کو بھی اسی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ سورۂ غاشیہ میں فرمایا ہے: 'وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ' (الغاشیۃ - ۸۸ : ۲۰) اور اس کے تحت ہم نے واضح کیا ہے کہ اس اجمال کے اندر وہ ساری تفصیل مضمر ہے جو قرآن نے دوسرے مقامات میں زمین کے آثار و عجائب سے متعلق بیان فرمائی اور اس سے اپنے مختلف دعاوی پر دلیل قائم کی ہے۔ گویا جن حقائق پر غور کرنے کے لیے سورۂ غاشیہ میں 'کَیْفَ' سے ابھارا ہے انہی پر غور کرنے کے لیے یہاں 'مَا مصدریہ' سے کام لیا ہے۔ لیکن دونوں کے محلِ استعمال میں ایک دقیق فرق بھی ہے جس پر گفتگو کا یہاں موقع نہیں ہے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۖ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۖ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۖ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (۷-۱۰)

آفاقی شہادتوں کے بعد نفسیاتی شہادت — آفاقی شہادتوں کے بعد نفسیاتی شہادت کی طرف توجہ دلائی کہ انسان اگر خود اپنے نفس پر غور کرے تو یہ حقیقت واضح ہو گی کہ خالق نے اس کی تشکیل اس طرح فرمائی ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی دونوں کا شعور ودیعت کر دیا ہے۔ یہ شعور ظاہر ہے کہ اسی لیے ودیعت ہوا ہے کہ انسان ان میں سے نیکی کو اختیار کرے اور بدی سے اپنے کو بچائے۔ اور اس سے یہ بات بھی بدیہی نتیجہ کے طور پر نکلی کہ فلاح وہی پائے گا جو اپنے کو بدی سے پاک رکھے گا اور وہ نامراد ہو گا جو اس کو گناہوں سے آلودہ کرے گا۔ اس معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ اپنے آپ کو غیر مسئول اور شترِ بے مہار سمجھنے کا تصور انسان کے خود اپنے نفس کی شہادت کے خلاف ہے۔

'نَفْسٍ' کی تنکیر تقلیل، تکثیر اور تفخیم سب کے لیے ہو سکتی ہے لیکن میرے نزدیک یہاں یہ تفخیمِ شان کے لیے ہے۔ پچھلی قسموں ہی کے سلسلہ میں اس کی نہایت واضح مثالیں گزر چکی ہیں۔ مثلاً سورۂ بروج میں فرمایا ہے: 'وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ' (۳) سورۂ بلد میں ہے: 'وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ'۔ ان کی وضاحت متعلق سورتوں میں ہو چکی ہے۔ اسی طرح یہاں 'وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا' ہے جس سے نفسِ انسانی کی حیرت انگیز حکیمانہ تشکیل اور اس کی نہایت اعلیٰ ظاہری و باطنی صلاحیتوں کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

'وَمَا سَوّٰىهَا' میں بھی 'مَا' مصدریہ ہے اور یہ، جیسا کہ اوپر وضاحت ہو چکی، نفسِ انسانی کی اسی

حکیمانہ تشکیل و تقویم کی طرف توجہ دلا رہا ہے جس کی وضاحت قرآن نے جگہ جگہ مختلف اسلوبوں سے فرمائی اور اس سے استدلال کیا ہے کہ قدرت ان اعلیٰ صلاحیتوں کی چیز محض ایک کارِ عبث اور کھلونے کے طور پر نہیں بنا سکتی اس وجہ سے لازم ہے کہ ایک دن یہ اپنی صلاحیتوں اور نعمتوں سے متعلق اپنے خالق کے آگے جواب دہ ہو۔

لفظ 'تَسْوِیَۃٌ' پر ہم مختلف مقامات میں بحث کر چکے ہیں کہ کسی چیز کی تخلیق میں جو تکمیلی مرحلہ ہوتا ہے یہ اس کی تعبیر کے لیے بھی آتا ہے، جیسے فرمایا ہے: 'اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی' (الاعلیٰ - ۸۷: ۲) (جس نے خاکہ بنایا پھر اس کے نوک پلک سنوارے) اس سے معلوم ہوا کہ یہاں قسم میں نفسِ انسانی کی تخلیق کا صرف ابتدائی مرحلہ پیشِ نظر نہیں ہے بلکہ وہ تکمیلی مرحلہ بھی مدِّ نظر ہے۔ جب وہ قدرت کے ایک شاہکار کی حیثیت سے نمایاں ہوا اور خود اپنے وجود سے اس حقیقت کا شاہد بن گیا کہ اس دنیا میں ذمہ داریوں کے ساتھ آیا ہے۔ اس میں وہ خدا کا خلیفہ اور اس کے آگے مسئول ہے۔

'فَاَلْہَمَہَا فُجُوْرَہَا وَتَقْوٰىہَا' یہ عملِ تسویہ کی تفصیل ہے۔ انسان کی تخلیق کا تکمیلی مرحلہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر ایک نورِ یزدانی ودیعت فرمایا جس سے اس کے اندر یہ شعور بیدار ہوا کہ کیا چیز اس کے لیے نیکی اور خیر ہے اور کیا چیز بدی اور شر۔ سابق سورہ میں اسی حقیقت کی طرف 'وَھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ' (البلد ۹۰: ۱۰) کے الفاظ سے اشارہ گزر چکا ہے اور اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ مزید تفصیل مطلوب ہو تو سورۂ قیامہ اور سورہ دہر کی تفسیر میں اس کے ہر پہلو پر جامع بحث ملے گی۔

الہامِ خیر و شر کا لازمی تقاضا

'قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰىہَا ﴿٩﴾ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىہَا' یہ الہامِ خیر و شر کا لازمی اور بدیہی تقاضا بیان ہوا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر و شر میں امتیاز بخشا ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ خیر کو اختیار اور شر سے اجتناب کرے۔ یہی طریقہ اس کے لیے دنیا اور آخرت میں فلاح و کامرانی کی راہ کھولے گا۔ اگر اس کے برعکس اس نے شر و فساد کی راہ اختیار کی تو یہ چیز اس کی بدبختی و نامرادی کا سبب بنے گی۔

'دَسّٰىہَا' دراصل 'دَسَّسَہَا'، 'دَسٌّ' کے مادہ سے ہے جس کے معنی کسی چیز کو خاک میں ڈھانک دینے اور مٹی میں ملا دینے کے ہیں۔ یہی لفظ بدل کر دَسّٰىہَا ہو گیا ہے اور اس تبدیلی سے اس کے اندر مبالغہ کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے یعنی اس کو بالکل خاک میں ملا دیا۔ عربی میں اس طرح کے تغیر کی مثالیں موجود ہیں مثلاً 'تَظَنَّنَ' سے 'تَظَنّٰی'۔

ہم نے اس کو الہامِ خیر و شر کا بدیہی تقاضا اس وجہ سے قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو نعمت بھی بندے کو عطا فرماتا ہے اس کا حق واجب یہ ہے کہ بندہ اس کو اس کے صحیح مصرف میں استعمال

کرے۔ اسی میں اس کی بہبود اور درحقیقت یہی اس نعمت کا شکر ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو گویا خود اپنے آپ کو تباہی کے گڑھے میں گراتا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ جس کو قدرت نے دو آنکھیں بخشی ہیں اس پر واجب ہے کہ وہ آنکھیں کھول کر راہ کے عقبات اور نشیب و فراز دیکھتا ہوا چلے۔ اگر وہ آنکھیں موند کر چلے گا تو اس کا کسی کھڈ میں گرنا بعید نہیں اور اس کی ذمہ داری خود اسی پر ہوگی، کسی دوسرے پر نہیں ہوگی۔

ان قسموں کا مقسم علیہ کیا ہے؟

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان قسموں کا مقسم علیہ کیا ہے؟ بعض لوگوں نے قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا کو مقسم علیہ قرار دیا ہے لیکن صاحب کشاف کو اس سے انکار ہے۔ ہمارے نزدیک ان کا انکار بے جا نہیں ہے۔ یہاں جو قسمیں مذکور ہیں ان میں سورج، چاند، دن اور رات کی قسمیں تو، جیسا کہ ہم نے وضاحت کی، اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں کہ اس کائنات کے تمام عناصر کی باگ ایک قادر و قیوم کے ہاتھ میں ہے جو ان میں سے کسی کو اس کے محور و مدار سے سرِ مُو تجاوز کی اجازت نہیں دیتا ورنہ یہ سارا عالم اپنے اضداد کے تصادم سے درہم برہم ہو جائے۔

اس کے بعد آسمان و زمین کی قسمیں اس عالم کے صانع کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں اور مقصود ان سے اس حقیقت کو سامنے لانا ہے کہ اس کی ان صفات کا لازمی تقاضا ہے کہ اس دنیا میں وہ کسی کو شترِ بے مہار بنا کے چھوڑے نہیں رکھے گا بلکہ ہر ایک کے سامنے اس کے محاسبہ کا دن آنا لازمی ہے۔ یہ خدا کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کا ایک بدیہی تقاضا ہے۔

تیسری قسم نفسِ انسانی کی تشکیل کی قسم ہے جو ایک انفسی شہادت کی حیثیت رکھتی ہے، جس کی وضاحت خود قرآن نے یوں فرمائی ہے کہ جب خالق نے خود انسان کی فطرت کے اندر خیر اور شر کا امتیاز ودیعت فرمایا ہے تو لازماً اس کے معنی یہی ہیں کہ جو اپنے کو خیر سے آراستہ کرے گا وہ فلاح پانے والا بنے گا اور جو اپنے اوپر شر کو مسلط کرے گا وہ نامراد ہونے والوں میں سے ہوگا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا یہاں مقسم علیہ کے طور پر نہیں بلکہ آخری قسم کے ایک خاص پہلو کی وضاحت کے طور پر ہے۔ مقسم علیہ یہاں ایسا ہونا چاہیے جو تمام قسموں کے لازمی نتیجہ کو اپنے اندر سموئے اس وجہ سے مجھے صاحب کشاف کی رائے قوی معلوم ہوتی ہے کہ یہاں جوابِ قسم محذوف ہے۔ اس کے حذف کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس آخری ٹکڑے نے مقسم علیہ کی طرف ایک اشارہ کر دیا اس وجہ سے اس کے اظہار کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ مقسم علیہ کے حذف کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ساری بات مقسم علیہ کی حیثیت سے محذوف مانی جا سکتی ہے جو قسموں سے متبادر ہوتی ہے۔ یہاں اس کو جامع الفاظ میں بیان کرنا تو مشکل ہے لیکن ایک نمایاں پہلو کی تعبیر یوں کی جا سکتی

ہے کہ خالقِ کائنات کسی قوم کے طغیان کو برداشت نہیں کرتا بلکہ وہ لازماً اس کو تباہ کر دیتا ہے۔

یہاں قرآن کے اس فلسفۂ تاریخ کو ذہن میں رکھیے جس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے کہ جہاں تک قوموں کا تعلق ہے وہ اپنے طغیان کی سزا قومی حیثیت سے اسی دنیا میں پا جاتی ہیں۔ آخرت میں افراد کا محاسبہ ان کی انفرادی حیثیت میں ہو گا اور ہر ایک اپنے اعمال کے مطابق جزا یا سزا پائے گا۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ۝ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ۝ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۝ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا (۱۱-۱۴)

ایک تاریخی شہادت

آفاقی و انفسی شواہد کے بعد یہ ایک تاریخی شہادت اسی دعوے کی دلیل کے طور پر پیش کی گئی ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ جو قوم طغیان میں مبتلا ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کو اتمامِ حجت کے بقدر مہلت دینے کے بعد لازماً تباہ کر دیا کرتا ہے۔ آفاقی و انفسی دلائل کا تعلق غور و فکر سے ہوتا ہے اس وجہ سے عاقلوں کے لیے تو وہ مفید ہوتے ہیں لیکن عام لوگوں پر ان کا وہ اثر نہیں پڑتا جو پڑنا چاہیے۔ اس طرح کے لوگوں پر واقعاتی شہادتیں زیادہ کارگر ہوتی ہیں بشرطیکہ ان کے اندر کچھ صلاحیت ہو۔ اس وجہ سے قرآن نے آفاقی و انفسی دلائل کے پہلو بہ پہلو تاریخی شواہد کا بھی التزام رکھا ہے تاکہ اتمامِ حجت کے پہلو سے دعوت میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔¹

دوسرے مقامات میں تو قرآن نے اس مقصد سے متعدد قوموں کا ذکر کیا ہے لیکن یہاں صرف ایک ہی قوم ـــــ ثمود ـــــ کا ذکر ہے۔ اس کے بعض وجوہ بالکل ظاہر ہیں۔

ثمود کے خاص طور پر ذکر کرنے کے بعض وجوہ

ایک وجہ تو یہ ہے کہ عرب کی اقوامِ بائدہ میں سے قریش ان کے حالات اور ان کے انجام سے نسبتہً زیادہ واقف تھے۔ استاذ امام مولانا فراہیؒ نے سورۂ شمس کی تفسیر میں ان کے حالات اور قریش سے ان کی مشابہت پر مفصل بحث کی ہے۔ ہم اس کے بعض ضروری حصے نقل کرتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

> اہلِ عرب جن قوموں سے اچھی طرح واقف تھے انہی کے حالات اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے عبرت کے لیے پیش کیے ہیں۔ یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ کے الفاظ سے جیسا دھندلا تصور ہمارے سامنے آتا ہے ویسا ہی قریش کے سامنے بھی آتا ہو گا۔

---

¹ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ تاریخی شواہد ہیں تو آفاقی دلائل ہی کا ایک حصہ لیکن ان کی خاص اہمیت کے سبب سے ہم نے یہاں ان کا ذکر الگ کیا ہے۔

اس سورہ میں ثمود سے متعلق جو اشارات ہیں وہ قریش کے سامنے ان کی پوری تاریخ رکھ دینے کے لیے کافی تھے۔ یہ عرب بائدہ میں سے ہیں جن کی بستیاں اور جن کی روایات اہل عرب کو وراثت میں ملیں۔ ان سے متعلق ان کی روزمرہ کی گفتگوؤں میں بہت سی مثلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ قرآن مجید ہمارے اس دعوے پر خود سب سے بڑی حجت ہے۔"
قرآن کے دلائل نقل کرنے کے بعد مولانا فرماتے ہیں:

"شعراء نے بھی ان کا ذکر ایک جانی پہچانی ہوئی قوم کی حیثیت سے کیا ہے ..... ان کی شوکت و عظمت ضرب المثل تھی۔ خنساء نے کہا ہے:

ولا تاہ من الایام یوم کما من قبل لم یخلد قدار

(اور اس کو گردش روزگار نے فنا کر دیا جس طرح اس سے پہلے قدار کو دوام حاصل نہیں ہوا)

شعر میں قدار سے مراد احمر ثمود ہے جو قوم کا سردار تھا اور جس نے اونٹنی کو گزند پہنچایا۔ جس طرح عاد میں قیل بن عمر گزرا ہے اسی طرح قوم ثمود میں یہ نہایت سرکش اور مطلق العنان سردار تھا۔ مشہور جاہلی شاعر افوہ اودی نے ایک قصیدے میں اپنی قوم کے پاجیوں کو قیل اور قدار سے تشبیہ دی ہے:

فینا معاشر لم یبنوا لقومهم وان بنی قومهم ما افسد واعادوا

(ہم میں کچھ ایسے اشرار ہیں جنھوں نے اپنی قوم کے لیے بنایا تو کچھ بھی نہیں اور اگر ان کی قوم نے ان کے لگاڑے ہوئے کو بنایا تو انھوں نے اس کو پھر لگاڑ دیا)

لا یرشدون ولن یرعوا لمرشدهم والجهل منهم معا والغی میعاد

(وہ خود راہ دیکھتے اور نہ راہ دکھانے والوں کی سنتے، جہالت اور سرکشی، دونوں ان میں ساتھ موجود ہیں)

اضحوا کقیل بن عمرو فی عشیرته اذ اهلکت بالذی سدی لها عاد

(وہ اپنی قوم میں قیل بن عمر کی مثال ہیں جس کی کرتوتوں کی بدولت عاد تباہ ہوئے)

او بعده کقدار حین تابعه علی الغوایة اقوام فقد بادوا

(یا اس کے بعد وہ قدار کی مثال ہیں جس کی پیروی لوگوں نے گمراہی میں کی اور تباہ ہوئے)"

اس سے معلوم ہوا کہ ثمود کی سرکشی، ان کے لیڈروں کی گمراہی اور ان کے عبرت انگیز انجام کی تفصیل اہل عرب میں اس طرح معلوم و معروف تھی کہ ان کے شعراء بے تکلف اپنے اشعار میں ضرب المثل کی طرح ان کا ذکر کرتے اس وجہ سے قرآن کا یہ اجمالی حوالہ اہل عرب کے لیے اجمالی نہیں تھا

وہ انہی چند لفظوں سے ان کے طغیان کے برے انجام کی پوری تفصیل سمجھ سکتے تھے۔

'كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ' میں لفظ 'طَغْوٰى' پر خاص طور پر نظر رہے۔ اس کے معنی سرکشی اور اللہ تعالیٰ کی حدود سے کھلم کھلا بغاوت کے ہیں۔ خاص طور پر وہ سرکشی جس کی مرتکب کوئی قوم اس وقت ہوتی ہے جب کہ حق اس پر اچھی طرح واضح ہو چکا ہو۔ اس لفظ پر نگاہ رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا تعلق سورہ کے عمود سے ہے۔ ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سورہ میں قریش کو یہ آگاہی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں کسی قوم کے طغیان کو پسند نہیں کرتا۔ جو قوم یہ روش اختیار کرتی ہے ایک خاص حد تک مہلت دینے کے بعد وہ لازماً تباہ کر دی جاتی ہے۔ اس لفظ سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ ثمود نے اپنے رسول کی تکذیب اس وجہ سے نہیں کی کہ ان پر حق واضح نہیں تھا بلکہ انھوں نے حق کے واضح ہونے کے باوجود محض سرکشی کے سبب سے تکذیب کی۔

'اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا' یہ ان کے طغیان کی تفصیل ہے۔ 'اَشْقٰى' سے اشارہ ثمود کے لیڈر قدار کی طرف ہے جس کی شقاوت پوری قوم کی تباہی کا سبب ہوئی۔ 'انبعاث' کے معنی اٹھنے اور کمربستہ ہونے کے ہیں اور اس سے مراد اس کا اس جرم کے لیے کمربستہ ہونا ہے جس نے پوری قوم پر قہر الٰہی کے دروازے کھول دیے۔ اس اجمال کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے[1]۔ جب قوم ثمود کے پیغمبر ـــــ حضرت صالح ـــــ نے لوگوں کو عذاب سے ڈرایا تو قوم نے سرکشی کے سبب سے یہ مطالبہ کیا کہ ان کو اس عذاب کی کوئی نشانی دکھا دی جائے ورنہ وہ ان کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ان کے مطالبہ پر ایک اونٹنی نامزد کر دی کہ یہ عذاب کی نشانی ہے۔ اگر تم نے اس کو کوئی نقصان پہنچایا تو عذاب تم پر ٹوٹ پڑے گا۔ ساتھ ہی ان کے لیے ایک امتحان بھی مقرر کر دیا کہ گھاٹ پر پانی پینے کی باری اس کے لیے مخصوص ہو گی۔ ایک دن یہ پانی پیے گی اور ایک دن تم اپنے جانوروں کو پلاؤ گے۔ بھلا یہ پابندی وہ کب گوارا کرنے والے تھے۔ انھوں نے اپنے لیڈر سے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ وہ جوش میں اٹھا اور اونٹنی کی کونچیں اس نے کاٹ دیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تین دن کی ان کو مہلت دی کہ اب بھی اگر وہ توبہ کرنی چاہیں تو کر لیں لیکن وہ اس مہلت سے اور بھی مغرور ہو گئے بالآخر عذاب نے ان کو بے نام و نشان کر دیا۔

'فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا' جب حضرت صالح علیہ السلام نے دیکھا کہ فی الواقع یہ بدبخت عذاب کی دیوار توڑ دینے پر تل ہی گیا ہے تو انھوں نے آخری تنبیہ فرمائی کہ اللہ کی اونٹنی اور اس کی پانی پینے کی باری سے خبردار رہو، ورنہ عذاب الٰہی آ دھمکے گا۔

---

[1] ملاحظہ ہو آیات ۲۷-۲۹ کی تفسیر سورۂ قمر میں۔

"نَاقَةَ اللّٰهِ" کا نصب بر بنائے تحذیر ہے۔ یعنی یہاں کوئی فعل محذوف مانیں گے جو آگاہ اور خبردار کر دینے کے معنی میں ہوگا۔ فعل کے حذف کر دینے میں یہ بلاغت ہے کہ سامع کی پوری توجہ اصل بات پر مرکوز کر دی جائے۔ کسی خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے یہ اسلوب ہماری زبان بلکہ ہر زبان میں موجود ہے۔

"فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا" یعنی انھوں نے جس طرح پہلے عذاب کی دھمکی کو جھٹلایا تھا اسی طرح پیغمبر کی اس آخری وارننگ کی بھی کوئی پروا نہیں کی بلکہ ان کی تکذیب کر دی کہ یہ محض ایک دھونس اور ڈراوا ہے۔ چنانچہ جو کچھ کرنا تھا بے دھڑک کر گزرے۔

"عقر" کے معنی اونٹ کی کونچیں کاٹ دینے کے ہیں۔ اس کے بعد اونٹ لازماً مر جاتا ہے اس وجہ سے لازم معنی کے طور پر قتل کر دینے کے معنی میں بھی آتا ہے لیکن لفظ کا اصل مفہوم وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔

قرآن کے فلسفۂ تاریخ کا ایک نکتہ

یہاں ایک بات خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کی ہے کہ اونٹنی کے قتل کا ارتکاب قوم کے اندر سے اگرچہ ایک ہی شخص نے کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کا مجرم پوری قوم کو ٹھہرایا اور اس کی سزا بھی پوری قوم کو دی۔ اس سے قرآن کے فلسفۂ تاریخ کا یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک شخص کے جرم میں پوری قوم کو سزا دیتا ہے اگر قوم اس جرم پر راضی ہو۔ اس کے وبال سے صرف وہی لوگ بچتے ہیں جو اپنی استطاعت کی حد تک اس کی اصلاح کے لیے جو کچھ کر سکتے ہوں کر گزریں اور اگر کچھ نہ کر سکتے ہوں تو ایمان کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اس سے بیزار اور کنارہ کش رہیں۔ اس سے نیچے نہ ایمان کا کوئی درجہ ہے نہ خدا کی پکڑ سے بچنے کی کوئی سبیل۔

ثمود کے عذاب کی نوعیت

"فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ"۔ "دَمْدَمَة" کے معنی ہلاک کر دینے کے ہیں لیکن اس کے اندر عذاب کی شدت اور بے پناہی کا مضمون بھی مضمر ہے جو مجرد "ہلاک کر دینے" کے لفظ سے واضح نہیں ہوتا۔ اگر اس کو ٹھیک ٹھیک تعبیر کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ تب ان کے خداوند نے ان کے اوپر دھما دھم عذاب برسا دیا۔ قرآن میں "فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ" (الفجر - ٨٩ : ١٣) (اور ان پر تیرے خداوند نے عذاب کے کوڑے برسا دیے) کا اسلوب بیان بھی استعمال ہوا ہے، وہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ سورۂ قمر کی آیت ٣١ کے تحت ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان پر جو عذاب آیا وہ سرما کے بادلوں، ژالہ باری، ہولناک کڑک، دمک اور طوفانی ہوا کا مجموعہ تھا۔ اس طرح کے عذاب کے لیے لفظ "دَمْدَمَ" نہایت موزوں ہے۔

اونٹنی عذاب کی نشانی تھی

"بِذَنْۢبِهِمْ" یعنی یہ عذاب ان کے اوپر ان کے اس جرم کے سبب سے آیا کہ انھوں نے اللہ اور رسول کی تنبیہ کے باوجود اونٹنی کو گزند پہنچانے کی جسارت کی۔ یہ اونٹنی عذاب الٰہی کی نشانی تھی اور جیسا کہ سورۂ قمر کی تفسیر میں وضاحت ہو چکی ہے، یہ بطور امتحان مقرر کی گئی تھی کہ اندازہ ہو جائے کہ قوم

کا طغیان کس درجے تک پہنچ چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس جرم کے بعد اگر ان کو ڈھیل ملتی تو وہ خود اللہ کے رسول پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت کر گزرتے اور یہ وہ جرم ہے جس کی مہلت اللہ تعالیٰ کسی قوم کو نہیں دیتا بلکہ جب کسی قوم نے رسول کے قتل کرنے کا ارادہ کر لیا ہے تو وہ لازماً تباہ کر دی گئی ہے۔ اس سنتِ الٰہی کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ اس دور میں نازل ہوئی ہے جب قریش کے لیڈروں نے دارالندوۃ اور اپنی نجی مجلسوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے مشورے شروع کر دیے تھے۔ یہ مشورے چونکہ خفیہ تھے اس وجہ سے قرآن نے بھی علانیہ کی بجائے اشارات کی زبان میں ان کو آگاہی دے دی کہ اگر وہ کوئی ارادۂ بد اپنے دل میں پرورش کر رہے ہیں تو دور تک اس کے نتائج پر نگاہ ڈال لیں۔

'فَسَوّٰىهَا' یعنی اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا عذاب برسایا تو ان کا بالکل ستھراؤ کر کے رکھ دیا۔ ضمیرِ مفعول کا مرجع ثمود اور ارضِ ثمود دونوں ہو سکتے ہیں۔

نہ نادر بجا باندو نے نا دری!

وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا (۱۵)

یعنی اللہ تعالیٰ جب اسی طرح کسی قوم کو تباہ کرتا ہے تو اپنی اس سنت کے مطابق کرتا ہے جو اس نے اس دنیا کی مصلحت اور بہبود کے لیے اپنے محیطِ کل علم اور احاطۂ قدرت کے تحت ٹھہرا رکھی ہے اس وجہ سے نہ اس کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ نتیجہ کے اعتبار سے اس کے اس فیصلہ میں کوئی غلطی ہو سکتی ہے اور نہ یہ ڈر ہوتا ہے کہ کوئی اس کو چیلنج کر سکتا ہے۔ وہ کسی کے آگے نہ مسئول ہے اور نہ کسی کا اس پر زور ہے۔

اس سے ضمناً ان لغو بیانات کی بھی نفی ہو جاتی ہے جو تورات کی کتابِ پیدائش میں اس کے راویوں نے ملائے ہیں، مثلاً

اور خداوند نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی اور اس کے دل کے تصور اور خیال سدا برے ہی ہیں۔ تب خداوند زمین پر انسان کو پیدا کرنے سے ملول ہوا اور دل میں غم کیا۔ (پیدائش۔ باب ۶: ۵-۶)

اسی طرح طوفانِ نوح کے ذکر کے بعد ہے:

"اور خداوند نے اپنے دل میں کہا کہ انسان کے سبب سے میں پھر کبھی زمین پر لعنت نہیں بھیجوں گا کیونکہ انسان کے دل کا خیال لڑکپن سے برا ہے اور نہ پھر سب جانداروں کو جیسا اب کیا ہے، ماروں گا۔" (پیدائش۔ باب ۸: ۲۱)

ان سطور پر اللہ تعالیٰ کی عنایت سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہ۔

لاہور

۱۶۔ جنوری ۱۹۸۰ء

۲۷۔ صفر ۱۴۰۰ھ

تدبّرِ قرآن

٩٢

الّیل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــ الشمس ـــــ کی مثنیٰ ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ ان کے ظاہر اور باطن میں اتنی گہری مشابہت و مماثلت ہے کہ ایک عام آدمی بھی ان کی یکسانی و ہم رنگی کو محسوس کر سکتا ہے۔

سابق سورہ میں نفسِ انسانی سے متعلق فرمایا ہے: قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰىهَا ۙ وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىهَا (الشمس-۹۱: ۹-۱۰) (فلاح پائی جس نے اس کو پاکیزہ کیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو آلودہ کیا) اس سورہ میں اسی بنیادی مسئلہ کو لیا اور بتایا ہے کہ نفس کو کیا چیز آلودہ کرتی اور اس سے اس کو بچانے کی کیا تدبیر ہے اور کیا چیز اس کو پاکیزہ بناتی ہے اور یہ پاکیزگی اس کو کس طرح حاصل ہوتی ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۴) آفاق و انفس کی شہادت اس بات پر کہ قیامت حق ہے۔ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ نے ہر چیز جوڑا جوڑا پیدا کی ہے اور ہر چیز اپنی غایت کو اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر ہی پہنچتی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس دنیا کا بھی جوڑا ـــــ آخرت ـــــ ہے جو اس کو بامقصد بناتا ہے ورنہ یہ بالکل اندھیر نگری بن کے رہ جائے گی جس میں خیر و شر دونوں یکساں ہو جائیں گے دراں حالیکہ ان میں فرق ایک امر بدیہی ہے۔

(۵-۷) وہ کردار اور عقیدہ جو آدمی کو آخرت کی کامرانیوں کا اہل اور اس راہ کو اس کے لیے آسان بناتا ہے۔

(۸-۱۰) وہ عقیدہ و عمل جو اس کے لیے ہلاکت کی راہ کھولتا اور جہنم کے کھڈ میں گراتا ہے۔

(۱۱-۱۴) قریش کو تنبیہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری صرف تمھیں ہدایت کی راہ دکھا دینا ہے سو یہ کام اس نے کر دیا۔ یہ ذمہ داری اس پر نہیں ہے کہ وہ اس راہ پر تمھیں چلا بھی دے۔ یہ راہ اختیار کرو گے تو اس میں تمھارا اپنا ہی بھلا ہے ورنہ یاد رکھو کہ دنیا اور آخرت دونوں خدا ہی کے قبضہ میں ہیں۔ نہ یہاں کوئی خدا سے بچا سکے گا اور نہ وہاں کوئی کام آنے والا بنے گا۔

(۱۵-۲۱) اس امر کی وضاحت کہ کس کردار کے لوگ دوزخ میں پڑیں گے اور کس کردار کے لوگ اس سے محفوظ رکھے جائیں گے اور ان کو کیا صلہ ملے گا؟

سُوْرَةُ الَّيْلِ

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيات : ۲۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۲۱
وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ﴿۱﴾ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ﴿۲﴾ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ
وَالْاُنْثٰٓى ﴿۳﴾ اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ﴿۴﴾ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ﴿۵﴾
وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ﴿۶﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْۢ
بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ﴿۸﴾ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ﴿۹﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ
لِلْعُسْرٰى ﴿۱۰﴾ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ﴿۱۱﴾ اِنَّ
عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ﴿۱۲﴾ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ﴿۱۳﴾ فَاَنْذَرْتُكُمْ
نَارًا تَلَظّٰى ﴿۱۴﴾ لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ﴿۱۵﴾ الَّذِيْ كَذَّبَ
وَتَوَلّٰى ﴿۱۶﴾ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ﴿۱۷﴾ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ
يَتَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ﴿۱۹﴾
ع ۲۱ ۱۷ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴿۲۰﴾ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴿۲۱﴾

ترجمۂ آیات ۱-۲۱
شاہد ہے رات جب کہ چھا جاتی ہے اور دن جب کہ چمک اٹھتا ہے اور
شاہد ہے نر و مادہ کی آفرینش کہ تمہاری کمائی الگ الگ ہے۔ ۱-۴
سو جس نے انفاق کیا اور پرہیزگاری اختیار کی اور اچھے انجام کو سچ مانا

اس کو تو ہم اہل بنائیں گے راحت کی منزل کا اور جس نے بخالت کی اور بے پروا ہوا اور اچھے انجام کو جھٹلایا اس کو ہم ڈھیل دے دیں گے کٹھن منزل کے لیے۔ ۵-۱۰

اور اس کے کیا کام آئے گا اس کا مال جب وہ کھڈ میں گرے گا! ہمارا کام سمجھا دینا ہے! اور ہمارے ہی اختیار میں ہے آخرت بھی اور دنیا بھی۔ سو میں نے تم کو آگاہ کر دیا دہکتی آگ سے۔ ۱۱-۱۳

اس میں وہی پڑے گا جو نہایت بدبخت ہوگا، جس نے جھٹلایا اور منہ موڑا۔ اور اس سے محفوظ رکھا جائے گا وہ خدا ترس جو اپنا مال پاکیزگی حاصل کرنے کو دیتا ہے اور جس کی کسی پر کوئی عنایت بدلے کے لیے نہیں بلکہ صرف اپنے خدائے برتر کی خوشنودی کے لیے ہے۔ اور وہ نہال بھی ہو جائے گا۔ ۱۴-۲۱

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰی ۙ وَالنَّہَارِ اِذَا تَجَلّٰی ۙ وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالۡاُنۡثٰۤی (۱-۳)

ہر چیز کے جوڑے جوڑے ہونے سے قیامت پر استدلال

یہ رات اور دن، نر اور مادہ کی قسم کھائی گئی ہے۔ اس طرح کی قسمیں جو قرآن میں آئی ہیں ان کی ہم جگہ جگہ وضاحت کرتے آ رہے ہیں کہ یہ کسی دعوے پر شہادت کے لیے آئی ہیں۔ رات اور دن، نر اور مادہ میں نسبت زوجین کی ہے اور یہ دونوں مل کر اس مقصد کو پورا کرتے ہیں جس کے لیے خالق نے ان کو پیدا کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے اندر خلا ہے جو جوڑے کے ساتھ مل کر ہی پورا ہوتا ہے۔ اس کے بغیر ان کے وجود کی نہ کوئی افادیت باقی رہتی اور نہ ان کی صلاحیتوں کی کوئی توجیہ ہو سکتی۔ قرآن نے ان اضداد کے اندر توافق کے پہلو سے توحید پر بھی دلیل پیش کی ہے جس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے اور قیامت پر بھی شہادت پیش کی ہے جو یہاں مقصود ہے۔ مثلاً سورۂ ذاریات میں فرمایا ہے: 'وَمِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَیۡنِ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ' (الذّٰریٰت - ۵۱: ۴۹) (اور ہم نے ہر چیز میں سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو) یعنی اس بات کی یاددہانی حاصل کرو کہ اس دنیا کا بھی جوڑا ہے اور یہ اپنی غایت کو اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر پہنچے گی۔ اس نکتہ کی وضاحت سورۂ ذاریات کی مذکورہ آیت کے تحت ہو چکی ہے اور اس کتاب کے دوسرے مقامات میں بھی اس پر مفصل بحث ہوئی ہے۔ آگے مقسم علیہ کی وضاحت کرتے ہوئے بھی ہم اس پر روشنی ڈالیں گے۔

'وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالۡاُنۡثٰۤی' میں 'مَا' ہمارے نزدیک مصدریہ ہے۔ سابق سورہ کی آیت 'وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰہَا' (الشمس - ۹۱: ۵) کے تحت ہم اس پر بحث کر چکے ہیں، یہاں اس کے دہرانے میں طوالت ہو گی۔

اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی (۴)

نیک اور بد دونوں کی کمائی یکساں نہیں ہو گی

یہ وہ اصل دعویٰ ہے جو اوپر کی شہادتوں سے ثابت کیا گیا ہے۔ یعنی کائنات میں ہر چیز کا جوڑا جوڑا ہونا اور اپنے جوڑے ہی کے ذریعہ سے ہر چیز کا اپنی غایت اور مقصد کو پہنچنا چاہتا ہے کہ اس دنیا کا بھی جوڑا ہے اور وہ ہے آخرت جو لازماً ظہور میں آئے گی تاکہ یہ دنیا اپنی غایت اور اپنے مقصود کو پہنچے ورنہ یہ بالکل عبث اور بے غایت بن کے رہ جائے گی۔ اگر آخرت نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ خالق کے نزدیک نیکی کرنے والے اور بدی کرنے والے دونوں یکساں ہیں۔ ایک حکیم خالق کی شان کے یہ بالکل خلاف ہے کہ وہ نیک اور بد دونوں کی جدوجہد اور کمائی کو یکساں کر دے۔

لفظ 'سعی' جدوجہد کے معنی میں بھی آتا ہے اور نتیجۂ جدوجہد یعنی کمائی کے معنی میں بھی۔ یہاں

اسی دوسرے معنی میں ہے۔ قرآن میں اس معنی کی نظیر موجود ہے۔ مثلاً فرمایا ہے: 'وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۝ وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی' (النجم ۵۳: ۳۹-۴۰) (اور یہ کہ انسان کو نہیں ملے گی مگر اپنی کمائی اور بے شک اس کی کمائی عنقریب ملاحظہ میں آئے گی)۔

قیامت کا اثبات اس کی ضرورت کے پہلو سے

'شَتّٰی'، جمع ہے 'شَتِیْت' کی جس کے معنی متفرق اور الگ الگ کے ہیں یعنی عقل اور فطرت کا بدیہی تقاضا ہے کہ نیکوں اور بدوں دونوں کی سعی کا نتیجہ ایک ہی شکل میں نہ برآمد ہو بلکہ ان کی جد وجہد کے اعتبار سے الگ الگ ہو۔ جنھوں نے نیکی کمائی ہو وہ اس کا صلہ فضل و انعام کی شکل میں پائیں اور جنھوں نے بدی کمائی ہو وہ اس کے انجام سے دوچار ہوں۔ گویا قیامت کا دعویٰ یہاں اس کی اصل ضرورت کے پہلو سے سامنے رکھا ہے کہ اس کا آنا اس وجہ سے ضروری ہے کہ قیامت اور جزا و سزا کے بغیر یہ دنیا ایک اندھیر نگری اور ایک کھلنڈرے کا کھیل بن کے رہ جاتی ہے چنانچہ قیامت کو نہ ماننے والوں سے اللہ تعالیٰ نے یہ سوال کیا ہے کہ: 'اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ' (المؤمنون ۲۳: ۱۱۵) (کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو بالکل عبث پیدا کیا ہے، تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے!)۔ یہی سوال منکرین قیامت ہی سے، دوسرے مقام میں بانداز تعجب، یوں کیا گیا ہے: 'اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ كَالْمُجْرِمِیْنَ ۝ مَا لَكُمْ قف كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ' (القلم ۶۸: ۳۵-۳۶) (کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کے مانند کر دیں گے؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسے فیصلے کرتے ہو!)

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ۝ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی (۵-۷)

اس فرق کی تفصیل جو نیکوں اور بدوں کی کمائی میں ہوگا

یہ تفصیل ہے اس فرق و اختلاف کی جو لازماً نیکوں اور بدوں کی کمائی میں رونما ہوگا اور جس کو رونما ہونا چاہیے بھی۔ فرمایا کہ جو اللہ کی راہ میں خرچ کرے گا، اپنے رب سے ڈرے گا، اچھے انجام کو سچ مانے گا اس کو تو ہم آسان راہ چلائیں اور آسانی کی منزل تک پہنچائیں گے۔

'اَعْطٰی' کے بعد 'وَاتَّقٰی' کے ذکر سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اس انفاق سے مقصود ریاء و نمائش یا کوئی اور دنیوی چیز نہ ہو بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی تمنا اور ایک ایسے دن کا خوف ہو جس دن نیک عمل کے سوا کوئی چیز کام آنے والی نہیں بنے گی۔ اس کی وضاحت سورۂ دہر میں یوں ہوئی ہے:

یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِیْرًا ۝ وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝	وہ اپنی نذر پوری کرتے ہیں اور ایک ایسے دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہمہ گیر ہوگی۔ وہ ضرورت مند ہونے کے باوجود، مسکین، یتیم اور قیدی کو کھلاتے ہیں۔ اس نیت کے ساتھ کہ ہم تم کو صرف اللہ کی خوشنودی کی خاطر کھلاتے ہیں، نہ کہ تم سے کسی بدلے

إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ۝ (الدھر - ۷۶ : ۷-۱۰)

کے طالب ہیں، نہ کسی شکریہ کے۔ ہم اپنے رب کی طرف سے ایک سخت اکل کھرے دن کے ظہور سے ڈرتے ہیں۔

'وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى'۔ 'حُسْنٰى' کا موصوف لفظ 'عاقبۃ' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے یعنی وہ انفاق اور نیکی کے اچھے انجام پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ ان کی نیکی کے اصل محرّک کا پتہ دیا ہے کہ آخرت کے خوف کے ساتھ ان کے اندر یہ ایمان بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی ہر نیکی کا بھرپور صلہ ہے۔

جس شخص کے اندر نہ آخرت کا خوف ہو نہ وہ یہ ایمان رکھتا ہو کہ آخرت میں اس کی رائی کے برابر کی نیکی کا بھی صلہ ملنے والا ہے، وہ اول تو کچھ خرچ کرنے کا حوصلہ کر سکتا ہی نہیں اور کرے گا بھی تو لازماً اپنے کسی دنیوی مفاد کو سامنے رکھ کر کرے گا۔ یہ انفاق اللہ تعالیٰ کے نزدیک بالکل بے برکت ہے۔ سورۂ ماعون میں فرمایا ہے: 'أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِينِ' (الماعون - ۱۰۷ : ۱-۳) (تم نے دیکھا روزِ جزا کے جھٹلانے والے کو! یہی ہے جو یتیموں کو دھکے دیتا اور مسکینوں کو کھلانے پر نہیں ابھارتا)۔

'فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرٰى'۔ 'یُسْرٰی' کا موصوف بھی 'حُسْنٰى' کے موصوف کی طرح محذوف ہے۔ یعنی 'العاقبۃ الیُسْرٰی' یہ اس سنتِ الٰہی کا حوالہ ہے جو قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ جو شخص نیکی کی راہ اختیار کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس راہ کی مشکلات آسان کرتا اور اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچنے کی توفیق بخشتا ہے، چنانچہ فرمایا ہے: 'وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا' (العنکبوت - ۲۹ : ۶۹) (جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کریں گے ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت بخشیں گے)۔ یہاں اس کی منزل کو 'یُسْرٰی' سے اس لیے تعبیر فرمایا ہے کہ اس کا حساب آسان ہوگا، چنانچہ فرمایا ہے: 'فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ۝ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا' (الانشقاق - ۸۴ : ۷-۸) (رہا وہ جس کا اعمال نامہ اس کے داہنے ہاتھ میں پکڑایا جائے گا تو اس کا حساب نہایت آسان ہوگا)۔

وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرٰى (۸-۱۰)

مقابل گروہ کے انجام کا بیان

یہ مقابل گروہ یعنی ان لوگوں کا بیان ہے جو اسی دنیا کی زندگی کو کل زندگی سمجھتے ہیں۔ جو اپنے مال پر مارِ گنج بن کر بیٹھے اور آخرت سے بالکل نچنت ہیں، جو نہ کسی جزا و انعام کے قائل اور نہ اس کے لیے کوئی بازی کھیلنے کا حوصلہ رکھتے۔ فرمایا کہ ان کا حشر مذکورہ بالا گروہ سے بالکل مختلف ہوگا۔ ان کو اللہ تعالیٰ اس راہ پر چلنے کے لیے ڈھیل دے دے گا جو ان کو نہایت کٹھن منزل پر لے جا چھوڑے گی۔ یہاں بھی 'عُسْرٰی' کا موصوف محذوف ہے اور 'تیسیر' اِمہال یعنی ڈھیل دینے کے مفہوم میں ہے۔

قرآن میں یہ سنتِ الٰہی جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ جو لوگ نیکی کی راہ اختیار کرنے کا حوصلہ نہیں کرتے اللہ تعالیٰ ان کی باگ ان کے نفس کے حوالے کر دیتا ہے۔ ان کو اپنے نفس سے کوئی مزاحمت نہیں کرنی پڑتی اس وجہ سے وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی راہ نہایت ہموار ہے۔ نفس کی پیروی کرتے ہوئے وہ خوش خوش زندگی کی آخری منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کو اس مرحلہ سے سابقہ پیش آتا ہے جس کو قرآن نے سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا (المدثر-۷۴ : ۱۷) (میں اس کو چڑھاؤں گا ایک کٹھن چڑھائی) سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں اسی مرحلے کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے بالکل برعکس ان لوگوں کی زندگی ہوتی ہے جو ایمان اور عملِ صالح کی راہ پر چلنے کا حوصلہ کر لیتے ہیں۔ ان کو قدم قدم پر اپنے نفس کی خواہشوں سے لڑائی کرنی پڑتی ہے اور اس لڑائی ہی سے ان کو بالتدریج وہ قوت حاصل ہوتی ہے جو راہ کے عقبات عبور کرنے میں ان کو مدد دیتی ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان کے سامنے فَادْخُلِىْ فِىْ عِبٰدِىْ ۙ وَادْخُلِىْ جَنَّتِىْ[۱] (الفجر-۸۹: ۲۹-۳۰) کی آخری منزل آ جاتی ہے۔

وَمَا يُغْنِىْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى (۱۱)

بخیلوں کو تنبیہ — یہ 'مَا' نافیہ بھی ہو سکتا ہے اور سوالیہ بھی۔ دونوں صورتوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہو گا لیکن سوالیہ میں زیادہ زور ہے اس وجہ سے ہم نے اسی مفہوم کو لیا ہے۔ یہ باندازِ سوال ان لوگوں کو تنبیہ اور ملامت ہے جو مال رکھتے ہوئے خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے جی چراتے ہیں۔ فرمایا کہ ایسے شخص کو اس کا مال اس وقت کیا نفع پہنچائے گا جب وہ جہنم کے کھڈ میں گر جائے گا! ——— مطلب یہ ہوا کہ مال کا اگر کوئی مستقل فائدہ ہے تو یہ ہے کہ آدمی خدا کی راہ میں خرچ کر کے اس کو اپنی ابدی زندگی کے لیے محفوظ کر لے۔ اگر ایسا نہ کیا تو یہ مال اس کے لیے نہ صرف یہ کہ کچھ نافع نہ ہوا بلکہ ہمیشہ کے لیے موجبِ وبال بنا۔

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۖ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى (۱۲-۱۳)

یہ وہی تنبیہ نسبتہً زوردار لفظوں میں ہے کہ ہمارا کام لوگوں کو راہ دکھانا ہے سو یہ کام ہم نے اپنا رسول بھیج کر اور اپنی کتاب نازل کر کے کر دیا۔ یہ ذمہ داری ہماری نہیں ہے کہ ہم لوگوں کو اس راہ پر چلا بھی دیں۔ یہ لوگوں کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ راہ اختیار کریں۔ جو یہ راہ اختیار کریں گے وہ فلاح پائیں گے، جو گریز کریں گے وہ اس کا انجام دیکھیں گے۔

'وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى'۔ یہ مذکورہ بالا تنبیہ پر مزید اضافہ ہے کہ لوگ یہ بات بھی اچھی طرح یاد رکھیں کہ آخرت ہو یا دنیا دونوں کے معاملات ہمارے ہی اختیار میں ہیں۔ نہ کوئی اپنی تدبیر اور اپنے زور سے اس دنیا میں کچھ بنا سکتا اور نہ آخرت میں کچھ بنا سکے گا۔ اگر کسی کو اپنے خاندانی شرف یا اپنے خیالی معبودوں پر ناز ہے تو وہ یاد رکھے کہ آخرت میں اس طرح کی مزعومہ چیزوں کا کوئی وجود نہیں ہو گا۔ ہر شخص کو صرف اللہ وحدہٗ لا شریک سے سابقہ پیش آئے گا۔ سورۂ نجم آیت ۲۵ میں یہ مضمون گزر چکا ہے۔

---

[۱] شامل ہو جاؤ میرے بندوں میں اور داخل ہو جاؤ میری جنت میں۔

مال دار بخیلوں کے ذہن کا خناس

اوپر آیت میں وَاَمَّا مَنۡۢ بَخِلَ وَاسۡتَغۡنٰی کے الفاظ جو آئے ہیں یہاں ان پر دوبارہ ایک نظر ڈال لیجیے. مال دار بخیلوں کے ذہن میں یہ خناس سمایا ہوا ہوتا ہے کہ ان کے پاس جو کچھ ہے ان کی اپنی تدبیر اور اپنے تدبر کا ثمرہ ہے اس وجہ سے وہ اپنے کو خدا سے بالکل بے نیاز سمجھ بیٹھتے ہیں۔ قارون کو جب یاد دہانی کی گئی کہ وہ خدا کے بخشے ہوئے مال میں خدا کے حق کو پہچانے تو اس نے جواب دیا کہ اِنَّمَآ اُوۡتِيۡتُهٗ عَلٰى عِلۡمٍ عِنۡدِىۡ (القصص - ۲۸: ۷۸) (یہ تو مجھے اپنے علم کی بدولت ملا ہے) یعنی میں نے اس کو اپنی قابلیت و ذہانت سے حاصل کیا ہے، خدا سے اس کو کیا تعلق کہ اس میں اس کا بھی کوئی حصہ ہو! یہی ذہنیت کم و بیش ہر سرمایہ دار کی ہوتی ہے۔ قرآن نے وَاِنَّ لَنَا لَلۡاٰخِرَةَ وَالۡاُوۡلٰى کے الفاظ سے اس شیطانی تصور پر بھی ضرب لگا دی ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ملتا ہے وہ بھی خدا ہی کا دیا ملتا ہے اور آخرت میں جو کچھ ملے گا وہ بھی خدا ہی کے دیے ملے گا۔ نہ آخرت میں اس کا کوئی شریک و سہیم ہے نہ دنیا میں۔

فَاَنۡذَرۡتُكُمۡ نَارًا تَلَظّٰى ۚ لَا يَصۡلٰٮهَاۤ اِلَّا الۡاَشۡقَى ۙ الَّذِىۡ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ؕ
وَسَيُجَنَّبُهَا الۡاَتۡقَى ۙ الَّذِىۡ يُؤۡتِىۡ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۚ (۱۴-۱۸)

قریش کی طرف التفات

اصولی طور پر حقیقت بیان کر دینے کے بعد یہ خاص طور پر بھی قریش کو مخاطب کر کے واضح فرما دیا کہ ضروری تھا کہ تمھیں پہلے سے آگاہ کر دیا جائے اس وجہ سے میں نے تمھیں اس بھڑکنے والی آگ سے آگاہ کر دیا ہے جس میں وہی لوگ پڑیں گے جو نہایت بدبخت، تکذیب کرنے والے اور منہ موڑنے والے ہوں گے۔ اور وہ اس سے محفوظ رکھے جائیں گے جو اپنا مال پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے خرچ کریں گے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہ امر یہاں واضح رہے کہ مقابلہ یہاں کم شقی اور زیادہ شقی یا زیادہ متقی اور کم متقی میں نہیں ہے بلکہ رسول کی تکذیب کرنے والوں اور اس کی تصدیق کرنے والوں میں ہے۔ رسول اتمام حجت کا کامل ذریعہ ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے جھٹلانے والے سب 'اَشۡقٰی' ہوتے ہیں۔ چنانچہ 'اَشۡقٰی' کی صفت 'الَّذِىۡ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى' آئی بھی ہے جس سے مقصود اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ یہاں زیر بحث وہ لوگ ہیں جو رسول کی تکذیب اس کے سامنے کر رہے تھے۔ فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جو سب سے زیادہ شقی ہیں اور یہ اس جہنم میں پڑیں گے جس کی آگ پہلے سے ان کے لیے تیار اور شعلہ زن ہے۔ برعکس اس کے رسول کے انذار سے چوکنے ہو کر جو لوگ روز حساب کی تیاریوں میں لگ گئے اور اپنے نفس کو آلائشوں سے پاک کرنے کے لیے اپنے مال خرچ کرنے لگے وہ سب 'اَتۡقٰی' ہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے ایسے وقت میں رسول کی بات مانی جب معاشرہ بحیثیت مجموعی اس کا دشمن تھا اور ایسے وقت نیکی کی راہ پر چلے جب اس پر چلنے کا حوصلہ کرنے والے بہت تھوڑے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کے ابتدائی دور کے ساتھیوں کا درجہ 'سابقین' اور 'مقربین' کا ہے جس میں بعد والوں کو شامل ہونے کی سعادت کم ہی حاصل ہو گی۔

اس آیت سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ دوزخ صرف انہی لوگوں کے لیے ہے جو زیادہ شقی ہوں گے، عام شقی دوزخ میں نہیں جائیں گے، لیکن یہ بات نہایت کمزور ہے۔ اگر اس کو صحیح مانیے تو ایک شخص

اس آیت سے یہ استنباط بھی کر سکتا ہے کہ دوزخ سے صرف وہی لوگ محفوظ رہیں گے جو اعلیٰ درجے کے متقی (اتقٰی) ہوں گے، عام متقی اس سے محفوظ نہیں رہیں گے یا یہ استدلال کر سکتا ہے کہ جنت کے حقدار صرف 'اتقٰی' ہوں گے، عام متقی اس سے محروم رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں صحیح نہیں ہیں۔ جن لوگوں نے بھی اس طرح کی کوئی بات کہی ہے ان کو غلط فہمی صرف آیات کا موقع و محل نہ سمجھنے سے پیش آئی ہے۔ ہم نے موقع و محل کی وضاحت کر دی ہے جس کے بعد اس طرح کی غلط فہمیوں کی راہ مسدود ہو گئی ہے۔

وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۙ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى (۱۹--۲۰)

انفاق وہ مقبول ہے جو رضائے الٰہی کے لیے ہو

یہ 'یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی' کی وضاحت ہے۔ یعنی تزکیۂ نفس کے مقصد کے لیے وہ انفاق اللہ تعالیٰ کے نزدیک وزن رکھتا ہے جو صرف اس کی خوشنودی اور رضا جوئی کی خاطر کیا جائے، یہ غرض نہ ہو کہ کسی کو ممنونِ احسان کر کے اس سے کسی شکل میں اس کا بدلہ چاہا جائے۔ اوپر سورۂ دہر کی آیت 'لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا' (الدھر - ۷۶ : ۹) (ہم کسی بدلے یا شکریہ کے طالب نہیں ہیں) ہم نقل کر آئے ہیں۔ جو مضمون اس آیت کا ہے وہی مضمون دوسرے لفظوں میں یہاں بھی ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض لوگوں نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ 'اور کسی کا اس پر احسان نہیں جس کا وہ بدلہ دے'۔ اگرچہ الفاظ کے اعتبار سے اس ترجمہ کو غلط نہیں قرار دیا جا سکتا لیکن اس کا مطلب اگر یہ ہے کہ جو شخص اس پر کچھ خرچ کرے جس نے پہلے اس پر کوئی احسان کیا ہے تو یہ انفاق اللہ کی رضا کے لیے نہ ہو گا تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ احسان کرنے والے پر احسان کرنا اس درجہ کی نیکی نہ سہی جو کسی احسان نہ کرنے والے پر کی جاتی ہے لیکن آخر یہ نیکی کیوں نہیں ہے؟ ایک غریب نے آپ کو کبھی پیاس میں پانی پلا دیا تھا، کیا آپ اس کو بھوک میں روٹی کھلا دیں گے تو آپ کا یہ فعل رضائے الٰہی کے لیے نہ ہو گا!

ہم نے آیت کا جو ترجمہ کیا ہے اس پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ ہمارے نزدیک یہ ترجمہ زبان کے اعتبار سے بھی صحیح ہے اور تاویل کے پہلو سے بھی اس میں کوئی الجھن نہیں پیدا ہوتی۔

وَلَسَوْفَ یَرْضٰی (۲۱)

یہ ان لوگوں کو بشارت ہے جو اس طرح کے انفاق کی سعادت حاصل کریں گے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ فرمایا کہ وہ نہال ہو جائیں گے۔ ان دو لفظوں کے اندر ربِّ کریم نے جو کچھ بخش دیا ہے اس کی تعبیر سے زبانِ قلم قاصر ہے۔ یہ وہی 'رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً' کی ابدی بادشاہی ہے جس کا ذکر اس کے محل میں ہو چکا ہے۔

ان سطور پر سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا۔

لاہور
۲۸ - جنوری ۱۹۸۰ء
۹ - ربیع الاول ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

٩٣

الضّحیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق و لاحق سے تعلق

یہ سورہ اور بعد کی سورہ ——— اَلَمۡ نَشۡرَحۡ ——— دونوں توام کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جس مشن پر مامور فرمایا ہے اس میں آپ فائز المرام ہوں گے۔ راہ میں جو رکاوٹیں اس وقت نظر آ رہی ہیں یہ سب دور ہو جائیں گی۔ یہ مضمون پچھلی سورتوں میں بھی آیا ہے۔ البتہ دوسرے مطالب کے ضمن میں آیا ہے لیکن ان دونوں کا خاص مضمون ہی یہی ہے۔ ان کے آئینہ میں آپ کی زندگی کے تمام مراحل گویا آپ کے سامنے رکھ دیے گئے ہیں۔ ان میں تسلی کا جو انداز اختیار فرمایا گیا ہے اس پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ ضحٰی مکی زندگی کے اس دور میں نازل ہوئی ہے جب دعوت کی مخالفت اتنی شدت اختیار کر گئی ہے کہ آپ آگے کی راہ مسدود پا کر دل گرفتہ رہنے لگے اور سورہ اَلَمۡ نَشۡرَحۡ اس دور میں نازل ہوئی ہے جب مخالفت کی شدت کے علی الرغم افق میں کامیابی کے کچھ آثار بھی نمایاں ہونے لگے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

پہلے آفاق کے شواہد سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس طرح اس دنیا کی مادی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے دن کی حرارت و روشنی کی بھی ضرورت ہے اور رات کی خنکی اور تاریکی کی بھی اسی طرح انسانی فطرت کے مخفی جواہر کو اجاگر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان عُسر اور یُسر، دکھ اور سکھ، رنج اور راحت، دونوں طرح کے حالات سے گزارا جائے۔ جو لوگ زندگی کی تربیت میں ان امتحانوں کا مقام سمجھتے اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں ان کی اعلیٰ صلاحیتیں ان سے پروان چڑھتی ہیں اور جو ان سے عہدہ برآ ہونے کی حکمت سے ناواقف ہوتے ہیں یا اپنی پست ہمتی کے سبب سے ان سے وہ فائدہ نہیں اٹھاتے جس کے لیے قدرت نے ان کو مقدر

کیا ہے وہ اپنے آپ کو اس مقامِ بلند سے محروم کر لیتے ہیں جو اس امتحان سے گزرے بغیر انسان کو حاصل نہیں ہوتا۔

اس اصولی حقیقت کے بیان کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے تسلی دی ہے کہ اس وقت جس امتحان سے آپ گزر رہے ہیں وہ خدا کی طرف سے کسی بے التفاتی یا آپ پر کسی عتاب کے سبب سے نہیں پیش آیا ہے بلکہ یہ اسی امتحان کا ایک حصہ ہے جو انسان کی روحانی و اخلاقی تربیت کے لیے ضروری ہے۔

اس کے بعد آپ کو بشارت دی ہے کہ آپ اس وقت جس دور سے گزر رہے ہیں یہ مقدمہ ہے ایک ایسے دور کا جو اس سے بہت بہتر ہو گا اور اس میں آپ کا ربِّ کریم ان فیروزمندیوں اور کامرانیوں سے آپ کو نوازے گا جو آپ کو نہال کر دیں گی۔

اس کے بعد آپ کی زندگی کے بعض ان مراحل کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو بعثت سے پہلے یا ابتدائے بعثت میں آپ کو پیش آئے اور جو بظاہر کٹھن تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سے آپ کو نکالا اور اس طرح نکالا کہ دنیا کی راہیں بھی آپ کے لیے فراخ ہوئیں اور روحانی فتوحات کے دروازے بھی کھلے۔

آخر میں آپ کو ان نعمتوں کے حقوق ادا کرنے کا طریقہ تعلیم فرمایا گیا جو آپ کو حاصل ہوئیں۔ اس میں ضمناً ان لوگوں پر تعریض بھی ہے جن کا ذکر سابق سورتوں میں آیا ہے کہ وہ نعمتیں پا کر اللہ سے اکڑنے اور اس کے بندوں کے حقوق تلف کرنے والے بن گئے۔

سُورَةُ الضُّحٰی

مَكِّيَّةٌ ــــــــــــ اٰیات: ۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۱۱
وَالضُّحٰى ۝۱ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝۲ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ
وَمَا قَلٰى ۝۳ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝۴ وَلَسَوْفَ
يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝۵ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝۶
وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۷ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝۸
فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝۹ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝۱۰
وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝۱۱ ع ۱۱ ۱۸

ترجمۂ آیات ۱-۱۱
شاہد ہے وقتِ چاشت اور شاہد ہے رات جب پُرسکون ہو جاتی ہے کہ تیرے خداوند نے نہ تجھے چھوڑا اور نہ تجھ سے بیزار ہوا۔ اور بعد کا دور تیرے لیے پہلے سے بہتر ہو گا۔ اور تیرا خداوند تجھے عطا فرمائے گا پس تو نہال ہو جائے گا۔ ۱-۵

کیا اس نے تجھے یتیم پایا تو ٹھکانا نہ دیا! جویائے راہ پایا تو راہ نہ دکھائی! اور محتاج پایا تو غنی نہیں کیا! ۶-۸

تو جو یتیم ہے اس کو مت دبائیو اور جو سائل ہو اس کو نہ جھڑکیو، اور اپنے پروردگار کی نعمت کا بیان کیجیو۔ ۹-۱۱

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالضُّحٰی ۙ وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی (۱-۲)

ضُحٰی چاشت کے وقت کو کہتے ہیں جب دن کی سرگرمیوں کا آغاز[1] ہوتا اور انسان رات میں آرام کے بعد از سر نو تازہ دم ہو کر، جد و جہد کے میدان میں اترتا ہے۔

رات اور دن کی باہمی سازگاری

رات کی شہادت قرآن میں، موقع کی مناسبت سے، مختلف پہلوؤں سے پیش کی گئی ہے جن کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے۔ یہاں اس کے ساتھ 'اِذَا سَجٰی' کی قید لگی ہوئی ہے۔ 'سَجٰی' کے معنی 'رَکَدَ' اور 'سَکَنَ' یعنی ٹھک جانے اور ساکن ہو جانے کے آتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ یہاں رات کا وہ وقت پیش نظر ہے جب وہ دن کے شور و شغب اور ابتدائے شب کے ہنگاموں سے نکل کر اچھی طرح ٹھک جاتی اور انسان کو سکون و راحت بخشنے کے قابل بن جاتی ہے۔ گویا لفظ 'ضُحٰی' سے جو حصہ دن کا مراد لیا گیا ہے 'وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی' سے اس کے بالمقابل شب کا حصہ مراد لیا گیا ہے۔

یہ دن اور رات غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اپنی شکل و صورت، اپنے مزاج اور اپنے اثرات کے لحاظ سے اگرچہ بالکل مختلف ہیں لیکن اس اختلاف کے باوجود انسان بھی اپنی زندگی کے لیے ان کا محتاج ہے اور یہ دنیا بحیثیت مجموعی بھی اپنی بقا کے لیے ان کی حاجت مند ہے اور خالقِ کائنات کی یہ بہت بڑی رحمت و عنایت ہے کہ اس نے دن کے ساتھ رات اور رات کے ساتھ دن کو وجود بخشا اور ان دونوں کے تفاعل سے وہ مصالح پورے ہوتے ہیں جو اس دنیا کے بقا کے لیے ضروری ہیں۔ قرآن نے ان دونوں کے تفاعل کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے، مثلاً:

هُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ لِتَسۡکُنُوۡا فِیۡہِ وَالنَّہَارَ مُبۡصِرًا ؕ (یونس - ۱۰: ۶۷)	وہی خدا ہے جس نے تمہارے لیے رات کو تاریک بنایا تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا تاکہ تم اس میں جد و جہد کرو۔

سورۂ قصص میں فرمایا ہے:

وَمِنۡ رَّحۡمَتِہٖ جَعَلَ لَکُمُ	اور یہ اس کی رحمت میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے

---

[1] اس آیت میں حذف و ایجاز کا جو اصول ملحوظ ہے اس کی وضاحت آیت کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔

الَّیۡلَ وَالنَّھَارَ لِتَسۡکُنُوۡا فِیۡہِ وَلِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِہٖ وَلَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ۝ (القصص - ۲۸ : ۷۳)

رات اور دن بنائے تاکہ تم رات میں سکون حاصل کرو اور دن میں اس کے رزق و فضل کے طلب کرنے والے بنو اور تاکہ تم اپنے رب کے شکر گزار رہو۔

مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی (۳)

رنج اور راحت دونوں انسان کی تربیت کے لیے ہیں

یہ وہ اصل مدعا ہے جس کو مبرہن کرنے کے لیے اوپر کے آفاقی شواہد کی قسم کھائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح اس دنیا میں سورج کی روشنی اور حرارت بھی ضروری ہے اور رات کی تاریکی اور سکون بھی اسی طرح انسان کی روحانی اور اخلاقی تربیت کے لیے عُسر اور یُسر، نرمی اور درشتی، فقر اور غنیٰ کی آزمائشیں بھی ضروری ہیں۔ انہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ، جیسا کہ سورۂ فجر میں وضاحت فرمائی ہے، اپنے بندے کے صبر یا شکر کا امتحان کرتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اس وقت اگر تم مخالفوں کی مخالفت، اعوان و انصار کی قلت اور اسباب و وسائل کی کمی سے دوچار ہو یا آسمانی و روحانی کمک کی جتنی ضرورت محسوس کر رہے ہو اتنی تمھیں نہیں پہنچ رہی ہے تو اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ اب تمھارے رب نے تمھیں چھوڑ دیا ہے یا تم سے بیزار ہو گیا ہے بلکہ یہ تمھاری تربیت کے لیے تمھارا امتحان ہے تاکہ تم اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے اچھی طرح تیار ہو جاؤ۔

اس آیت کے اندر یہ سارا مضمون مضمر ہے جو اوپر کی آیات سے بھی واضح ہو رہا ہے اور آگے کی آیات اور اس کے بعد کی سورہ سے بھی، جیسا کہ آپ دیکھیں گے، واضح ہو گا لیکن تقاضائے ایجاز مقسم علیہ کی حیثیت سے سب سے نمایاں تسلی کے مضمون کے اسی پہلو کو کیا گیا ہے جس کے آپ اس دور میں خاص طور پر محتاج تھے یعنی یہ اطمینان دلا دیا گیا کہ جن حالات سے اس وقت آپ دوچار ہیں اس کی وجہ آپ کے معاملہ سے اللہ تعالیٰ کی بے تعلقی یا ناخوشی نہیں ہے بلکہ سنتِ الٰہی کے مطابق آپ کی تربیت ہے۔

نزول وحی میں وقفہ کی مصلحت اور حضور کا شدتِ انتظار

یہ امر واضح رہے کہ مکی دور میں قریش کی مخالفت جب زیادہ شدت اختیار کر گئی تو اس سے آپ کو خاص پریشانی جو ہوئی وہ یہی ہوئی کہ مبادا ان لوگوں کی اس بیزاری میں آپ کی کسی کوتاہی یا بے تدبیری کو کوئی دخل ہے جو اللہ تعالیٰ کے عتاب کا سبب ہوئی جس کے باعث یہ حالات پیش آ رہے ہیں۔ آپ کا یہ احساس ظاہر ہے کہ ایک نہایت کمر شکن احساس تھا چنانچہ آگے والی سورہ میں اس کو کمر شکن بوجھ سے تعبیر فرمایا بھی گیا ہے: 'وَوَضَعۡنَا عَنۡکَ وِزۡرَکَ ۝ الَّذِیۡۤ اَنۡقَضَ ظَھۡرَکَ' (الم نشرح - ۹۴: ۲-۳)

اس پریشانی میں قدرتی طور پر آپ کو سب سے زیادہ بے چینی کے ساتھ وحی الٰہی کا انتظار رہتا

اس لیے کہ یہی واحد چیز ہے جو تاریک حالات میں روشنی بھی دکھا سکتی ہے اور اسی سے آپ کو یہ اندازہ بھی ہوتا کہ آپ فریضۂ دعوت رب کے منشا کے مطابق انجام دے رہے ہیں یا اس میں کوئی کوتاہی یا بے تدبیری ہو رہی ہے۔ لیکن وحی کا معاملہ تمام تر اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی ہے۔ ضروری نہیں کہ حضورؐ کو انتظار اور پریشانی ہو تو وحی نازل بھی ہو جائے۔ چنانچہ ان حالات میں وحی کے وقفہ سے آپ کی پریشانی فطری طور پر دوچند ہو جاتی۔ حضورؐ کی ان پریشانیوں کا ذکر مکی سورتوں میں جگہ جگہ ہوا ہے اور ہم ان کی پوری وضاحت کرتے آ رہے ہیں۔ تفصیل مطلوب ہو تو سورہ طٰہٰ اور سورۂ قیامہ کی تفسیر میں متعلق مباحث پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

اس آیت میں آپ کو جو تسلی دی گئی ہے وہ اسی طرح کے حالات میں دی گئی ہے۔ ضروری نہیں کہ کفار میں سے کسی کے اس طعنہ کے جواب میں کہ "اس شخص کو اس کے رب نے چھوڑ دیا" یہ آیت اتری ہو۔ کفار یہ مانتے کب تھے کہ اللہ تعالیٰ سے آپ کا یا آپ کی دعوت کا کوئی خاص ربط ہے اور وہ آپ پر وحی بھیجتا ہے! وہ تو آپ کو کاہن اور شاعر کہتے تھے۔ پھر یہ کہ وحی کے آنے یا نہ آنے کا تجربہ صرف حضورؐ کو ہوتا تھا، کفار کو کیسے معلوم کہ وحی کا سلسلہ قائم ہے یا بند ہے؟ جہاں تک تبلیغ و دعوت کا تعلق ہے وہ آپ نے ایک دن کے لیے بھی کبھی بند نہیں کی کہ کفار کو یہ طعنہ دینے کا موقع ملے کہ اب یہ شخص اپنے منصب پر مامور نہیں رہا یا اس کے رب نے اس کو چھوڑ دیا۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (۴)

تسلی کے مضمون کی مزید وضاحت

یہاں 'اٰخرۃ' اور 'اُولیٰ' کے الفاظ دنیا اور آخرت کے اصطلاحی مفہوم میں نہیں بلکہ عام مفہوم یعنی دعوت کے دورِ آخر اور دورِ اول یا اس کے حاضر و مستقبل کے مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔ یہ اسی تسلی کے مضمون کی مزید وضاحت ہے کہ اس وقت جو حالات ہیں وہ بدل جائیں گے اور مستقبل ماضی و حاضر سے بہت بہتر ہوگا۔ اس مضمون کی بشارت خفی اور جلی دونوں طرح قرآن نے جگہ جگہ دی ہے اور قدیم صحیفوں میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق جو پیشین گوئیاں وارد ہیں ان میں آپ کی دعوت کے آغاز کو رائی کے دانے کی تمثیل سے سمجھایا ہے جو ہوتا تو نہایت چھوٹا ہے لیکن جب اُگتا ہے تو اس کا پودا سب ترکاریوں سے بڑا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ پرندے اس میں بسیرا لیتے ہیں۔

ایک جامع بشارت

لفظ 'خَیْرٌ' سے یہاں جو بشارت دی گئی ہے وہ ایک جامع بشارت ہے جس کے اندر دین کے غلبہ و تمکن، مکہ کی فتح، دشمنوں کی پامالی اور دین میں داخل ہونے والوں کی کثرت کے وہ سارے پہلو جمع ہو گئے ہیں جو سابق سورتوں میں بھی بیان ہوئے ہیں، آگے والی سورہ میں بھی ان کی طرف اشارہ

ہے اور سورۂ نصر میں بھی ان کی وضاحت آئے گی۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ (۵)

فرمایا کہ عنقریب تمہارا رب تمھیں دے گا اور تم نہال ہو جاؤ گے۔ یہاں اگرچہ واضح نہیں فرمایا کہ کیا دے گا لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد وہی خیر ہے جس کی بشارت اوپر والی آیت میں دی گئی ہے اور جو حاوی ہے ان تمام فیروز مندیوں اور کامرانیوں پر جو بعد کے ادوار میں اسلام کو حاصل ہوئیں۔ چونکہ ابھی یہ ساری باتیں پردۂ غیب میں تھیں اس وجہ سے 'یُعْطِیْکَ' کے مفعولِ ثانی کو ظاہر نہیں فرمایا لیکن اس کے بعد 'فَتَرْضٰی' کے لفظ نے کسی قدر اس شاندار مستقبل کی جھلک دکھا دی کہ اتنا دے گا کہ بس تم نہال ہو جاؤ گے! ــــــ اس ایک ہی لفظ کے اندر وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک دفتر میں بھی نہیں سما سکتا۔

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ﴿﴾ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ﴿﴾ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ (۶ - ۸)

حضورؐ کی زندگی کے بعض سبق آموز حالات کی طرف اشارہ

یہ اسی بات کو جو اوپر آیت ۴ میں ارشاد ہوئی کہ تمہارا مستقبل ماضی سے بہتر ہوگا، مؤکد کرنے کے لیے خود حضورؐ ہی کی زندگی کے بعض سبق آموز حالات کی طرف توجہ دلائی کہ غور کرو تو تمھیں اپنی ہی زندگی اس حقیقت کی نہایت عمدہ تفسیر نظر آئے گی۔

سب سے پہلے آپ کی یتیمی کا حوالہ دیا۔ یتیمی اول تو خود ہی ایک بہت بڑی مصیبت ہے لیکن معاشرہ اگر اس حد تک بگڑا ہوا ہو جس کی تصویر پچھلی سورتوں میں کھینچی گئی ہے تو اس میں یتیم کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ' (الفجر - ۸۹: ۱۷) (ہرگز نہیں، بلکہ تم یتیم کی کوئی عزت نہیں کرتے) اسی طرح حضورؐ ہی کے خاندان کے بعض افراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: 'فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ' (الماعون - ۱۰۷: ۲) (وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے)۔

لیکن حضورؐ کے حال پر اللہ تعالیٰ کا یہ خاص فضل ہوا کہ باوجودیکہ آپؐ کے والد ماجد نے کوئی قابلِ ذکر ترکہ نہیں چھوڑا لیکن آپ کے دادا اور ان کے بعد آپ کے چچا نے آپ کی پرورش کی اور نہایت عزت اور شفقت کے ساتھ پرورش کی۔ عام حالات میں دادا کے دل میں یتیم پوتے کے لیے شفقت اور چچا کے دل میں یتیم بھتیجے کے لیے عزّت و محبت کا پایا جانا کوئی نادر بات نہیں بلکہ انسانی فطرت کا ایک بدیہی تقاضا ہے لیکن ایک فاسد معاشرہ میں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہ ایک نادرالوجود بات ہے اور یہ بغیر اس کے ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی یتیم پر اپنے جمالِ محبت کا وہ پرتو ڈال دے جو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ڈال دیا کہ ان کی پرورش ان کے سب سے

بڑے دشمن فرعون نے اپنے محل میں کی۔

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى۔ یہ اس روحانی انعام کا بیان ہے جو آپ پر بعد کے دور میں ہوا۔

ایک جویائے راہ کی سرگردانیاں اور خدا کی دست گیری

معلوم ہے آپ کو جو رسوم و روایات خاندان کے بزرگوں سے وراثت میں ملیں ان پر آپ کی سلیم فطرت ایک لمحہ کے لیے بھی مطمئن نہ ہو سکی اور دوسری کوئی ایسی روشنی تھی نہیں جو آپ کے لیے سرمایۂ تسکین بن سکتی۔ آسمانی مذاہب کے پیرو جو آپ کے گرد و پیش تھے ان کا حال البقرۃ، آل عمران اور دوسری مدنی سورتوں سے واضح ہو چکا ہے کہ ان کے عقائد و اعمال اس قدر مسخ ہو چکے تھے کہ کوئی جویائے حقیقت ان سے کوئی رہنمائی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس صورتِ حال نے آپ کو ایک شدید قسم کی ذہنی کشمکش میں ڈال دیا تھا۔ آپ کی اسی کشمکش کو یہاں وَوَجَدَكَ ضَآلًّا کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ضَآلًّا یہاں گمراہ کے معنی میں نہیں بلکہ جویائے راہ کے معنی میں ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام بعثت سے پہلے بھی فطرتِ سلیم پر ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کے ابتدائی دور میں بھی فطرت کی بدیہیات سے کبھی منحرف نہیں ہوتے لیکن فطرت صرف عقائد و اعمال کی موٹی موٹی باتوں ہی میں رہنمائی کر سکتی ہے۔ تمام عقائد اور ان کے سارے تضمنات و لوازم کی نہ وہ تشریح کر سکتی اور نہ تمام اعمال و اخلاق کی صحیح صحیح حد بندی اس کے بس میں ہے اس وجہ سے فطرت پر ہونے کے باوجود ایک شخص یہ جاننے کا محتاج ہی رہتا ہے کہ جس خدا کے وجود پر اس کا دل گواہی دے رہا ہے اس کی صفات اور ان صفات کے تقاضے اور مطالبے کیا ہیں؟ اس کے کیا حقوق بندے پر عائد ہوتے اور وہ کس طرح ادا کرنے ہیں؟ زندگی کی ایسی ضابطہ بندی کس طرح کی جائے کہ وہ پوری کی پوری، اپنے بعید ترین گوشوں میں بھی، خالق کی پسند کے مطابق ہو جائے؟ جب تک یہ سوالات حل نہ ہوں اس وقت تک نہ انسان کو حقیقی اطمینان حاصل ہو سکتا اور نہ رب کے ساتھ اس کا تعلق ہی استوار ہو سکتا۔ یہی سوالات ہیں جو پوری شدت کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر زندگی کے اس دور میں مستولی تھے جس کی طرف وَوَجَدَكَ ضَآلًّا کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حالت نہ ضلالت کی ہے اور نہ اس کو ہدایت سے تعبیر کر سکتے بلکہ صحیح الفاظ میں یہ جستجوئے راہ کی سرگردانی ہے۔ گویا ایک شخص چوراہے پر کھڑا ہو اور فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ کس سمت میں قدم بڑھائے۔ بعثت سے پہلے غارِ حراء کی تنہائیوں میں آپ انہی گتھیوں کو سلجھانے میں گم رہے۔

بعثت سے پہلے عرب میں دینِ حنیفی کے پیرؤوں کا حال کتابوں میں اس طرح بیان ہوا

بعثت سے پہلے دینِ حنیفی کے پیرو

ہے کہ ان میں سے بعض افراد ایسی شدید الجھن میں مبتلا تھے کہ وہ بیت اللہ سے ٹیک لگا کر حرم میں بیٹھ جاتے اور نہایت حسرت کے ساتھ کہتے کہ "اے رب! ہم نہیں جانتے کہ تیری عبادت کس طرح کریں ورنہ اسی طرح کرتے۔" یہی حال اس وقت تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی رہا ہوگا جب تک آپ ایمان کی حقیقت اور کتاب سے روشناس نہیں ہوئے۔ چنانچہ قرآن میں اسی حالت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے: 'وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا' (الشوریٰ - ۴۲: ۵۲) (اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف ایک روح وحی کی جو ہمارے امر میں سے ہے، نہ تم کتاب سے آشنا تھے اور نہ ایمان سے لیکن ہم نے اس وحی کو روشنی بنایا جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں راہ دکھاتے ہیں) اسی حالت کو سورۂ یوسف میں 'غفلت' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے 'وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ' (یوسف - ۱۲: ۳) (اور بے شک اس سے پہلے تم اس سے بے خبروں میں سے تھے)

حقیقی غنا کا سرچشمہ ایمان اور معرفتِ الٰہی ہے

'وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى' فرمایا کہ ہم نے تمہیں محتاج پایا تو غنی کر دیا۔ غنا اور فقر کا جتنا تعلق مادی اسباب و وسائل سے ہے اس سے زیادہ قلب کے احوال سے ہے۔ آدمی کا سینہ ایمان سے خالی ہو تو وہ محتاج ہے اگرچہ اس کے پاس قارون کا خزانہ ہو اور اگر ایمان سے اس کا سینہ معمور ہے تو وہ غنی ہے اگرچہ وہ حضرت یحییٰ کی طرح کمل کی پوشاک پہنتا اور جنگلی شہد اور ٹڈیوں پر گزارہ کرتا ہو۔ یہی حکمت یوں سمجھائی گئی ہے کہ 'الغنی غنی القلب' (حقیقی غنا دل کا غنا ہے) یہ حقیقی غنا ایمان، اللہ کی معرفت اور اس کی کتاب کے نور سے پیدا ہوتا ہے جس کو یہ دولت حاصل نہیں ہوتی وہ دنیا کی حرص سے کبھی پاک نہیں ہو سکتا اور جو حریص ہے اس کا کاسۂ گدائی کبھی نہیں بھرتا۔

کاسۂ چشمِ حریصاں پُر نہ شد

یہ دنیا عالمِ اسباب ہے اس وجہ سے اس میں انسان اسباب کا محتاج ہے۔ اگر سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو سیدہ خدیجہؓ کے مال سے کچھ فائدہ پہنچا تو یہ حضرت خدیجہؓ اور ان کے مال کی ایسی خوش بختی ہے جو اس زمین پر کسی مال اور کسی صاحبِ مال کو مشکل ہی سے حاصل ہوئی ہوگی لیکن وہ غنا جس کا یہاں ذکر ہے مجرد مال سے، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، نہیں حاصل ہوتا بلکہ یہ اصلاً اس ہدایت کا ثمرہ ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہے اور جس کی صحیح تعبیر وہ شرحِ صدر ہے جس کی تفصیل بعد کی سورہ ــــــ اَلَمْ نَشْرَحْ ــــــ میں، جو اس کی توام ہے، آئے گی۔ جن لوگوں نے اس غنا کو تمام تر حضرت خدیجہؓ کے مال کا نتیجہ قرار دیا ہے ان کی نظر صرف ظاہر پر اٹک گئی حالانکہ اصل حقیقت اس سے ماورا ہے جو دیکھی نہیں جا سکتی بلکہ صرف سمجھی جا سکتی ہے۔ یہاں اشارات پر قناعت فرمائیے۔ آگے آخری آیت کے تحت بھی اور سورہ اَلَمْ نَشْرَحْ میں بھی اس کے بعض مخفی پہلو ان شاء اللہ زیر بحث آئیں گے۔

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝ (۹ - ۱۱)

انعامات کا حق

یہ ان انعامات کا، جو اوپر مذکور ہوئے، حق بیان ہوا ہے اور انداز بیان ایسا ہے جس میں ان لوگوں پر نہایت لطیف تعریض بھی ہے جن کا حال پچھلی سورتوں میں بیان ہوا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں عطا فرمائیں ان کو اس کا انعام سمجھنے اور اس کے شکرگزار ہونے کی بجائے وہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہو گئے کہ یہ جو کچھ ان کو ملا ہے یہ اسی کے حقدار ہیں۔ فرمایا کہ تم یہ روش نہ اختیار کرنا بلکہ تمھاری یتیمی کی حالت میں تمھارے رب نے جس طرح تم کو پناہ دی اسی طرح تم یتیموں کو پناہ دینا، ان پر شفقت اور کرم کی نظر رکھنا اور ان کے حقوق کی حفاظت کرنا۔ آیت 'وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا' (الفجر - ۸۹ : ۱۹) کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں[1] کہ جاہلی معاشرہ میں زورآور عصبات اور اقرباء کمزور وارثوں اور یتیموں کے حقوق دبا بیٹھتے اور ساری وراثت تنہا سمیٹ لیتے۔

قریش کے زورآوروں کو تنبیہ

'فَلَا تَقْهَرْ' کے الفاظ میں اسی صورت حال کی طرف اشارہ ہے۔ 'فَلَا تَقْهَرْ' کے معنی یہ ہیں کہ یتیم کو کمزور پاکر اس کو دبانے اور اس کے حقوق غصب کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تنبیہ ظاہر ہے کہ اس بنا پر نہیں کی گئی کہ آپ سے اس قسم کے کسی جرم کے صدور کا امکان تھا بلکہ یہ بالواسطہ قریش کے ان زورآوروں کو تنبیہ ہے جن کو پچھلی سورتوں میں ان کے اسی قسم کے غصب حقوق پر سرزنش فرمائی گئی ہے لیکن وہ اپنے رویے کی اصلاح کے بجائے رسول کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس سورہ میں ان کو نظرانداز کر کے رسول کو ہدایت فرما دی کہ دوسرے جو روش بھی اختیار کریں ان کو ان کے حال پر چھوڑو، تمھیں بہرحال یتیموں کے حقوق کی حفاظت کرنی ہے۔

دوسرے انعام کا حق

'وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ' یہ اس انعام کا حق بیان ہوا ہے جو اوپر 'وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ لفظ 'سائل' یہاں محدود معنی میں نہیں بلکہ وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے۔ خواہ سائل اپنے پیٹ اور تن کی کسی ضرورت کے تحت سوال کرے یا اپنی کسی ذہنی و عقلی الجھن سے متعلق سوال کرے یا اپنے دین سے متعلق سوال کرے، غرض جس طرح کی بھی مدد و رہنمائی کا طالب ہو حتی الامکان اس کی مدد و رہنمائی کی جائے اور اگر اس کا موقع نہ ہو تو خوبصورتی کے ساتھ اس کے سامنے معذرت پیش کر دی جائے، اس کو جھڑکا اور ڈانٹا نہ جائے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بات یاد رکھنا کہ ایک دور تم پر بھی ایسا گزرا ہے جب تم سراپا سوال تھے اور ان سوالوں نے تمھاری زندگی ضیق میں ڈال رکھی تھی بالآخر تمھارے رب نے تمھاری ہر خلش دور فرمائی اور تمھارے

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن - جلد ہشتم، صفحہ: ۳۵۹

ہر سوال کا جواب دیا۔ اس کا حق یہ ہے کہ تم بھی سائلوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، ان لوگوں کی روش نہ اختیار کرنا جن کا حال یہ ہے کہ خدا نے ان کو دے رکھا ہے تو مسکینوں اور سائلوں سے ترش روئی سے پیش آتے ہیں اور اگر ابھی کسی گردش میں خدا ان کو پکڑ لے تو کہیں گے کہ خدا نے مجھے ذلیل کر دیا، اس وقت ان کو یہ بات یاد نہیں آتی کہ انھوں نے خدا کے بندوں کو کس طرح ذلیل کیا ہے۔

لوگوں کو اللہ کی حکمت سے بہرہ مند کرو

'وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ' یہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل و انعام کا حق بیان ہوا ہے جو اوپر 'وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ ہم اس کی وضاحت کرتے ہوئے اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سے صرف وہ غنا مراد نہیں ہے جو حضورؐ کو حضرت خدیجہؓ کے مال سے حاصل ہوا بلکہ اصلاً اس سے دین کی وہ حکمت اور شریعت کی وہ دولت مراد ہے جس کی شان قرآن میں یہ بیان ہوئی ہے کہ 'وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا' (البقرۃ - ۲ : ۲۶۹) (اور جس کو حکمت عطا ہوئی اس کو خیر کثیر کا خزانہ بخشا گیا)۔ یہاں لفظ 'فَحَدِّثْ' خاص طور پر نگاہ میں رکھیے۔ یہ مال کی نعمت کے لیے نہیں بلکہ حکمت کی نعمت ہی کے لیے موزوں ہے۔ فرمایا کہ جس حکمت کے خزانے سے تمھارے رب نے تم کو بہرہ ور کیا ہے اس کی تحدیث کرو یعنی جس طرح تمھارے رب نے تمھیں مفت بخشا ہے تم بھی اس کو مفت بانٹو، فیاضانہ بانٹو، ہر آنے جانے والے کے سامنے اس کا چرچا کرو اور ہر بزم و انجمن کو اس کے ذکر سے معمور کر دو۔

ربِّ کریم کے فضل سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى اِحْسَانِهٖ۔

لاہور

۶- فروری ۱۹۸۰ء

۱۹- ربیع الاول ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

۹۴

الم نشرح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ کی مثنیٰ ہے۔ سورۂ ضحٰی کے بعد یہ بغیر کسی تمہید کے اس طرح شروع ہو گئی ہے گویا سابق سورہ میں جو مضمون اَلَمۡ یَجِدۡكَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی (الضحٰی - ۹۳: ۶) اور اس کے بعد کی آیات میں بیان ہوا ہے اسی کی اس میں تکمیل کر دی گئی ہے۔ بس اتنا فرق نظر آتا ہے کہ سابق سورہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے جن الطاف و عنایات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلّی کا ذریعہ بنایا ہے اُن کا تعلق بعثت سے قبل یا ابتدائے بعثت کے دور سے ہے اور اس میں جن افضال و احسانات کا حوالہ دیا ہے وہ اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب آپ کی دعوت کا چرچا مکہ سے نکل کر عرب کے دوسرے گوشوں میں بھی پہنچ چکا ہے۔

سابق سورہ میں آپ کو یہ بشارت دی گئی کہ دعوت کے پہلو سے آپ کا مستقبل آپ کے ماضی اور حاضر سے بہت بہتر ہو گا، آپ اس وقت جن مشکلات سے دوچار ہیں وہ قانونِ قدرت کے مطابق آپ کی تربیت کے لیے ہیں وہ جلد دور ہو جائیں گی۔ اس سورہ میں اس بشارت کی صداقت کے چند نمایاں شواہد کا حوالہ دے کر تاکید کے ساتھ آپ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں آپ کو جو دشواری بھی پیش آئے گی اس کے پہلو بہ پہلو فیروزمندی بھی ہو گی بشرطیکہ آپ عزم و جزم کے ساتھ اس سے عہدہ برآ ہونے کا حوصلہ کریں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب میں کسی قسم کا الجھاؤ نہیں ہے۔ اس دور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس ذہنی پریشانی سے دوچار رہے اس کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو شرحِ صدر کی جس نعمت سے سرفراز فرمایا ہے پہلے اس کا حوالہ ہے اس کے بعد آپ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ جس طرح آپ نے اب تک دیکھا ہے کہ ہر مشکل کے بعد آسانی نمودار ہوتی ہے اسی طرح آئندہ

بھی آپ کی دعوت کے مراحل طے ہوں گے اور کسی مرحلے میں بھی یہ کام رکنے والا نہیں ہے۔ اس کے بعد تکمیلِ دعوت کی منزل کی طرف اشارہ اور اس مرحلہ کی کامرانیوں کے حصول کی تدبیر بتائی گئی ہے۔

سُوْرَةُ اَلَمْ نَشْرَحْ

مَكِّيَّةٌ ــــــــــــــــ آيات: ۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۸
اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ① وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ②
الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ③ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ④
فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ⑤ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ⑥ فَاِذَا
فَرَغْتَ فَانْصَبْ ⑦ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ⑧ ع ۱۹

ترجمۂ آیات ۱-۸
کیا ہم نے تمہارا سینہ کھول نہیں دیا اور جو بوجھ تمہاری کمر کو توڑے دے رہا تھا اس کو تمہارے اوپر سے اتار نہیں دیا! اور تمہارا آوازہ بلند نہیں کیا۔ ۱-۴

تو ہر مشکل کے ساتھ آسانی، بے شک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے! ۵-۶

پس جب تم فارغ ہو تو کمر بستہ ہو اور اپنے رب سے لو لگاؤ۔ ۷-۸

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ ۙ وَوَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ (۱-۲)

وہ سنتِ الٰہی جو دعوتِ حق کی کامیابی کے لیے مقرر ہے

سابق سورہ کی تفسیر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ذہنی الجھنوں اور پریشانیوں کی تفصیل بیان ہو چکی ہے جو بعثت سے پہلے آپ کو جستجوئے حقیقت کی راہ میں اور ابتدائے بعثت کے دور میں مخالفوں کی مخالفت کی شدت اور اعوان و انصار کی قلت کے سبب سے لاحق ہوئیں۔ ساتھ ہی اس میں یہ بشارت بھی دی گئی کہ اس وقت آپ جن حالات و مشکلات سے دوچار ہیں یہ وقتی و عارضی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو جلد دور فرما دے گا اور آپ کی دعوت کا مستقبل اس کے ماضی و حاضر سے بہت زیادہ روشن ہوگا۔ بعد میں جب وحیٔ الٰہی کی روشنی نے آپ کے دل کے خلجان دور کر دیے اور حقیقت روشن ہو کر سامنے آگئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی تعلیم اور مزید حوصلہ افزائی کے لیے اپنی وہ سنت بھی نہایت واضح الفاظ میں بیان فرما دی جو اس نے دعوتِ حق کی کامیابی کے لیے مقرر فرما رکھی ہے اور جس سے لازماً ہر داعیٔ حق کو سابقہ پیش آتا ہے اور جو آگے اس سورہ کے اصل مضمون کی حیثیت سے 'فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا' (۵) (بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے) کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

سینہ کو کھول دینے سے مقصود وہ بصیرت و معرفت پیدا کرنا ہے جو صحیح ایمان کا ثمرہ ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ پر وہ اعتماد و توکل پیدا ہوتا ہے جو تمام قوت اور عزم کا سرچشمہ ہے۔ اگر یہ ایمان موجود ہو تو بڑی سے بڑی مزاحمت بھی انسان کے عزم کو متزلزل نہیں کر سکتی اور اگر یہ نہ ہو تو بغیر کسی مزاحمت کے بھی انسان شکست کھا جاتا ہے۔

'وَوَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ' یہ جملہ معناً پہلے ہی جملہ پر عطف ہے اس وجہ سے اس کا ترجمہ ہم نے اسی کے تحت کیا ہے۔ سورۂ نبا کی تفسیر میں اس اسلوب کی وضاحت ہو چکی ہے۔

اَلَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَکَ (۳)

غم بالائے غم!

یہ اس 'وِزْر' (بوجھ) کی صفت ہے کہ اس نے تمہاری کمر توڑ رکھی تھی۔ یہ وہی بارِ غم ہے جو بعثت سے پہلے آپ کے دل پر اس سبب سے تھا کہ آپ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں و حیران تھے لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا پھر جب اللہ نے آپ پر ہدایت کی راہ کھول دی تو اس غم پر مزید اضافہ اس سبب سے ہوا کہ آپ کی پوری قوم اس کی دشمن بن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس غم کو اَلَّذِیۡۤ اَنۡقَضَ ظَہۡرَکَ (کمر شکن) کی صفت سے تعبیر کرنا کوئی مبالغہ نہیں بلکہ یکسر حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس ہدایت سے آپ کا سینہ کھول دیا اس کے متعلق آپ کا یہ احساس ایک امرِ فطری تھا کہ جس طرح اس نے آپ کے سینہ میں گھر کر لیا اسی طرح ہر سینہ میں اس کو اتر جانا چاہیے۔ لیکن اس توقع کے خلاف جب آپ نے دیکھا کہ جتنے ہی دعوت کی راہ میں آپ کی سرگرمی بڑھتی جا رہی ہے اتنی ہی اس سے لوگوں کی وحشت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے تو قدرتی طور پر آپ کو یہ گمان گزرا کہ شاید آپ کی جدوجہد میں کوئی کمی یا خامی ہے جس کے سبب سے دعوت اثر انداز نہیں ہو رہی ہے۔ یہ گمان کر کے آپ جدوجہد میں مزید اضافہ کرتے چلے جاتے لیکن اس سے بھی جب صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تو آپ کی پریشانی دوچند ہو گئی۔ علاوہ ازیں اس طرح کے حالات میں اگر وحی کے آنے میں کچھ وقفہ ہو جاتا تو یہ وقفہ بھی آپ کے غم والم میں اضافہ کر دیتا کہ مبادا یہ اللہ تعالیٰ کے کسی عتاب کے سبب سے ہو۔ حضورؐ کی ان پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے جس طرح یہاں تسلی دی گئی ہے اسی طرح سورۂ طٰہٰ میں بھی دی گئی ہے:

طٰهٰ ۚ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰۤی ۙ اِلَّا تَذۡكِرَةً لِّمَنۡ یَّخۡشٰی ۙ (طٰہٰ - ۲۰: ۱-۳)	یہ سورۂ طٰہٰ ہے۔ ہم نے تم پر قرآن اس لیے نہیں اتارا ہے کہ اپنی زندگی اجیرن بنا لو۔ یہ تو بس ان لوگوں کے لیے یاددہانی ہے جو ڈرنے والے ہوں۔

وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ (۴)

یعنی کیا یہ بات نہیں ہے کہ ہم نے تمہارا آوازہ بلند کیا! 'لَكَ' جس طرح پہلی آیت میں اختصاص، تائید اور نصرت کے اظہار کے لیے ہے اسی طرح یہاں بھی ہے۔ یعنی تمہاری تقویت و حوصلہ افزائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے تمہارا ذکر دور و نزدیک پھیلا دیا۔

دعوت کا چرچا اطراف و اکناف میں

اس آیت سے سورہ کا زمانۂ نزول معین ہوتا ہے کہ یہ اس دور میں اتری ہے جب آپ کی دعوت کا چرچا عرب کے اطراف و اکناف میں پھیلنے لگا ہے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ مکہ کے سادات، جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے دعوت دی، وہ تو ایک عرصہ تک دعوت اور داعی کی مخالفت پر جمے رہے لیکن حج کے موسم میں باہر کے جو لوگ آتے ان کے ذریعہ سے یہ دعوت مکہ کے اطراف، خصوصیت کے ساتھ مدینہ کے انصار میں پھیل گئی۔ پھر بالتدریج نہ صرف عرب کے دور و قریب کے قبائل بلکہ اطراف کے دوسرے ملکوں میں بھی اس کا ذکر پہنچ گیا اور یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں رہا کہ یہ آواز دبنے والی نہیں ہے بلکہ جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ بچہ بچہ کی زبان پر اس کا چرچا ہو گا اور گوشہ گوشہ 'اَللّٰہُ اَکۡبَرُ' کی صدا سے گونج اٹھے گا۔

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (۵-۶)

اصل سبق — یہ وہ اصل سبق ہے جو اوپر کے پیش کردہ شواہد کی روشنی میں دینا مقصود ہے اور جس کو اس سورہ کے عمود کی حیثیت حاصل ہے۔ فرمایا کہ جب تم اپنے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ دیکھ رہے ہو تو اس کی اس سنت پر اطمینان رکھو کہ اس نے 'یُسر' کا دامن 'عُسر' کے ساتھ باندھ رکھا ہے۔ یعنی آسانی ظاہر تو ہو گی ضرور لیکن آزمائش کے دور سے گزرنے کے بعد۔ سابق سورہ میں یہی حقیقت آفاق اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات سے ثابت کی گئی ہے۔ اس سورہ میں خاص حضورؐ کی زندگی کے تجربات ہی کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے تاکہ زیادہ مؤثر ہو سکیں۔

یہاں اس پہلو پر بھی نظر رہے کہ ایک ہی بات دو مرتبہ فرمائی گئی ہے۔ یہ تکرار محض تاکید کے لیے نہیں، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ اس سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ یہ 'عُسر' اور 'یُسر' دونوں اس دنیا میں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک گھاٹی کسی نے پار کر لی تو یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ بس اب کسی نئی گھاٹی سے اس کو سابقہ نہیں پیش آنا ہے بلکہ دوسری اور تیسری گھاٹی بھی آسکتی ہے۔ چاہیے کہ ان کو عبور کرنے کا حوصلہ بھی قائم رکھے۔ زندگی مسلسل جدوجہد سے عبارت ہے۔ (ایک خاص نکتہ) اس جہان میں ہر مسافر کو نشیب و فراز سے سابقہ پیش آتا ہے اور ان سے گزرنے کے بعد ہی کوئی رہرو منزلِ مقصود پر پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہی معاملہ حق کے راستہ پر چلنے والوں سے بھی ہے۔ جو لوگ اس راستہ پر چلنے کا ارادہ کرتے ہیں ان کے لیے یہ نہیں ہوتا کہ راہ سے تمام عقبات خود بخود دور ہو جائیں بلکہ ان کو دور کرنے کے لیے خود ان کو جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے یہ ضمانت ضرور ہے کہ اگر وہ راہ کی رکاوٹوں کے علی الرغم ہمت نہیں ہاریں گے اور جتنی قوت ان کے رب نے ان کو بخشی ہے اس کو استعمال کرنے سے دریغ نہیں کریں گے تو وہ ان کے لیے ہر مشکل کے بعد آسانی پیدا کرے گا جس سے تازہ دم ہو کر وہ آگے کے سفر کے لیے مزید عزم و حوصلہ حاصل کر لیں گے اور ایک کے بعد دوسری مشکل سے لڑتے اور اس کو سر کرتے ہوئے بالآخر منزلِ مطلوب پر پہنچ جائیں گے۔

اس امتحان کی حکمت قرآن میں یہ بتائی گئی ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ منافق اور مخلص، راست باز اور ریاکار میں امتیاز کرتا ہے تاکہ ہر ایک اپنے اعمال کے مطابق جزا یا سزا پائے، کسی کو یہ شکایت نہ رہے کہ اس کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ اگر یہ امتحان نہ ہوتا تو کھوٹے اور کھرے میں وہ امتیاز نہ ہو سکتا جو ہر ایک پر حجت قائم کر دے۔

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ (۷-۸)

(آخری منزل کے لیے ہدایت) یہ آخری منزل کے لیے جدوجہد کی ہدایت ہے۔ 'نصب ینصب' کے معنی جدوجہد اور محنت

کرنے کے ہیں ۔ فرمایا کہ دعوت کی راہ کے عقبات طے کرتے ہوئے جب وہ مرحلہ آجائے کہ اللہ کی نصرت بے نقاب ہو جائے، مکہ فتح ہو جائے، دشمن گھٹنے ٹیک دیں اور لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگیں تو پھر تم کمر کس کے آخری منزل کی تیاری کے لیے جدوجہد کرو اور کلیتہً اپنے رب کی طرف جھک پڑو۔ گویا بیک وقت ان آیات میں دو باتیں جمع کر دی گئی ہیں۔

ایک تو یہ بشارت کہ آپ تمام مشکلاتِ راہ کو عبور کرتے ہوئے دعوت کی آخری منزل پر کامیابی کے ساتھ پہنچنے اور اپنی عظیم ذمہ داری سے سرخروئی کے ساتھ فارغ ہونے کا شرف حاصل کریں گے۔

دوسری یہ کہ کامیابی کی آخری منزل پر پہنچ جانے کے بعد بھی آپ کے لیے کمر کھول دینے کا وقت نہیں آئے گا بلکہ لقائے رب کی منزل کے سفر کے لیے آپ کو مزید اہتمام سے کمر کس کے تیاری کرنی پڑے گی۔

اسی آخری ہدایت کی تعمیل کا اہتمام تھا کہ آخر دورِ حیات میں آپؐ کا انہماک عبادتِ الٰہی میں بہت بڑھ گیا تھا۔ بعض لوگوں نے آپ کا یہ حال دیکھ کر سوال کیا کہ حضورؐ آپ کے تو تمام اگلے پچھلے گناہ بخشے جا چکے ہیں تو آپ عبادت میں اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ آپ نے جواب میں فرمایا: "افلا اکون عبداً شکوراً" (تو کیا میں اپنے رب کا شکرگزار بندہ نہ بنوں!)

یہاں بات اجمال کے ساتھ فرمائی گئی۔ اس کی پوری تفصیل سورۂ نصر میں آئے گی۔ سورہ یہاں ہم نقل کیے دیتے ہیں:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۙ وَ رَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۧ	جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے اور دیکھو کہ لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی تسبیح کرو اس کی حمد کے ساتھ اور اس سے مغفرت مانگو۔ وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا ہے۔
(النصر - ۱۱۰ : ۱-۳)	

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ اولا و اخرا۔

لاہور

۱۵ - فروری ۱۹۸۰ء

۲۷ - ربیع الاول ۱۴۰۰ھ

تدبّرِ قرآن

٩٥

التّین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلّق اور مطالب کی ترتیب

اس سورہ کا عمود جزا و سزا کا اثبات ہے۔ اس کی تمہید یوں اٹھائی ہے کہ دنیا میں انبیائے کرام کی بعثت و دعوت کے جو اہم مراکز ہیں پہلے ان کا ذکر بصورتِ قسم یعنی بطورِ شہادت کیا اور اس کی روشنی میں یہ واضح فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین ساخت پر، نہایت اعلیٰ فطرت اور نہایت برتر صلاحیتوں کے ساتھ، پیدا کیا ہے لیکن اس برتری کو قائم رکھنے اور ان اعلیٰ صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے اس نے یہ سنت ٹھہرائی ہے کہ جو لوگ ایمان و عملِ صالح کی راہ اختیار کریں گے اور اس راہ کی صعوبتوں کا عزم و حوصلہ کے ساتھ مقابلہ کریں گے تو وہ اپنی اس جد و جہد کا بھرپور صلہ پائیں گے۔ رہے وہ لوگ جو نفس پرستی اور تن آسانی کے باعث اس راہ کے عقبات کو پار کرنے اور اس کی صعوبتوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ نہیں کریں گے اللہ تعالیٰ ان کو ان کی اختیار کی ہوئی راہ پر جانے کے لیے چھوڑ دے گا اور وہ بالآخر اس کھڈ میں گریں گے جو یہ راہ اختیار کرنے والوں کے لیے مقدر ہے۔

یہاں پچھلی دونوں توام سورتوں میں آیات فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ۝ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی (اللیل - ۹۲: ۵-۷) اور آیت فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا (الم نشرح - ۹۴: ۵) کی تفسیر پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ ان میں بھی ایک دوسرے پہلو سے یہی حقیقت واضح فرمائی گئی ہے جو اس سورہ میں پیش کی گئی ہے۔ اس سے سابق اور لاحق دونوں سورتوں کا تعلق واضح ہو جائے گا۔

آخر میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ بالکل حق و عدل پر مبنی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کی نظر میں نیک و بد دونوں یکساں ہیں حالانکہ یہ بات بالبداہت باطل ہے۔ جس خدا نے لوگوں کو نیکی اور بدی کا شعور دیا ہے لازم ہے کہ وہ سب سے بڑھ کر نیک اور بد میں امتیاز کرنے والا اور ہر ایک کے ساتھ اس کے استحقاق کے مطابق معاملہ کرنے والا ہو۔

آگے سورۂ عصر میں بھی یہی حقیقت ذرا مختلف الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ اس کو بھی سامنے رکھ لیجیے تو اس سورہ کے رخ کو معین کرنے میں آسانی ہو گی۔ فرمایا ہے:

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝	زمانہ شاہد ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے
اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	مگر وہ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک
وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝	عمل کیے اور جنھوں نے ایک دوسرے کو
(العصر - ۱۰۳ : ۱ - ۳)	حق اور صبر کی تلقین کی ۔

سُورَةُ التِّين

مَكِّيَّةٌ ــــــــــــــ آیات : ۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱ - ۸ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ① وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ② وَهٰذَا الْبَلَدِ
الْاَمِيْنِ ③ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ④
ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ⑤ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ⑥ فَمَا يُكَذِّبُكَ
ع ۸ ۲۰ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ⑦ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ⑧

ترجمۂ آیات ۱ - ۸ شاہد ہیں جبلِ تین اور کوہِ زیتون اور طورِ سینین اور یہ پُرامن سرزمین۔ ۱ - ۳

کہ ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر بنایا، پھر ہم نے اس کو ادنیٰ درجہ میں ڈال دیا جب کہ وہ خود گرنے والا بنا بجز ان کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے۔ سو ان کے لیے ایک دائمی صلہ ہے۔ ۴ - ۶

تو اب کیا ہے جس سے تم جزاء و سزا کو جھٹلاتے رہو! کیا اللہ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں! ۷ - ۸

الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالتِّیۡنِ وَالزَّیۡتُوۡنِ (۱)

'تین' سے مراد جبلِ تین ہے

'و' یہاں قسم کے لیے ہے اور قسم سے متعلق ہم برابر وضاحت کرتے آرہے ہیں کہ قرآن میں اشیاء اور مقامات کی جو قسمیں آئی ہیں وہ تمام تر اس دعوے پر دلیل کی حیثیت سے آئی ہیں جو قسم کے بعد مذکور ہوا ہے۔ یہاں 'تِیۡن' سے مشہور پھل انجیر مراد نہیں ہے، جیسا کہ ہمارے مفسرین نے سمجھا ہے، بلکہ جبلِ تین ہے جو انجیر کی پیداوار کے لیے مشہور رہا ہے۔ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر سورۂ تین میں اس کی جو تحقیق بیان فرمائی ہے اس کا کچھ ضروری حصہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں:

"'تین' ایک خاص پہاڑ کا نام ہے۔ عربی میں انجیر کو تین کہتے ہیں۔ چونکہ یہاں انجیر کی پیداوار بکثرت تھی اس وجہ سے یہ تین ہی کے نام سے مشہور ہوگیا۔ اہل عرب اس نام سے اس کو جانتے تھے۔ نام رکھنے کا یہ طریقہ عربوں میں معروف رہا ہے۔ جس چیز کی پیداوار جہاں زیادہ ہوتی بسا اوقات اسی کے نام سے اس مقام کو موسوم کردیتے۔ غضی، شجرۃ، نخلۃ وغیرہ مقاموں کے نام اسی طرح پڑے۔......

مشہور شاعر نابغہ ذبیانی نے اپنے شعروں میں 'تین' کا ذکر ایک مقام کی حیثیت سے کیا ہے:

صھب الظلال اتین التین عن عرض یزجین غیما قلیلا ماؤہ شبما

"اس میں اس نے 'تین' سے شمال کے ایک پہاڑ کو مراد لیا ہے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ یہ حلوان اور ہمدان کے درمیان ہے۔"

آگے مولاناؒ اس کے بارے میں بعض قیاسات کی تردید کرتے ہوئے اپنی قطعی رائے ان الفاظ میں ظاہر فرماتے ہیں:

"اس سے معلوم ہوا کہ تین سے مراد یا تو کوہِ جودی ہے یا اسی کے قریب کا کوئی دوسرا پہاڑ۔ تورات میں ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد بنی آدم یہیں سے ادھر ادھر متفرق ہوئے اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ کوہِ جودی کے پاس پیش آیا۔"

'زیتون' سے مراد کوہِ زیتون ہے

'زَیۡتُوۡن' سے بھی زیتون کا درخت یا اس کا پھل مراد نہیں ہے، جیسا کہ ہمارے مفسرین نے

گمان کیا ہے۔ بلکہ جبلِ زیتون ہے جو حضرت مسیحؑ کی دعوت اور عبادت کے مرکز کی حیثیت سے معروف ہے اور انجیل میں جس کا ذکر بار بار آیا ہے۔

مولاناؒ اس کے متعلق اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"ہمارے نزدیک یہ بھی مقام کا نام ہے۔ چونکہ زیتون کی پیداوار یہاں زیادہ تھی اس وجہ سے عربوں کے اس طریق تسمیہ کے مطابق، جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ زیتون کے نام سے موسوم ہو گیا۔ یہ یقیناً وہی پہاڑ ہے جس کا انجیل میں اکثر ذکر آتا ہے اور جس پر حضرت مسیح علیہ السلام عبادت اور دعا کے لیے جایا کرتے تھے۔ لوقا ۲۱: ۳۷ میں اس کا ذکر یوں آیا ہے:

'اور دن میں وہ ہیکل میں تعلیم دیتا تھا اور رات میں نکل جاتا تھا اور اس پہاڑ پر شب بسر کرتا تھا جس کا نام کوہِ زیتون ہے'

سلف کے اقوال سے بھی اس رائے کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت کعبؓ سے روایت ہے کہ زیتون سے مراد بیت المقدس ہے اور قتادہ کہتے ہیں کہ زیتون وہ پہاڑ ہے جہاں بیت المقدس واقع ہے"

وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۙ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ (۲-۳)

طورِ سینا — ان دونوں کا مقام ہونا تو بالکل واضح ہے لیکن طورِ سینین ہی لفظ سینا، جو سینین ہو گیا ہے، اس کی تحقیق مولانا کے نزدیک یہ ہے:

"قرآن میں ایک جگہ 'طُوْرِ سَيْنَآءَ' المومنون - ۲۳: ۲۰ بھی آیا ہے یعنی ایک جگہ یہ مؤنث کی صورت میں ہے اور دوسری جگہ جمع سالم کی شکل میں۔ جیسے عربی میں 'جمعًا' اور 'اَجْمَعُوْنَ' مستعمل ہیں۔ تورات میں کہیں 'سینا' آیا ہے اور کہیں 'سینیم' اور معلوم ہے کہ عبرانی میں 'یم' جمع کی علامت ہے"۔ [1]

بلد امین سے مکہ مراد ہے — بلد امین سے ظاہر ہے کہ مکہ مراد ہے لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ صاف الفاظ میں مکہ کیوں نہیں کہا، صفت کے ساتھ کیوں اس کا ذکر کیا۔ اس سوال کا جواب ہم آگے ان شاء اللہ جب مقسم علیہ سے ان قسموں کے تعلق کی وضاحت کریں گے، دیں گے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۟ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۟

---

[1] ہم اس کتاب میں واضح کر چکے ہیں کہ عربی میں بعض مرتبہ کسی چیز کی جمع اس کی وسعتِ اطراف کو ظاہر کرنے کے لیے بھی آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے عبرانی میں بھی یہ قاعدہ موجود ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ (۴-۶)

اصل دعویٰ جس کو ثابت کرنے کے لیے قسمیں کھائی گئی ہیں

یہ وہ اصل دعویٰ ہے جس کو ثابت کرنے کے لیے مذکورہ بالا قسمیں کھائی گئی ہیں۔ فرمایا کہ ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے لیکن ہماری سنت یہ ہے کہ جو لوگ اس انعام کی قدر کرتے اور ان کی فطرت کے اندر جو ہدایت ہم نے ودیعت کی ہے اس کو پروان چڑھاتے اور پھر نبیوں کی دعوت قبول کر کے ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کر لیتے ہیں ان کو تو ہم دائمی اجر سے نوازتے ہیں، لیکن جو لوگ اس کی قدر نہیں کرتے وہ ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں، اور ان کو ہم اسی گڑھے میں پھینک دیتے ہیں جس سے بچانے ہی کے لیے ہم نے ان پر یہ انعام کیا تھا۔

'لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ'۔ 'تَقْوِيمٌ' کا لغوی مفہوم تو کسی چیز کو سیدھا کرنا، مثلاً کہیں گے: قوّمت الرمح فاستقام (میں نے نیزے کو سیدھا کیا تو وہ سیدھا ہو گیا) پھر اسی مفہوم سے ترقی کر کے یہ لفظ کسی شے کو کسی خاص مقصد کے لیے موزوں اور مناسب بنانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

انسان کو اللہ نے نہایت اعلیٰ مقصد کے لیے بہترین صلاحیتوں سے آراستہ کیا ہے

انسان کے متعلق قرآن میں بار بار یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ اس کو خدا نے عبث نہیں بلکہ ایک عظیم غایت (بِالْحَقِّ) کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ وہ غایت یہ ہے کہ اس دنیا کے دارالامتحان میں وہ شیطان اور اس کے ایجنٹوں کی باطل ترغیبات و ترہیبات سے بچتا ہوا زندگی کی اس صراطِ مستقیم پر گامزن رہے جو اس کے رب نے اس کے لیے کھولی ہے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ابدی بادشاہی بخشے گا اور اگر وہ شیطان کی ترغیب سے بہک کر یا اس کی ترہیب سے ڈر کر اس صراطِ مستقیم کو چھوڑ بیٹھے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ہلاکت کی اسی وادی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دے گا جو وہ اپنے لیے پسند کرے گا۔ انسان کو اس غایت کے اعتبار سے، اللہ تعالیٰ نے نہایت بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے۔ اس کی ظاہری ساخت بھی گواہ ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہے اور اس کی باطنی صلاحیتیں بھی اتنی اعلیٰ ہیں کہ اس زمین کی تمام مخلوقات میں سے صرف وہی ان کا اہل بن سکا ہے۔ پچھلی سورتوں میں، مختلف اسلوبوں سے، یہ بات بیان ہوئی ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے خیر اور شر میں امتیاز بخشا ہے۔ یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ بالطبع وہ خیر کو پسند کرنے والا اور شر کو ناپسند کرنے والا ہے۔ نیز یہ حقیقت بھی جگہ جگہ واضح کی گئی ہے کہ وہ ذی عقل اور ذی ارادہ ہستی ہے، دوسری مخلوقات کی طرح عقل اور ارادہ سے محروم نہیں ہے۔ یہ ساری باتیں شہادت دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے اس کو پیدا کیا ہے اس کے لیے تمام ضروری صلاحیتوں سے اس کو آراستہ بھی کیا ہے۔

وہ سنت جس کے تحت اللہ تعالیٰ انسان کو سافلین میں لوٹاتا ہے

'ثُمَّ رَدَدْنٰهُ أَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ'۔ یہ اس سنت کی طرف اشارہ ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ

اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ فرمایا کہ انسان چونکہ ذی ارادہ ہستی ہے اس وجہ سے اس احسن تقویم کے شرف سے بہرہ یاب رہنا یا اس سے محروم ہو جانا اس کے اپنے رویہ پر منحصر ہے۔ اگر وہ اس کی قدر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے مدارج بلند کرتا ہے اور اگر وہ اس کی قدر نہیں کرتا بلکہ نیچے ہی کی طرف جھکا رہتا ہے تو اس کو وہ نیچے ہی کی طرف لوٹا دیتا ہے اور بالآخر وہ تمام سرفرازیوں سے محروم ہو کر، لڑکھڑاتا ہوا قعرِ جہنم میں گر پڑتا ہے۔

'اَسْفَلَ' میرے نزدیک ظرف اور 'سٰفِلِیْنَ' 'رَدَدْنٰهُ' کی ضمیر مفعول سے حال ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو نیچے کی طرف اس وجہ سے پھینکتا ہے کہ وہ نیچے کی طرف جانے ہی کی رغبت کرتا ہے، بلندیوں پر چڑھنے کا حوصلہ نہیں کرتا۔

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ کھٹک پیدا ہو کہ سٰفلین جمع ہے تو وہ ضمیر واحد سے کس طرح حال پڑ سکتا ہے؛ لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے۔ ضمیر اگرچہ واحد ہے لیکن اس کا مرجع 'الْاِنْسَانَ' ہے جو معناً جمع ہے چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ اس کے لیے ضمیریں واحد بھی آتی ہیں اور جمع بھی۔

ان لوگوں کی صفت جو ہلاکت سے محفوظ رہتے ہیں

'اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ' یہ ان لوگوں کی صفت بیان ہوئی ہے جن کو اللہ تعالیٰ اس ہلاکت سے محفوظ رکھتا ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ 'اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ' پر پیدا کیے جانے کی قدر و قیمت سمجھتے اور ایمان و عمل صالح کی زندگی اختیار کرنے کی توفیق پاتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نیچے نہیں پھینکتا بلکہ ان کو عزت و رفعت بخشتا ہے اور وہ ایک ابدی زندگی میں ابدی انعام سے نوازے جاتے ہیں۔

'غَیْرُ مَمْنُوْنٍ' کی تحقیق اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ اس کے معنی غیر منقطع اور دائم کے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس کی تاویل اس سے مختلف بھی کی ہے لیکن وہ عربیت کے خلاف ہے۔

اصل دعوے کو متعین کرنے کے بعد اب آئیے اس سوال پر غور کیجیے کہ مذکورہ بالا قسمیں کس طرح اس دعوے پر دلیل ہیں جو یہاں پیش کیا گیا ہے۔

جبلِ تین کی شہادت جزا پر

جبلِ تین کی شہادت جزا پر

سب سے پہلے جبلِ تین کی قسم کھائی گئی ہے اور دلائل کی روشنی میں اوپر وضاحت ہو چکی ہے کہ اس سے مراد کوہِ جودی ہے۔ اس پہاڑ پر اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافات کے دو اہم واقعات پیش آئے ہیں اور ان کی تفصیل قدیم صحیفوں میں موجود ہے۔ ایک حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ اور دوسرا حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا واقعہ۔ ان میں سے پہلے واقعہ کا ذکر مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر سورۂ تین میں یوں کیا ہے:

"تین وہ پہلا مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لیے جزا و سزا کا پہلا واقعہ پیش آیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب آدم علیہ السلام نے خدا کا عہد بھلا دیا اور اپنے حاسد کے فریب میں آکر ممنوعہ درخت کا پھل کھا بیٹھے تو ان کو اور ان کی بیوی کو جزا کے قانون سے دوچار ہونا پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو سرفرازی بخشی تھی اس سے وہ محروم کر دیے گئے اور جنت کی خلعت ان سے چھین لی گئی ——— ...... اور یہ واقعہ ان کی پوری نسل کے لیے ایک یادگار واقعہ قرار پایا۔ چنانچہ قرآن میں متعدد جگہ اسی پہلو سے اس کو یاد دلایا گیا ہے، مثلاً فرمایا ہے: یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّکُمُ الشَّیْطٰنُ کَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَیْکُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ یَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا (الاعراف - ۷: ۲۷) (اے آدم کے بیٹو! کہیں شیطان تم کو ورغلا نہ دے جس طرح اس نے تمھارے ماں باپ کو جنت سے نکلوا چھوڑا، جنت کے خلعت سے محروم کر کے)۔"

"یہاں وہ بات بھی یاد رکھیے جو تورات میں مذکور ہے کہ حضرات آدم و حوا (علیہما السلام) نے جنت کی خلعت سے محروم ہونے کے بعد جس درخت کے پتوں سے اپنے تن ڈھانکے وہ انجیر کا درخت تھا۔"

"اس واقعہ کے بعد قرآن میں تصریح ہے کہ حضرات آدم و حوا (علیہما السلام) نے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور ان پر ہدایت نازل کرنے اور اس ہدایت کی پیروی کرنے والوں کو اجر دینے کا وعدہ فرمایا۔ پہلے عہد کے بعد یہ اللہ تعالیٰ کا دوسرا عہد تھا جو اس نے حضرت آدمؑ سے کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جبل تین کا واقعہ اپنے اندر دو مختلف پہلو رکھتا ہے۔ اس دن اللہ تعالیٰ نے ایک طرف حضرت آدمؑ سے ایک نعمت چھینی اور دوسری طرف ایک عظیم نعمت ان کو بخشی۔ چھینی اس وجہ سے کہ انھوں نے اللہ کے عہد کو فراموش کر دیا تھا اور بخشی اس وجہ سے کہ غفلت کے بعد وہ متنبہ ہو گئے اور انھوں نے توبہ کی۔"

جبل تین کے پاس جزا کا دوسرا واقعہ حضرت نوح علیہ السلام کے عہد میں پیش آیا اس کی تفصیل مولانا رحمۃ اللہ علیہ یوں پیش کرتے ہیں:

"ان کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے اسی پہاڑ کے پاس ظالموں کو تباہ کیا اور نیکوکاروں کو طوفان سے نجات دی اور برکت بخشی۔ قرآن مجید میں ہے:

وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ	اور حکم دیا گیا، اے زمین اپنا پانی
وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ	جذب کر لے اور اے آسمان! تھم جا۔

وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (ھود - ۱۱: ۴۴)	پانی اتر گیا اور کام تمام کر دیا گیا اور کشتی کوہِ جودی پر ٹِک گئی اور اعلان کر دیا گیا کہ ظالموں کے لیے ہلاکی ہو۔

آگے حضرت نوحؑ کی دعا کے بعد ان کو یہ ہدایت ہوئی:

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (ھود - ۱۱: ۴۸)	کہا گیا، اے نوح، اترو، ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ اپنے اوپر اور ان قوموں پر جو تمھارے ساتھ ہیں اور تمھارے سوا اور قومیں بھی ہوں گی جن کو ہم کچھ دن بہرہ مند ہونے کا موقع دیں گے۔ پھر ان کو ہمارا دردناک عذاب پکڑے گا۔

...... اس سے معلوم ہوا کہ جبل تین اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافات کے ظہور کا ایک یادگار مقام ہے"۔

کوہِ زیتون کی شہادت جزا پر

کوہِ زیتون پر جزا کا جو واقعہ پیش آیا ہے اس کی تفصیل مولاناؒ یوں پیش کرتے ہیں:

"اسی پہاڑ پر خدا نے اپنی شریعت یہود سے چھینی اور وہ سلسلۂ ابراہیمی کی دوسری شاخ کے حوالہ کر دی۔ یہ واقعہ حضرت مسیحؑ کی زندگی کے آخری دور سے تعلق رکھتا ہے۔ انجیلوں میں اس کی جو تفصیلات موجود ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک روز آپ شب بھر جاگ کر اپنے رب سے دعا و مناجات کرتے رہے کہ ان کی قوم (یہود) کی کشتی غرق ہونے سے بچ جائے لیکن تقدیر کا فیصلہ اٹل تھا۔ بالآخر وہ قوم کے مستقبل سے مایوس ہو گئے۔ بالخصوص جب آپ کو معلوم ہوا کہ یہود آپ کے قتل کے درپے ہیں تو اس بات سے آپ کو اور بھی غم ہوا کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ اگر یہود نے اس طرح کا کوئی اقدام کیا تو ان پر سنتِ الٰہی کے مطابق اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو جائے گی اور وہ اپنی امانت ان سے چھین کر دوسروں کے حوالے کر دے گا۔ متی ۲۱: ۴۲ میں ہے:

یسوع نے ان سے کہا کہ تم نے کتابِ مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا۔ وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔

یہ عبارت زبور - ۱۱۸ : ۲۲ - ۲۳ کی ہے - حضرت مسیح علیہ السلام نے اس کا حوالہ دے کر اپنی طرف سے اس کی شرح یوں فرمائی :

"اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، لیکن جس پر وہ گرے گا اس کو پیس ڈالے گا۔"

یہود سے یہ آسمانی بادشاہت چھینے جانے کا واقعہ کوہِ زیتون پر پیش آیا۔ انجیلوں میں اس ماجرے کی ساری تفصیلات موجود ہیں۔"

طور سینین کی شہادت جزا پر

طورِ سینین کی شہادت کی تفصیل کرتے ہوئے مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

" طور سینین کی شہادت جزا پر بالکل واضح ہے۔ یہی مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے ایک مظلوم و مقہور قوم پر اپنی عنایت مبذول فرمائی اور اس کے صبر کے صلہ میں دشمنوں کے پنجہ سے اس کو نجات دے کر اس کا سر اونچا کیا اور پھر اس کو ایک ایسی شریعت عطا فرمائی جو منکروں اور دشمنوں کے لیے یکسر تازیانۂ عذاب تھی۔ یہ واقعہ مظلوموں پر لطف و نوازش اور ظالموں پر قہر و غضب کی نہایت واضح مثال ہے۔ قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ اور قوم فرعون کے واقعات جہاں بیان ہوئے ہیں اس حقیقت کی طرف اشارات موجود ہیں۔ مثلاً :

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى	اور تمھارے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل
عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ	کے لیے پورا ہوا۔ بوجہ اس کے کہ
وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ	انھوں نے صبر کیا، اور ہم نے تباہ
فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا	کر ڈالیں وہ عمارتیں جو فرعون اور اس
كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ○	کی قوم بناتے رہے تھے اور وہ بیلیں
(الاعراف - ۷ : ۱۳۷)	بھی جو وہ ٹٹیوں پر چڑھاتے رہے تھے۔"

مولاناؒ نے یہ تفصیل وضاحت سے لکھی ہے لیکن یہ واقعات معلوم ہیں اس وجہ سے ہم نے صرف مختصر اقتباس پر کفایت کی ہے۔ جن کو تفصیل مطلوب ہو وہ اصل کتاب کی مراجعت کریں۔

بلد امین کی شہادت جزا پر

بلد امین سے مراد ظاہر ہے کہ مکہ ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے ایک مامون گھر بنایا ہے، چنانچہ فرمایا ہے: 'وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا' (آل عمران - ۳ : ۹۷) (اور جو اس میں داخل ہوا وہ مامون ہوا) جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی کافر قوم سے ہجرت کر کے اس علاقہ میں آئے ہیں یہ بالکل غیر آباد و غیر مامون تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے لیے رزق و امن کی دعا فرمائی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی جس کی بدولت اس علاقہ میں رزق کی بھی فراوانی ہوئی اور یہ امن سے بھی معمور ہوا۔ اور یہ دونوں نعمتیں لوگوں کو حضرت ابراہیمؑ کے بنائے ہوئے گھر کی برکت سے ملیں۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۙ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ڏ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ' (قریش - ۱۰۶ : ۳ - ۴) (پس چاہیے کہ لوگ اس گھر کے خداوند کی بندگی کریں جس نے ان کو بھوک میں کھلایا اور خوف سے نچنت کیا)۔ حضرت ابراہیمؑ پر یہ انعام ان کی ان جاں بازیوں اور قربانیوں کے صلے میں ہوا جو انھوں نے کلمۂ توحید کی سربلندی کی راہ میں پیش کیں۔ پھر جب انھوں نے اس سے بھی بڑے امتحان یعنی بیٹے کی قربانی کے امتحان میں بھی کامیابی حاصل کر لی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے بھی بڑے انعام یعنی قوموں کی امامت کے منصب سے نوازا۔ اس وقت حضرت ابراہیمؑ نے سوال کیا کہ کیا اس امامت کے انعام میں میری ذرّیت بھی شامل ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب یہ دیا کہ میرا یہ وعدہ ان لوگوں سے متعلق نہیں ہے جو شرک و کفر میں مبتلا ہو کر اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بن جائیں گے۔ یعنی تم کو جو کچھ ملا ہے وہ تو انعام ہے تمھاری جاں بازیوں اور وفاداریوں کا۔ اس وجہ سے تمھاری ذریت میں سے وہی اس انعام میں شریک ہوں گے جو تمھارے طریقہ کے پیرو ہوں گے۔ رہے وہ جو اس راہ سے منحرف ہو جائیں گے تو وہ اپنے اسی انجام سے دوچار ہوں گے جو اس طرح کے لوگوں کے لیے خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے مقدّر ہے۔ قرآن میں اس کا حوالہ یوں آیا ہے:

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۔ (البقرۃ - ۲ : ۱۲۴)

اور یاد کرو جب کہ ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں سے جانچا تو اس نے وہ پوری کر دکھائیں تو فرمایا کہ میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں تو اس نے سوال کیا کہ کیا میری ذریت میں سے بھی؟ ارشاد ہوا کہ میرا یہ عہد ان لوگوں سے متعلق نہیں ہے جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ مقام نہ صرف اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافات کا ایک مظہر ہے بلکہ اسی سرزمین سے اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کی عام منادی کرائی ہے کہ کون لوگ اس کے فضل و انعام کے حق دار ہوں گے اور کون اس کے قہر و غضب کے سزاوار ٹھہریں گے۔

ناموں کی ترتیب سے متعلق ایک سوال کا جواب

ایک سوال ان ناموں کی ترتیب سے متعلق بھی ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے کہ ان کی تقدیم و تاخیر میں کونسا اصول ملحوظ ہے۔ استاذ امامؒ اس کا یہ جواب دیتے ہیں:

"اس میں ترتیب جمع مثل بالمثل کی ملحوظ ہے۔ پہلے آدم علیہ السلام کا واقعہ بیان ہوا اس لیے کہ تقدم زمانی کے لحاظ سے اسی کا ذکر ہونا تھا۔ پھر مسیح علیہ السلام کے واقعہ کا ذکر ہوا اور یہ اس مماثلت کے سبب سے ہوا جو حضرت آدمؑ اور حضرت مسیحؑ کے درمیان ہے اور جس کا ذکر قرآن نے نہایت واضح الفاظ میں یوں فرمایا ہے: 'اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ' (آل عمران - ۳: ۵۹) (عیسیٰ کی مثال اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم کی ہے)"

. . . .

"اس کے بعد ان دو مقاموں کا ذکر آتا ہے جن کا تعلق حضرت موسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور ان دونوں رسولوں میں جو مماثلت ہے وہ بھی قرآن سے واضح ہے۔ چنانچہ قریش کو مخاطب کر کے فرمایا ہے:

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا شَاھِدًا عَلَیْکُمْ کَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (المزمل - ۷۳: ۱۵)

ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا تم پر گواہ بنا کر جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا۔"

"تورات کی کتاب استثناء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو بشارت وارد ہے اس میں بھی یہ مماثلت موجود ہے:

'اور میں ان کے لیے انہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اس کو حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اُنہی سے لوں گا۔'"

فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ ۝ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحٰکِمِیْنَ (۷-۸)

'فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ'۔ اس آیت کی تاویل مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں یوں فرمائی ہے:

"اس آیت کی تاویل میں دو قول ہیں:

فَمَا يُكَذِّبُكَ الآیۃ کی تاویل

ایک یہ کہ پس اے انسان! ان واضح شہادتوں کے بعد کیا چیز ہے جو جزا کے بارے میں تیری تکذیب کرتی ہے۔ یہ تاویل مجاہدؒ نے اختیار کی ہے۔ جب ان سے کہا گیا کہ اس میں تو مخاطب آنحضرت صلعم ہیں تو انھوں نے فرمایا: معاذ اللہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، اس میں مخاطب انسان ہے۔ زمخشریؒ نے یہی تاویل اختیار کی ہے لیکن 'فَمَا يُكَذِّبُكَ' میں 'تکذیب' کے معنی 'حمل علی التکذیب' یعنی تکذیب پر ابھارنے کے لیتے ہیں۔ اگر یہ معنی ثابت ہو جائیں تو یہ تاویل نہایت واضح ہے لیکن اس کی تائید میں انھوں نے کوئی دلیل نہیں دی ہے۔"

"دوسری تاویل یہ ہے کہ پس اے پیغمبرؐ! اس کے بعد کیا چیز ہے جو جزا کے بارے میں تمھاری تکذیب کرتی ہے! فراءؒ نے یہی تاویل اختیار کی ہے۔ اس پہلو سے تو یہ تاویل صحیح ہے کہ اس میں الفاظ کے مشہور معنی سے کوئی انحراف نہیں ہے لیکن سیاقِ کلام اور موقع استفہام کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو یہ تاویل صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اول تو دو دو استفہاموں کے ساتھ آنحضرت صلعم کو یہاں مخاطب کرنے کا کوئی پہلو سمجھ میں نہیں آتا۔ دوسرے 'فَمَا يُكَذِّبُ' کا زور اور لفظ 'بَعْدُ' کی تاکید تو یہ تاویل لینے کی صورت میں بالکل ہی مخفی رہ جاتی ہے۔ سیاق اور حسنِ نظم سے اقرب تاویل وہی معلوم ہوتی ہے جو مجاہدؒ نے اختیار کی ہے۔ اس میں لفظ اپنے اصل مفہوم پر باقی بھی رہتا ہے اور اس کے ان دونوں معنوں کے لحاظ سے جو اوپر بیان ہوئے یہاں دو تاویلیں نہایت محکم اور خوبصورت بن جاتی ہیں:"

"ایک یہ کہ اے انسان! ان شہادتوں کے بعد اب کون سی شہادت اور دلیل ہے جو وقوعِ جزا کے بارے میں تیرے عقیدے کی تکذیب کرتی ہے۔ اس صورت میں مخاطب انسان ہو گا اور جو لوگ جزا پر یقین رکھنے والے ہیں ان کو اس کلام سے تقویت اور تائید حاصل ہو گی اور جو لوگ جزا کے بارے میں مذبذب ہوں گے ان کو اس پر غور کرنے کی تحریک ہو گی۔"

"پھر لفظ 'ما' کے حسنِ استعمال پر غور کیجیے۔ اس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ انسان نے انکار کی راہ ہمیشہ تقلید اور ضد کی بنا پر اختیار کی ہے۔ اس راہ میں دلائل نے کبھی اس کا ساتھ نہیں دیا ہے۔ دلائل اور شہادتوں کی اس پوری کائنات میں کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جو جزا کے انکار کے حق میں ہو۔ اس وجہ سے انسانوں کو مخاطب کر کے یہ دعوت دی کہ وہ تقلید سے ہٹ کر دلائل پر غور کریں اور دیکھیں کہ کیا یہاں کوئی ایک چیز بھی ایسی ہے جو جزا کے عقیدے کو غلط ثابت کر رہی ہو۔"

"دوسری تاویل یہ کہ واقعات اور دلائل کی ان شہادتوں کے بعد آخر وہ اوہام اور آرزوئیں کیا ہیں جو جزا کے بارے میں انسان کو فریب میں مبتلا کر رہی ہیں۔"

"اس صورت میں روئے سخن منکرین کی طرف ہو گا۔ قرآن میں اس قسم کے خطاب کی نظیریں

موجود ہیں، مثلاً،

یٰۤاَیُّہَا الۡاِنۡسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الۡکَرِیۡمِ ۙ (الانفطار - ۸۲: ۶) "اے انسان! تجھے تیرے رب کریم کے بارے میں کس چیز نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔"

ان دونوں استفہاموں کا مدعا

ان دونوں استفہاموں کا مدعا مولاناؒ یوں واضح فرماتے ہیں:

اب دونوں استفہاموں کے مدعا پر غور کیجیے:

"پہلے استفہام کا مدعا دونوں تاویلوں کی صورت میں یہ ہوگا کہ مجازات کے اس قدر دلائل سامنے آجانے کے بعد انسان کو چاہیے کہ اس کا اقرار کرے اور ان شبہات سے اپنے کو بچائے جو لوگوں کی طرف سے یا خود اس کے اپنے نفس کی طرف سے اس کے دل میں پیدا ہوں۔"

دوسرے استفہام 'اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِاَحۡکَمِ الۡحٰکِمِیۡنَ' کا مقصد یہ ہے کہ لوگ مجازات کا اقرار کریں اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے۔ گویا پوری بات یوں ہوئی کہ کیا اللہ تعالیٰ تمام حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں ہے! پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ انسانوں کو یونہی چھوڑ دے گا، ان کے اچھوں اور بروں میں کوئی امتیاز نہ کرے گا! 'اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ کَالۡمُجۡرِمِیۡنَ ؕ مَا لَکُمۡ ۟ کَیۡفَ تَحۡکُمُوۡنَ' (القلم - ۶۸: ۳۵-۳۶) (کیا ہم فرماں برداروں کو نافرمانوں کی طرح کر دیں گے، تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسے فیصلے کرتے ہو!)"

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس سورہ میں انسان کے 'احسن تقویم' پر پیدا کیے جانے کا جو ذکر ہے اس کا خاص پہلو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو خیر و شر میں امتیاز بخشا ہے اور اس کے اندر عدل سے محبت اور ظلم سے کراہت ودیعت فرمائی ہے۔ اس چیز کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ کے اندر، جو انسان کا خالق ہے، عدل اور خیر سے محبت اور ظلم و شر سے کراہت بدرجۂ کمال موجود ہو۔ پھر یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ اس کی یہ صفت اس پر واجب کرتی ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں تمام خلق کا انصاف کرے۔ جنھوں نے نیکی کمائی ہو ان کو اچھا صلہ دے اور جنھوں نے بدی کمائی ہو ان کو ان کی بدی کے مطابق سزا دے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ 'اَحۡکَمُ الۡحٰکِمِیۡنَ' نہیں ہے حالانکہ وہ بالبداہت 'اَحۡکَمُ الۡحٰکِمِیۡنَ' ہے۔ اس کی اس صفت سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس سورہ کی تفسیر بیشتر امام فراہیؒ کی عربی تفسیر سورۃ التین سے ماخوذ ہے، صرف بعض مقامات میں ہم نے حذف و اضافہ سے کام لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے یہ تفسیر تمام ہوئی۔ فَالۡحَمۡدُ لِلّٰہِ عَلٰی فَضۡلِہٖ وَاِحۡسَانِہٖ۔

لاہور
۲۴- فروری ۱۹۸۰ء
۷- ربیع الثانی ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

٩٦

العلق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلّق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــ التین ـــــ کی مثنیٰ ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ سابق سورہ میں تاریخی شواہد اور فطرتِ انسانی کی اعلیٰ ساخت سے یہ حقیقت نمایاں فرمائی ہے کہ انسان کے لیے فلاح کی راہ یہ ہے کہ وہ ایمان اور عمل صالح کی زندگی اختیار کرے۔ جو لوگ یہ راہ اختیار نہیں کرتے وہ بالآخر تباہی کے کھڈ میں گر کے رہتے ہیں اور اپنے اس انجام کے وہ خود ہی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اسی کلیہ کی روشنی میں اس سورہ میں قریش اور ان کے لیڈروں کو تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ سیدھی راہ اختیار کرنے کے بجائے بالکل الٹی چال چل رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو اپنے فضل و کرم سے ان کی رہنمائی کے لیے اپنا صحیفۂ ہدایت اتارا لیکن ان کے طغیان کا حال یہ ہے کہ اللہ کا جو بندہ ان کے لیے ایمان و عملِ صالح کی راہ کھول رہا ہے یہ اس کے جانی دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر وہ اپنے رب کی نماز پڑھتا ہے تو یہ شامت زدہ لوگ اس کے بھی روادار نہیں ہیں بلکہ اس سے بالجبر روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ اپنے اس رب کے نام سے، جو سارے جہان کا خالق ہے، تم ان لوگوں کو اس کا فرمان واجب الاذعان سناؤ۔ اسی نے انسان کو خون کے ایک تھکّے سے بنایا اور وہ اس کو دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ ان کو پڑھ کر سناؤ اور اپنے رب کے اس فضلِ عظیم کو یاد دلاؤ کہ اس نے امیوں پر یہ عظیم احسان فرمایا ہے کہ ان کی تعلیم کے لیے اس تعلیم بالقلم کا اہتمام فرمایا اور ان کو وہ باتیں بتائیں جو وہ نہیں جانتے تھے۔

(۶-۸) قریش کے لیڈروں کے طغیان پر سرزنش کہ یہ مال و جاہ کے گھمنڈ میں خدا سے بے نیاز و بے پروا ہو بیٹھے ہیں حالانکہ ایک دن سب کو اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے تیرے رب ہی کی طرف

لوٹنا ہے۔

(۹-۱۳) ان سرکشوں کو خاص طور پر تہدید و وعید جو اللہ کے رسول کو نماز پڑھنے سے روکتے تھے۔ نہایت غضب آلود لہجہ میں یہ سوال کہ اگر اللہ کا بندہ ہدایت پر ہو یا تقویٰ کی بات بتا رہا ہو اور یہ سرکش تکذیب اور اعراض کر رہے ہوں تب ..... ! یعنی اس قسم کے سرکشوں کو اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ ان کی ان حرکتوں کا کیا انجام ہو سکتا ہے !

(۱۴-۱۸) ان سرکشوں پر مزید اظہارِ غضب اور ان کو چیلنج کہ کیا ان کو ہوش نہیں ہے کہ خدا ان کی یہ تمام گستاخانہ حرکتیں دیکھ رہا ہے۔ اگر یہ ان بدتمیزیوں سے باز نہ آئے تو وہ دن آ رہا ہے جب ہم ان کی نابکار اور گنہگار پیشانیوں کو گھسیٹیں گے۔

(۱۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین کہ ان سرکشوں کی بے ہودگیوں کی ذرا پروا نہ کرو۔ سجدہ کرو اور اپنے رب سے قریب تر ہو جاؤ۔

سُوْرَةُ الْعَلَق

مَكِّيَّةٌ ——————— آيات: ۱۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۱۹ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۚ ﴿۱﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ
عَلَقٍ ﴿۲﴾ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ﴿۳﴾ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿۴﴾ عَلَّمَ
الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ﴿۵﴾ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ﴿۶﴾
اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ﴿۷﴾ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ﴿۸﴾ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ
يَنْهٰى ﴿۹﴾ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ﴿۱۰﴾ اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰٓى ﴿۱۱﴾
اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ﴿۱۲﴾ اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۱۳﴾ اَلَمْ يَعْلَمْ
بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ﴿۱۴﴾ كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ﴿۱۵﴾
نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴿۱۶﴾ فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ﴿۱۷﴾ سَنَدْعُ
الزَّبَانِيَةَ ﴿۱۸﴾ كَلَّا ۭ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴿۱۹﴾ السجدۃ ع ۱ ۱۹ ۲۱

ترجمۂ آیات ۱-۱۹ پڑھ اپنے اس خداوند کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا انسان کو خون کے تھکے سے۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا ہی کریم ہے، جس نے تعلیم دی قلم کے واسطہ سے۔ اس نے سکھایا انسان کو وہ کچھ جو وہ نہیں جانتا تھا۔ ۱-۵

ہرگز نہیں، بے شک انسان سرکشی کر رہا ہے اپنے تئیں بے نیاز سمجھ کر۔

بے شک تیرے خداوند ہی کی طرف لوٹنا ہے۔

ذرا دیکھو تو اس کو جو روکتا ہے ایک بندے کو، جب وہ نماز پڑھتا ہے۔ بھلا دیکھو تو، اگر وہ ہدایت پر ہوا یا نیکی کا حکم دینے والا ہوا ..... ! بھلا دیکھو تو، اگر اس نے جھٹلایا اور منہ موڑا .... ! کیا اس نے نہیں جانا کہ اللہ دیکھ رہا ہے! ۹-۱۴

ہرگز نہیں، اگر یہ باز نہ آیا تو ہم اس کو گھسیٹیں گے، چوٹی پکڑ کر، جھوٹی نابکار، گنہگار چوٹی! پس وہ بلا وے اپنی پارٹی کو، ہم بھی بلائیں گے سرہنگوں کو! ۱۵-۱۸

ہرگز نہیں، اس کی بات نہ مان اور سجدہ کر اور قریب ہو جا۔ ۱۹

۱- الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (۱)

'اقرأ' بطریق دعوت سنانے کے معنی میں

لفظ اِقْرَاْ (پڑھو) صرف اسی مفہوم میں نہیں آتا جس مفہوم میں ایک استاد اپنے شاگرد سے کہتا ہے: 'پڑھو!' بلکہ یہ اِقْرَاْ علی الناس یا اُتْلُ علی الناس یعنی دوسروں کو بطریق دعوت سنانے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ لفظ اس مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ان کفار کو مخاطب کر کے جو قرآن کے سنانے میں مزاحم ہوتے تھے، فرمایا ہے:

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (الاعراف - ۷: ۲۰۴)

جب قرآن سنایا جائے تو اس کو توجہ سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَیْنَكَ وَبَیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا (بنی اسرآئیل - ۱۷: ۴۵)

اور جب تم لوگوں کو قرآن پڑھ کر سناتے ہو تو ہم تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ایک مخفی پردہ کھڑا کر دیتے ہیں۔

قرینہ دلیل ہے کہ یہاں یہ لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

ایک نہایت اہم تنبیہ

'بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ' یعنی اس قرآن کو اپنے اس خداوند کے نام سے پڑھ کر سناؤ جو سارے جہان کا خالق ہے۔ یہ ایک نہایت اہم تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ اس کو اپنے خداوند کے فرمان واجب الاذعان کی حیثیت سے پیش کرو تاکہ لوگ یہ جانیں کہ جو کلام ان کو سنایا جا رہا ہے وہ براہِ راست ربِ دو جہان کا کلام ہے۔ نہ یہ داعی کا کلام ہے، نہ کسی اور شخص کا اور نہ یہ کسی سائل کی درخواست ہے کہ رد کر دی تو وہ رد ہو جائے۔ بلکہ یہ اس خالق و مالک کا کلام ہے جس کو حق ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو حکم دے اور لوگوں کا فرض ہے کہ وہ بے چون و چرا اس کی تعمیل کریں، اس کو کوئی معمولی چیز سمجھ کر ٹال دینے، مذاق اڑانے یا اس کی مخالفت کرنے کی جسارت نہ کریں۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ قرآن مجید براہِ راست اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس سے پہلے کسی کتاب کو یہ شرف حاصل نہیں کہ وہ کُل کی کُل اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ الفاظ پر مشتمل ہو۔ اس وجہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم

کو ہدایت ہوئی کہ اس کو اپنے خداوند کے نام سے پیش کرو تاکہ اس کی اصلی عظمت لوگوں پر واضح ہو اور بعد وہ اس کی مخالفت کر کے اپنی شامت نہ بلائیں۔ قدیم صحیفوں میں حضورؐ سے متعلق جو پیشین گوئیاں ہیں ان میں بھی یہ بات واضح فرمائی گئی ہے کہ "آپ جو کچھ کہیں گے خدا کے نام سے کہیں گے اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے انتقام لے گا جو خدا کے نام پر کہی ہوئی اس کی باتوں کو رد کریں گے۔" گویا ان الفاظ سے قرآن کی اصلی عظمت بھی واضح کر دی گئی ہے اور قریش کو ڈرا بھی دیا گیا ہے کہ اگر وہ اس کی مخالفت کرنی چاہتے ہیں تو اپنے اس فعل کے انجام کو دور تک سوچ لیں۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (۲)

یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ پہلی آیت میں تمام کائنات کے پیدا کیے جانے کا ذکر ہوا۔ اب یہ خاص اہتمام کے ساتھ انسان کے پیدا کیے جانے کی طرف اشارہ ہے۔

انسان کی خلقت کے ابتدائی مراحل کی یاددہانی سے مقصود

'عَلَقٌ'، خون کی پھٹکی یا تھکے کو کہتے ہیں۔ انسان کی خلقت کے ابتدائی مراحل کی یاددہانی قرآن میں جگہ جگہ فرمائی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ حج، سورۂ مومنون، سورۂ سجدہ، سورۂ قیامہ اور سورۂ دھر وغیرہ میں۔ ہم ہر جگہ تمام اہم الفاظ کی بھی وضاحت کرتے آرہے ہیں اور اس خاص پہلو کی طرف بھی ہم نے توجہ دلادی ہے جو اس یاددہانی سے پیش نظر ہے۔ اس سے مقصود بالعموم تین حقیقتوں کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے:

- ایک یہ کہ جس خالق کی قدرت و حکمت کا یہ حال ہے کہ وہ خون کی ایک حقیر پھٹکی کو عاقل و مدرک اور سمیع و بصیر انسان بنا کر کھڑا کر دیتی ہے کیا اس کے لیے اس کو دوبارہ پیدا کر دینا مشکل ہو جائے گا۔
- دوسری یہ کہ انسان کی تخلیق میں خالق کی جو قدرتیں اور حکمتیں نمایاں ہیں وہ دلیل ہیں کہ یہ عبث اور بے غایت نہیں پیدا کیا گیا ہے بلکہ اس کے لیے ایک روزِ حساب لازماً آنا ہے اور یہ اپنے اعمال کی جزا یا سزا ضرور پائے گا۔
- تیسری یہ کہ جس انسان کی پیدائش اتنے حقیر اور ذلیل عنصر سے ہوئی ہے اس کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنی پاکی و پاک دامنی یا اپنے حسب و نسب کی حکایت زیادہ بڑھائے اور غرور و استکبار کا مظاہرہ کرے۔

قرآن کے بعض مقامات میں بیک وقت ان تمام حقائق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے لیکن بعض جگہ ان میں سے ایک یا دو مدنظر ہیں۔ یہاں موقع کلام اشارہ کر رہا ہے کہ ان میں سے اوپر کی دو حقیقتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ مقصود یہ بتانا ہے کہ خالقِ کائنات کا کلام خاص اس کے نام سے لوگوں کو پہنچاؤ اور ان کو یاددہانی کرو کہ جس خالق نے انسان کو خون کی پھٹکی سے وجود بخشا ہے وہ قادر ہے کہ اس کو دوبارہ پیدا کر کے اس کے اعمال کا محاسبہ کرے۔

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (۳-۴)

اہل عرب پر عظیم احسان

یہ 'اِقْرَاْ' سابق 'اِقْرَاْ' سے بدل کے طور پر آیا ہے اور یہ اسی حکم کی تاکید ہے جو اوپر دیا گیا ہے البتہ اس میں اظہارِ احسان کا پہلو بھی نمایاں ہے کہ قریش اللہ تعالیٰ کے اس فضلِ عظیم کی قدر کریں کہ اس نے ان کی ہدایت کے لیے تعلیم بالقلم کا اہتمام فرمایا۔ یہ امر واضح رہے کہ اس سے پہلے بنی اسماعیل کے پاس حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ کی تعلیمات سے متعلق اگر کچھ روایات تھیں تو وہ زبانی روایات کی شکل میں تھیں اور امتدادِ زمانہ سے ان کی شکل بھی متغیر ہو چکی تھی۔ دوسرے انبیاءؑ کی تعلیمات بھی زبانی ہی تھیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احکامِ عشرہ تو ضرور لکھ کر دیے گئے لیکن موجودہ تورات کی حیثیت بس قلم بند کی ہوئی روایات کی ہے۔ اس کے اندر یہ امتیاز ناممکن ہے کہ کون سی بات اللہ تعالیٰ کے لفظوں میں ہے اور کون سی بات مجہول راویوں کے الفاظ میں لیکن قرآن کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام فرمایا کہ اس کا ہر لفظ اول تو براہِ راست نطقِ الٰہی ہے، پھر اس کو زبانی روایات پر نہیں چھوڑا گیا بلکہ اس کو عین اللہ تعالیٰ کے لفظوں میں تحریری طور پر محفوظ کیا گیا اور یہ کام، جیسا کہ سورۂ قلم اور سورۂ قیامہ کی تفسیروں میں وضاحت ہو چکی ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت کے تحت کرایا تاکہ کسی حرف میں سرمو کوئی تغیر نہ ہونے پائے۔

مزید احسان اور ایک تنبیہ

اس اہتمامِ خاص کی طرف یہاں 'عَلَّمَ بِالْقَلَمِ' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ عربوں پر ایک عظیم احسان ہوا۔ اوّل تو جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، وحی کو محفوظ کرنے کا یہ اہتمام اس سے پہلے کسی قوم کے لیے بھی نہیں کیا گیا، ثانیاً اہلِ عرب امّی ہونے کے باعث قلم کے استعمال سے اچھی طرح واقف نہ تھے لیکن قرآن کی بدولت انھوں نے اس کے ذریعہ وہ عظیم آسمانی خزانہ محفوظ کیا جو صرف انہی کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لیے سرمایۂ زندگی ہے۔

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (۵)

یہ اسی انعام و احسان کا ایک اور پہلو ہے کہ صرف تعلیم بالقلم ہی کا احسان امیوں پر نہیں کیا بلکہ مزید احسان یہ بھی کیا کہ ان کو وہ باتیں بتائیں اور سکھائیں جو وہ نہیں جانتے تھے۔ لفظ 'انسان' اگرچہ عام ہے لیکن قرآن کے پہلے مخاطب چونکہ امّی عرب ہی تھے اس وجہ سے یہاں اصلاً وہی مراد ہیں۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضلِ خاص سے ان کو جاہلیت کی تاریکی سے نکالنے کے لیے ان پر اپنی یہ کامل ہدایت نازل فرمائی ہے۔ ان پر حق ہے کہ وہ اس کی قدر کریں۔ سورۂ جمعہ میں یہی مضمون یوں آیا ہے:

هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ	وہی ہے جس نے اٹھایا امیوں میں ایک رسول
رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ	انہی میں سے وہ ان کو سناتا ہے اس کی آیتیں
اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ	اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو سکھاتا ہے

اُلْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ (الجمعۃ ۶۲: ۲)

کتاب اور حکمت دراں حالیکہ وہ اس سے پہلے نہایت کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

یہی مضمون، الفاظ کے معمولی تغیر کے ساتھ، البقرۃ: ۱۵۱، البقرۃ: ۱۲۹ اور آل عمران: ۱۶۴ میں بھی گزر چکا ہے اور ہم بقدر کفایت اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

اس آیت میں جہاں اظہارِ احسان ہے وہیں اس کے اندر قریش کے لیے ایک تنبیہ بھی ہے کہ اگر انھوں نے اپنے رب کی اس سب سے بڑی نعمت کی قدر نہ کی تو سوچ لیں کہ ان کی اس ناسپاسی اور اس طغیان کا نتیجہ ان کے سامنے کس شکل میں آ سکتا ہے!

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۙ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى (۶-۷)

یہ ان کے اس رویّہ کا بیان ہے جو انھوں نے اس ہدایت کے معاملے میں اختیار کیا۔ فرمایا کہ وہ اس رحمت کی قدر کرنے کے بجائے نہایت سرکشی کے ساتھ اس کی تکذیب کر رہے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو جو مال و اسباب حاصل ہے اس کو پا کر وہ اب خدا سے اپنے کو بالکل مستغنی خیال کرنے لگے ہیں۔

قریش کے رویہ کا بیان

اس آیت کا آغاز 'كَلَّا' سے جو ہوا ہے اس سے مقصود قریش کی ان سخن سازیوں کی تردید ہے جو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کی تکذیب کے لیے کرتے تھے۔ فرمایا کہ ان کی یہ سخن سازیاں محض حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے ہیں۔ ان کے انکار کی اصل علت ہے تو خدا سے ان کی بے نیازی اور دنیا کی محبت لیکن نمائش یہ کر رہے ہیں کہ گویا ان کے پاس کچھ شبہات ہیں جن کا کوئی تسلی بخش جواب ان کو نہیں مل رہا ہے۔

اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى (۸)

'رُجْعٰى' مصدر ہے 'بُشْرٰى' کے وزن پر، لوٹنے کے معنی میں۔

تنبیہ اور آخرت کی یاددہانی

فرمایا کہ یہ جو کچھ کر رہے ہیں کرنے دو بالآخر ان کو لوٹنا تمھارے رب ہی کی طرف ہے جس سے یہ مستغنی اور بے خوف ہیں۔ اس وقت ان کے طغیان کی حقیقت ان کے سامنے کھل جائے گی۔ اگر ان کو گمان ہے کہ ان کے مزعومہ شرکاء ان کے مولیٰ و مرجع بنیں گے تو ان کے اس وہم سے بھی پردہ اٹھ جائے گا۔ اس دن بادشاہی صرف اللہ کی ہوگی اور اس کی پکڑ سے پناہ دینے والا کوئی نہیں ہوگا۔

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۙ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى (۹-۱۰)

قریش کے لیڈروں کے طغیان کی ایک مثال

یہ ان کے اس طغیان کی ایک مثال بیان ہوئی ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ فرمایا کہ بھلا دیکھو تو اس کو جو ایک بندے کو روکتا ہے جب کہ وہ نماز پڑھتا ہے! یہ قریش کے ان اشقیاء کی طرف اشارہ ہے جو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اور دوسرے مسلمانوں کو بھی نماز سے روکتے تھے۔ بندے پر اس کے رب کا اوّلین حق اس کی بندگی ہے اور بندگی میں اوّلین درجہ نماز کا ہے اس وجہ سے جو بندہ نماز پڑھ رہا ہے وہ اپنے رب کا سب سے بڑا حق ادا کر رہا ہے اور سزاوار ہے کہ سب اس کے اس کام کو عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھیں اور اس کے عمل کو قابلِ تقلید جانیں۔ اگر کوئی اس چیز سے روکنے کی جسارت کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ بندے کو سب سے بڑے فرض اور خدا کے سب سے بڑے حق سے روک رہا ہے۔

'اَرَءَیْتَ' کے اسلوب پر ہم جگہ جگہ لکھ چکے ہیں کہ یہ اس وقت لاتے ہیں جب کسی کی نہایت نامناسب حرکت پر لوگوں کو توجہ دلانی یا اس پر نکیر کرنی ہو۔ جس طرح ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں 'بھلا دیکھا تم نے اس کو، کیا تم نے اس کا حال دیکھا، ذرا اس کو تو دیکھو!'

'اَلَّذِیْ' سے ضروری نہیں کہ کوئی ایک معیّن شخص ہی مراد ہو بلکہ یہ اس طرح کی بے ہودہ حرکت کرنے والوں کو ممثّل کر دینے کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز سے روکنے والا صرف ابوجہل ہی نہیں تھا بلکہ دوسرے گنڈے بھی تھے اور یہ گنڈے صرف حضورؐ ہی کی نمازوں میں مزاحم نہیں ہوتے تھے بلکہ اللہ کے دوسرے بندوں کے ساتھ بھی وہ اسی طرح کی بدتمیزیاں کرتے تھے۔

اَرَءَیْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰىٓ ۙ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى (۱۱-۱۲)

اقدام سے پہلے سوچنے کی ضرورت

یعنی اس مجنونانہ اقدام سے پہلے اسے سوچنا تھا کہ اسلام دشمنی کے جوش میں اسے اتنا اندھا نہیں بن جانا چاہیے کہ اپنے انجام کا بھی کچھ ہوش نہ رہے۔ آخر امکان اس بات کا بھی تو ہے کہ یہ اللہ کا بندہ نیکی اور ہدایت پر ہو اور اپنے قول و عمل سے تقویٰ کی راہ دکھا رہا ہو اور یہ اس کو اس سے روک کر اپنی شامت کو دعوت دے رہا ہو! مطلب یہ ہے کہ آخر کس دلیل سے وہ اپنے کو برحق سمجھ کر وہ کام کرنے اٹھ کھڑا ہوا ہے جو شیطان کے کرنے کا ہے!

اَرَءَیْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى (۱۳)

دوسرے امکان کا حوالہ

یہ اس دوسرے امکان کا حوالہ ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔ یعنی کوئی بتائے کہ اگر یہی تکذیب کرنے والا اور حق سے منہ موڑنے والا ہوا تب ......! یعنی تب تو اس نے اپنے لیے جہنم کا دروازہ خود اپنے ہی ہاتھوں کھولا! یہاں عربیت کا وہ قاعدہ ملحوظ رہے جس کی طرف ہم جگہ جگہ اشارہ کر چکے ہیں کہ بعض مرتبہ شرط کا جواب اس وجہ سے بھی حذف کر دیا جاتا ہے کہ اس کی سنگینی احاطۂ بیان سے باہر ہوتی ہے۔ یہاں اسی وجہ سے جواب محذوف ہے۔ اس کی ایک مثال سورۂ یونس میں بھی موجود ہے۔

رسول کی تکذیب کرنے اور اس کی دعوت سے منہ موڑنے والوں کا انجام سورۂ لیل میں یوں بیان ہوا ہے:

لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ۙ الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۗ (الّیل - ۹۲: ۱۵ - ۱۶)

اس جہنم میں وہی بدبخت خلائق پڑیں گے جنھوں نے جھٹلایا اور منہ موڑا۔

اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى (۱۴)

یعنی کیا اس نے نہیں جانا کہ اللہ تعالیٰ اس کی یہ ساری تعدیاں دیکھ رہا ہے! اگر وہ دیکھ رہا ہے اور ضرور دیکھ رہا ہے تو اس کا انتقام وہ ضرور لے گا۔ وہ عادل، رحیم، عزیز اور غیور ہے۔ اس کے بندے اگر اس کی بندگی سے روکے جائیں تو وہ کس طرح گوارا کر سکتا ہے کہ وہ تماشائی بن کر اس کا تماشا دیکھتا رہے۔

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ (۱۵)

سرکشوں کو تند الفاظ میں وعید

یہ اس قسم کے سرکشوں کو نہایت تند الفاظ میں وعید ہے۔ فرمایا کہ اگر یہ ان حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم ان کی چوٹی پکڑ کر گھسیٹیں گے۔ 'نَاصِيَةٌ' پیشانی اور پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو کہتے ہیں۔ 'سَفْعٌ' کسی چیز کو مٹھی میں پکڑ کر کھینچنے اور گھسیٹنے کے معنی میں آتا ہے۔ سورۂ رحمان میں اسی طرح کے سرکشوں کے بارے میں فرمایا ہے: 'فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ' (الرحمٰن - ۵۵: ۴۱) (پس وہ چوٹیوں اور ٹانگوں سے پکڑ کر جہنم میں پھینک دیے جائیں گے)۔

نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ (۱۶)

یہ 'النَّاصِيَةِ' سے بدل ہے۔ گو دونوں میں معرفہ اور نکرہ کا فرق ہے لیکن نکرہ موصوف ہو تو معرفہ سے بدل پڑ سکتا ہے۔ یہاں اس جوش غضب پر خاص طور سے نگاہ رہے جو اس آیت کے ہر لفظ سے ابل رہا ہے۔ ان نابکاروں کی چوٹی کا ذکر انتہائی غضب آلود الفاظ میں فرمایا: 'نابکار اور گنہگار چوٹی!!' ـــــ چہرہ اور پیشانی آدمی کی ذات کے سب سے اشرف حصے ہیں اس وجہ سے ان سے بعض اوقات اس کی پوری شخصیت تعبیر کر دی جاتی ہے۔ یہاں یہی صورت ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ آدمی کی پیشانی کے لیے سب سے بڑا شرف سجدوں کا نشان ہے۔ اگر کوئی شخص اتنا شقی ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ خود سجدہ نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو سجدہ کرنے سے روکتا بھی ہے تو ایسا نابکار و گنہگار سزاوار ہے کہ اس کی چوٹی پکڑ کر اس کو گھسیٹا اور جہنم میں جھونک دیا جائے۔

فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ۙ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ (۱۷ - ۱۸)

سرکشوں کو چیلنج

یہ ان سرکشوں کو چیلنج ہے کہ اگر کسی کو اپنی قوت و جمعیت پر بڑا ناز ہے تو وہ اپنی ٹولی کو بلائے، ہم بھی اپنے سرہنگوں کو بلائیں گے اور دیکھیں گے کہ ان کے اندر کتنا زور ہے! ـــــ اس چیلنج کا عملی امتحان بعد کے دور میں سب سے پہلے بدر کے معرکہ میں ہوا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ خدا کے سرہنگوں

کے آگے قریش کی پوری قوت و جمعیت کس طرح غبار بن کر اڑ گئی۔

'نَادِی' کے اصل معنی مجلس اور سوسائٹی کے ہیں۔ یہاں مراد وہ افراد ہیں جو کسی رشتۂ عصبیت کے تحت باہم دگر وابستہ ہیں۔ موقع و محل کا لحاظ کر کے اس کا اس کا ترجمہ 'ٹولی' یا پارٹی ہو سکتا ہے۔

'زَبَانِیَۃ' جمع ہے 'زِبنیۃ' کی جس کے اصل معنی تو دفاع کرنے والے کے ہیں لیکن یہ پولیس اور پیادوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ میں نے موقع و محل کا لحاظ کر کے اس کا ترجمہ 'سرہنگوں' کیا ہے۔ گویا یہ خدائی ٹاسک فورس کے وہ کرّوبی ہیں جو خاص نوعیت کی وقتی مہمات پر بھیجے جاتے ہیں۔

كَلَّا ۚ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (۱۹)

نبی صلعم کو ہدایت — فرمایا کہ اگر کوئی سرپھرا تمھیں خدا کے آگے سجدہ کرنے سے روکتا ہے تو اس کی اس حرکت کو خاطر میں نہ لاؤ بلکہ سجدہ کرو اور اپنے رب سے قریب تر ہو جاؤ۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ قرآن نے جگہ جگہ نماز ہی کو صبر و عزیمت اور فتحِ بابِ نصرت کی کلید بتایا ہے اور سجدہ نماز کا سب سے اعلیٰ رکن ہے۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کس کی مجال ہے کہ تمھیں اس چیز سے روک دے جو تمھاری زندگی کی غایت اور خدا سے تعلق کا واحد وسیلہ ہے۔ اگر کوئی ایسی جسارت کرتا ہے تو تم اس کے شر سے خدا کی پناہ چاہو جس کا واحد طریقہ اس کے آگے سربسجود ہونا ہے۔

۲۔ سورہ کا زمانۂ نزول

سورۂ علق کی تفسیر تمام ہوئی۔ اب اس پوری سورہ پر تدبر کی نگاہ ڈال کر اس کے زمانۂ نزول پر غور کیجیے۔ کسی سورہ کے زمانۂ نزول کے متعین کرنے میں سب سے زیادہ مدد اس کے مضمون، اس کے لب و لہجہ اور اس کے خطاب و اندازِ خطاب ہی سے ملتی ہے۔ اس وجہ سے میں نے اس سوال کو تمہیدی مباحث میں چھیڑنے کے بجائے یہاں اٹھایا ہے تاکہ اس مسئلہ میں ہمارے مفسرین کے درمیان جو اختلاف ہے آپ خود اس کا فیصلہ کر سکیں۔

— اس کے زمانۂ نزول سے متعلق مشہور قول تو یہ ہے کہ قرآن میں سب سے پہلے یہی سورہ نازل ہوئی۔ بعض پوری سورہ کو سب سے پہلے نازل ہونے والی قرار دیتے ہیں لیکن اکثریت پوری سورہ کو نہیں بلکہ اس کی صرف ابتدائی پانچ آیتوں کو یہ درجہ دیتی ہے۔ اس قول کی بنیاد صحیحین کی ایک روایت پر ہے۔

— دوسرا قول صاحبِ کشاف کا ہے، جو انھوں نے اپنی تفسیر میں بدیں الفاظ نقل کیا ہے

اکثر المفسرین علی ان الفاتحۃ اول ما نزل ثم سورۃ القلم (اور اکثر مفسرین اس قول پر

ہیں کہ سورۂ فاتحہ سب سے پہلے نازل ہوئی پھر سورۂ قلم)۔ بعض مفسرین نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے لیکن بعض نے اسے اختیار بھی کیا ہے۔

● ایک تیسرا قول یہ ہے کہ سورۂ مدثّر سب سے پہلے نازل ہوئی۔ اس قول کے قائلین بھی غالباً اس کی ابتدائی آیات ہی کو سب سے پہلے نازل ہونے والی قرار دیتے ہوں گے اس لیے کہ باقی سورہ کا لب ولہجہ اور انداز خطاب سورۂ علق کی طرح اتنا تیز و تند ہے کہ اس کو سب سے پہلے نازل ہونے والی سورہ قرار دینا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔

میرے نزدیک یہ پوری سورہ بالکل ہم آہنگ و ہم رنگ ہے۔ اس کی ابتدائی پانچ آیتوں کا مزاج بھی بعد کی آیتوں سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ سورہ کا انداز خطاب و کلام اتنا تیز و تند ہے کہ بالکل پہلی ہی سورہ میں یہ انداز سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں اختیار فرمایا گیا۔ علاوہ ازیں سورہ کے الفاظ میں کوئی قرینہ یا اشارہ ایسا موجود نہیں ہے جس سے اس کا دو الگ الگ قسطوں میں نازل ہونا معلوم ہوتا ہو۔ ھذا ما عندی والعلم عند اللہ وعلمہ احکم و اتم وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

لاہور

۴۔ مارچ ۱۹۸۰ء

۱۶۔ ربیع الثانی ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

٩٧

القدر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلّق اور مطالب کا تجزیہ

قرآن مجید نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے خلق پر جو احسانِ عظیم فرمایا اور تعلیم بالقلم کا اہتمام کر کے اس کی حفاظت اور خلق کی ہدایت کا جو سامان کیا اس کا ذکر سابق سورہ میں بالاجمال ہوا ہے۔ اب اس سورہ کا موضوع ہی نزولِ قرآن ہے۔ اس میں خاص اس مبارک رات کی نشان دہی فرمائی گئی ہے جس میں اس کا نزول ہوا اور ساتھ ہی اس رات کی وہ اہمیت و عظمت بیان ہوئی ہے جو دوسری راتوں کے بالمقابل اس کو حاصل ہے۔ اگرچہ یہ باتیں اسرارِ کائنات سے تعلق رکھنے والی ہیں جن کی پوری حقیقت دوسرے نہیں سمجھ سکتے لیکن حقیقت بہرحال حقیقت ہے جس سے اہلِ علم فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اس کے بیان سے مقصود قرآن کے مخاطبوں کو آگاہ کرنا ہے کہ وہ اس کتاب کے معاملے میں جو رویہ اختیار کریں وہ چند باتوں پر پوری سنجیدگی سے غور کر کے اختیار کریں۔

- ایک یہ کہ یہ کتاب کسی شخص کی ذاتی امنگ کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنی اسکیم کے تحت اور خود اپنے اہتمام میں اتاری ہے۔

- دوسری یہ کہ اس کی نوعیت کسی ہنگامی اور وقتی واقعہ کی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس رات میں اتارا ہے جو نظامِ عالم میں اس کے ہاں امورِ مہمہ کی تقسیم و تنفیذ کے لیے مخصوص ہے۔ یہ ایک ہی رات ہزار راتوں سے بڑھ کر ہے۔ اس میں ابدی قدر و قیمت رکھنے والے امور طے پاتے ہیں۔ اس کی رحمتوں سے جو اپنے کو محروم کر لیتے ہیں وہ پھر کسی اور راہ سے ان کو حاصل نہیں کر سکتے۔

- تیسری یہ کہ اس میں کسی شیطانی چھوت کا کوئی ادنیٰ دخل بھی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس رات کو کامل سلامتی کی رات بنایا ہے جو شیاطین کی گردش، ان کی مداخلت اور ان کی دراندازیوں سے بالکل مامون ہے۔

سُورَةُ الْقَدْرِ

مَكِّيَّةٌ ــــــــــ آیات : ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱ - ۸ إِنَّآ أَنزَلْنٰهُ فِى لَيْلَةِ الْقَدْرِ ﴿١﴾ وَمَآ أَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ
وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم الْقَدْرِ ﴿٢﴾ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ﴿٣﴾ تَنَزَّلُ
الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ ﴿٤﴾ سَلٰمٌ
ع ۵ ۲۲ هِىَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ﴿٥﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۵ ہم نے اسے شبِ قدر میں نازل کیا اور تم کیا جانو کہ شبِ قدر کیا ہے! شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس میں فرشتے اور روح اترتے ہیں، ہر امر میں، اپنے رب کی اجازت کے ساتھ۔ ۱-۴

وہ یکسر امان ہے! یہ صبح کے نمودار ہونے تک ہے ۵

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ (۱)

قرآن کا نزول اللہ تعالیٰ کی اسکیم کے تحت ہوا ہے

سابق سورہ کی آیات ۳-۵ میں اس عظیم احسان کا ذکر ہو چکا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی تعلیم کے لیے قرآن نازل کر کے فرمایا۔ اب اس سورہ میں اسی کا حوالہ، بغیر کسی تمہید کے، دے کر بتایا کہ ہم نے اس کو شب قدر میں نازل کیا ہے۔ 'اَنۡزَلۡنٰهُ' میں ضمیر مفعول اگرچہ بظاہر مرجع کے بغیر آگئی ہے لیکن قرینہ بالکل واضح ہے اس وجہ سے اس طرح ضمیر لانے میں کوئی خرابی نہیں ہے بلکہ غور کیجیے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن میں ایک سورہ کے بعد دوسری سورہ جو آتی ہے تو وہ بغیر کسی تعلق کے نہیں آجاتی بلکہ سابق اور لاحق دونوں میں نہایت گہرا ظاہری اور باطنی ربط ہوتا ہے۔

'اِنَّاۤ' میں جو زور اور تاکید ہے اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ کتاب نہ اس کے پیش کرنے والے کی ذاتی اپج کا نتیجہ ہے نہ اس میں کسی شیطانی تحریک یا وسوسہ کو کوئی دخل ہے، جیسا کہ اس کے مخالفین سمجھتے ہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ نے خاص اپنی جانب سے خلق کی تعلیم و ہدایت کے لیے اتاری ہے، کسی دوسری طاقت کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

لیلۃ القدر

'لَیۡلَةُ الۡقَدۡرِ' سے مراد تقدیر امور یا تقسیم امور کی وہ رات ہے جس کا ذکر سورۂ دخان میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے:

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةٍ مُّبٰرَکَةٍ اِنَّا کُنَّا مُنۡذِرِیۡنَ ۝ فِیۡهَا یُفۡرَقُ کُلُّ اَمۡرٍ حَکِیۡمٍ ۝ اَمۡرًا مِّنۡ عِنۡدِنَا ؕ اِنَّا کُنَّا مُرۡسِلِیۡنَ ۝ (الدخان - ۴۴: ۳-۵)	ہم نے اس (قرآن) کو ایک نہایت مبارک رات میں اتارا ہے۔ بے شک ہم اس کے ذریعہ سے لوگوں کو ہوشیار کرنے والے ہیں۔ اسی رات میں تمام حکیمانہ امور کی تقسیم ہوتی ہے۔ خاص ہمارے حکم سے، بے شک ہم رسول بھیجنے والے تھے۔

اس آیت پر تدبر کی نظر ڈالیے تو اس سے دو باتیں بالکل واضح طور پر نکلتی ہیں:

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مبارک رات خاص اس کام کے لیے مقرر فرمائی ہے جس میں وہ تمام امور، جو اس عالم میں نافذ ہونے والے ہوتے ہیں، ان ملائکہ کے سپرد کیے جاتے ہیں جو ان کو نافذ کرتے ہیں۔

دوسری یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، قرآن کا نزول اور قریش کو انذار ان اہم امور میں سے

ہیں جن کی تنفیذ کا کام اسی مبارک رات میں متعلق فرشتوں کے حوالہ ہوا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی اہم اسکیموں اور عظیم منصوبوں میں سے ہے اور ضروری ہے کہ یہ اپنے آخری مراحل تک پہنچے۔

اس رات میں قرآن کے اتارے جانے سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ پورا قرآن اسی ایک رات میں اتار دیا گیا ہو بلکہ اس کے لیے یہ بھی کافی ہے کہ اس میں آتارے جانے کا فیصلہ ہو گیا، جبریل امینؑ کو یہ کام سپرد کر دیا گیا اور پہلی وحی اسی رات میں نازل ہو گئی۔ اس کے بعد اگر قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوتا رہا اور تیئیس سال کی مدت میں تمام ہوا تو اس بات میں اور اس آیت میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ (۲)

شب قدر کی عظمت: یہ شب قدر کی عظمت و برکت واضح فرمائی ہے کہ وہ ایسی باعظمت و بابرکت رات ہے کہ اس کی عظمتوں اور برکتوں کا کما حقہٗ اندازہ نہیں کرایا جا سکتا۔ اس کی یہ عظمت و برکت اس وجہ سے ہے کہ اس میں اس کائنات سے متعلق بڑے بڑے فیصلے ہوتے ہیں۔ جب اس دنیا کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے وہ دن بڑی اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں جن میں وہ اپنے سال بھر کے منصوبے طے کرتی ہیں تو اس رات کی اہمیت کا اندازہ کون کر سکتا ہے جس میں پوری کائنات کے لیے خدائی پروگرام طے ہوتا اور سارے جہان کا فیصلہ ہوتا ہے۔

اگرچہ یہ فیصلے رحمت اور عذاب، نصب اور عزل، فتح اور شکست دونوں طرح کے امور سے متعلق ہوتے ہیں لیکن چونکہ یہ اس کی طرف سے ہوتے ہیں جس کا ہر فیصلہ عدل، رحم اور حکمت پر مبنی اور جس کا ہر کام اس مجموعی دنیا کی فلاح و بہبود کے لیے ہوتا ہے اس وجہ سے اس رات میں جو کچھ بھی ہوتا ہے مجموعی حیثیت سے مبارک ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ سورۂ دخان کی مذکورہ آیت میں اس رات کو 'لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ' سے تعبیر فرمایا ہے اور آگے اس سورہ میں اس کو ہزار مہینوں سے بڑھ کر قرار دیا ہے اس کی ان صفتوں کے بیان سے مقصود، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، قرآن کے مخالفوں کو یہ آگاہی دینا ہے کہ ایسی عظیم اور مبارک رات میں نازل ہونے والی کتاب کو اگر کسی نے کہانت، نجوم اور شاعری کے قسم کی کوئی چیز سمجھا تو وہ کھرا اور کھوٹا میں امتیاز کرنے سے قاصر رہا۔ اس مبارک رات میں شیطانی القاء کی تمام راہیں مسدود ہوتی ہیں۔ اس میں وحی کا ابرِ نیساں برستا ہے جس کا ایک ایک قطرہ ایک گوہر گراں مایہ ہوتا ہے۔

لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ (۳)

لیلۃ القدر کی برکت: یہ اس رات کی برکت بیان ہوتی ہے کہ یہ ایک رات ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے۔ یہ بہتری، ظاہر

ہے کہ حصولِ مقصد کے اعتبار سے ہے۔ جس طرح اس مادی دنیا میں فصلوں، موسموں اور اوقات کا اعتبار ہے اسی طرح روحانی عالم میں بھی ان کا اعتبار ہے۔ جس طرح خاص خاص چیزوں کے بونے کے لیے خاص خاص موسم اور مہینے ہیں، ان میں آپ بوتے ہیں تو وہ پروان چڑھتی اور مثمر ہوتی ہیں اور اگر ان موسموں اور مہینوں کو آپ نظر انداز کر دیتے ہیں تو دوسرے مہینوں کی طویل سے طویل مدت بھی ان کا بدل نہیں ہو سکتی اسی طرح روحانی عالم میں بھی خاص خاص کاموں کے لیے خاص موسم اور خاص اوقات و ایام مقرر ہیں۔ اگر ان اوقات و ایام میں وہ کام کیے جاتے ہیں تو وہ مطلوبہ نتائج پیدا کرتے ہیں اور اگر وہ ایام و اوقات نظر انداز ہو جاتے ہیں تو دوسرے ایام و اوقات کی زیادہ سے زیادہ مقدار بھی ان کی صحیح قائم مقامی نہیں کر سکتی۔ اس کو مثال سے یوں سمجھیے کہ جمعہ کے لیے ایک خاص دن ہے۔ روزوں کے لیے ایک خاص مہینہ ہے۔ حج کے لیے خاص مہینہ اور خاص ایام ہیں۔ وقوفِ عرفہ کے لیے معیّنہ دن ہے۔ ان تمام ایام و اوقات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی عبادتیں مقرر کر رکھی ہیں جن کے اجر و ثواب کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے لیکن ان کی ساری برکتیں اپنی اصلی صورت میں تبھی ظاہر ہوتی ہیں جب یہ ٹھیک ٹھیک ان ایام و اوقات کی پابندی کے ساتھ عمل میں لائی جائیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ برکت فوت ہو جاتی ہے جو ان کے اندر مضمر ہوتی ہے۔

یہی حال لیلۃ القدر کا ہے۔ یہ بڑی برکتوں اور رحمتوں کی رات ہے۔ بندہ اگر اس کی جستجو میں کامیاب ہو جائے تو اس ایک ہی رات میں خدا کے قرب کی وہ اتنی منزلیں طے کر سکتا ہے جتنی ہزار راتوں میں نہیں کر سکتا۔ 'ہزار راتوں' کی تعبیر بیانِ کثرت کے لیے بھی ہو سکتی ہے اور بیانِ نسبت کے لیے بھی لیکن مدعا کے اعتبار سے دونوں میں کوئی بڑا فرق نہیں ہوگا۔ مقصود یہی بتانا ہے کہ اس رات کے پردوں میں روح و دل کی زندگی کے بڑے خزانے چھپے ہوتے ہیں۔ خوش قسمت ہیں وہ جو اس کی جستجو میں سرگرم رہ سکیں اور اس کو پانے میں کامیاب ہو جائیں!

لیلۃ القدر کی تعیین میں اختلاف

اس رات سے متعلق یہ بات تو مسلّم ہے کہ اس میں قرآن کے نزول کا آغاز ہوا اور یہ بات بھی مسلّم ہے کہ یہ رمضان کی کوئی رات ہے۔ دوسرے مقام میں یہ تصریح ہے کہ قرآن رمضان کے مہینے میں نازل ہوا: 'شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ' (البقرۃ - ۲ : ۱۸۵) (رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا) رہا یہ سوال کہ یہ رمضان کی کون سی تاریخ ہے تو روایات کے اختلاف کے سبب سے اس کا کوئی قطعی جواب دینا مشکل ہے بس زیادہ سے زیادہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ رمضان کے آخری عشرہ میں اس کے ہونے کا گمان غالب ہے۔

اس باب میں جو روایات وارد ہیں ان کے اختلاف کے باعث بعض لوگوں نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ یہ رمضان ہی کے مہینہ کے ساتھ مخصوص ہے یا کسی دوسرے مہینہ میں بھی اس کے پائے

جانے کا امکان ہے؛ اسی طرح یہ سوال بھی اٹھایا گیا ہے کہ اس کی میعاد ایک سال ہے یا اس سے مختلف بھی ہو سکتی ہے؛ ان سوالوں کے اطمینان بخش جواب کا انحصار تمام روایاتِ باب کی تحقیق و تنقید پر ہے اور یہ ایک طویل بحث ہے جس کے لیے یہاں گنجائش نہیں ہے۔ ہم نے ان کی طرف یہاں صرف اس مقصد سے اشارہ کر دیا ہے کہ اہلِ علم ان پر نگاہ رکھیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ہم کو حدیث پر اپنی پیشِ نظر کتاب لکھنے کا موقع عنایت فرمایا تو شاید اس میں یہ سوالات زیرِ بحث آئیں۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ (۴)

اس رات کا اصل کام

یہ اس رات کے تقدیرِ امور یا تقسیمِ امور کی رات ہونے کی وضاحت ہے۔ فرمایا کہ اس میں ملائکہ اور جبریلِ امینؑ ان تمام معاملات میں جو زمین میں نافذ ہونے والے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کی منظوری لے کر اترتے ہیں۔ یہی بات سورۂ دخان میں 'فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۙ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا' (الدخان - ۴۴: ۴-۵) (اسی رات میں تمام حکیمانہ امور کی تقسیم ہوتی ہے خاص ہمارے حکم سے) کے الفاظ میں ارشاد ہوئی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت جو امور طے کر رکھے ہیں وہ اس رات میں تقسیم ہوتے ہیں اور متعلق فرشتے اللہ تعالیٰ کے اذن (SANCTION) سے ان کی تنفیذ کے لیے زمین میں اترتے ہیں۔ لفظ 'الرُّوْحُ' اس آیت میں قرینہ دلیل ہے کہ حضرت جبریل امینؑ کے لیے ہے۔ چونکہ ملائکہ کے زمرے میں ان کا درجہ بہت اونچا ہے اس وجہ سے ان کا ذکر خاص طور پر ہوا۔

سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۵)

اس رات میں شیاطین پابند ہوتے ہیں

یہ اس رات کے اس پہلو کی وضاحت ہے جس کا ذکر اوپر 'خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔ فرمایا کہ یہ رات کلیتہً امان ہی امان ہے اور اس کی یہ برکت طلوعِ فجر تک محیط ہے۔

'سَلٰمٌ' میرے نزدیک مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ پورا جملہ 'هِيَ سَلٰمٌ' ہے۔ پوری توجہ خبر پر مرکوز کر دینے کے لیے مبتداء کو حذف کر دیا ہے۔ جس طرح 'زَيْدٌ عَدْلٌ' میں لفظ 'عَدْلٌ' میں مبالغہ کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے اسی طرح 'سَلٰمٌ' میں بھی مبالغہ کا مفہوم ہے۔ میں نے ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھا ہے۔

لفظ 'سَلٰمٌ' میں یوں تو ہر قسم کی آفات سے محفوظ ہونے کی ضمانت ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس مبارک رات میں شیاطین کی ہر قسم کی دوادوش پر پابندی لگا دی جاتی ہے۔ جس طرح وحی کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمایا کہ ملاءِ اعلیٰ کے حدود میں ان کی مداخلت کی تمام راہیں مسدود کر دی گئیں، جس کی تفصیل قرآن میں موجود ہے، اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ لیلۃ القدر

میں شیاطین آسمانی کرفیو کے تحت ہوتے ہیں اور ان پر یہ کرفیو طلوع فجر تک نافذ رہتا ہے۔ جس کے سبب سے نہ وہ اس اہم رات کے اسرار معلوم کرنے کے لیے کوئی نقل و حرکت کر سکتے اور نہ شب مبارک کی برکتوں میں کوئی خلل پیدا کر سکتے۔ هذا ما عندی والعلم عند الله وعلمه اکمل واتم۔

لاہور

۱۳- مارچ ۱۹۸۰ء

۲۵- ربیع الثانی ۱۴۰۰ھ

تدبّرِ قرآن

۹۸

البيّنة

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ——— القدر ——— کی مثنیٰ ہے۔ اس میں قرآن کی عظمت بیان ہوئی ہے اور اس میں یہ واضح فرمایا گیا ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین دونوں گٹھ جوڑ کر کے اس وقت قرآن کی تکذیب کے لیے جو اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ قرآن کے باب میں انھیں کوئی واقعی شبہ ہے بلکہ اس کا سبب محض ان کا استکبار ہے۔ وہ ظاہر تو یہ کر رہے ہیں کہ اگر ان کو کوئی کھلی ہوئی نشانی دکھا دی جائے تو وہ اس کو مان لیں گے لیکن یہ محض ان کا فریب ہے۔ کوئی بڑے سے بڑا معجزہ بھی ان کو قائل کرنے والا نہیں بن سکتا۔ یہ اس کو دیکھ کر بھی اپنے استکبار پر پردہ ڈالنے کے لیے کوئی بات بنا ہی لیں گے۔ اہل کتاب آج مشرکین کی جو پشت پناہی اور قرآن کی تکذیب کے لیے ان کو جو اعتراضات القا کر رہے ہیں اگر اپنی تاریخ کے آئینہ میں اپنے کردار کو دیکھیں تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جس طرح کے معجزے کا مطالبہ وہ آج کر رہے ہیں اسی قسم کے معجزوں کا مطالبہ ان کے پیشرووں نے اپنے زمانے میں اپنے پیغمبروں سے کیا اور وہ ان کو دکھا بھی دیے گئے لیکن سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی انھوں نے اللہ کی کتاب اور اس کے دین کا تیا پانچا کر کے رکھ دیا۔ ایمان لانے کے لیے اصل چیز اللہ کی خشیت ہے۔ جن کے اندر یہ خشیت موجود ہے وہ اس کتاب پر ایمان لائیں گے۔ رہے وہ جن کے دل پتھر ہو چکے ہیں وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں خواہ ان کو کتنی ہی بڑی نشانی دکھا دی جائے۔

ب۔ سورہ کا زمانۂ نزول

بعض مفسرین نے اس سورہ کو مدنی قرار دیا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ ان لوگوں کا ذہن اس طرف اس وجہ سے گیا کہ اس میں مشرکین مکہ کے ساتھ اہل کتاب کے رویہ کا بھی حوالہ ہے لیکن محض اتنی بات کسی سورہ کو مدنی قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔ سورتوں کے پچھلے گروپ آپ کی نظروں سے اگر گزر چکے ہیں تو آپ نے دیکھا ہو گا کہ ہر گروپ کی آخری مکی سورتوں

میں مشرکین مکہ کے رویہ کے ساتھ ساتھ اہل کتاب کے رویے کی طرف بھی اشارے ہوئے ہیں جو بالتدریج خفی سے جلی ہوتے چلے گئے ہیں[1] اس کی وجہ یہ ہے کہ مکہ میں ایک نئی رسالت اور ایک نئی دعوت کا معاملہ ایسا معاملہ نہیں تھا جس سے اہل کتاب، بالخصوص یہود، بالکل غیر متعلق رہتے۔ ان کے علماء اپنے صحیفوں کی پیشین گوئیوں کی بنا پر ایک نئی بعثت کا اندیشہ پہلے سے رکھتے تھے پھر وہ اس نئی دعوت کو نظرانداز کیسے کر سکتے تھے۔ البتہ شروع شروع میں انھوں نے اس کی مخالفت میں کوئی عملی حصہ اس وجہ سے نہیں لیا کہ قریش کی مخاصمت کا انداز دیکھ کر انھوں نے خیال کیا کہ اس دعوت کو ختم کر دینے کے لیے یہ خود ہی کافی ہیں لیکن جب دیکھا کہ دعوت قریش کے علی الرغم دبنے کے بجائے بڑھ ہی رہی ہے تو انھوں نے بھی ان کی پشت پناہی شروع کر دی۔ اول اول تو انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ کچھ اعتراضات و سوالات قریش کو سکھائے تاکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھیں اور آپ کو زچ کرنے کی کوشش کریں۔ پھر اپنی مذہبی برتری کے زعم میں انھوں نے نبی کی شناخت کے لیے بعض خود ساختہ علامتیں مقرر کیں اور قریش کو مشورہ دیا کہ وہ نئے مدعی نبوت کو ان کی بتائی ہوئی کسوٹی پر پرکھیں۔ مثلاً انھوں نے بتایا کہ ہمارے صحیفوں میں تو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ہم اس وقت تک کسی نبی کی نبوت کی تصدیق نہ کریں جب تک اس کی پیش کی ہوئی قربانی کو کھانے کے لیے آسمان سے آگ نہ اترے۔ قرآن نے ان کی اس طرح کی شرارتوں کا جگہ جگہ حوالہ دیا ہے۔ اور یہ کام انھوں نے دعوت کے ابتدائی دور ہی سے شروع کر دیا تھا اس وجہ سے جابجا مکی سورتوں میں بھی ان کی طرف اشارہ ہوا۔ اس سورہ میں بھی اسی نوعیت سے قریش کے ساتھ ان کے گٹھ جوڑ کا ذکر فرمایا۔

ج۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۳) پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین قریش کے جو اشرار تمھارے درپے مخالفت ہیں، یہ گمان نہ کرو کہ کسی قیمت پر بھی وہ اپنی ہٹ سے باز آ جائیں گے اور اس قرآن کو مان لیں گے۔ یہ تو اسی وقت مانیں گے جب آسمان سے کوئی فرشتہ صحیفے پڑھتا ہوا اترے اور وہ اس کو دیکھیں کہ وہ صحیفے لیے اتر رہا ہے۔

(۴-۵) اس کے بعد اہل کتاب پر تعریض ہے کہ یہ ناہنجار لوگ آج رسول کی مخالفت کے جوش

---

[1] ہم نے اپنی اس کتاب میں ان کی طرف ہر جگہ توجہ دلا دی ہے۔

ہیں قریش کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں حالانکہ ان کی بدبختی کا یہ حال ہے کہ انھوں نے بڑے بڑے معجزے دیکھے لیکن پھر بھی ان کو اللہ کے دین پر قائم رہنا نصیب نہ ہوا بلکہ یہ سب کچھ دیکھ کر اندھے بنے رہے اور دین کی ان اساسات پر بھی متفق نہ رہ سکے جن میں کسی اختلاف کی بھی گنجائش نہیں تھی۔

(۶-۸) آخر میں اہل کتاب اور قریش دونوں کے استکبار پر ضرب لگائی ہے کہ یہ اپنے کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اس وجہ سے رسول کی دعوت کو خاطر میں نہیں لا رہے ہیں حالانکہ یہ بدترین خلائق ہیں۔ یہ جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔ اللہ کے نزدیک درجہ صرف ان بندوں کے لیے ہے جو غیب میں رہتے اپنے رب پر ایمان لائیں اور عمل صالح کریں نہ کہ ان مغروروں کے لیے جو سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لیں گے تب مانیں گے۔

سُوْرَةُ الْبَيِّنَةِ

مَكِّيَّةٌ ——— آیات : ۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ آیات ۱-۸
مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ﴿۱﴾ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا
صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ﴿۲﴾ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ﴿۳﴾ وَمَا تَفَرَّقَ
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ﴿۴﴾
وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ
حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ
الْقَيِّمَةِ ﴿۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ
فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ﴿۶﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ
الْبَرِيَّةِ ﴿۷﴾ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ
وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ﴿۸﴾ ع ۸ ۲۳

ترجمۂ آیات ۱-۸

اہل کتاب اور مشرکین میں سے جنھوں نے (قرآن کا) انکار کیا وہ اپنی ہٹ سے

باز آنے والے نہیں ہیں، یہاں تک کہ ان کے پاس کھلی ہوئی نشانی آجائے ــــ یعنی اللہ کی طرف سے ایک فرستادہ، پاکیزہ اوراق پڑھتا ہوا، جس میں صاف احکام لکھے ہوئے ہوں۔ ۱-۳

حالانکہ اہل کتاب کھلی ہوئی نشانی آجانے کے بعد ہی اختلاف میں پڑے۔ ان کو حکم یہی ہوا تھا کہ وہ اللہ ہی کی بندگی کریں، اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ، بالکل یکسو ہو کر اور نماز کا اہتمام رکھیں اور زکوٰۃ دیں اور یہی سیدھی ملّت کا دین ہے۔ ۴-۵

بے شک اہل کتاب اور مشرکین میں سے جنھوں نے کفر کیا، وہ دوزخ کی آگ میں پڑیں گے، اسی میں ہمیشہ رہنے کے لیے۔ یہی لوگ بدترین خلائق ہیں! ۶

بے شک جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے وہ بہترین خلائق ہیں۔ ان کا صلہ ان کے رب کے پاس ہمیشگی کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ خدا ان سے راضی وہ خدا سے راضی! یہ صلہ اس کے لیے ہے جو اپنے خداوند سے ڈرا۔ ۷-۸

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ مُنْفَکِّیْنَ حَتّٰی تَاْتِیَھُمُ الْبَیِّنَۃُ (۱)

اہل کتاب اور مشرکین کا ضدی گروہ

یہاں 'لَمْ یَکُنْ' فعل ناقص کے مفہوم میں نہیں بلکہ جس طرح 'وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا' (النسآء - ۴ : ۱۷) (اللہ علیم و حکیم ہے) میں ہے اسی طرح یہاں بھی فعل تام کے مفہوم میں ہے اس وجہ سے اس کا ترجمہ یوں ہونا چاہیے کہ اہل کتاب اور مشرکین میں سے جنھوں نے قرآن اور رسول کا کفر کیا وہ اپنی ہٹ سے باز آنے والے نہیں ہیں جب تک کھلی نشانی نہیں دیکھ لیں گے۔

'کَفَرُوْا' کا مفعول یہاں، قرینہ کی وضاحت کی بنا پر محذوف ہے۔ یعنی جنھوں نے قرآن اور رسول کا انکار کر دیا ہے۔

'اھل کتاب' اور 'مشرکین' کا ذکر یہاں بحیثیت دو گروہوں کے ہے جو اس دور میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں پیش پیش تھے ۔ مشرکین علانیہ طور پر اور اہل کتاب، جیسا کہ ہم نے تمہید میں اشارہ کیا، خفیہ طور پر۔ لفظ 'مشرکین' جب یوں آتا ہے جس طرح یہاں آیا ہے تو مشرکین قریش یا مشرکین بنی اسمٰعیل کے لیے بطور عَلَم آتا ہے۔ اس استعمال کی مثالیں قرآن میں متعدد نہایت واضح موجود ہیں۔

'مِنْ' یہاں اپنے معروف استعمال یعنی تبعیض ہی کے لیے ہے اس لیے کہ یہاں مشرکین اور اہل کتاب میں سے اس گروہ کا کردار بیان ہو رہا ہے جو اسلام کی مخالفت کے لیے اندھا بہرا بن کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ان دونوں گروہوں میں سب ایک ہی طرح کے نہیں تھے بلکہ ان میں ایسے سنجیدہ افراد بھی تھے جو اسلام لائے اور اگر اسلام نہیں لائے تو کم از کم اس معاملے میں وہ میانہ رَو یا غیر جانبدار رہے۔ قرآن میں اس طرح کے لوگوں کا ذکر تحسین کے ساتھ ہوا ہے۔ یہاں 'مِن' اسی فرق کو ظاہر کرنے کے لیے آیا ہے کہ یہ صرف اس گروہ کا کردار بیان ہو رہا ہے جو اپنے مطلوبہ معجزات دیکھے بغیر کوئی بات سننے سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

ضدیوں کا مطالبہ

'حَتّٰی تَاْتِیَھُمُ الْبَیِّنَۃُ' یہ ان ضدیوں کی وہ شرط بیان ہوئی جس کے پورے ہوئے بغیر وہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز آنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ 'بَیِّنَۃٌ' کے معنی کھلی ہوئی نشانی کے ہیں۔ 'کھلی ہوئی نشانی' سے ان کی مراد یہ تھی کہ ان کو کوئی ایسا واضح معجزہ دکھایا جائے جس کے انکار کی کوئی

گنجائش باقی نہ رہے۔ ان کے اس مطالبہ کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ ہم بعض مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے ان کے ذہن کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

سورۂ نساء میں اہل کتاب کے مطالبہ کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے:

یَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَیْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً۔ (النسآء - ۴ : ۱۵۳)	اہل کتاب تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم ان پر آسمان سے براہ راست ایک کتاب اتارو تب وہ مانیں گے۔ ان کا یہ مطالبہ کچھ عجیب نہیں۔ موسیٰ سے تو انھوں نے اس سے بھی بڑا مطالبہ کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اللہ کو کھلم کھلا دکھاؤ تب ہم مانیں گے۔

اسی طرح مشرکین سے متعلق قرآن نے سورۂ مدثر میں بیان فرمایا ہے:

بَلْ یُرِیْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ یُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً۔ (المدّثّر - ۷۴ : ۵۲)	بلکہ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کو کھلے ہوئے صحیفے پکڑائے جائیں۔

یعنی وہ اس قرآن کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں جو وحی کے ذریعے سے صرف ایک شخص پر نازل ہوتا ہے بلکہ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ آسمان سے ان میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ صحیفے اتریں۔ تب وہ یقین کریں گے کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے کتاب اتاری ہے۔

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ فِیْهَا كُتُبٌ قَیِّمَةٌ (۲-۳)

یہ 'اَلْبَیِّنَةُ' کی وضاحت ہے کہ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم سے منوانا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی فرشتہ براہ راست پاک اور اچھوتے اوراق پڑھتا ہوا اترے جس میں نہایت واضح اور قطعی احکام مرقوم ہوں۔

'رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ' کے الفاظ سے واضح ہے کہ ان کا منشا یہ تھا کہ انسانوں میں سے اٹھا ہوا کوئی رسول جو مدعی ہو کہ اس پر وحی آتی ہے، ان کو مطلوب نہیں ہے بلکہ وہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والا کوئی فرشتہ چاہتے ہیں جو پاک اور اچھوتے اوراق پڑھتا ہوا اترے۔

'صُحُفًا مُّطَهَّرَةً'۔ 'صَحِیْفَةٌ' ورق کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ فرشتہ کی بات بھی اس صورت میں باور کریں گے جب وہ خدا کی طرف سے صرف خبر دینے والا نہ ہو بلکہ جو کچھ لائے، لکھے ہوئے اوراق میں لائے اور اس کو پڑھ کر سنائے۔ ان اوراق کے لیے 'مُطَهَّرَةٌ' کی صفت میں یہ مضمون مضمر ہے کہ یہ اوراق بالکل پاکیزہ اور اچھوتے ہوں، خدا اور فرشتہ کے سوا کسی جن و بشر نے ان

کو ہاتھ نہ لگایا ہو۔

'فِیْهَا كُتُبٌ قَیِّمَةٌ'۔ مذکورہ شرائط کے اوپر ایک مزید شرط یہ بھی کہ ان اوراق میں ادھر ادھر کی بہت سی سرگزشتیں اور حکایتیں نہ ہوں بلکہ سیدھے سیدھے قطعی اور واضح احکام ہوں کہ وہ ان کو سن کر بے تکلف جان لیں کہ ان کا رب ان کو کن باتوں کا حکم دیتا ہے اور کن باتوں سے روکتا ہے۔

'کُتُبٌ' جمع ہے 'کِتَابٌ' کی۔ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں اس کی وضاحت ہو چکی ہے[1]۔ وہاں ہم نے بتایا ہے کہ یہ لفظ قرآن میں شریعت کے احکام کے معنی میں بھی آیا ہے۔ یہاں یہ اسی معنی میں ہے۔

'قَیِّمَةٌ' کے معنی سیدھے، واضح اور قطعی کے ہیں۔ یعنی ہمیں قطعی احکام بتلائے جائیں، غیر متعلق باتیں سننے کے خواہش مند ہم نہیں ہیں۔ اس لفظ میں ان شریر لوگوں کی طرف سے قرآن مجید پر جو تعریض ہے وہ اہل ذوق خود سمجھ سکتے ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح تورات کے احکام عشرہ الواح میں لکھ کر دیے گئے تھے اسی طرح واضح احکام، اوراق میں لکھے ہوئے لے کر فرشتہ آسمان سے ہمارے اوپر اترے تب ہم مانیں گے کہ یہ خدا کی اتاری ہوئی کتاب ہے۔

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنَةُ (۴)

اہل کتاب القاء مطالبہ جواب

یہ مطالبہ چونکہ اہل کتاب کی ایجادات میں سے تھا جو انھوں نے قریش کے لیڈروں کو اس لیے سکھایا تھا کہ وہ اس کو قرآن کے خلاف استعمال کریں، اس وجہ سے قرآن نے اس کا جواب انہی کو سامنے رکھ کر دیا۔ فرمایا کہ ان کو ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ دکھا بھی دیا جائے جب بھی یہ ماننے والے اسامی نہیں ہیں۔ ان کی تاریخ شاہد ہے کہ ان کو جو شریعت دی گئی تھی وہ نہایت کھلے ہوئے معجزات کے جلو میں دی گئی تھی، ان کے پیغمبر، حضرت موسیٰؑ نے قدم قدم پر ان کو قدرتِ خداوندی کے وہ کرشمے دکھائے جو کسی قوم کو ان سے پہلے نہیں دکھائے گئے، تورات کے احکام عشرہ ان کو الواح میں لکھ کر دیے گئے۔ ان سے شریعت کا عہد لیتے وقت پہاڑ ان کے اوپر چھتری کی طرح اڑھا دیا گیا، ان کے لیے صحرا میں سایہ اور من و سلویٰ کا انتظام کیا گیا، پہاڑ سے ان کے لیے اکٹھے بارہ چشمے جاری کر دیے گئے لیکن یہ سارے کرشمے اور معجزے دیکھنے کے بعد شریعتِ الٰہی کے ساتھ وفاداری کا حق انھوں نے یوں ادا کیا کہ سامری سے ایک بچھڑا بنوا کر اس کی پوجا شروع کر دی کہ یہی ہمارا معبود ہے۔ ان کے اسی فساد سے ان کے اندر سب سے پہلے انتشار پیدا ہوا جو امتدادِ زمانہ کے ساتھ بڑھتا گیا یہاں تک کہ اختلاف کے سوا کوئی چیز بھی ان کے درمیان مشترک نہیں رہ گئی۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَیُقِیْمُوا

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن۔ جلد اوّل، صفحہ: ۴۲

الصَّلٰوۃَ وَیُؤۡتُوا الزَّکٰوۃَ وَذٰلِکَ دِیۡنُ الۡقَیِّمَۃِ (۵)

یہ اس تفرق کی مثال ہے جس کا ذکر اوپر کی آیت میں ہوا ہے۔ فرمایا کہ دین کی بنیادی چیزوں میں سے کوئی چیز بھی ایسی باقی نہیں رہ گئی ہے جس پر یہ قائم و استوار ہوں بلکہ ہر چیز میں ان کی راہیں الگ الگ ہو گئیں یہاں تک کہ اپنے اس اختلاف کی بدولت وہ ان کو ضائع کر بیٹھے۔

ان کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے توحید کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ ہی کی بندگی کریں اسی کے لیے اطاعت کو خالص کر کے، بالکل یکسو ہو کر، لیکن انھوں نے دین کی یہ بنیادی تعلیم برباد کر دی۔ اپنے پیغمبر کی موجودگی میں انھوں نے ایک بچھڑے کی پرستش کی، عزیر کو ابن اللہ اور اپنے علماء و فقہا کو 'اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ' بنایا۔ جادو اور اعمالِ سفلیہ اختیار کر لیے یہاں تک کہ دوسری قوموں کے بتوں کی بھی پوجا کی جس پر ان کے نبیوں نے نہایت دردانگیز الفاظ میں نوحہ کیا۔

اسی طرح انھیں نماز اور زکوٰۃ کا بھی حکم دیا گیا تھا لیکن نماز انھوں نے جیسا کہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں وضاحت ہو چکی ہے، بالکل ہی ضائع کر دی یہاں تک کہ تورات میں اس کا ذکر بھی باقی نہیں رہا۔ تورات میں قربانی کا ذکر آتا ہے لیکن نماز کا ذکر بمنزلہ صفر ہے۔ یہی حال زکوٰۃ کا بھی ہوا۔ رسمی طور پر تو وہ باقی رہی لیکن اس کے اصلی حقدار فقراء و غرباء کی جگہ بنی لاوی کے علماء و فقہاء بن گئے اور ان کے علماء و فقہاء کی خست و نجاست کا جو حال رہا ہے اس کا اندازہ کرنا ہو تو انجیلوں اور دوسرے نبیوں کے صحیفوں میں ان کی زرپرستی کی جو تصویر کھینچی گئی ہے اس کو ملاحظہ فرمائیے۔

'وَذٰلِکَ دِیۡنُ الۡقَیِّمَۃِ' یہ جواب ہے ان کے اس مطالبہ کا جو اوپر 'فِیۡہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ' کے الفاظ میں نقل ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ فی الواقع سیدھے اور واضح دین ہی کے طالب ہیں تو یہ احکام تو انھیں سیدھے اور فطری دین ملتِ ابراہیم کے احکام کی حیثیت سے دیے گئے تھے تو انھوں نے آخر ان کو کیوں برباد کیا؟ اور یہ قرآن بھی ان کو انہی واضح اور قطعی باتوں کی طرف بلا رہا ہے تو اس کی مخالفت کے درپے کیوں ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب جو سوالات اٹھا رہے ہیں یہ محض ان کے حسد کی پیداوار ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح یہ خود اپنے کو اللہ کی شریعت سے محروم کیے بیٹھے ہیں اسی طرح دوسرے بھی اس سے محروم ہی رہیں۔

دین قیم 'ذٰلِکَ دِیۡنُ الۡقَیِّمَۃِ' یہ اصل میں 'ذٰلِکَ دِیۡنُ الۡمِلَّۃِ الۡقَیِّمَۃِ' ہے۔ 'قَیِّمَۃ' کا موصوف یہاں حذف ہو گیا ہے اور اس قسم کا حذف، قرینہ موجود ہو تو عربی میں معروف ہے۔ اس اسلوبِ بیان سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ دین کی یہی وہ بنیادی تعلیمات ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کے خاندان کی دونوں شاخوں کو ان کے جدِّ اعلیٰ کی وراثت کی حیثیت سے منتقل ہوئیں، تو حیف ہے، اگر انہی کی مخالفت کے لیے دونوں شاخیں گٹھ جوڑ کرنے کی کوشش کریں۔

یہ امر واضح رہے کہ ملتِ ابراہیم کا تعارف قرآن میں جگہ جگہ 'مِلَّةً قَيِّمَةً' کی صفت سے کرایا گیا ہے۔ اس ملت پر مفصل بحث اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ یہاں ہم صرف ایک آیت کے حوالہ پر اکتفا کریں گے۔ فرمایا ہے:

قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۚ دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۚ (الانعام - ۶ : ۱۶۱)

کہہ دو، میرے رب نے میری رہنمائی ایک سیدھی راہ کی طرف فرمائی ہے۔ فطری دین، ملتِ ابراہیم کی طرف یکسو ہو کر۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ أُولَٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ (۶)

اہلِ کتاب اور مشرکین کے کبر و غرور پر ضرب

یہ ان لوگوں کا انجام بیان فرمایا ہے جو قرآن کی تکذیب پر اڑے ہوئے ہیں، خواہ وہ اہلِ کتاب میں سے ہوں یا مشرکین سے۔ ساتھ ہی اس میں ان کے اس کبر و غرور پر بھی ضرب لگائی ہے جو اس تکذیب کا سبب بنا۔

فرمایا کہ جو بھی قرآن کی تکذیب کر کے کفر کے مرتکب ہوئے ہیں وہ سب جہنم میں بھر دیے جائیں گے، خواہ وہ اہلِ کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے۔ اہلِ کتاب ہو کر جنھوں نے اسی اندھے پن کا ثبوت دیا جس کا مظاہرہ مشرکین نے کیا تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ کسی رعایت کے مستحق ٹھہریں۔ ساتھ ہی یہ تاکید بھی ہے کہ یہ اس جہنم میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل کیے جائیں گے۔ یہ نہیں ہو گا کہ چند دنوں کے بعد اس سے ان کو نکلنا نصیب ہو جائے۔ یہاں اہلِ کتاب کے اس زعم پر نظر ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ فرمایا ہے کہ ان کا گمان یہ ہے کہ اول تو دوزخ کی آگ سے ان کو کوئی سابقہ پڑنے والا نہیں ہے اور پڑا بھی تو وہ چند دنوں سے زیادہ کے لیے نہیں ہو گا۔

'أُولَٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ'۔ یہ ان کے کبر پر ضرب لگائی گئی ہے۔ اہلِ کتاب اور مشرکین کے سردار، قرآن اور پیغمبر پر ایمان لانے کے لیے یہ شرط جو لگاتے تھے کہ جب تک کوئی فرشتہ آسمان سے اچھوتے صحیفے پڑھتا نہیں اترے گا یا جب تک ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں کھلے صحیفے نہیں پکڑائے جائیں گے اس وقت تک وہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے دعوائے رسالت میں سچے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ شرط وہ اس غرور کی بنا پر لگاتے تھے کہ وہ اپنے ہی اندر کے ایک شخص کو، جو دنیوی اعتبار سے ان سے فروتر بھی ہے، خدا کا رسول مان کر اس کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردن میں کس طرح ڈال لیں! ان کا یہ غرور ان کے لیے قبولِ حق سے مانع بنا حالانکہ حق خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اللہ تعالیٰ کی طرف ہے جس کے آگے گردن جھکا دینا ہر ایک پر

واجب ہے خواہ وہ کوئی بادشاہ ہو یا غلام۔ اگر کوئی شخص حق سے اکڑتا ہے تو وہ ابلیس کی ذریّت میں سے ہے اور ابلیس کی ذریّت بدترین خلائق ہے جس کا ٹھکانا صرف جہنم ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِکَ ہُمۡ خَیۡرُ الۡبَرِیَّۃِ (۷)

ان بندوں کا بیان جو تکبر سے پاک رہے

یہ اللہ کے ان بندوں کا بیان ہے جو کبر و غرور کی آلائش سے پاک رہے اس وجہ سے ان کے اندر حق کا احترام باقی رہا۔ انھوں نے جب رسول کی دعوت سنی تو اس طرح کا کوئی مطالبہ نہیں کیا جس طرح کا مطالبہ مغروروں نے کیا بلکہ وہ اللہ کی کتاب پر ایمان لائے اور عمل صالح کی راہ پر چل پڑے۔ فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جو بہترین خلائق ہیں۔ اس لیے کہ انسان کی قدر و قیمت مال و اسباب اور خاندان و نسب سے نہیں بلکہ اس کے عقلی و اخلاقی اوصاف سے ہے۔ جن کے اندر یہ اوصاف موجود ہیں اللہ کے نزدیک وہی اشراف و سادات ہیں اگرچہ وہ روم یا حبش کے غلام ہوں اور جو ان اوصاف سے محروم ہیں وہ اللہ کے نزدیک ارذل خلائق ہیں اگرچہ وہ قرشی و ہاشمی سادات ہوں۔ یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے قریش کے لیڈروں کی وہ پھبتیاں ذہن میں تازہ کر لیجیے جو وہ ان غریب مسلمانوں پر چست کرتے تھے جو شروع شروع میں اسلام لائے تھے۔ ان کی طرف سے اس توہین و تذلیل کے بعد رب السّمٰوٰت والارض کی طرف سے ان کی اس سرفرازی سے کون اندازہ کر سکتا ہے کہ ان کے سر کتنے اونچے ہوئے ہوں گے!

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور جیسا کہ سورۂ تین میں ارشاد ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو بہترین ساخت اور نہایت اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اگر یہ اپنی قدر پہچان لے تو یہ 'خَیۡرُ الۡبَرِیَّۃِ' ہے، خدا کی مخلوقات میں کوئی اس کے برابر کا نہیں۔ اور اگر یہ اپنی حقیقی قدر و قیمت سے بے خبر رہ کر زندگی گزارے تو یہ 'شَرُّ الۡبَرِیَّۃِ' اور 'رَدَدۡنٰہُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ' کا بالکل صحیح مصداق ہے۔ پھر یہ اتنی پستی میں گرتا ہے جو صرف اسی کے لیے خاص ہے، خدا کی کوئی اور مخلوق اس پستی تک نہیں گرتی۔ جس طرح انسان کے عروج کی کوئی حد نہیں ہے اسی طرح اس کے زوال کی بھی کوئی حدِ نہایت نہیں ہے۔ بڑی ہی اعلیٰ بات کہی ہے ان حکماء نے جنھوں نے کہا ہے کہ "اے انسان! تو اپنے کو پہچان!"

جَزَآؤُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ ؕ ذٰلِکَ لِمَنۡ خَشِیَ رَبَّہٗ (۸)

یہ اللہ کے ان بندوں کا صلہ بیان ہو رہا ہے۔ فرمایا کہ اس دنیا میں ان کے لیے جو آزمائشیں مقدّر ہیں، ان سے تو انھیں بہرحال گزرنا ہے لیکن اپنے رب کے پاس ان کے لیے اقامت کے ایسے باغ ہیں جن میں نہریں جاری ہوں گی اور یہ ان میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل ہوں گے۔

'جَنّٰتُ عَدْنٍ' کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

'رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ' یعنی اس جنت میں اللہ بھی ان سے راضی اور وہ بھی اس سے راضی۔ اللہ ان سے اس وجہ سے راضی کہ انھوں نے بندگی کا حق اس طرح ادا کیا جس طرح ان کو ادا کرنا چاہیے تھا اور جو ان کے رب کے معیار پر پورا اترا اور وہ اللہ سے اس وجہ سے راضی کہ ان کے رب نے نہ صرف وہ وعدے پورے کیے جو ان سے کیے تھے بلکہ ان کو وہ کچھ بخشا جس کا وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔

'ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّہٗ' فرمایا کہ یہ مقام ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنے رب سے، غیب میں رہتے، ڈرے۔ مطلب یہ ہے کہ جو احمق سب کچھ آنکھوں سے دیکھ کر ماننا چاہتے ہیں وہ اسی طرح بھٹکتے رہیں گے۔ ان کا علاج کوئی نہیں کر سکتا۔ اس دنیا میں انسان کا اصلی امتحان یہی ہے کہ وہ اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر ان حقائق پر ایمان لائے جن کی خبر اللہ کے رسولوں نے دی ہے۔ وہ کان اور آنکھیں بند کر کے زندگی نہ گزارے اور نہ اس بات کا منتظر رہے کہ سب کچھ سامنے دکھا دیا جائے تو وہ تب مانے گا۔ جس نے یہ امتحان پاس کر لیا وہی اس بات کا مستحق ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے فضلِ عظیم سے نوازے۔ جو اس میں ناکام رہا وہ جانوروں سے بھی بدتر ہے اور اس لائق نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے فضل کا کوئی حصہ عطا کرے۔

بتوفیقِ ایزدی ان سطور پر سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ حَمْدًا کَثِیْرًا۔

لاہور

۲۴- مارچ ۱۹۸۰ء

۶- جمادی الاولیٰ ۱۴۰۰ھ

تدبّرِ قرآن

۹۹

الزّلزال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورہ کا مضمون اور ترتیب بیان

اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ ایک ایسا دن لازماً آنے والا ہے جس دن انسان کی کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی نہیں رہ جائے گی بلکہ اس کی ہر نیکی و بدی خواہ اس نے کتنے ہی پردوں کے اندر چھپ کر کی ہو، اس کے سامنے رکھ دی جائے گی اور وہ اس کی جزا یا سزا پائے گا۔ اس دن ہر شخص اپنے اعمال سے متعلق خود جواب دہ ہوگا۔ کوئی دوسرا نہ اس کا حامی و مددگار ہوگا اور نہ کوئی اس کا سفارشی بنے گا۔

اس مدّعا کو واضح کرنے کے لیے پہلے اس ہلچل کی تصویر کھینچی گئی ہے جو قیامت کے دن اس زمین میں برپا ہوگی اور جس کے نتیجے میں وہ سب کچھ باہر آ جائے گا جو اس کے اندر مدفون ہے۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ کے ایماء سے اپنی ساری کہانی کہہ سنائے گی تاکہ انسان پر اچھی طرح واضح ہو جائے کہ اس نے اس کے اندر کہاں کہاں کیا کچھ چھپایا اور کیا کیا کہا اور کیا ہے۔ اس کے بعد ہر ایک اپنی نیکی بھی دیکھے گا، اگر اس نے کوئی نیکی کی ہوگی اگرچہ وہ کتنی ہی حقیر ہو اور وہ برائی بھی دیکھے گا جس کا وہ مرتکب ہوا ہوگا اگرچہ وہ برائی کتنی ہی چھوٹی ہو۔

پچھلی سورتوں کے مطالب اگر ذہن میں محفوظ ہیں تو اس سورہ کے انذار کی اہمیت کا اندازہ کرنے میں کچھ زحمت نہیں ہوگی۔ قیامت کے باب میں منکرین کے بڑے مغالطے تین تھے۔ ایک یہ کہ یہ زمین و آسمان بھلا درہم برہم کس طرح ہو سکتے ہیں؛ دوسرا یہ کہ انسان کے تمام اقوال و افعال کا بھلا کوئی احاطہ کر سکتا ہے کہ ان کا حساب کرنے بیٹھے؛ تیسرا یہ کہ اگر یہ باتیں ممکن بھی فرض کر لی جائیں جب بھی خود ان کے لیے کوئی اندیشہ نہیں ہے، ان کے شرکاء اپنی سفارش سے ان کو ہر آفت سے بچا لیں گے اور ان کو خدا کے ہاں بڑے بڑے درجے دلوائیں گے۔ اس سورہ میں ان کے ان تینوں مغالطوں پر ضرب لگائی گئی ہے۔

سُورَةُ الزِّلْزَالِ

مَكِّيَّةٌ ______ آيات: ۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۸ إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ﴿۱﴾ وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ
أَثْقَالَهَا ﴿۲﴾ وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا ﴿۳﴾ يَوْمَئِذٍ
تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ﴿۴﴾ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ﴿۵﴾ يَوْمَئِذٍ
يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ﴿۶﴾ فَمَنْ
يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ﴿۷﴾ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ
ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ﴿۸﴾ ع ۱ ۸ ۲۴

ترجمۂ آیات ۱-۸ جب کہ زمین ہلا دی جائے گی جس طرح اس کو ہلانا ہے۔ اور زمین اپنا بوجھ باہر نکال پھینکے گی اور انسان پکار اٹھے گا کہ اسے کیا ہوگیا ہے! اس دن وہ اپنی داستان کہہ سنائے گی، تیرے خداوند کے ایما سے۔ ۱-۵

اس دن لوگ الگ الگ نکلیں گے کہ ان کو ان کے اعمال دکھائے جائیں۔ پس جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ بھی اس کو دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھے گا۔ ۶-۸

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا (۱)

جب اس طرح إِذَا سے کسی چیز کا بیان ہوتا ہے تو مقصود اس کی یاد دہانی ہوتی ہے یعنی اس وقت کو یاد رکھو، اس دن سے ہوشیار رہو، جب کہ ایسا ایسا ہوگا۔ آپ چاہیں تو اس مخفی مضمون کو ترجمے میں ظاہر بھی کر سکتے ہیں۔

زبان کا ایک نکتہ

'زِلْزَال' آیا تو ہے فعل 'زُلْزِلَتْ' کی تاکید کے لیے جس طرح مفعول مطلق آیا کرتا ہے لیکن یہاں زمین کی طرف اس کی اضافت سے مضمون میں ایک خاص اضافہ ہو گیا ہے جس کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے ورنہ آیت کا صحیح زور سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اس خاص اسلوب کو سامنے رکھ کر اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جب کہ زمین ہلا دی جائے گی اس طرح جس طرح زمین کو ہلانے کا حق ہے یا جس طرح اس کا ہلایا جانا مقدر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس ہلائے جانے کا صحیح تصور آج ممکن نہیں ہے، پورے کرۂ ارض کا جھنجھوڑا جانا اور اس طرح جھنجھوڑا جانا جس طرح خدا نے مقدر فرمایا ہے تصور سے ایک مافوق حادثہ ہے لیکن یہ پیش آنے والا ہے اس وجہ سے اس کو یاد رکھو، اس سے غافل رہ کر زندگی نہ گزارو۔

وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا (۲)

'اثقال' سے مراد

'ثِقْل' کے معنی بار اور بوجھ کے ہیں۔ یہاں اس کا اولین مصداق تو مردے ہیں جو زمین میں دفن ہیں اور قیامت کے دن زمین ان کو نکال باہر کرے گی لیکن لفظ عام ہے اس وجہ سے اس سے وہ خزانے اور دفینے بھی مراد ہو سکتے ہیں اور ان جرائم کی یادگاریں بھی جن کا مجرموں نے ارتکاب کیا اور زمین میں ان کو چھپایا۔ سورۂ انشقاق کی آیت 'وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ' (الانشقاق - ۸۴: ۴) (جو کچھ اس کے اندر ہوگا وہ اس کو ڈال کر فارغ ہو جائے گی) میں اس کی وضاحت ہو چکی ہے اور آگے سورۂ عادیات کی آیت إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ (العٰدیٰت - ۱۰۰: ۹) (اور جب کہ قبریں اگلوائی جائیں گی) کے تحت بعض اشارات ان شاء اللہ مزید آئیں گے۔

وَقَالَ الْإِنسَانُ مَا لَهَا (۳)

انسان کی بدحواسی کی تصویر

اس ہولناک صورت حال کا انسان پر جو اثر پڑے گا یہ اس کی تعبیر ہے کہ وہ بدحواس ہو کر پکار اٹھے گا کہ ارے، یہ اسے کیا ہو گیا ہے کہ یہ کسی طرح ٹکنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے اور اپنے

اندر کی ہر چیز باہر نکالے دے رہی ہے! اسی طرح کی گھبراہٹ مجرموں پر اس وقت بھی طاری ہو گی جب ان کے اعمال کا رجسٹر کھلے گا۔ اس وقت بھی وہ کہیں گے: "مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا" (الکہف - ۱۸ : ۴۹) (عجیب ہے یہ کتاب! کوئی چھوٹا یا بڑا عمل ایسا نہیں ہے جو اس کی گرفت سے باہر رہ گیا ہو!)

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۙ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا (۴-۵)

زمین ہر ایک کا ریکارڈ سنا دے گی

یعنی اس دن زمین وہ تمام نیکیاں اور بدیاں جو اس کی پشت پر کی گئی ہیں خدا کے حکم سے سنا ڈالے گی۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں یہ تصریح ہے کہ اس دن اللہ تعالیٰ مجرموں کے اعضا کو ناطق بنا دے گا اور وہ ان کے خلاف گواہی دیں گے یہاں تک کہ ان کی کھالیں (بدن کے رونگٹے) بھی ان کے خلاف شہادت دیں گے۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں فرمایا ہے:

وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ۭ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ۔ (حٰمٓ السجدۃ - ۴۱ : ۲۱)

اور مجرمین اپنی کھالوں سے پوچھیں گے کہ آخر تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ وہ جواب دیں گی کہ جس خدا نے آج ہر چیز کو گویا کر دیا ہے اس نے ہمیں بھی گویا کر دیا۔

اس دنیا میں انسان جو کچھ بھی کرتا ہے اسی زمین کے اوپر یا نیچے کرتا ہے اس وجہ سے یہ انسان کے اعمال و اقوال کی سب سے بڑی گواہ ہے۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جس طرح انسان کے اعضاء و جوارح اور اس کے بدن کے روئیں روئیں کو اس کے خلاف گواہی دینے اور اس کی زندگی کا ریکارڈ سنانے کے لیے گویا کر دے گا اسی طرح زمین کو بھی ناطق بنا دے گا کہ وہ ہر ایک کا ریکارڈ سنا دے۔

یہ اللہ کے حکم سے ہوگا

'بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا'۔ لفظ 'وحی' یہاں ایما اور اشارہ کے مفہوم میں ہے۔ اس معنی میں یہ قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زمین ایسا اس وجہ سے کرے گی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو اس کے لیے ایما ہو گا۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی مذکورہ بالا آیت 'قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ' میں جو بات فرمائی گئی ہے وہی بات یہ ذرا مختلف اسلوب میں یہاں ارشاد ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہو گا خدا کے حکم سے ہو گا اور ہر چیز خدا کے حکم کی تعمیل پر مجبور ہو گی۔ چنانچہ سورۂ انشقاق میں زمین ہی سے متعلق ارشاد ہے کہ 'وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ' (الانشقاق - ۸۴ : ۵) (اور وہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اس کے لیے یہی زیبا ہے)۔

[illegible]

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ڏ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ (۶)

'اَشْتَاتٌ' کے معنی منفرق، اکیلے اکیلے، تنہا تنہا کے ہیں۔ یعنی اس دن لوگ قبروں سے اس طرح نکلیں گے کہ کسی کے ساتھ نہ اس کے اہل خاندان ہوں گے، نہ اعزہ و اقربا، نہ اس کا جتھا ہو گا، نہ خدم و حشم، نہ املاک و

جائداد، نہ اعوان وانصار، اور نہ مزعومہ شرکاء وشفعاء بلکہ ہر ایک اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے اپنے رب کے حضور تنہا حاضر ہوگا۔ یہ مضمون قرآن کے دوسرے مقامات میں نہایت وضاحت سے بیان ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ مریم میں فرمایا ہے وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا (مریم - ۱۹: ۹۵) (اور ان میں سے ہر ایک اپنے رب کے سامنے حاضر ہوگا تنہا)۔ سورۂ انعام میں فرمایا ہے: وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (الانعام - ۶: ۹۴) (اور تم آئے ہمارے پاس تنہا تنہا جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا)۔

لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ - یہ اس حاضری کی غایت بیان ہوئی ہے کہ یہ اس لیے ہوگی کہ ان کو ان کے اعمال دکھا دیے جائیں کہ دنیا کی زندگی میں انھوں نے کیا کارگزاری انجام دی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دکھا دینے سے مقصود اس کا نتیجہ یعنی اس کا مزہ چکھانا ہے یعنی فعل نتیجۂ فعل کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (۷-۸)

یہ اس اجمال کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ فرمایا کہ جس نے ذرہ کے برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ بھی اس کے سامنے آئے گی اور جس نے ذرہ کے برابر برائی کی ہوگی وہ بھی اس کے سامنے آئے گی۔

نیکیوں اور بدیوں کے جانچنے کے لیے ضابطہ

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ ہر مومن و کافر کی ہر چھوٹی بڑی نیکی یا بدی اس کے سامنے آئے گی تو ضرور لیکن اس قاعدے کے مطابق آئے گی جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کے دوسرے مقامات میں بیان فرمایا ہے یعنی ایک مومن یہ دیکھے گا کہ اس سے نیکیوں کے ساتھ فلاں فلاں غلطیاں بھی صادر ہوئی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی فلاں فلاں نیکیوں کو ان کا کفارہ بنا دیا ہے۔ اسی طرح ایک کافر یہ دیکھے گا کہ اس نے بدیوں کے ساتھ کچھ نیک کام بھی کیے ہیں لیکن اس کے وہ نیک کام اس کے فلاں برے اعمال و عقائد کے سبب سے حبط ہوگئے، اس وجہ سے وہ ان کے صلہ سے محروم رہا۔

اس قاعدہ پر پرکھے جانے کے بعد نجات پانے والوں اور ہلاک ہونے والوں کے لیے جو ضابطہ مقرر ہوا ہے وہ سورۂ قارعہ میں یوں بیان ہوا ہے:

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝ (القارعۃ - ۱۰۱: ۶-۹)

پس جس کے پلڑے بھاری ہوں گے وہ تو دل پسند عیش میں ہوگا اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو اس کا ٹھکانا دوزخ کا کھڈ ہوگا۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ والحمد للہ علیٰ فضلہ واحسانہ۔

لاہور
۳۱ - مارچ ۱۹۸۰ء
۱۳ - جمادی الاول ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

۱۰۰

العٰدیٰت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورہ کا مضمون اور ترتیب بیان

اس سورہ میں انسان کے ناشکرے پن پر اس کو تنبیہ اور ملامت ہے۔ اس کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ اس دنیا میں وہ جو کچھ بھی حاصل کرتا ہے ان وسائل و ذرائع ہی سے حاصل کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو بخشے ہیں لیکن وہ اس حقیقت کو بھول جاتا ہے کہ جب سب کچھ خدا کی عنایت سے حاصل ہوا ہے تو اس پر خدا کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان کو ادا کرنا بھی واجب ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ خدا کا کوئی حق تسلیم نہیں کرتا بلکہ علانیہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی قوتیں اور صلاحیتیں خود اسی کے خلاف استعمال کرتا ہے اور اس بات کی ذرا پروا نہیں کرتا کہ ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جس دن کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی نہیں رہ جائے گی بلکہ سینوں کے راز تک بھی اگلوا لیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے پورے علم کے ساتھ ہر ایک کا محاسبہ کرے گا اور ہر شخص کو جزا یا سزا دے گا۔

گویا اس سورہ کا اصل مضمون تو وہی ہے جو سابق سورہ ــــــ الزلزال ــــــ کا ہے لیکن دونوں میں یہ فرق ہے کہ اُس میں اس دن کی تصویر ہے جس دن یہ سب کچھ ہوگا اور اس سورہ میں اس کی دلیل بیان ہوئی ہے جس کی وضاحت ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

ترتیبِ بیان اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے تصرف میں جو حیوانات دیے ہیں ان میں سے خاص طور پر جنگی گھوڑوں کی ان جاں فشانیوں، جاں بازیوں اور وفا بازیوں کا بطریق قسم حوالہ دیا ہے جو وہ اپنے آقا یعنی انسان کی اطاعت و خدمت کی راہ میں کرتے ہیں اور پھر انسان کی ناشکری و ناسپاسی پر اس کو ملامت کی ہے کہ آخر وہ اپنے ان غلاموں اور مملوکوں کی اس وفادارانہ روش سے یہ سبق کیوں نہیں سیکھتا کہ وہ بھی کسی مالک کا مملوک، کسی رب کا مربوب اور کسی آقا کا غلام ہے اور اس پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ بھی انہی کی طرح بلکہ ان سے بھی بڑھ کر اس کی بندگی اور اس کے احکام کی اطاعت میں سرگرم رہے۔

آخر میں انسان کے بخل اور اس کی زر پرستی پر ملامت کی ہے کہ وہ پاتا تو سب کچھ خدا سے

ہے لیکن وہ اسی سے اپنے مال کو بچا لے اور چھپانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ کہاں اور کب تک چھپائے گا! ایک دن زمین کے سارے دفینے اور دلوں کے سارے راز آشکارا ہو کر رہیں گے! عاقل وہ ہیں جو اس دن کے لیے تیاری کریں۔

سُورَةُ الْعٰدِيٰتِ

مَكِّيَّةٌ ———— آيات: ۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ﴿۱﴾ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۙ﴿۲﴾ فَالْمُغِيْرٰتِ آيات ۱-۱۱
صُبْحًا ۙ﴿۳﴾ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ﴿۴﴾ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۙ﴿۵﴾ اِنَّ
الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۚ﴿۶﴾ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۚ﴿۷﴾ وَاِنَّهٗ
لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۭ﴿۸﴾ اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي
الْقُبُوْرِ ۙ﴿۹﴾ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ﴿۱۰﴾ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾ ع ۸ / ۲۴

ترجمۂ آیات ۱-۱۱ گواہی دیتے ہیں ہانپتے، دوڑنے والے گھوڑے، ٹاپوں کی ٹھوکر سے چنگاریاں نکالنے والے، صبح کے وقت دھاوا کرنے والے، دوڑ سے غبار اٹھانے والے اور غبار کے ساتھ غول میں گھس جانے والے۔ ۱-۵

کہ انسان اپنے رب کا نہایت ناشکرا ہے اور وہ اپنے رویہ پر خود گواہ ہے۔ اور وہ دولت کا رسیا ہے۔ ۶-۸

کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب قبریں اگلوائی جائیں گی اور دلوں کے بھید نکلوائے جائیں گے۔ بے شک اس دن ان کا رب ان سے اچھی طرح باخبر ہو گا۔ ۹-۱۱

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا (۱)

'عادیات' سے مراد — 'عَادِیَات' کے معنی دوڑنے والے کے ہیں لیکن یہاں یہ جنگی گھوڑوں کی صفت کے طور پر آیا ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ آگے چار صفتیں، جو ترتیب کے ساتھ آئی ہیں، وہ جنگی گھوڑوں کے سوا کسی اور چیز پر منطبق نہیں ہوتیں۔ بعض لوگوں نے اس سے مزدلفہ میں اونٹوں کو مراد لیا ہے لیکن اس کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے آگے کی صفتیں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اونٹوں کی نہیں ہو سکتیں۔

ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس سے غازیوں کے گھوڑے مراد ہیں۔ لیکن اس تخصیص کے لیے بھی کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ خاص طور پر مقسم علیہ سے تو یہ بات بالکل ہی بے جوڑ ہو جائے گی مقسم علیہ یہاں اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّہٖ لَکَنُوْدٌ (۶) (بے شک انسان اپنے رب کا نہایت ناشکرا ہے) ہے، اس مقسم علیہ کو غازیوں اور مجاہدین کے گھوڑوں کے ساتھ کیا ربط ہو سکتا ہے!

یہ قول اور اوپر مزدلفہ کے اونٹوں سے متعلق جس قول کا حوالہ گزرا ہے یہ دونوں قول اس عام وہم پر مبنی ہیں کہ جس چیز کی قسم کھائی جائے ضروری ہے کہ وہ کوئی مقدس چیز ہو۔ ہم اس وہم کی تردید اس کتاب میں جگہ جگہ کر چکے ہیں کہ مقسم بہ کے لیے مقدس ہونا کوئی ضروری بات نہیں ہے بلکہ اصل اہمیت رکھنے والی چیز اس کا اس دعوے پر شہادت ہونا ہے جو اس کے بعد مذکور ہوتا ہے۔ آگے ہم تفصیل سے بتائیں گے کہ گھوڑوں کی قسم کن کن پہلوؤں سے انسان کی ناشکری و ناسپاسی کی دلیل ہے۔

'ضَبْحٌ' وہ خاص آواز نکالنے کے لیے آتا ہے جو گھوڑے ہانپتے ہوئے اپنے نتھنوں سے نکالتے ہیں۔ ان کے ہانپنے کا یہ خاص انداز اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے ان کو انسان کی محکومی میں دیا ہے اس کو وہ نہایت وفاداری و جاں نثاری سے پورا کرنے والے اور انسان کی مقصد برآری میں اپنی طاقت کا آخری قطرہ بھی نچوڑ کر رکھ دینے والے ہیں۔

فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا (۲)

زبان کا ایک اسلوب — 'ف' کے ذریعہ سے جب عطف ہوتا ہے تو، جیسا کہ ہم اس کے محل میں وضاحت کر چکے ہیں، ترتیب پر بھی دلیل ہوتا ہے اور اس بات پر بھی کہ تمام صفتیں ایک ہی موصوف سے تعلق رکھنے والی ہیں۔

'مُوْرِیَات'، 'اِیْرَاءٌ' سے ہے جس کے معنی چقماق یا کسی چیز سے آگ نکالنے کے ہیں۔

'قَدْحٌ' ضرب لگانے، ٹھوکر لگانے اور ایک چیز کو دوسری سے ٹکرانے کے معنی میں یہاں ہے۔

انسان کی مقصد برآری میں گھوڑوں کی سرگرمی اور آتش زیرپائی

یہ انسان کی مقصد برآری میں گھوڑوں کی سرگرمی اور آتش زیرپائی کی تعبیر ہے کہ وہ اس طرح دوڑتے ہیں کہ ان کی سموں کی ٹھوکر سے چنگاریاں جھڑتی ہیں۔ گھوڑوں کے چونکہ آہنی نعل ہوتے ہیں اس وجہ سے جب وہ دشمن پر دھاوا کرنے کے لیے پتھریلی زمینوں پر دوڑتے ہیں تو ان کی سموں کی ضرب سے چقماق کی طرح چنگاریاں نکلتی ہیں۔ گویا وہ اپنے مالکوں کی رضا جوئی میں آگ کے انگاروں پر دوڑ رہے ہیں۔

فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا (۳)

یہ وہ اصل مقصد بیان ہوا ہے جس کے لیے وہ یہ جان بازی کرتے ہیں یعنی وہ دشمنوں اور حریفوں پر شب خون مارتے ہیں۔ عرب میں حریفوں پر غارت گری کا سب سے موزوں وقت صبح ہی کا سمجھا جاتا تھا اس وجہ سے یہاں 'صُبْحًا' کی قید لگی ہوئی ہے۔ ان کے ہاں غارت گری کے الارم کے طور پر 'وَاصَبَاحَا' کا جو نعرہ تھا اس میں بھی صبح کا حوالہ اسی پہلو سے ہے، یہاں تک کہ لفظ 'صَبَّحَ' عربی میں حملہ اور غارت گری کے لیے ایک معروف لفظ بن گیا۔

فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا (۴)

'اِثَارَةٌ' کے معنی اٹھانے اور ابھارنے کے اور 'نَقْعٌ' کے معنی گرد و غبار کے ہیں۔

'بِهٖ' میں 'ب' ظرف کے مفہوم میں لیجیے اور ضمیر کا مرجع 'صُبْحًا' قرار دیجیے تو مطلب یہ ہوگا کہ جب وہ صبح کو غارت گری کرتے ہیں تو اس وقت وہ گرد و غبار کا ایک طوفان اٹھا دیتے ہیں یعنی ان کا حملہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی جانب سے ایک طوفانی آندھی آگئی۔

اور اگر 'بِهٖ' کو اس تگاپو سے متعلق مانیے جو 'عٰدِيٰت' کے اندر مضمر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنی اس تگاپو سے غبار ابھار دیتے ہیں۔

دونوں ہی شکلوں میں مقصود اس کلام سے ان کی جنگی اہمیت کا اظہار ہے۔ یعنی ان کا آنا نسیم صبح کا آنا نہیں بلکہ ایک آندھی کا آنا ہوتا ہے۔

فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا (۵)

'بِهٖ' میں 'ب' یہاں ملابست کے مفہوم میں اور ضمیر کا مرجع 'نَقْعًا' ہے۔ یعنی وہ اسی آندھی اور طوفان کے ساتھ دشمن کے ایک پورے غول کے اندر گھس جاتے ہیں اور اس کے نیزوں اور تلواروں کی ذرا پروا نہیں کرتے۔ انھیں اپنی جانوں سے زیادہ اپنے مالکوں کا مقصد عزیز ہوتا ہے۔ اس کی خاطر وہ ہر خطرے سے بے خوف ہو کر اقدام کرتے ہیں اور یہی ان کے شایان شان ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (۶)

اصل دعویٰ

یہ وہ اصل بات ہے جس پر شہادت کے لیے اوپر کی قسمیں کھائی گئی ہیں۔

'کَنُوْدٌ' کے معنی ہیں ناشکرا، ناسپاس، تنہا خور، اپنے مالک کی عنایتوں کا ناقدرا۔
مطلب یہ ہے کہ جو انسان گھوڑوں کی یہ ساری جاں نثاریاں دیکھتا ہے اور ان کی قربانیوں سے بہرہ مند ہوتا ہے لیکن اسے یہ سوچنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ وہ بھی اپنے رب کا غلام ہے اور اس پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ بھی انہی کی طرح اپنے رب کی اطاعت میں سرگرم و سینہ سپر رہے، وہ نہایت ناشکرا اور لئیم ہے۔ کیونکہ وہ جانور ہو کر اپنے مالک کا حق پہچانتے ہیں اور یہ انسان ہو کر اپنے خداوند کا حق نہیں پہچانتا۔

گھوڑوں کے خاص طور پر ذکر کی وجہ

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ گھوڑوں کا ذکر بطور مثال ہے۔ یہی وفاداری و جاں نثاری ان تمام حیوانات میں پائی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے مسخر کیے ہیں۔ چنانچہ قرآن نے جگہ جگہ ان کا بھی ذکر کر کے انسان کی حسِ شکر کو ابھارا ہے۔ خاص طور پر اونٹ کی صلاحیتوں اور خدمتوں کا ذکر تو قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے۔ اس کی خدمت، اس کی جفاکشی اور اس کے صبر سے انسان کو سبق لینے کی دعوت دی گئی ہے کہ جس طرح وہ اپنے آقا کی تابعداری کرتا ہے اسی طرح انسان کا فرض ہے کہ اپنے اس آقا کی تابعداری کرے جس نے اونٹ جیسے عظیم اور کثیر المنافع جانور کو اس کی تابعداری میں دے دیا ہے۔

گھوڑوں کے خصوصیت سے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ جنگ اور دفاع کے لیے خاص طور پر اس دور میں، بڑی اہمیت رکھتے تھے جب ہر خاندان اور قبیلہ کی حفاظت کی ذمہ داری خود خاندان و قبیلہ پر عائد ہوتی تھی۔ اس زمانے میں ہر شخص کو اپنے اہل و عیال کی حفاظت کے لیے اصیل جنگی گھوڑے رکھنے پڑتے تھے اور ان گھوڑوں کی ان کے ہاں بڑی عظمت و اہمیت تھی۔ یہ گھوڑے عربی شاعری کا خاص موضوع ہیں۔ یہاں اشعار نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے محض ان کے ذوق کا اندازہ کرنے کے لیے کسی حماسی کا ایک شعر نقل کرتا ہوں جو بالکل بروقت زبانِ قلم پر آگیا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

وفی فرس نهد عتیق جعلته حجابا لبیتی ثم اخدمته عبدا

(اور میں اپنا مال ایک جوان اور اصیل گھوڑے کے لیے خرچ کرتا ہوں جس کو میں نے اپنے گھر کا پاسبان بنایا ہے اور پھر میں نے اس کی خدمت کے لیے ایک غلام رکھ چھوڑا ہے)

انسان کے لیے خاص درس

گھوڑوں کی یہ قدر و قیمت، ظاہر ہے کہ، ان کی خدمات اور جاں بازیوں کی بنا پر ہے جو وہ انسان کی انجام دیتے ہیں۔ اگر یہ خدمتیں وہ انجام نہ دیتے تو انسان نہ ان پر اپنا مال خرچ کرتا اور نہ اپنے قصیدوں میں ان کی مدح سرائی کرتا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان اس حقیقت سے

ناواقف نہیں ہے کہ غلام کی قدر و قیمت کا انحصار اس کی خدمات پر ہے لیکن خود اپنے معاملے میں وہ اس حقیقت کو فراموش کر جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ جس رب کا غلام ہے حکم تو اس کا ایک نہ مانے لیکن انعام دنیا اور آخرت دونوں میں سب سے بڑھ کر پائے۔

انسان کی ناشکری کا ایک اور پہلو بھی قابلِ توجہ ہے کہ انسان نہ گھوڑوں ہی کا خالق ہے اور نہ ان چیزوں ہی کا خالق ہے جن پر ان کی پرورش کا انحصار ہے تاہم وہ نہایت بے جگری سے انسان کی خدمت محض اس وجہ سے کرتے ہیں کہ خدا نے ان کو اس کی خدمت میں لگا دیا ہے۔ اس کے برعکس انسان کا حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا بھی خالق ہے اور اس کے کام آنے والے تمام جانوروں اور معاش و معیشت کے جملہ اسباب و وسائل کا بھی لیکن وہ خدا کی بندگی کے حقوق و فرائض سے بے پرواہ ہے۔

وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ (۷)

انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے

فرمایا کہ اس کے اس ناشکرے پن پر کوئی دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خود اس پر سب سے بڑا گواہ ہے۔ یہ فقرہ اسی طرح کا ہے جس طرح سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے: بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ (القیٰمۃ - ۷۵ : ۱۴-۱۵) (بلکہ انسان خود اپنے اوپر حجت ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذرات تراشے)۔

جو باتیں انسان کی فطرت کے بدیہی مقتضیات میں سے ہیں وہ دلیل کی محتاج نہیں ہوتیں۔ ان کے حق میں سب سے بڑی گواہی خود انسان کی فطرت اور اس کے ضمیر کے اندر موجود ہوتی ہے۔ انسان اگر ان سے گریز اختیار کرتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ ان کے حق میں اس کو کوئی دلیل نہیں ملی بلکہ ان کو وہ اپنے نفس کی سفلی خواہشوں کے خلاف پاتا ہے اس وجہ سے ان سے گریز کے لیے بہانے تلاش کرتا ہے۔ ورنہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ خود تو صرف انہی گھوڑوں کی قدر کرتا ہے جو اس کی کوئی قابلِ قدر خدمت انجام دیتے ہیں لیکن اپنے مالک اور رب کے متعلق یہ گمان رکھتا ہے کہ اس کے ہاں نیکوکار اور بدکار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس نے ان کے ساتھ جو معاملہ اس دنیا میں کیا ہے اس سے بہتر معاملہ آخرت میں کرے گا، خواہ اس کے ایک حکم کی بھی وہ تعمیل نہ کرے بلکہ ساری زندگی اپنے نفس کی غلامی میں گزارے۔

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (۸)

کردار کی گواہی

یہ اس کے ناشکرے پن پر اس کے کردار سے دلیل پیش کی ہے کہ وہ مال کی محبت میں غرق ہے۔ وہ اپنے گھوڑوں کو تو دیکھتا ہے کہ وہ جان کی بازی لگا کر اور نیزوں کے مقابل میں سینہ سپر ہو کر جو کچھ حاصل کرتے ہیں سب مالک کے حوالے کرتے ہیں، اپنے کسی حق کا مطالبہ نہیں کرتے،

مالک جو کچھ ان کے آگے ڈال دیتا ہے اس پر قانع رہتے ہیں لیکن اس کا حال یہ ہے کہ یہ جو کچھ اپنے رب کی بخشش و عنایات سے پاتا ہے اس کو اپنی تدبیر و قابلیت کا کرشمہ سمجھتا ہے اور اس پر مارِ گنج بن کر بیٹھ رہتا ہے، اس میں مالک کا کوئی حق تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتا اور اگر کوئی اس کے لیے اس کو یاد دہانی کرے تو اس کو جواب دیتا ہے کہ اس کے مال کو خدا سے کیا تعلق۔ یہ تو اس نے اپنی محنت و قابلیت سے حاصل کیا ہے۔ 'اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ عِنْدِيْ' (القصص - ۲۸ : ۷۸) (یہ تو مجھے اس علم کی بدولت ملا ہے جو میرے اپنے پاس ہے)۔

لفظ 'خَيْر' یہاں مال کے معنی میں ہے۔ اس معنی میں یہ عربی میں معروف ہے اور قرآن میں بھی یہ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ محبت کی اصلی حق دار وہ ذات ہے جو انسان کی خالق و مالک ہے اور جس کے فضل سے انسان کو وہ سب کچھ ملتا ہے جو اس دنیا میں وہ پاتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے سچے اہلِ ایمان کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ جب ان کے سامنے کوئی مرحلہ ایسا آتا ہے جس میں ان کے نفس اور ان کے رب کے مطالبات میں تصادم ہوتا ہے تو وہ اپنے رب کی محبت میں مضبوط ثابت ہوتے ہیں اور نفس کے مطالبے کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ 'وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ' (البقرۃ - ۲ : ۱۶۵) (اور جو اہل ایمان ہوتے ہیں وہ سب سے زیادہ سخت اللہ کی محبت میں ہوتے ہیں)۔ اس کے برعکس حال ان لوگوں کا ہوتا ہے جو ناشکرے اور ناسپاس ہوتے ہیں وہ اپنے رب سے زیادہ اپنے مال کے پرستار ہوتے ہیں۔

اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۙ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ (۹ - ۱۰)

زرپرست ناشکروں کو تنبیہ

یہ ناشکرے اور زرپرست انسانوں کو تنبیہ ہے کہ کیا وہ اس دن کو نہیں جانتے جب وہ سب کچھ جو قبروں میں ہے اگلوا لیا جائے گا اور جو کچھ لوگوں کے سینوں میں ہے وہ نکلوا لیا جائے گا۔ قبروں کے اندر سے مردوں کو نکلوانا تو بالکل واضح ہے لیکن یہاں یہ بات زرپرستوں کی تنبیہ کے سیاق میں فرمائی گئی ہے اس وجہ سے قرینہ دلیل ہے کہ اس سے وہ دفینے بھی مراد ہیں جو بخیل مال دار، خدا اور اس کے بندوں کے حقوق مار کر، زمینوں میں دفن کر چھوڑتے ہیں۔ 'بُعْثِرَ' کے معنی ہیں کسی جمع کی ہوئی چیز کو جائزہ لینے کے لیے پراگندہ اور متفرق کر دینا۔ یعنی اس دن کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں رہ جائے گی بلکہ ہر چیز سب کے سامنے آ جائے گی۔

اعمال کے ریکارڈ کے ساتھ محرکاتِ اعمال کا ریکارڈ بھی خدا کے سامنے ہوگا

'وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ' یعنی دفینوں کی طرح سینوں کے سارے راز بھی اکٹھے کر لیے جائیں گے تاکہ ہر شخص پر حجت قائم کی جا سکے کہ کس نے کون سا عمل کس محرک کے تحت کیا ہے۔ یہ امر واضح رہے کہ کوئی شخص کتنا ہی غلط کام کرے لیکن وہ اس کو جائز ثابت کرنے کے لیے کوئی اچھا محرک تلاش کرنے کی ضرور کوشش کرتا ہے تاکہ اپنے ضمیر کو بھی چپ کر سکے اور دوسروں کی

تنقید و تحقیر سے بھی اپنے کو بچا سکے۔ خاص طور پر وہ لوگ جو اپنے کو مذہبی روپ میں پیش کرتے یا قیادت کے مقام پر فائز ہوتے یا ہونے کے متمنی ہوتے ہیں وہ تو اس کے بغیر کوئی کام کر ہی نہیں سکتے۔ وہ اپنے باطن کو خلق کی نگاہوں سے چھپائے رکھنے کے لیے اس طرح کا کوئی لبادہ ضرور ایجاد کر لیتے ہیں۔ اس قسم کے شاطروں کو اس آیت میں متنبہ فرمایا گیا ہے کہ اس دن ان کے اعمال کے ریکارڈ کے ساتھ ساتھ ان کے محرکات کا سارا ریکارڈ بھی ان کے اور ان کے رب کے سامنے ہوگا۔

سابق سورہ ـــــ الزلزال ـــــ کی آخری آیات کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے تاکہ اس کے سارے پہلو واضح ہو جائیں۔

إِنَّ رَبَّهُم بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ (۱۱)

یہ بات اوپر والی تنبیہ ہی کو مؤکد کرنے کے لیے فرمائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر شخص کے اعمال اور ان کے محرکات سے اچھی طرح باخبر تو آج بھی ہے لیکن آج ہر چیز کو آشکارا کرنا اس کی حکمت کے خلاف ہے البتہ وہ دن اسی لیے ہوگا کہ سارا ریکارڈ ہر شخص کے سامنے رکھ دیا جائے۔ چنانچہ جب وہ رکھ دیا جائے گا تو دوسرے بھی جان لیں گے کہ ان کا رب ان کے ظاہر و باطن دونوں سے کتنا آگاہ ہے۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ فضلہ واحسانہ۔

لاہور
۷ - اپریل ۱۹۸۰ء
۲۰ - جمادی الاولیٰ ۱۴۰۰ھ

تدبّرِ قرآن

١٠١

القارعة

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورہ کا مضمون اور ترتیب بیان

اس سورہ میں یہ حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ جس قیامت سے ڈرایا جا رہا ہے اس وقت اگرچہ کسی کو نہیں معلوم لیکن اس کا آنا یقینی ہے جس طرح کوئی اچانک آکر دروازے پر دستک دیتا ہے اسی طرح وہ اچانک آدھمکے گی۔ دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا کھٹکا ہر وقت لگا رہے۔ اس دن کسی کے پاس کوئی قوت و جمعیت نہیں ہوگی۔ لوگ قبروں سے اس طرح پراگندہ نکلیں گے جس طرح برسات میں پتنگے نکلتے ہیں۔ ہر ایک پر نفسی نفسی کی حالت طاری ہوگی۔ کوئی بھی کسی دوسرے کی مدد کر سکنے کی پوزیشن میں نہ ہوگا۔ اس دن قلعے، مورچے، حصار تو درکنار پہاڑوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ دھنکی ہوئی اون کی مانند ہو جائیں گے۔ اس دن صرف نیک عمل ہی کام آنے والا بنے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنی میزانِ عدل قائم کرے گا۔ جس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا وہ جنت کے عیش جاوداں میں ہوگا اور جس کی بدیوں کا پلڑا بھاری ہوگا وہ دوزخ کے کھڈ میں بھڑکتی آگ کے اندر پھینک دیا جائے گا۔

سُوْرَةُ الْقَارِعَةِ

مَكِّيَّةٌ ـــــــــــــــ آیات : ۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱ - ۱۱ اَلْقَارِعَةُ ﴿۱﴾ مَا الْقَارِعَةُ ﴿۲﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ﴿۳﴾
يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ﴿۴﴾ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ
كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ﴿۵﴾ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴿۶﴾ فَهُوَ فِيْ
عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴿۸﴾ فَاُمُّهٗ
هَاوِيَةٌ ﴿۹﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ﴿۱۰﴾ نَارٌ حَامِيَةٌ ﴿۱۱﴾ ع ۱۱ / ۲۶

ترجمۂ آیات ۱ - ۱۱

کھٹکھٹانے والی!

کیا ہے کھٹکھٹانے والی!

اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہے کھٹکھٹانے والی! ۱-۳

اس دن لوگ منتشر پتنگوں کے مانند ہوں گے اور پہاڑ دھنکی ہوئی اون کے مانند ہو جائیں گے۔ ۴-۵

توجس کے پلّے بھاری ہوں گے وہ تو دل پسند عیش میں ہو گا۔ اور جس کے پلّے ہلکے ہوئے تو اس کا ٹھکانا کھڈ ہو گا۔ اور تم کیا سمجھے کہ وہ کیا ہے! دہکتی آگ! ۶-۱۱

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلْقَارِعَةُ (۱)

'القارعۃ' میں ایک خاص تنبیہ مضمر ہے — یہ قیامت کے مختلف ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اس کے معنی ہیں ٹھونکنے والی، کھٹکھٹانے والی۔ 'قَرَعَ الْبَابَ' کے معنی ہیں اس نے دروازہ کو ٹھونکا یا کھٹکھٹایا۔ اس نام سے قیامت کے اس خاص پہلو کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ جس طرح کوئی رات میں آنے والا دروازے کو ٹھونکتا اور گھر کے تمام سونے والوں کو دفعتہً ہڑبڑا دیتا ہے، وہی حال قیامت کا بھی ہوگا۔ اس کا وقت کسی کو نہیں معلوم کہ کب آدھمکے۔ اس کا ظہور اچانک ہوگا اور وہ بالکل دفعتہً سارے عالم میں ایک ہلچل برپا کر دے گی۔ اس کے اسی نام کے اندر یہ تنبیہ بھی مضمر ہے کہ جب یہ اس کائنات کی سب سے بڑی ہلچل ہے اور اس کا وقت کسی کو نہیں معلوم ہے تو سلامتی اسی میں ہے کہ اس کا کھٹکا ہر وقت لگا رہے۔

یہ اسلوب بیان جو یہاں اختیار فرمایا گیا ہے ایک الارم کی نوعیت کا ہے تاکہ تمام کان رکھنے والے اس مبتدا کی خبر سننے کے لیے تیار ہو جائیں۔ گویا قیامت جس نوعیت کی ہڑبڑاہٹ اس دنیا میں پیدا کرے گی اسی نوعیت کی ہڑبڑاہٹ یہاں اس کا نام پیدا کر رہا ہے۔ سورۂ حاقہ میں بھی یہی اسلوب کلام اختیار کیا گیا ہے اور اس کی بقدر ضرورت وضاحت ہم کر چکے ہیں۔[1]

مَا الْقَارِعَةُ (۲)

اس سوال نے اس الارم کی سنگینی میں مزید اضافہ کر دیا کہ جو لوگ اس کو کوئی معمولی بات سمجھ کر اس سے بے پروا ہیں وہ چوکنے ہوں اور کان کھول کر اس کا حال سن لیں اور اس کے لیے جس تیاری کی ضرورت ہے اس کی فکر کریں۔

وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ (۳)

لوگوں کی غفلت پر سرزنش — اس اسلوب کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ اس میں سوال کے ساتھ ساتھ مخاطب کی غفلت، بلادت اور ناعاقبت بینی پر افسوس اور حسرت کا اظہار بھی ہے کہ تم کیا جانو یا کیا سمجھے کہ وہ اچانک

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن جلد ہفتم، صفحات: ۵۴۱-۵۴۲

ٹوٹ پڑنے والی آفت کیا ہے اور ان لوگوں پر کیا گزرے گی جو بار بار کی تنبیہ و تذکیر کے باوجود اس کا مذاق اڑائے جا رہے ہیں۔

يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ (۴)

اس دن کوئی کسی کا ساتھ نہیں دے گا

اس دن جس صورتِ حال سے سابقہ پیش آئے گا یہ اس کا بیان ہے کہ اس دن لوگ پراگندہ پتنگوں کے مانند ہوں گے۔ نہ کسی کے ساتھ اس دن اس کا خاندان و قبیلہ ہوگا، نہ کسی کی کوئی جماعت و جمعیت ہوگی اور نہ وہ شرکاء و شفعاء ہی ہوں گے جن کے اعتماد پر لوگ نچنت ہیں۔ بلکہ لوگ قبروں سے متفرق نکلیں گے اور ہر ایک کو سابقہ صرف اپنے اعمال سے پیش آئے گا۔ سورۂ زلزال میں فرمایا ہے:

يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا ۙ لِيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ۞ (الزلزال - ۹۹: ۶)

اس دن لوگ قبروں سے متفرق ہو کر نکلیں گے تاکہ ان کو ان کے اعمال دکھائے جائیں۔

سورۂ مومنون میں فرمایا ہے:

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ ۝ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ ۞ (المومنون - ۲۳: ۱۰۱-۱۰۳)

پس جب صور پھونکا جائے گا تو ان کے آپس کے نسبی رشتے اس دن ختم ہو جائیں گے اور وہ ایک دوسرے سے مدد کے طالب نہ ہو سکیں گے۔ پس جن کے نیکیوں کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پانے والے بنیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو وہی لوگ ہوں گے جنھوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا، وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں پڑے۔

اس دن ہر شخص پر نفسی نفسی کی جو حالت طاری ہوگی اس کی تصویر سورۂ معارج میں یوں کھینچی گئی ہے:

وَلَا يَسْأَلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا ۞ يُبَصَّرُونَهُمْ ۚ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ۙ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ۙ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ ۙ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ

اور اس دن کوئی دوست اپنے دوست کو نہ پوچھے گا باوجودیکہ وہ ان کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ کاش! وہ اپنے بیٹوں، اپنی بیوی اور اپنے بھائی اور اس خاندان کو، جو اس کو پناہ دیتا ر

جَمِيْعًا لا ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۝ (المعارج ۷۰: ۱۰-۱۴) — ہے، فدیہ میں دے کر اس دن کے عذاب سے اپنے کو چھڑالے جائے۔

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ (۵)

اس دن سارے استحکامات ٹوٹ پھوٹ جائیں گے — یعنی خاندانوں اور قبیلوں کی عصبیتوں کی طرح اس دن قلعوں، گڑھیوں اور عمارتوں کے سارے استحکامات بھی درہم برہم ہو کر رہ جائیں گے۔ اس دن پہاڑوں تک کا یہ حال ہوگا کہ وہ دھنکی ہوئی اون کے مانند ہو جائیں گے۔ یعنی جس طرح دھنکی ہوئی اون کا ریشہ ریشہ الگ ہو جاتا ہے اسی طرح پہاڑوں کا ذرہ ذرہ بھی پراگندہ ہو جائے گا۔

پہاڑوں کا ذکر خاص طور پر اس وجہ سے ہوا کہ قیامت کے منکرین پہاڑوں کو غیر فانی خیال کر کے بطور استہزاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتے تھے کہ کیا جب قیامت آئے گی تو وہ پہاڑوں کو بھی اکھاڑ پھینکے گی؟ ان کے اس سوال کا حوالہ اور اس کا جواب قرآن مجید میں مذکور ہے۔

'عِهْنٌ' اس اون کو کہتے ہیں جو دھنک کر اور رنگ کر کاتنے کے لیے تیار کی جا چکی ہو۔ اس طرح کی اون کا ریشہ ریشہ الگ ہوتا ہے اس وجہ سے یہاں اس کی تشبیہ استعمال ہوئی ہے۔ تشبیہ میں اصل مقصود اون کی پراگندگی کو نمایاں کرنا ہے نہ کہ اس کے رنگ کو۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ لا فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ (۶-۷)

اس دن صرف نیک اعمال کام آئیں گے — اس دن واحد کام آنے والی چیز آدمی کے نیک اعمال ہوں گے۔ ہر شخص کے اعمال تولے جائیں گے۔ جس کی میزان بھاری ہوگی وہ تو فلاح پائے گا اور جس کی میزان ہلکی رہ جائے گی وہ نامراد ہوگا۔ اس دن جو میزان نصب ہوگی وہ خاص میزان ہوگی جو لوگوں کے اعمال ہی کے تولنے کے لیے نصب کی جائے گی۔ سورۂ انبیاء میں اس کا ذکر یوں آیا ہے:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ (الانبیآء ۲۱: ۴۷) — اور ہم قیامت کے دن کے لیے خاص میزان عدل مقرر کریں گے۔

اس دن اور اس میزان کا خاص وصف سورۂ اعراف میں یہ بیان ہوا ہے کہ اس دن وزن صرف حق کے اندر ہوگا، باطل کے اندر سرے سے کوئی وزن ہی نہیں ہوگا۔ یہ میزان ہر شخص کے عمل کو تول کر بتا دے گی کہ کس کا عمل حق اور وزن دار ہے اور کس کے اعمال بالکل باطل اور پھوک ہیں۔ فرمایا ہے:

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ۨ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ — اس دن وزن صرف حق کا ہوگا تو جن کے پلڑے بھاری ہوئے وہ تو فلاح پانے والے ہوں گے

هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ○ (الاعراف - ۷: ۸ - ۹)

اور جن کے پلڑے ہلکے رہے وہی ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا بوجہ اس کے کہ وہ ہماری آیات کی ناقدری کر کے اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے۔

'فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ' یہاں 'مَنْ' کے لحاظ سے ضمیر اگرچہ واحد ہے لیکن اس سے مراد جیسا کہ اوپر سورۂ اعراف کی آیات میں شہادت موجود ہے، جمع بھی لے سکتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ پسندیدہ عیش میں ہوں گے۔ یعنی جو کچھ یہ چاہیں گے وہ بھی انھیں ملے گا اور ان کا رب ان کو وہ کچھ بھی دے گا جس کا وہ تصور بھی نہ کر سکتے ہوں گے۔

وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۭ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ۭ نَارٌ حَامِيَةٌ (۸ - ۱۱)

یہ ان لوگوں کا حشر بیان ہو رہا ہے جن کے پاس صرف باطل ہی باطل ہو گا۔ حق ان کے پاس ہو ہی گا نہیں یا ہو گا تو ان کے عقیدے اور ان کی نیت نے اس کو بھی بالکل بے وزن کر دیا ہو گا۔ فرمایا کہ ان کا ٹھکانا کھڈ ہو گا۔ اس کھڈ کی وضاحت آگے فرما دی کہ 'نَارٌ حَامِيَةٌ' وہ دوزخ کا کھڈ ہو گا جس میں آگ بھڑک رہی ہو گی۔

'اُمٌّ' کے معنی ماں کے ہیں لیکن یہاں یہ ملجا اور ٹھکانے کے معنی میں ہے اور نہایت بلاغت کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

'مَا هِيَهْ' میں 'ہ' سکتہ کی ہے جو قافیہ کی رعایت سے آئی ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے اس کتاب میں گزر چکی ہیں۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ حمداً کثیراً۔

لاہور

۱۰ - اپریل ۱۹۸۰ء

۲۴ - جمادی الاول ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

۱۰۲

التّکاثر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلق اور ترتیب بیان

یہ سورہ سابق سورہ ـــــ القارعة ـــــ کی مثنیٰ ہے۔ دونوں کے مضمون میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ سابق سورہ میں بتایا ہے کہ آخرت میں کام آنے والی چیز وہ نیکیاں ہیں جو اس دنیا میں کر لی جائیں۔ خدا کی میزان میں انہی کے اندر وزن ہوگا۔ جس نے ان کا ذخیرہ جمع کر لیا وہ فلاح پائے گا اور جو ان سے محروم رہا اس نے، خواہ کتنا ہی خزانہ اکٹھا کر لیا ہو، اس کی میزان بالکل بے وزن رہے گی۔ حسرت و اندوہ کے سوا اس کے حصہ میں کچھ نہیں آئے گا۔

اب اس سورہ میں ان لوگوں کو متنبہ فرمایا ہے جنھوں نے ساری عمر اس جدوجہد میں کھپا دی کہ مال و دولت کے اعتبار سے وہ دوسروں سے آگے نکل جائیں، ان کا بنک بیلنس سب سے زیادہ ہو جائے، کاروباری میدان میں کوئی ان کا حریف نہ رہے۔ معیارِ زندگی کی مسابقت میں وہ سب کو پیچھے چھوڑ جائیں۔ بس اسی تگ و دو میں ان کی ساری زندگی ختم ہو گئی اور اس امر پر غور کرنے کی انھیں کبھی توفیق نہیں ہوئی کہ آگے ایک یقینی مرحلہ حساب کتاب اور جزا و سزا کا بھی آنے والا ہے جس سے بے پروا ہو کر زندگی گزارنے والوں کو جہنم سے سابقہ پیش آئے گا اور اس دن ہر ایک سے یہ پرسش بھی ہونی ہے کہ اس نے دنیا میں جو کچھ حاصل کیا کس راہ سے حاصل کیا اور اس کو کس راہ میں صرف کیا اور اللہ تعالیٰ نے جو قوتیں اور صلاحیتیں اور جو نعمتیں اس کو بخشیں ان کا کتنا حصہ اس نے بخشنے والے کی خوشنودی کے لیے استعمال کیا اور کتنا اپنے نفس اور شیطان کی خوشنودی کے لیے۔

سُوْرَةُ التَّكَاثُرِ

مَكِّيَّةٌ ـــــــــــــــ آیات: ۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۸
أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝١ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝٢ كَلَّا سَوْفَ
تَعْلَمُوْنَ ۝٣ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝٤ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ
عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝٥ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝٦ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ
الْيَقِيْنِ ۝٧ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝٨ ع ۲۷

ترجمۂ آیات ۱-۸
تم کو طلب مال کی مسابقت نے غفلت میں ڈالے رکھا یہاں تک کہ قبروں میں جا پہنچے۔ ہرگز نہیں، تم آگے جانو گے! ہاں، ہرگز نہیں، تم آگے جان لوگے! ۱-۴ ہرگز نہیں، اگر تم یقین کے ساتھ جانتے کہ دوزخ سے ضرور دوچار ہوگے، پھر تم اس کو یقین کی آنکھوں سے دیکھو گے، پھر تم سے اس دن نعمتوں کے باب میں پرسش ہونی ہے تو ۵-۸

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ (۱)

'اِلْهَاءٌ' کے معنی غافل اور مبتلائے فریب رکھنے کے ہیں۔

'تَكَاثُرٌ' کے معنی ہیں مال و اولاد کی کثرت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی تگ و دو۔

عرب جاہلیت میں حفاظت و مدافعت کی ذمہ داری چونکہ خاندان اور قبیلہ ہی پر ہوتی تھی اس وجہ سے قبیلہ میں سرداری کا مقام اسی خاندان کو حاصل ہوتا جس کے افراد زیادہ ہوں۔ اس چیز نے قدرتی طور پر ان کے ہاں مال کے تکاثر کے ساتھ ساتھ اولاد کے تکاثر کے جذبہ کو بھی بہت قوی کر دیا تھا۔ چنانچہ ان کے لٹریچر پر جن کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ جس طرح وہ اپنے مال کی کثرت پر فخر کرتے اسی طرح بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی اولاد کی کثرت پر بھی فخر کرتے۔ اب موجودہ دور میں اجتماعی زندگی کے بدلے ہوئے نظام اور خاص طور پر خاندانی منصوبہ بندی کے تصور نے اولاد کی کثرت کے رجحان کو دبا کر اس کی جگہ معیارِ زندگی کے رجحان کو غالب کر دیا ہے۔ اس دور کی عام بیماری یہی ہے۔ مشکل ہی سے اس زمانے میں کوئی شخص اس وبا کے اثر سے محفوظ ملے گا۔ ہر شخص رات دن معیارِ زندگی اونچا کرنے کی دھن میں ہے اور چونکہ اس کی کوئی حد معیّن نہیں ہے اس وجہ سے جو اس میدان میں گامزن ہیں ان کو اپنا ہر قدم پہلا قدم معلوم ہوتا ہے، آخری منزل نگاہوں سے اوجھل ہے، کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے، کب آئے گی اور کبھی آئے گی بھی یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ معیارِ زندگی کی بلندی کا سارا انحصار مال پر ہے تو جب معیار کی کوئی حد معیّن نہیں ہے تو مال کی حرص میں بھی کسی کمی کا امکان نہیں ہے۔ چنانچہ جس رفتار سے زندگی کا معیار اونچا ہو رہا ہے اس سے زیادہ شدت کے ساتھ مال کی ترنس بڑھتی جا رہی ہے۔ یہی چیز ہے جس کو قرآن نے 'تکاثر' سے تعبیر کیا ہے اور اس کا اثر یہ بتایا ہے کہ اس نے ہر شخص کو اس طرح اپنے دامِ فریب میں گرفتار کر لیا ہے کہ اسی میں عمر بیت جاتی ہے اور کسی کو اس سوال پر غور کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوتی کہ اس زندگی کے بعد بھی کوئی زندگی ہے یا نہیں اور ہے تو اس کے لیے بھی کچھ کرنا ہے یا نہیں۔

حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۲)

یعنی اسی تگ و دو میں زندگی گزرتی ہے یہاں تک کہ عمر تمام ہو جاتی ہے اور قبروں میں جا پہنچتے ہو۔ لفظ 'زُرْتُمْ' عربی میں بالکل سادہ معنوں میں آتا ہے۔ اردو کے لفظ 'زیارت' کی طرح اس کے اندر

کسی شرف و تقدس کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ 'زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ' کے معنی بس یہ ہوں گے کہ تم نے قبروں کو دیکھا یعنی ان کے حوالے ہوئے۔ کسی حماسی کا شعر ہے:

اذا زرت ارضًا بعد طول اجتنابہا   فقدت صدیقی والبلاد کما ہیا

(جب میں کسی سرزمین کو، عرصہ تک اس سے جدا رہنے کے بعد، دیکھتا ہوں تو نظر آتا ہے کہ احباب تو زمین نے سارے کھو دیے لیکن زمین اسی طرح ہے جس طرح تھی)

سرگشتگانِ دنیا کی حالت پر اظہارِ افسوس

اگرچہ عربوں میں یہ روایت بھی رہی ہے کہ اپنے قبیلہ کے ناموروں اور مقتولوں کی قبروں کا شمار رکھتے اور مفاخرت کی مجلسوں میں ان کا ذکر بھی کرتے لیکن یہ چیز یہاں مراد نہیں ہے اور یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے کہ اس کا یوں ذکر آئے۔ البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلوب 'حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ' کا کیوں اختیار کیا گیا۔ سیدھے لفظوں میں یوں کیوں نہیں کہا گیا کہ 'یہاں تک کہ تمھاری موت آگئی'، یا یہاں تک کہ تم نے جان، جان آفریں کے حوالہ کی۔ اس کا جواب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اول تو قافیہ کی رعایت یہ اسلوب اختیار کرنے کی متقاضی ہوئی دوسرے اس سے سرگشتگانِ دنیا کی محرومی و بےنصیبی پر اظہارِ افسوس کا مضمون آیت میں پیدا ہو گیا۔ گویا مطلب یہ ہوا کہ اسی تکاثر کی بھاگ دوڑ میں لگے رہے یہاں تک کہ قبروں سے دوچار ہوئے یا قبرستانوں میں جا براجے۔

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۳-۴)

یہ ان غفلت کے ماتوں کو تنبیہ اور نہایت زوردار و مؤثر تنبیہ ہے کہ سب کچھ سمجھا دینے کے بعد بھی اگر تم آنکھیں کھولنے کے لیے تیار نہیں ہو تو سن رکھو کہ زندگی یہی نہیں ہے جو تمھیں نظر آ رہی ہے اور جس کے عشق نے تمھیں فریب میں مبتلا کر رکھا ہے بلکہ اس کا اصل چہرہ تمھاری نظروں سے اوجھل ہے جس کو تم جلد دیکھو گے اور پھر سن لو کہ اس کو تم عنقریب دیکھو گے!!

یہ تاکید در تاکید انذار کو مؤثر بنانے کے لیے بھی ہے اور اس حقیقت کے اظہار کے لیے بھی کہ جس قوم کو اللہ کا رسول انذار کرتا ہے وہ اس کی تکذیب کے نتیجہ میں اس دنیا میں بھی گرفتارِ عذاب ہوتی ہے اور آخرت میں بھی اس کے آگے وہ سب کچھ آئے گا جس سے رسول نے آگاہ کیا۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو اس دنیا میں بھی دیکھو گے اور آخرت میں بھی دیکھو گے اور اس میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ تمھارے لیے عدالت قائم ہو چکی ہے اور فیصلہ ہوا ہی چاہتا ہے۔ لفظ 'تَعْلَمُوْنَ' کے ابہام کے اندر جو وعید مضمر ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۭ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۙ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۙ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَىِٕذٍ عَنِ النَّعِيْمِ (۵-۸)

غفلت کا اصل سبب

یہ ان غافلوں کی اس غفلت کے اصل سبب سے پردہ اٹھایا ہے کہ تمھاری یہ حالت اس وجہ

سے ہے کہ تم کو یہ یقین نہیں آ رہا ہے کہ فی الواقع ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جس دن جہنم کو یقین کی آنکھوں سے دیکھو گے، پھر تم سے ان تمام نعمتوں کی بابت پرسش ہونی ہے جو تمھارے رب نے تم کو بخشیں لیکن تم نے ان کو اس کی مرضی کے خلاف استعمال کیا۔ اگر ان باتوں کا یقین ہوتا تو تم اپنی زندگیاں اس طرح دنیا کے پیچھے نہ گزارتے بلکہ لمحہ لمحہ اس آنے والے دن کی تیاریوں میں صرف کرتے۔

کلام کی تالیف

کلام کی تالیف پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہاں 'لَوْ' کا جواب محذوف ہے۔ جواب کو محذوف تو سب مانتے ہیں لیکن 'لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ' اور بعد کی آیات کو 'لَوْ' کے تحت نہیں مانتے۔ لیکن میرے نزدیک یہ تینوں آیتیں 'لَوْ' کے تحت ہی ہیں۔ یعنی اگر تم یہ باتیں یقین کے ساتھ جانتے ہوتے تو اپنے آپ کو اس طرح نہ کھو بیٹھتے۔

'لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ' سے کلام کا پھر آغاز نہیں ہو رہا ہے، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے خیال کیا ہے، بلکہ یہ 'لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ' کے مفعول کے محل میں ہے یعنی اگر تم یقین کے ساتھ جانتے کہ جہنم کو لازماً دیکھو گے۔ 'لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ' پر 'ل' اس یقین کی تعبیر کے لیے ہے جس کا ہونا مطلوب ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ علم الیقین جو ان باتوں کو ماننے کے لیے مطلوب ہے اس کے وسائل اللہ تعالیٰ نے آفاق و انفس کے شواہد اور قرآن کی آیاتِ بینات میں رکھ دیے ہیں۔ اس وجہ سے ہر عاقل مکلف ہے کہ ان کو سمجھے اور مانے۔ جو ان سے گریز کرتا ہے، خواہ سمجھنے سے گریز کرتا ہے یا اس کے قبول کرنے سے وہ اپنی بدبختی کا ذمہ دار خود ہے۔ عند اللہ وہ اپنے اس گریز کی سزا بھگتے گا۔

اس دنیا میں صرف علم الیقین حاصل ہوتا ہے

اس سے یہ بات بھی نکلی کہ ایک عاقل کو اس دنیا میں غیب کے حقائق کا علم الیقین تو حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ علم الیقین دلائل سے حاصل ہوتا ہے جو آفاق و انفس اور قرآن میں بیان کر دیے گئے ہیں لیکن عین الیقین کا درجہ اس کو آخرت ہی میں حاصل ہوگا اس لیے کہ اس کا تعلق معائنہ و مشاہدہ سے ہے۔ جن لوگوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ چیز اس دنیا میں بھی حاصل ہوتی ہے ان کا دعویٰ ہمارے نزدیک بے بنیاد ہے۔ اس دنیا میں عین الیقین نہیں حاصل ہوتا بلکہ اس بات کا علم الیقین حاصل ہوتا ہے کہ قرآن جو کچھ ہمیں بتا رہا ہے وہ ایک دن ہم آنکھوں سے بھی دیکھیں گے۔ عین الیقین اس دن حاصل ہوگا جس دن تمام حقائق کا آنکھوں سے مشاہدہ کریں گے۔

نعمتوں کا حق

'ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ' یہ بات بھی 'لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ' کے تحت ہی ہے یعنی اگر تمھیں اس بات کا علم ہوتا کہ اس دن تم سے تمام نعمتوں کی پرسش ہونی ہے۔ پرسش سے مراد، ظاہر ہے کہ، وہ سزا ہے جو ان کی ناشکری، ناقدری اور ان کے سوءِ استعمال کے نتیجہ میں بھگتنی پڑے گی۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جتنی قوتیں و صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں اور جو وسائل و ذرائع بھی بخشے

ہیں وہ سب 'نعیم' میں داخل ہیں۔ ان کا فطری حق یہ ہے کہ ان کے لیے خدا کا شکرگزار رہا جائے اور ان کو اس کے مقرر کردہ حدود کے اندر ان کاموں میں استعمال کیا جائے جن کے لیے وہ عطا ہوئے ہیں۔ کوئی نعمت اگر ضائع کی گئی یا وہ خالق کی پسند کے خلاف استعمال ہوئی تو لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی سزا دے۔ انسان کے کان، آنکھ، دل، دماغ اور تمام اعضاء و جوارح نعمت ہیں، اسی طرح اس کو جو ظاہری و باطنی قوتیں اور صلاحیتیں عطا ہوئی ہیں وہ بھی نعمت ہیں، علیٰ ہذا القیاس اس دنیا میں زندگی کے جو اسباب و وسائل اس کو عطا ہوتے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمت ہیں۔ ان کا فطری حق، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہی ہے کہ انسان ان کو برتے اور اپنے رب کا شکرگزار رہے۔ اس ناشکرگزاری کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ ان کے برتنے میں نہ خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود سے تجاوز کرے اور نہ ان میں سے کسی کے عشق میں اس طرح مبتلا ہو جائے کہ اسی کو معبود بنا بیٹھے اور خدا کو بھول جائے۔ جو لوگ اس طرح کے کسی تجاوز میں مبتلا ہوں گے وہ قیامت کے دن لازماً اس کی سزا بھگتیں گے۔

اس سورہ میں چونکہ تکاثر اموال کے فتنہ سے آگاہ فرمایا گیا ہے اس وجہ سے وہ یہاں خاص طور پر پیش نظر ہے۔ ہر صاحب مال سے یہ سوال ہوگا کہ اس نے اپنا مال کن راستوں سے حاصل کیا اور کن کاموں میں صرف کیا۔ جنھوں نے نہ اس کے حاصل کرنے میں حرام و حلال کی پروا کی اور نہ اس کے صرف کرنے میں اصل مالک کی مرضی پیش نظر رکھی بلکہ مال ہی کو انھوں نے معبود بنا لیا اور اسی کے حاصل کرنے میں ساری زندگی کھپا دی ان کو اس انجام سے سابقہ پیش آئے گا جو سورۂ ہمزہ میں بیان ہوا ہے:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۙ الَّذِيْ	ہلاکی ہے ہر اس اشارہ باز، عیب جو کے لیے
جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ يَحْسَبُ اَنَّ	جس نے مال سمیٹا اور اس کو گن گن کر رکھا۔
مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۚ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ	یہ گمان کرتے ہوئے کہ اس کے مال نے اس
فِي الْحُطَمَةِ ۖ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۭ	کو زندہ جاوید کر دیا۔ ہرگز نہیں وہ چور چور
نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ الَّتِيْ تَطَّلِعُ	کر دینے والی میں پھینکا جائے گا۔ اور کیا
عَلَى الْاَفْـــِٕدَةِ ۭ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ	سمجھے کہ چور چور کر دینے والی کیا ہے! خدا
مُّؤْصَدَةٌ ۙ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۧ	کی بھڑکتی آگ جو دلوں پر چڑھ جائے گی۔ وہ
(الھمزۃ - ۱۰۴: ۱-۹)	اس میں بند ہوں گے لمبے ستونوں میں جکڑے۔

آخر میں 'لو' کا جواب جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، محذوف ہے۔ شرط کا جواب ان مواقع میں حذف کر دیا جاتا ہے جہاں وہ اظہار کے بغیر واضح ہو۔ اس کی متعدد مثالیں اس کتاب میں گزر چکی ہیں۔ اس

حذف سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ ساری بات محذوف مانی جاسکتی ہے جس کے لیے موقع کلام مقتضی ہو۔ اس میں یہ بلاغت بھی ہے کہ مخاطب کو گویا یہ موقع دیا جاتا ہے کہ وہ خود ٹھنڈے دل سے اپنے رویہ کا جائزہ لے اور فیصلہ کرے کہ اگر یہ باتیں صحیح ہیں (اور ان کے صحیح ہونے سے اس کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے) تو اس کا رویہ کیا ہونا چاہیے اور اس نے اب تک جو زندگی گزاری ہے وہ کتنی غلط، حقائق سے کتنی بعید اور انجام کے اعتبار سے کتنی ناعاقبت اندیشانہ اور لاابالیانہ زندگی گزاری ہے۔ یہاں اس حذف سے یہ سارا مضمون پیدا ہو رہا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر تم ان بدیہی حقائق پر سنجیدگی سے غور کرتے تو اپنی قیمتی زندگی یوں برباد نہ کرتے۔ اب بھی اگر بھلائی چاہتے ہو تو عقل سے کام لو اور جس زندگی کے بدلے ابدی بادشاہی حاصل کر سکتے ہو اس کو اس دنیائے فانی کے حقیر خزف ریزوں کو جمع کرنے میں برباد نہ کرو۔

اللہ تعالیٰ کی مدد سے ان سطور پر سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ حمداً کثیراً۔

لاہور

۱۶ - اپریل ۱۹۸۰ء

۲۹ - جمادی الاول ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

۱۰۳

العصر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورہ کا مضمون، سابق سورہ سے تعلّق اور ترتیب بیان

سابق سورہ ــــــ التکاثر ــــــ میں ان لوگوں کو تنبیہ فرمائی گئی ہے جو ساری عمر اسی دنیا کے مال و متاع جمع کرنے کی فکر میں گنوا بیٹھتے ہیں یہاں تک کہ موت کی گھڑی آجاتی ہے اور انھیں یہ سوچنے کی فرصت کبھی نہیں ملتی کہ یہ عمر عزیز اللہ تعالیٰ نے انھیں کس مقصدِ بلند کی خاطر عطا فرمائی اور وہ اس کو کس بوالہوسی و بے حاصلی میں برباد کر بیٹھے۔ اگر وہ جانتے کہ ایک دن تمام نعمتوں کی طرح زندگی کی عظیم نعمت سے متعلق بھی ان سے سوال ہوگا کہ اس کو انھوں نے کس کام میں صرف کیا تو وہ ہرگز یہ حماقت نہ کرتے کہ جس چیز سے وہ ابدی بادشاہی حاصل کر سکتے تھے اس کو دنیا کے خزف ریزے جمع کرنے اور اپنے لیے ابدی لعنت کا سامان کرنے پر قربان کر دیتے۔ اب اس سورہ میں بتایا ہے کہ زندگی کی اصل قدر و قیمت کیا ہے؟ کیا چیز اس کو ابدی فلاح کی ضامن بناتی ہے اور کیا چیز اس کو دائمی خسران میں تبدیل کر دیتی ہے؟ کس طرح انسان اس کو اپنے لیے رحمت بنا سکتا ہے اور کس طرح یہ آپ سے آپ اس کے لیے نقمت اور عذاب بن جاتی ہے اگر وہ اس کو رحمت بنانے کی کوشش نہ کرے۔

اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے اس میں زمانہ کی قسم بطور شہادت کھائی گئی ہے کہ انسان غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس دنیا میں اصل سرمایہ جو اسے حاصل ہے بس وہ تھوڑا سا وقت ہے جو مہلتِ حیات کی حیثیت سے اس کے حصہ میں آیا ہے۔ اس کو صحیح استعمال کر کے وہ زندگی بخشنے والے کا پسندیدہ بندہ بھی بن سکتا اور 'رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً' کا مقام بھی حاصل کر سکتا ہے اور اسی کو غلط کاموں میں ضائع کر کے ہمیشہ کے لیے اپنے کو دوزخ کے عذاب کا سزاوار بھی بنا سکتا ہے۔ اس کی فطرت یہ ہے کہ ایک شمشیرِ دو دَم ہے۔ اس کو انسان نے اگر اپنے حق میں استعمال نہ کیا تو یہ آپ سے آپ اس کے ابدی دشمن ــــــ شیطان ــــــ کے حق میں استعمال ہوگا۔ اس کا بہت تھوڑا سا حصہ یعنی صرف حاضر ہے جو اس کے اختیار میں ہے جس میں وہ کوئی تصرّف کر سکتا ہے، باقی یا تو ماضی بن چکا جو کسی قیمت پر بھی واپس نہیں مل سکتا یا مستقبل کے پردوں میں چھپا ہوا ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کتنا ہے اور ہے بھی یا نہیں اور ہے تو وہ اپنے ساتھ کیا احوال و مسائل اور کیا تقاضے و مطالبے

دکھتا ہے۔ جو وقت آتا ہے وہ اپنے مطالبے اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ انسان حاضر کے فرض کو مستقبل پر ٹال سکے۔

اس اہم حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے بعد وہ صحیح طریقہ بتایا ہے جس کو اختیار کرنے والے اپنی مہلتِ حیات سے صحیح فائدہ اٹھاتے اور اس حیاتِ چند روزہ کے بدلے حیاتِ جاوداں پاتے ہیں۔ اگرچہ یہ طریقہ صرف چند لفظوں میں بتایا گیا ہے لیکن ایسے جامع اور حکیمانہ اسلوب میں بتایا گیا ہے کہ انسان تدبر کرے تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں سے متعلق اس پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں جو اسے ادا کرنے ہیں اور جن کے ادا کرنے ہی پر اس کی ابدی فلاح کا انحصار ہے۔

غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ قرآن کا بھی اصل مقصد اسی صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرنا اور انسان کی شخصی و اجتماعی زندگی کو آخرت کے نصب العین کے تحت منظم کرنا ہے۔ گویا جو بات قرآن کی ایک سو چودہ سورتوں میں سمجھائی گئی ہے وہ اس سورہ کی تین آیتوں میں سمو دی گئی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں اشارہ فرمایا ہے کہ "اگر لوگ تنہا اسی سورہ۔ العصر۔ پر غور کریں تو ان کے لیے کفایت کرے"۔

سُوْرَةُ الْعَصْرِ

مَكِّيَّةٌ ________ اٰيات : ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آيات ۱-۳
وَالْعَصْرِ ﴿۱﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾ ع ۱ / ۲۸

ترجمۂ آیات ۱-۳
زمانہ شاہد ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے بجز ان کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔ ۱-۳

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالْعَصْرِ (۱)

لفظ عصر کی تحقیق

'و' قسم کے لیے ہے اور 'عَصْرٌ' کے معنی زمانہ کے ہیں۔ استاذ امام مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس لفظ کی جو تحقیق اپنی تفسیر سورۂ عصر میں بیان فرمائی ہے اس کا خلاصہ ہم اپنے لفظوں میں پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

" 'عصر' کے معنی زمانہ کے ہیں۔ جس طرح لفظ 'دَھْرٌ' میں زمانہ کی مجموعیت کا اعتبار ہے اسی طرح لفظ 'عَصْرٌ' میں اس کے گزرنے اور اس کی تیز روی کی طرف اشارہ ہے چنانچہ اس کا غالب استعمال گزرے ہوئے زمانہ ہی پر ہوتا ہے۔ امرؤ القیس کا مصرع ہے:

وھل ینعمن من کان فی العصر الخالی

(اور اب ان کے لیے کیا مبارکی ہے جو گزرے ہوئے زمانوں میں ہوئے)

علید بن الابرص نے کہا ہے:

فذالک عصر وقد ارانی یحملنی بازل شبوب

(وہ بھی زمانہ تھا جب میں اپنے کو دیکھتا کہ ایک جوان اور خوبصورت اونٹنی پر سوار ہوں)"

کلامِ عرب کی روشنی میں لفظ کی تحقیق بیان کرنے کے بعد مولانا خلاصۂ بحث پیش کرتے ہیں:

" اس سے معلوم ہوا کہ لفظ 'عَصْرٌ' ایک طرف زمانۂ گزشتہ کے احوال و واقعات یاد دلا رہا ہے دوسری طرف اس کی مخصوص صفت تیز روی اور برق رفتاری کی طرف بھی متوجہ کر رہا ہے۔ ان دونوں حقیقتوں کی طرف اشارہ سے ہمارے سامنے دو اہم نتائج آتے ہیں۔ ایک یہ کہ انسانوں پر اللہ تعالیٰ کے فیصلے ان کے اعمال کے اعتبار سے نافذ ہوں گے۔ دوسرا یہ کہ ہم کو زمانہ سے جس کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی تیز روی اور برق رفتاری ہے، زیادہ سے زیادہ مستعدی سے فائدہ اٹھا لینا چاہیے۔"

اب اس سوال پر غور کیجیے کہ زمانہ کی قسم یہاں کیوں کھائی گئی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم سے ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے تاریخ کے ان واقعات کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس دنیا میں قانونِ مجازات کے ظہور کے پیش آئے اور جو قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں بیان ہوئے ہیں۔ دوسری طرف لوگوں کو اس سے جھنجھوڑا ہے کہ لوگ اپنی زندگیاں غفلت میں نہ گزاریں بلکہ پوری

مستعدی سے ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ انہی تیز رو لمحات کے بدلے وہ ابدی بادشاہی حاصل کر سکتے ہیں اگر انھوں نے ان کی صحیح قدر پہچانی اور اگر ان کی قدر نہ پہچانی تو یاد رکھیں کہ یہ ان کے لیے ابدی لعنت بن جائیں گے۔

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس نکتہ کی وضاحت اپنی تفسیر میں یوں فرمائی ہے:

"پچھلی قوموں پر اللہ تعالیٰ کے جو فیصلے نافذ ہوئے وہ ٹھیک ٹھیک ان کے اعمال کا بدلہ تھے۔ انھوں نے نیکیاں اور بھلائیاں کیں تو خدا نے ان کو عروج بخشا اور اگر انھوں نے ظلم و فساد کی راہ اختیار کی تو قانونِ الٰہی نے، اتمامِ حجت کے بقدر مہلت دینے کے بعد ان کو تباہ و برباد کر دیا۔ اسی حقیقت کی یاددہانی کے لیے یہاں زمانہ کی قسم کھائی کہ لوگ یاد رکھیں کہ ایک دن اس قانونِ مکافات سے لازماً انھیں بھی دوچار ہونا ہے۔"

"علاوہ ازیں اس قسم میں ایک اور نازک نکتہ بھی مضمر ہے۔ وہ یہ کہ انسان کا اصل راس المال زمانہ ہی ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ تیز روی اور برق رفتاری میں کوئی چیز بھی اس سے بڑھ کر نہیں ہے۔ پھر یہ انسان کی کیسی نادانی ہے کہ وہ زمانہ کی اس بے وفائی سے واقف ہونے کے باوجود اس پر بھروسہ کرتا اور زندگی کی بے ثباتی، قیامت کی بازپرس اور جزائے عمل کے قانون سے غافل رہتا ہے۔"

اس حقیقت کو مولانا مثال سے یوں سمجھاتے ہیں:

"اس معاملے میں انسان کی مثال بالکل اس تاجر کی ہے جو برف کی تجارت کرتا ہے، لیکن بجائے اس کے کہ جلد سے جلد اس کو بیچ کر اپنے دام کھرے کرنے کی فکر کرے اس کو اس نے رکھ چھوڑا اور اس کی چمک اور ٹھنڈک کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ناعاقبت اندیش تاجر کو بہت جلد اپنی غفلت پر کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔"

اسی سلسلہ میں ایک اور نکتہ کی طرف مولانا ان لفظوں میں اشارہ فرماتے ہیں:

"علاوہ بریں زمانہ کی تیز روی میں ایک پہلو بشارت اور تقویتِ صبر کا بھی ہے۔ وہ اس طرح کہ اس تھوڑی سی مدت میں اگر انسان چاہے تو اجر و ثواب کا ایک لازوال خزانہ جمع کر سکتا ہے۔ ایک بدبخت انسان اس حیاتِ فانی کی چند روزہ لذتوں پر ریجھ کر اپنے کو ابدی مسرت و کامیابی سے محروم کر لیتا ہے لیکن ایک عاقل اسی فانی زندگی کے چند دنوں کے اندر، جن کی حقیقت ایک خواب اور برقِ خاطف سے زیادہ نہیں، تقویٰ اور ضبطِ نفس کی آزمائشیں جھیل کر ...... خدا کی خوشنودی اور اس کی محبت کا ابدی تخت و تاج حاصل کر لیتا ہے۔"

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۝ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (۳-۲)

اصل بات — یہ وہ اصل بات ہے جس کو ثابت کرنے کے لیے زمانہ کی قسم کھائی گئی ہے۔ جب ایک طرف مہلتِ حیات کی اہمیت اور قدر و قیمت کا حال یہ ہے کہ اسی کے بدلے میں انسان ابدی بادشاہی حاصل کر سکتا ہے اور اگر اس سے غفلت برتے تو یہ اس کے لیے ابدی لعنت بن جاتی ہے۔ دوسری طرف اس کی تیز روی کا یہ حال ہے کہ ہر سیکنڈ کے ساتھ وہ ماضی کے اندر تحلیل ہوتی جا رہی ہے اور اس پر انسان کو کوئی قابو نہیں تو وہ سارے انسان انتہائی خسارے میں ہوئے جن کا اصل راس المال اس تیزی سے برباد ہو رہا ہے اور وہ اس سے غافل ہوں۔ چنانچہ اس کو شہادت میں پیش کر کے فرمایا کہ انسان گھاٹے میں ہیں بجز ان کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے۔

اس سے معلوم ہوا کہ زندگی کی ساری قدر و قیمت ایمان اور عمل صالح کے اندر مضمر ہے۔ خالق نے یہ عطا فرمائی ہی اس لیے ہے کہ انسان اس کو شیطان کے علی الرغم اپنے رب کے بنائے ہوئے طریقے کے مطابق گزارے اور اس کے صلہ میں 'رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً' کی سند اور ابدی جنت کا ٹکٹ حاصل کرے۔ چند دنوں کے امتحان کے بدلے میں ابدی جنت کا انعام جس طرح کوئی معمولی انعام نہیں اسی طرح اس کو شیطان کی ترغیبات کے جال میں پھنس کر کھو بیٹھنا بھی کوئی معمولی محرومی نہیں ہے۔

ایمان کا مفہوم — ایمان کی تعریف اس کتاب میں جگہ جگہ بیان ہو چکی ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ خدا کو اس کی تمام صفات اور ان کے لازمی مقتضیات کے ساتھ پورے صدقِ دل سے تسلیم کرنا ایمان ہے۔ استاذ امام فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں ایمان کا مفہوم ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

"ایمان کی اصل 'امن' ہے۔ یہ لفظ لغت میں مختلف معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

'اٰمَنَہٗ' ای اعطاہ امنًا' (اس کو امن دیا) قرآن میں ہے: 'وَاٰمَنَھُمْ مِّنْ خَوْفٍ' (قریش - ۱۰۶: ۴) (اور ان کو خوف سے امان دی)۔ 'اٰمَنَ لَہٗ' صدقہ و اعتمد علیہ (اس کی تصدیق کی، اس پر اعتماد کیا) 'اٰمَنَ بِہٖ' ایقن بہ (اس کا یقین کیا)"

"قرآن مجید میں یہ لفظ مذکورہ تمام صورتوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے مشتقات میں سے لفظ 'مُؤْمِنٌ' اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں آنے والے بندوں کو پناہ دیتا ہے۔"

"یہ ایک قدیم دینی اصطلاح بھی ہے .... پس وہ یقین جو خشیت، توکّل اور اعتقاد کے تمام لوازم و شرائط کے ساتھ پایا جائے، ایمان ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر، اس کی آیات پر، اس کے احکام پر ایمان لائے، اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دے

اس کے فیصلوں پر راضی رہے وہ مومن ہے۔"

عملِ صالح

ایمان کے بعد عملِ صالح کی حیثیت اس کے لازمی مقتضی کی ہے۔ جب حقیقی ایمان پیدا ہو گا تو وہ لازماً زندگی کے باطنی گوشوں کی طرح اس کے ظاہری اعمال کو بھی منور کرے گا۔ اگر ایمان سے اس کے تقاضوں کے مطابق عمل نہ پیدا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایمان نے دل میں جڑ نہیں پکڑی۔ ایمان اور عمل میں مطابقت اور ہم آہنگی ہونا لازمی ہے۔ امام فراہیؒ اپنی تفسیر میں اس نکتہ کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:

"قرآن مجید میں ایمان کے بعد عملِ صالح کا جو ذکر آتا ہے وہ درحقیقت ایک طرح کی تفصیل و توضیح ہوتی ہے ...... اسی طرح اطاعتِ رسول کو اطاعت اللہ پر جو عطف کیا جاتا ہے یہ بھی عطفِ تفصیل ہوتا ہے .... اس تفصیل کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ بعض اہم الفاظ کے بعض پہلو مخفی رہ جاتے ہیں۔ ایمان کے معاملہ میں اس توضیح کی ضرورت بالکل ظاہر ہے۔ ایمان کا محل دل اور عقل ہے۔ عقل اور دل کے معاملات میں انسان نہ صرف دوسروں کو دھوکا دے سکتا ہے بلکہ بسا اوقات خود بھی دھوکے میں رہتا ہے۔ وہ اپنے کو مومن سمجھتا ہے حالانکہ وہ مومن نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے ایمان کے دو شاہد قرار دیے گئے۔ ایک قول اور دوسرا عمل۔ قول بھی چونکہ جھوٹ ہو سکتا ہے اس وجہ سے صرف زبان سے اقرار کرنے والا مومن نہیں قرار دیا گیا بلکہ ضروری ہوا کہ آدمی کا عمل اس کے ایمان کی تصدیق کرے[1]۔ چنانچہ فرمایا ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا (النساء - ۴: ۱۳۶) اے وہ لوگو جو زبان سے ایمان لائے ہو! عمل سے ایمان لاؤ۔"

اعمالِ حسنہ کو 'صالحات' سے تعبیر کرنے کی حکمت امام فراہیؒ نے ان الفاظ میں واضح فرمائی ہے:

اعمالِ حسنہ کو صالحات سے تعبیر کرنے کی حکمت

"اللہ تعالیٰ نے اعمالِ حسنہ کو صالحات سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس لفظ کے استعمال سے اس عظیم حکمت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ انسان کی تمام ظاہری و باطنی، دینی و دنیوی، شخصی و اجتماعی، جسمانی و عقلی صلاح و ترقی کا ذریعہ اعمالِ صالحہ ہی ہیں۔ یعنی عملِ صالح

---

[1] یہ امر واضح رہے کہ یہاں زیرِ بحث حقیقی ایمان ہے، فقہی اور قانونی ایمان پر بحث نہیں ہے۔ جو لوگ فقہی اور قانونی ایمان کی نوعیت سمجھنا چاہتے ہوں وہ اس بحث کو اس کے محل میں دیکھیں۔ مولانا فراہیؒ نے اس کے بعض اہم پہلوؤں کی طرف تفسیر سورۂ عصر میں اشارے کیے ہیں اور ہم نے بھی اس کتاب میں بعض جگہ اس کے بعض پہلو واضح کیے ہیں۔

وہ عمل ہو اجو انسان کے لیے زندگی اور نشوونما کا سبب بن سکے اور جس کے ذریعے سے انسان ترقی کے ان اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکے جو اس کی فطرت کے اندر ودیعت ہیں۔"

آگے چل کر اس نکتہ کی مزید وضاحت انھوں نے یوں فرمائی ہے:

"اس نکتہ کو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ سکتے ہیں کہ انسان کائنات کی مجموعی مشین کا ایک پرزہ ہے۔ اس وجہ سے اس کے اعمال میں سے صالح صرف وہی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی اس حکمت و تدبیر کے موافق ہوں جو اس نے اس مجموعی نظام کے لیے پسند فرمائی ہے۔ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے بازیچۂ اطفال نہیں بنایا ہے، بلکہ ایک خاص نظامِ حکمت ہے جو اس پورے کارخانہ میں جاری ہے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ اس کائنات کے اندر جو کچھ ہو اسی نظامِ حکمت کے تحت ہو، اس سے الگ ہو کر نہ ہو۔"

انسان پر اس کے معاشرہ کا حق

'وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ' اوپر والے ٹکڑے میں جو بات ارشاد ہوئی ہے اس کا تعلق اصلاً انسان کی انفرادی زندگی سے ہے لیکن انسان صرف انفرادی زندگی نہیں رکھتا بلکہ وہ فطرتاً معاشرتی مزاج رکھنے والی مخلوق ہے اور جہاں بھی پایا جاتا ہے کسی خاندان کے رکن اور معاشرہ کے ایک فرد کی حیثیت سے ہی پایا جاتا ہے۔ اگر اس نے اس کے خلاف کوئی اور روش زندگی کی اختیار کی ہے تو اپنے فطری مزاج کے تقاضے سے نہیں بلکہ کسی غیر فطری انحراف کے باعث اختیار کی ہے۔ خاندان اور معاشرہ کے ساتھ اس کا تعلق فطری ہے۔ وہ جس طرح اپنی مادی زندگی کی تعمیر و ترقی میں ان سے سہارا حاصل کرتا ہے اسی طرح اپنے اخلاقی و روحانی ارتقا میں بھی ان سے رہنمائی پاتا ہے۔ یہیں سے اس پر خاندان اور معاشرہ کا یہ حق قائم ہو جاتا ہے کہ وہ ان کی صلاح و فلاح کے فرض سے غافل نہ رہے ورنہ یہ چیز اس کی فتوّت کے خلاف ہو گی۔ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ جو لوگ ایمان و عمل کی صراطِ مستقیم سے آشنا ہوں وہ دوسروں کو بھی اس حق کی تلقین کریں جس کی راہ ان پر ایمان و عمل صالح کی زندگی نے کھولی ہے اور ساتھ ہی ایک دوسرے کو صبر و عزیمت کی بھی تلقین کریں اس لیے کہ صبر و عزیمت کے بغیر نہ حق کو اختیار کرنا اور اس پر قائم رہنا آسان ہے اور نہ اس کی دعوت دینا کوئی سہل بازی ہے۔

ایک دقیق نکتہ

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ بات یوں نہیں فرمائی کہ 'وہ ایمان اور عمل صالح کی دعوت دیتے ہیں' بلکہ یوں فرمائی کہ 'وہ حق اور صبر کی ایک دوسرے کو تلقین کرتے ہیں'۔ اس اسلوب نے وہ باتیں بھی اپنے اندر سمیٹ لی ہیں جو پہلے ٹکڑے میں ہیں اور ان کے اوپر مزید نہایت اہم اضافے بھی کر دیے ہیں۔ لفظ 'حق' کے اندر ایمان بدرجۂ اولیٰ داخل ہے اس لیے کہ وہ خدا کا حق اور سب سے بڑا حق ہے۔ اسی طرح اعمالِ حسنہ کا تعلق بھی یا تو خدا کے حقوق سے ہے یا بندوں کے حقوق سے اس وجہ

سے وہ بھی اس میں داخل ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ ساری باتیں حقوق اور فرائض کی طرح ادا بھی کرتے ہیں، دوسروں کو اس کی تلقین بھی کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ حکمت بھی لوگوں کو بتاتے ہیں کہ حقوق کو ادا کرنا کوئی سہل بازی نہیں ہے، اس کے لیے صبر و عزیمت ضروری ہے۔ جن کے اندر یہ وصف نہیں ہوگا ان کے لیے حقوق کا ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔

حق کا مفہوم

'حق' کی وضاحت امام فراہیؒ نے اپنی تفسیر میں یوں فرمائی ہے:

"'حق' اصل میں کہتے تو ہیں موجود و قائم کو لیکن استعمال میں اس کے معنی مختلف ہو گئے ہیں۔ کم از کم تین معنوں میں تو اس کا استعمال معروف ہے:

۱۔ وہ بات جس کا واقع ہونا قطعی ہو۔

۲۔ وہ بات جو عقل کے نزدیک مسلّم ہو۔

۳۔ وہ بات جو اخلاقاً فرض ہو۔"

ان تینوں معنوں کی تائید میں قرآن سے دلائل نقل کرنے کے بعد مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں:

"باقی رہا اس کا خاص مفہوم یعنی غریبوں اور کمزوروں کی ہمدردی تو وہ اسی عام معنی سے نکلا ہوا ہے۔ گویا اہل عرب کے نزدیک سب سے بڑا حق یہی ہے جو ہر صاحب استطاعت پر لازم ہے اور جو ہر مستحق کو حاصل ہونا چاہیے جو عقل کے نزدیک مسلّم اور تمام اچھے لوگوں کے نزدیک بالکل متعیّن و معروف ہے۔ اسی سبب سے احسان کو معروف کہتے ہیں یعنی ایک ایسی چیز جو ہر شخص کے نزدیک جانی پہچانی ہوتی ہے اور تمام معقول لوگوں کے اندر مسلّم قانون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق کے معنی اگر غریبوں کی ہمدردی کے لیے جائیں تو اس کے اندر ان تمام معانی کی جھلک موجود رہے جو اوپر مذکور ہوئے۔"

صبر کا

'صبر' کی تحقیق کے ذیل میں مولانا فراہیؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ عربوں کے نزدیک صبر کوئی عجز و تذلّل کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جو بے بسوں اور درماندوں کا شیوہ ہے بلکہ ان کے نزدیک یہی تمام قوت و استقامت کی بنیاد ہے۔ کلامِ عرب میں یہ لفظ بہت استعمال ہوا ہے اور اس کے تمام استعمالات سے اسی حقیقت کی تائید ہوتی ہے۔ حاتم طائی کہتا ہے:

وغمرة موت ليس فيها هوادة　　　يكون صدور المشرفي جسورها

(موت و ہلاکت کے کتنے ہولناک دریا جن پر تلواروں کے پل تھے)

صبرنا له في نهكها ومصابها　　　بأسيافنا حتى يبوخ سعيرها

(ہم نے ان کی تمام آفات کے مقابلہ میں اپنی تلواروں کے ساتھ ثابت قدمی دکھائی یہاں تک کہ

وہ ٹھنڈے پڑ گئے"۔

بعض دوسرے مشہور شاعروں کے کلام سے نظائر پیش کرنے کے بعد مولانا فراہیؒ نے 'صبر' کا مفہوم خود قرآن سے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:

"'صبر' کا اصل مفہوم قرآن نے خود کھول دیا:

وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ (البقرۃ - ۲ : ۱۷۷) اور صبر کرنے والے سختی میں، تکلیف میں اور لڑائی کے وقت۔"

"اس آیت میں صبر کے تین موقعے ذکر ہوئے ہیں: غربت، بیماری اور جنگ۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ تمام مصائب و شدائد کے سرچشمے یہی تین ہیں جو ان تینوں امتحانوں میں ثابت قدم رہتے ہیں وہ صابر ہیں۔"

حق و صبر کے باہمی تعلق کی مزید وضاحت کرتے ہوئے مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں:

"خلاصہ ان تفصیلات کا یہ ہے کہ 'حق' تمام بھلائیوں کے دروازے کھولتا ہے اور 'صبر' تمام برائیوں کے دروازے بند کرتا یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ 'حق' اصل محبوب و مطلوب ہے اور 'صبر' اس کے لیے جوش طلب اور سرگرمی ہے۔"

'اہل بصیرت سے یہ راز مخفی نہیں ہے کہ سعادت کے حاصل ہو جانے کے بعد اصلی چیز اس پر جمے رہنا ہے۔ اب غور کرو، دو لفظوں —— حق اور صبر —— کے اندر تمام سعادتیں اور بھلائیاں کس خوبی و اختصار کے ساتھ جمع ہو گئی ہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان کس قدر گہرا اور وسیع تعلق ہے۔"

. . . .

"یہاں درحقیقت ایک ہی جڑ سے کئی شاخیں نکلی ہیں۔ ایمان ایک اصل اور مرکز کی حیثیت سے ہے۔ اس کے بعد عمل صالح کا ذکر اس کی تفصیل کی حیثیت سے آیا۔ اسی طرح حق چونکہ دل و دماغ دونوں کو محبوب ہے اور اسی پر ان دونوں کے عروج و کمال کا انحصار ہے اس وجہ سے اس کی محبت کے نتیجہ کے طور پر صبر کا بیان ہوا۔ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب کے لیے آدمی کے اندر ثابت قدمی اور استقامت پیدا ہو۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ثابت قدمی اور استقامت محبوب کی حیثیت کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ جو شے جس قدر محبوب ہوگی اس کے لیے اسی قدر پامردی و استقلال کا جوش اُبلے گا۔ مدافعت، غضب، اور غیرت کے جذبات کا ظہور ہر شے کے لیے یکساں نہیں ہوتا بلکہ مختلف درجہ کا ہوتا ہے۔ دل کو جو شے جس قدر عزیز ہوتی ہے اس کے لیے اسی درجہ کا جذبۂ غیرت و حمیت بھڑکتا ہے۔"

"اللہ تعالیٰ کے غضب اور انتقام کی بنیاد بھی یہی ہے کہ اس کو حق عزیز و محبوب ہے اس وجہ سے جو لوگ اس کو پامال کرتے ہیں ان پر اس کا قہر و غضب بھڑکتا ہے۔ جو شے تم کو عزیز و محبوب ہو گی کیا تم اس کی تحقیر و اہانت چپ چاپ برداشت کر لو گے؟ اس کی حمایت کے لیے تمہاری غیرت ضرور جوش میں آئے گی۔ ماں اپنے بچہ سے محبت کرتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ یہ محبت تنہا نہیں ہوتی بلکہ اپنے ساتھ ایک مجنونانہ غیرت بھی رکھتی ہے اور جب وقت آتا ہے ماں کو بچہ کی مدافعت میں قربان کر دیتی ہے۔ یہی جوشِ غیرت و حمایت قوموں میں اپنے قومی حقوق و مطالبات کے لیے ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مسکین کبوتری بھی اپنے انڈوں اور بچوں کے لیے اپنے اندر محبت کا جذبہ اور غیرت کا جوش رکھتی ہے۔ اگر تم اس کے انڈوں اور بچوں کو اس سے چھیننا چاہو گے تو وہ اپنے کمزور پروں سے ضرور تم کو دفع کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ صبر درحقیقت محبتِ حق سے پیدا ہوتا ہے۔"

ایک اور نازک سوال کا جواب

اب اس سوال پر غور کیجیے کہ 'ایمان و عملِ صالح' اور 'تواصی بالحق والصبر' میں باہم کیا تعلق ہے؟ استاذ امام فراہیؒ اس سوال کا یہ جواب دیتے ہیں:

"'وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ' سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر حق اور صبر کی صفات موجود ہیں اور یہ ان پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی ان کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ مضمون آیت کے اندر مضمر ہے اور اس کی تصریح نہیں کی گئی ہے۔ اس کی وجہ اوّل تو یہ ہے کہ 'اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ' کے اندر یہ بات موجود تھی۔ ثانیاً وعظِ بے عمل کی برائی اس قدر واضح ہے کہ اس مدح کے محل میں یہ تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ لوگ دوسروں کو حق و صبر کی نصیحت کریں گے اور خود ان اوصاف سے محروم ہوں گے۔"

"اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ایمان سے عملِ صالح وجود میں آیا اسی طرح 'عملِ صالح' سے 'تواصی' وجود میں آیا۔ جس شخص کی نگاہوں میں 'حق' محبوب ہو جائے گا اور وہ اس کی خاطر صبر و استقامت کی کڑیاں بھی جھیلنے پر آمادہ ہو گا اس کے بارے میں لازماً اس کا علم اس کی محبت اور اس کی غیرت بڑھ جائے گی۔ وہ صرف یہی نہیں چاہے گا کہ خود ہی اس سے محبت کرے بلکہ یہ بھی چاہے گا کہ ساری دنیا اس سے محبت کرے اور وہ جہاں کہیں بھی حق کو مظلوم و مقہور اور باطل کو غالب و فتحمند دیکھے گا، تڑپ اٹھے گا اور ایک غیور و اولوالعزم انسان کی طرح دوسروں کو بھی ابھارے گا کہ وہ حق کی حمایت کے لیے کمربستہ ہوں۔ اس کا دوسروں کو یہ ابھارنا بھی خود اس کے اپنے ہی جذبۂ حمیتِ حق کا ایک قدرتی نتیجہ اور اسی کا ایک حصہ ہے۔ پس یہاں 'تواصی' کا ذکر 'عملِ صالح' کے ایک

جزو اور اس کی توضیح کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔"

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا۔

لاہور
۲۴ - اپریل ۱۹۸۰ء
۸ - جمادی الثانی ۱۴۰۰ھ

تدبّرِ قرآن

۱۰۴

الھمزۃ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلق اور ترتیبِ بیان

یہ سورہ سابق سورہ ——— العصر ——— کی مثنیٰ ہے۔ دونوں کے مضمون میں نہایت واضح مناسبت، جو باوّل وہلہ سامنے آتی ہے، یہ ہے کہ سابق سورہ میں فلاح پانے والے انسانوں کا کردار یہ بیان ہوا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو حق و صبر کی تلقین کرتے ہیں اور اس سورہ میں اس کے بالکل ضد کردار یعنی ان بخیلوں کا کردار بیان ہوا ہے جو روپیہ گن گن کر رکھتے ہیں اور لوگوں کو ادائے حقوق پر ابھارنا تو درکنار، کسی کو اگر دیکھ پائیں کہ وہ ادائے حقوق کے معاملے میں عملاً و قولاً سرگرم ہے تو اپنے طعن و طنز اور ہمز و لمز سے اس کا قافیہ تنگ کر دیتے ہیں اور ان کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح اس کا حوصلہ اتنا پست کر دیں کہ وہ بھی انہی کی طرح بے حس و بے غیرت بن کر رہ جائے تاکہ اس کی بخالت پر پردہ پڑا رہے اور اس کی دعوت و تلقین سے ان کے ضمیر کو خفت و ندامت کی اذیت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

قرآن نے بخیل سرمایہ داروں کے اس کردار کی طرف جگہ جگہ اشارہ کیا ہے۔ مثلاً سورۂ توبہ میں فرمایا ہے:

اَلَّذِیۡنَ یَلۡمِزُوۡنَ الۡمُطَّوِّعِیۡنَ
مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ فِی الصَّدَقٰتِ
وَالَّذِیۡنَ لَا یَجِدُوۡنَ اِلَّا
جُهۡدَهُمۡ فَیَسۡخَرُوۡنَ
مِنۡهُمۡ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنۡهُمۡ ۫
وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۝
(التوبۃ - ۹ : ۷۹)

جو لوگ خوش دلی سے انفاق کرنے والے اہلِ ایمان پر ان کے صدقات کے باب میں نکتہ چینی کرتے ہیں اور جو غریب اپنی محنت و مزدوری ہی سے انفاق کرتے ہیں تو ان پر پھبتیاں چست کرتے ہیں، اللہ نے ان کا مذاق اڑایا اور ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔

اس آیت کے تحت ہم نے تدبرِ قرآن میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ضروری حصہ ہم یہاں نقل کیے دیتے ہیں تاکہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے:

"'مُتَطَوِّعٌ' اور 'مُطَّوِّعٌ' دونوں ایک ہی لفظ ہیں۔ 'مُطَّوِّعٌ' اس کو کہتے ہیں جو صرف فرائض و واجبات ہی ادا کر لینے پر قناعت نہ کر بیٹھے بلکہ اپنی خوشی اور حوصلہ مندی سے نفلی نیکیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔"

'لَمْزٌ' کے معنی عیب لگانا، ہجو کرنا، مذمّت کرنا۔"

"اوپر کی آیات میں یہ بیان ہوا ہے کہ منافقین نہ صرف یہ کہ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے بلکہ دوسروں کو بھی خدا کی راہ میں خرچ کرتے دیکھ نہیں سکتے۔ جس کو خرچ کرتے دیکھتے ہیں اس کو فوراً ہمز و لمز کا نشانہ بنا لیتے ہیں۔ جو فیاض اور مخلص مسلمان اپنی فیاضی اور خوش دلی سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کو تو کہتے ہیں کہ یہ ریاکار اور شہرت پسند ہے، اپنی دینداری کی دھونس جمانے کے لیے خرچ کر رہا ہے۔ اور جو غریب بے چارے کچھ رکھتے ہی نہیں، بس اپنی محنت مزدوری کی گاڑھی کمائی ہی میں سے کچھ اللہ کی راہ میں دیتے ہیں ان کی حوصلہ شکنی کے لیے یہ ان کا مذاق اڑاتے اور ان پر پھبتیاں چست کرتے ہیں کہ لو، آج یہ بھی اٹھے ہیں کہ حاتم کا نام دنیا سے مٹا کے رکھ دیں گے۔"

بخیلوں اور کنجوسوں کی نفسیات کا یہ پہلو ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اپنی بخالت پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے ان کی کوشش ہمیشہ یہ رہتی ہے کہ دوسرے بھی بخیل بنے رہیں۔ ننگا دوسروں کو بھی ننگا ہی دیکھنا چاہتا ہے تاکہ اسے کوئی ننگا کہنے والا باقی نہ رہے۔ یہی نفسیات ان بخیلوں کی بھی تھی۔ پھر اس سے ان کے اسلام دشمنی کے جذبہ کو بھی تسکین ہوتی تھی۔ وہ نہ خود خدا کی راہ میں کوڑی خرچ کرنا چاہتے تھے، نہ اس بات پر راضی تھے کہ کوئی دوسرا خرچ کرے۔ اپنی اس خواہش کے برخلاف جب دوسروں کو دیکھتے کہ وہ اسلام کے لیے اس دریا دلی سے لٹا رہے ہیں گویا اپنے ہی گھر بھر رہے ہیں، یہاں تک کہ مزدور اپنی مزدوری میں سے، بیوی بچوں کا پیٹ کاٹ کر، اس خوشی سے دیتا ہے گویا اپنی آدھ سیر کھجور یا جَو کے عوض دولتِ کونین خرید رہا ہے تو ان بخیلوں کے سینہ پر سانپ لوٹ جاتا۔ وہ غصّہ سے کھولتے اور حسد سے جلتے پھر اپنے دل کا بخار طعن و تشنیع، طنز اور پھبتی سے نکالتے۔[۱]"

بخیلوں کا یہ کردار ان کی بے بسی کی تصویر ہے۔ بخالت کے سبب سے نہ یہ حوصلہ ان کے اندر ہوتا کہ ادائے حقوق کے میدان میں سبقت کر سکیں اور نہ ادائے حقوق کی دعوت

۱؎ تدبرِ قرآن۔ جلد سوم، صفحات: ۲۰۲ - ۲۰۳

دینے والوں کی زبانیں ہی بند کر سکتے۔ اپنی مدافعت کی واحد تدبیر ان کے پاس صرف یہ رہ جاتی ہے کہ ان لوگوں کا مذاق اڑائیں اور ان پر پھبتیاں چست کریں جن کی دعوت سے ان کی پردہ دری ہو رہی ہو۔ ان کی یہ کوشش چونکہ اپنے باطن پر پردہ ڈالنے کی تھی اس وجہ سے قرآن نے اس سورہ میں ان کے ظاہر و باطن کے ہر گوشہ کو اچھی طرح بے نقاب کر دیا ہے۔

یہ امر واضح رہے کہ ان سورتوں میں اگرچہ اصلاً زیرِ بحث بخیلوں کا کردار ہے لیکن یہی کردار ان لوگوں کا بھی ہوتا ہے جو دوسری اخلاقی کمزوریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ بھی اپنے سے برتر کردار رکھنے والوں کا مقابلہ ہمیشہ اپنے ہمز و لمز سے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قومِ لوط کے گنڈوں نے جب دیکھا کہ حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی دعوتِ اصلاح کے مقابل میں ان کے لیے اپنی آبرو بچانا دشوار ہو رہا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ اپنے رویہ کی اصلاح کرتے انھوں نے حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں پر فقرے چست کرنے شروع کر دیے کہ "یہ لوگ بڑے پارسا بنتے ہیں"[۱] اور قوم کو ابھارا کہ ان لوگوں کو ملک سے باہر نکالو، ورنہ یہ پوری قوم کو ذلیل کر دیں گے۔

---

[۱] إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ (النمل - ۲۷: ۵۶)

سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ

مَكِّيَّةٌ ________ آیات: ۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیات ۱-۹ وَیْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ﴿۲﴾
یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۚ﴿۳﴾ كَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ ۖ﴿۴﴾
وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ؕ﴿۵﴾ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ﴿۶﴾ الَّتِیْ
تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ؕ﴿۷﴾ اِنَّهَا عَلَیْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۙ﴿۸﴾
فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۠﴿۹﴾ ع ۹ / ۲۹

ترجمۂ آیات ۱-۹ ہلاکی ہو ہر اشارہ باز، عیب جُو کے لیے! جس نے مال سمیٹا اور اس کو گنتا رہا۔ گویا اس کے مال نے اس کو زندۂ جاوید کر دیا۔ ۱-۳

ہرگز نہیں، وہ چُور چُور کر دینے والی میں پھینکا جائے گا اور تم کیا سمجھے کہ چُور چُور کر دینے والی کیا ہے! اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ! جو دلوں پر جا چڑھے گی۔ اس میں وہ موندے ہوئے ہوں گے۔ لمبے ستونوں میں جکڑے ہوئے۔ ۴-۹

الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَیۡلٌ لِّکُلِّ ہُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِ (۱)

ایک ہی کردار کے دو پہلو

'ھمز' کے معنی اشارہ بازی کرنے اور 'لمز' کے معنی عیب لگانے کے ہیں۔ 'ھُمَزَۃ' اور 'لُمَزَۃ' مبالغہ کے صیغے ہیں اور اسی سورہ میں آگے 'حُطَمَۃ' بھی اسی وزن پر آیا ہے۔ 'ھُمَزَۃ' کے معنی اشارہ باز اور 'لُمَزَۃ' کے معنی عیب جُو اور عیب چیں کے ہیں۔ اشارہ بازی کا تعلق زیادہ تر حرکتوں اور اداؤں سے ہے اور عیب جوئی کا تعلق زبان سے۔ یہ دونوں ایک ہی کردار کے دو پہلو ہیں۔ جب کسی کا مذاق اڑانا، اس کا تہتک کرنا اور اس کو دوسروں کی نگاہوں سے گرانا مقصود ہو تو اس میں اشارہ بازی سے بھی کام لیتے ہیں اور زبان سے بھی۔ اشارہ بازی سے کسی کی تضحیک و تحقیر کے جو پہلو پیدا کیے جا سکتے ہیں بسا اوقات وہ زبان کی فقرہ بازیوں سے زیادہ کارگر ہوتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے 'ھُمَزَۃ' کو مقدم رکھا ہے۔

ھمز و لمز کی عادت مہذب اور شائستہ سوسائٹی میں ہمیشہ عیب سمجھی گئی ہے۔ تمام آسمانی مذاہب میں اس کی ممانعت وارد ہے۔ قرآن مجید میں نہایت واضح الفاظ میں اس سے روکا گیا ہے:

وَلَا تَلۡمِزُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ وَلَا تَنَابَزُوۡا بِالۡاَلۡقَابِ ط (الحجرات - ۴۹: ۱۱)	اور اپنے آپس میں ایک دوسرے کو عیب نہ لگاؤ اور ایک دوسرے پر پھبتیاں چست نہ کرو۔

دعوتِ حق کا مقابلہ اوچھے ہتھیاروں سے

لیکن جدید جاہلیت کی طرح قدیم جاہلیت میں بھی اس فن کو بڑا فروغ حاصل رہا ہے۔ اس زمانے میں جس طرح اخباروں میں مزاحیہ کالم بھی ہوتے ہیں اور کارٹون بھی چھپتے ہیں جو اشاروں کی زبان میں حریفوں کی تضحیک کرتے ہیں اسی طرح قدیم زمانے میں نقّال، بھانڈ اور فقرہ باز ہوتے تھے جو اجرت لے کر شریفوں کی پگڑیاں اچھالتے اور اپنے سرپرستوں کا جی خوش کرتے۔ سورۂ قلم میں قریش کے لیڈروں اور ان کے گنڈوں پر قرآن نے جو جامع تبصرہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی مسلمانوں کی 'تَوَاصِیْ بِالْحَقِّ وَالصَّبْرِ' کی دعوت کو اسی حربے سے شکست دینے کی کوشش کی جو حربے اس زمانے کے پیشہ ور لیڈر اپنے حریفوں کو شکست دینے کے لیے اختیار کرتے ہیں۔
چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان ہتھکنڈوں سے ہوشیار رہنے کی ہدایت فرمائی گئی:

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۙ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيمٍ ۙ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۙ عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ ۙ أَن كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ ۙ (القلم ۶۸: ۱۰-۱۴)

اور تم ہر لپاٹیے ذلیل کی بات کا دھیان نہ کرو، اشارہ باز اور لگانے بجھانے والے کا، بھلائی سے روکنے والا، حدود سے تجاوز کرنے والا اور حق کو تلف کرنے والا۔ اجڈ مزید برآں چاپلوس۔ بوجہ اس کے کہ وہ مال و اولاد والا ہوا۔

الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ (۲)

بخیل سرمایہ داروں کی نہایت جامع تصویر

یعنی حقوق کی یاد دہانی اور نصیحت کرنے والوں کو تو انھوں نے ہمز و لمز کے حربے سے چپ کرنے کی کوشش کی اور خود مال جمع کرنے اور اس کو گن گن کر سینتنے میں لگے رہے۔ مال کے حریص و بخیل مال داروں کی یہ نہایت جامع تصویر ہے۔ ان کا دل و دماغ ہمیشہ اپنے سرمایہ کے حساب کتاب میں لگا رہتا ہے۔ کس کاروبار میں کتنا منافع ہوا ہے؟ فلاں سرمائے سے یافت کی کتنی توقع ہے؟ فلاں خسارہ جو ہوا ہے اس کی تلافی کی کیا صورت ہوگی؟ اگلے سال تک سرمایہ کی مجموعی مقدار کہاں تک پہنچ جائے گی؟ اسی طرح کے سوال ہمیشہ ان کے دل و دماغ پر مستولی رہتے ہیں۔ اگر کسی نے ذکر کیا کہ فلاں نے غریبوں اور یتیموں کی امداد کے لیے اتنا خرچ کیا ہے تو اس پر پھبتی چست کر دی کہ شیخی باز ہے، اپنی دولت مندی کی دھونس جماتا ہے۔ آخر ہم بھی تو ڈھیروں مال لٹاتے ہیں لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔

يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ (۳)

بخیلوں کے باطن پر ایک عکس

یہ ان کے اس انہماک کے باطن پر عکس ڈالا گیا ہے کہ یہ انہماک پتہ دیتا ہے کہ وہ گویا یہ خیال کیے بیٹھے ہیں کہ یہ مال ان کو زندۂ جاوید رکھے گا۔ اگر وہ جانتے کہ یہ مال بھی فانی اور ان کی زندگی بھی فانی ہے تو وہ مال کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنے میں سبقت کرتے جو ان کی ابدی زندگی میں کام آنے والا ہوتا لیکن اس کی محبت میں ان کا یہ استغراق پتہ دیتا ہے کہ وہ اس مال ہی میں اپنی زندگی پا گئے ہیں۔ اسی ذہنیت کی تصویر سورۂ شعراء میں کھینچی گئی ہے:

أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ ۙ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ۚ (الشعراء ۲۶: ۱۲۸-۱۲۹)

کیا تم ہر بلندی پر عبث یادگاریں تعمیر کرتے اور شاندار محل تعمیر کرتے رہو گے گویا تمھیں ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔

آدمی کے باطن کا سراغ دینے والی اصل چیز اس کی زبان نہیں بلکہ اس کی زندگی کا رویہ ہے۔

جو آدمی اسی دنیا کو اپنی منزل سمجھتا ہے اس کی زندگی اس شخص کی زندگی سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو اس دنیا کو منزل نہیں بلکہ راہ سمجھتا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ جو شخص آخرت کا قائل اور اس کا طالب ہو وہ اپنا مال گن گن کر اس دنیا کے بنکوں اور تجوریوں میں رکھے بلکہ وہ اپنا مال اپنے خداوند کے پاس رکھتا ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ "تو اپنا مال اپنے خداوند کے پاس رکھ اس لیے کہ جہاں تیرا مال رہے گا وہیں تیرا دل بھی رہے گا۔"

كَلَّا لَيُنۢبَذَنَّ فِى ٱلْحُطَمَةِ (۴)

بخیلوں کے سرمایہ کا حشر

'کَلَّا' یہاں اس خیالِ باطل کی تردید کے لیے ہے جو 'يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُۥٓ أَخْلَدَهُۥ' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ فرمایا کہ ہرگز نہیں، وہ بھی اور اس کا یہ سارا اندوختہ بھی چور چور کر دینے والی میں پھینک دیا جائے گا۔ 'حُطَمَةٌ'، 'حطم' کے مادہ سے ہے جس کے معنی چور چور کر دینے کے ہیں۔ یہ بھی 'هُمَزَةٌ' اور 'لُمَزَةٌ' کے وزن پر ہے اس وجہ سے اس کے اندر بھی مبالغہ کا مفہوم موجود ہے۔

وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا ٱلْحُطَمَةُ (۵)

یہ سوال اس کی ہولناکی کے بیان کے لیے ہے کہ اس کو کوئی معمولی چیز نہ سمجھو۔ وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے!

اس آگ کو 'حطمۃ' یعنی چور چور کر دینے والی کی صفت سے تعبیر کرنے کی حکمت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ بخیل سرمایہ دار اپنی دولت اس زمانے میں سونے چاندی کی اینٹوں، زیورات، ظروف اور جواہرات وغیرہ کی شکل میں محفوظ کرتے تھے۔ اس طرح کی دولت کو برباد کرنے کے لیے چور چور کر دینے کی تعبیر زیادہ موزوں ہے یعنی یہ ساری دولت جلا کر اور چورہ چورہ کر کے پراگندہ کر دی جائے گی کہ جو لوگ اس کو حیاتِ جاوداں کی ضامن سمجھے بیٹھے تھے وہ اس کا حشر دیکھیں۔

نَارُ ٱللَّهِ ٱلْمُوقَدَةُ ۝ ٱلَّتِى تَطَّلِعُ عَلَى ٱلْأَفْـِٔدَةِ (۶-۷)

اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ کی ایک خاص صفت

یہ اس 'حُطَمَۃ' کی وضاحت ہے کہ یہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں پر جا چڑھے گی۔ یعنی اس کا خاص مزاج یہ ہو گا کہ وہ سب سے پہلے ان دلوں کو پکڑے گی جن میں مال کی محبت اس طرح رچی بسی رہی ہے کہ اس نے خدا اور آخرت کی یاد کے لیے کوئی جگہ ان کے اندر باقی نہیں چھوڑی۔ اس آگ کی مطلوب غذا چونکہ انہی دلوں کے اندر ہو گی اس وجہ سے اس کا سب سے پہلا حملہ انہی پر ہو گا۔ اس زمانے میں خاص خاص چیزوں کے تعاقب کے لیے ایسے ایسے آلات ایجاد ہو گئے ہیں جو دور ہی سے اپنے شکار کو بھانپ لیتے اور از خود ان کا پیچھا شروع کر دیتے ہیں یہاں تک کہ ان کو مار گراتے ہیں۔ یہی حال اللہ تعالیٰ کی بھڑکائی ہوئی اس آگ کا ہو گا۔ یہ ان دلوں پر خود بخود جا چڑھے گی۔

جو مال کے عشق میں گرفتار اور اللہ کے حاجت مند بندوں کے حقوق سے بے پروا رہے۔

اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ (۸)

یہ آگ ان پر اس طرح بھڑکے گی اور اوپر سے وہ ڈھانک بھی دی جائے گی کہ تپش کا کوئی حصہ ضائع نہ ہو بلکہ سب کا سب ان کے جلانے ہی میں صرف ہو۔ 'اَوْصَدَ الْبَابَ' کے معنی ہوں گے دروازے کو بند دیا۔ یہ آگ بھی بھٹہ اور تنور کی آگ کی طرح اوپر سے ڈھانک دی جائے گی تاکہ وہ پوری قوت کے ساتھ اپنا عمل کرے۔

فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ (۹)

یہ ان کی ذلت اور بے بسی کی تصویر ہے کہ اس آگ کے اندر وہ لمبے لمبے ستونوں کے ساتھ بھاری بھاری زنجیروں سے جکڑے ہوئے بھی ہوں گے کہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکیں۔ یہاں ستونوں کا ذکر ہے، 'سورۂ حاقّہ' میں اسی طرح کے مجرموں کے لیے زنجیر کا بھی ذکر ہے۔ فرمایا ہے:

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۙ ثُمَّ الْجَحِيْمَ	اس کو پکڑو، پھر طوق ڈالو، پھر دوزخ میں
صَلُّوْهُ ۙ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ	داخل کرو، پھر ایک زنجیر میں جس کا طول
ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ۗ	ستر گز ہے، اس کو جکڑو۔ یہ خدائے
اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۙ	عظیم پر ایمان نہیں رکھتا تھا اور
وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۗ	مسکین کو کھلانے پر نہیں ابھارتا
(الحاقۃ ۶۹: ۳۰-۳۴)	تھا۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق و تائید سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى اِحْسَانِهٖ۔

لاہور

۲۸ - اپریل ۱۹۸۰ء

۱۲ - جمادی الثانی ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

١٠٥

الفیل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورہ کا عمود، سابق و لاحق سے تعلق اور ترتیبِ بیان

'القارعۃ' سے لے کر 'الھمزۃ' تک خاص بات جو قریش پر واضح فرمائی گئی ہے وہ یہی ہے کہ انھوں نے مال اور اولاد کے عشق میں مبتلا ہو کر اللہ اور بندوں کے حقوق تو تمام برباد کر دیے ہیں لیکن یہ زعم رکھتے ہیں کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے وارث اور ان کے بنائے ہوئے گھر کے متولی ہیں۔ اب اس سورہ اور اس کے بعد کی سورہ — قریش — میں، جو اس کی توام ہے، ان کو یہ تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ تمھیں اس سرزمین میں جو امن اور رزق حاصل ہے وہ تمھاری تدبیر و قابلیت اور تمھارے استحقاق کا کرشمہ نہیں بلکہ یہ تمام تر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور ان کے بنائے ہوئے اس گھر کی برکت کا ثمرہ ہے اس وجہ سے تم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اس امن و رزق پر نازاں ہونے کے بجائے اس گھر کے خداوند کی بندگی کرو جس نے تمھیں بھوک میں کھلایا اور خطرہ سے نچنت کیا ہے۔ یہ مضمون آگے والی سورہ میں یوں واضح فرما دیا گیا ہے: 'فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ ۝ الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ' (قریش - ۱۰۶: ۳-۴) (پس چاہیے کہ وہ اس گھر کے خداوند کی بندگی کریں جس نے ان کو بھوک میں کھلایا اور خطرے سے نچنت کیا) ان دونوں سورتوں میں بس یہ فرق ہے کہ سورۂ فیل میں ایک نہایت اہم شہادت اس امر کی پیش کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس گھر کی حفاظت کے لیے اپنی کیا شان دکھائی ہے اور سورۂ قریش میں یہ واضح کیا ہے کہ اس سرزمین کے باشندوں کے لیے رزق و فضل کی جو راہیں کھلی ہیں وہ اسی گھر کے واسطہ سے کھلی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس وقت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو مکہ کی سرزمین میں بسایا ہے اس وقت یہ علاقہ امن اور رزق کے وسائل سے بالکل محروم تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان دونوں چیزوں کے لیے دعا کی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور ان کی ذریت کو یہ دونوں چیزیں حرم ہی کے واسطہ سے حاصل ہوئیں لیکن بعد میں لوگ اس حقیقت کو فراموش کر کے اپنی بدمستیوں میں کھو گئے۔ ان کی اس ناشکری پر قرآن نے ان کو جگہ جگہ تنبیہ فرمائی ہے جس کی وضاحت ہم کرتے آ رہے ہیں۔ اس گروپ کی سورتوں میں سے سورۂ بلد میں بھی اس کے بعض اہم پہلو زیرِ بحث آئے ہیں، تفصیل مطلوب

ہو تو اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

زیرِ نظر سورہ میں قریش کو ابرہہ کی اس فوج کشی کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس نے بیت اللہ الحرام کو ڈھا دینے کے ناپاک ارادے سے ساٹھ ہزار کے لشکرِ جرّار کے ساتھ، مکّہ پر کی۔ ایک ایسے بھاری لشکر سے، بالخصوص جب کہ اس کا ہراول دستہ ہاتھیوں پر مشتمل ہو، عربوں کے لیے میدان میں نکل کر عہدہ برآ ہونا آسان نہیں تھا اس وجہ سے انھوں نے پہاڑوں میں محفوظ ہو کر سنگ باری کی صورت میں اپنی مدافعت کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ یہ مدافعت ایک کمزور مدافعت تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی تائیدِ غیبی سے ان کی اسی کمزور مدافعت کو ابرہہ کے لشکرِ گراں کے لیے ایک قہرِ الٰہی بنا دیا اور وہ اس طرح تباہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا گوشت مکّہ کی وادی میں چیلوں، کوّوں اور گدھوں کو کھلا یا۔

سُوْرَةُ الْفِيْلِ

مَكِّيَّةٌ ———— اٰيات : ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۵
اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ⑴ اَلَمْ يَجْعَلْ
كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ⑵ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ⑶
تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ⑷ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ
مَّاْكُوْلٍ ⑸

ترجمۂ آیات ۱-۵
کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے خداوند نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا! کیا ان کی چال بالکل برباد نہ کردی! اور ان پر جھنڈ کے جھنڈ چڑیاں نہ بھیجیں! ۱-۳

تم ان کو مارتے تھے سنگِ گِل کے قسم کے پتھروں سے، بالآخر ان کو اللہ نے کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔ ۴-۵

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ (۱)

خطاب کی نوعیت

'اَلَمْ تَرَ' کے خطاب کی نوعیت ہم جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں کہ اگرچہ یہ لفظاً واحد ہے لیکن اس کا استعمال بیشتر جمع کو مخاطب کرنے کے لیے ہوتا ہے اور یہ طرزِ خطاب گویا مخاطب گروہ کے ایک ایک فرد کو فرداً فرداً متوجہ کرتا ہے۔ یہاں مخاطب قریش ہیں۔ ان کو مخاطب کر کے توجہ دلائی ہے کہ اصحابِ فیل کے ساتھ تمھارے رب نے جو معاملہ کیا، کیا وہ تم نے نہیں دیکھا؟ یہ امر ملحوظ رہے کہ اصحاب الفیل کے واقعہ پر ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت عام الفیل ہی کے دوران میں ہوئی ہے اس وجہ سے اس سورہ کے نزول کے وقت بہت سے ایسے لوگ رہے ہوں گے جنھوں نے اس واقعہ کا بچشمِ خود مشاہدہ کیا ہوگا اور اگر مشاہدہ نہیں کیا ہوگا تو اس تواتر کے ساتھ سنا ہوگا کہ وہ مشاہدہ ہی کے حکم میں ہے۔ اس وجہ سے 'اَلَمْ تَرَ' کا خطاب یہاں بالکل اپنے موزوں محل میں ہے۔

اصحاب الفیل کون تھے؟

قرآن نے یہاں ان ہاتھی والوں کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی ہے کہ وہ کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور ان کے آنے کا مقصد کیا تھا؟ اجمال کے ساتھ صرف ان کے انجام کی طرف اشارہ کر کے بات ختم کر دی ہے۔ اس اجمال کی وجہ یہ ہے کہ مخاطب گروہ کو ان کا سارا واقعہ معلوم تھا۔ 'اصحاب الفیل' کے الفاظ سے ان کا تعارف ہی یہ سمجھ جانے کے لیے کافی تھا کہ یہ اشارہ یمن کے حبشی حکمران، ابرہہ کی طرف ہے جس کے حملہ آور لشکر کے ساتھ کوہ پیکر ہاتھی بھی تھے۔ ہاتھیوں والے لشکر کا تجربہ عربوں کو پہلی بار اسی جنگ میں ہوا اس وجہ سے اسی نام سے انھوں نے اس حملہ کو یاد رکھا جس سے اس کی سنگینی کا اظہار ہوتا ہے۔

ہاتھی ایک ہی تھا یا اس سے زیادہ تھے قرآن کے الفاظ سے دونوں ہی مفہوم نکل سکتے ہیں لیکن چونکہ 'صاحب الفیل' نہیں بلکہ 'اصحاب الفیل' کہا گیا ہے اس وجہ سے متبادر یہی ہوتا ہے کہ ہاتھی ایک سے زیادہ تھے اور روایات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھیوں کا ایک پورا دستہ فوج کے ساتھ تھا جس سے اس کی قوت اور ہیبت میں بڑا اضافہ ہو گیا تھا۔

ابرہہ اور اس کا کردار

ابرہہ کو اگرچہ بعض مورخین نے ایک بُردبار حکمران لکھا ہے لیکن اس کے حالاتِ زندگی سے اس حسنِ ظن کی تائید نہیں ہوتی بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک موقع پرست، غدار اور نہایت متعصب عیسائی تھا۔ اس نے خود حبش کے بادشاہ کے ساتھ بھی غداری کی جس کی فوجوں کے ذریعہ سے اس نے یمن پر قبضہ کیا تھا،

اس کی تفصیل تاریخوں میں موجود ہے لیکن یہاں اس سے تعرض کا موقع نہیں ہے۔ یمن پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے نہ صرف اس کے یہودی بادشاہ کو قتل کیا بلکہ وہاں سے یہود اور یہودیت کا بیخ و بُن سے خاتمہ کر دیا۔

ابرہہ کی چال اور اس کی ناکامی

عیسائیت کے تعصب کے جنون میں اس نے یہ اسکیم بنائی کہ عربوں کو عیسائی بنا لے۔ اس اسکیم کو بروئے کار لانے کے لیے اس نے یمن کے دارالسلطنت، صنعاء میں ایک عظیم الشان گرجا بنوایا اور حبش کے نجاشی کو، جس کے نائب السلطنت کی حیثیت سے وہ یمن پر حکومت کر رہا تھا، اس نے لکھا کہ میں نے ایک ایسا گرجا تعمیر کرایا ہے جس کی نظیر چشمِ فلک نے نہیں دیکھی ہو گی۔ میں چاہتا ہوں کہ عربوں کے حج کا رُخ بھی اسی کی طرف موڑ دوں اور ان کے مکہ کے معبد کو ڈھا دوں۔ اس کے بعد اس نے کعبہ پر حملہ کا جواز پیدا کرنے کے لیے یہ مشہور کیا کہ اس کے تعمیر کردہ گرجا کو کسی عرب نے بقصدِ توہین ناپاک کیا ہے۔ یہ واقعہ اول تو بالکل جھوٹ معلوم ہوتا ہے، عرب ہمیشہ تلوار کے دھنی رہے ہیں، بہادر قوموں کے افراد اس طرح کی پست حرکتیں نہیں کیا کرتے، لیکن بالفرض صحیح بھی ہو تو کسی ایک شخص کا انفرادی فعل اس بات کو جائز ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس کا انتقام پوری قوم سے لیا جائے، یہاں تک کہ اس جرم کی پاداش میں ان کے دینی معبد کو ڈھا دینے کی جسارت کی جائے لیکن عیسائیوں کے جذبات بھڑکانے اور نجاشی کی تائید حاصل کرنے کے لیے اس جھوٹ کو خوب شہرت دی گئی یہاں تک کہ ساٹھ ہزار کا لشکرِ جرار، جس کے ساتھ نو دس ہاتھی بھی تھے، جمع کر کے مکہ پر حملہ کر دیا گیا۔

اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ (۲)

لیکن ابرہہ کی یہ ساری تدبیریں اللہ تعالیٰ نے بالکل پامال و رائگاں کر دیں۔ ان تدبیروں کو 'کید' (چال) سے تعبیر کرنے کی ایک واضح وجہ تو وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا کہ ایک نہایت ظالمانہ اقدام کو جائز ثابت کرنے کے لیے ایک نہایت بے ہودہ قسم کا الزام گھڑا گیا لیکن اس کے کید ہونے کے بعض اور پہلو بھی ہیں جن کی طرف امام فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اشارے فرمائے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"۱۔ اس نے محترم مہینوں میں حملہ کیا۔ اس کو خیال تھا کہ عرب ان مہینوں میں جنگ خونریزی سے احتراز کرتے ہیں۔

۲۔ اس نے مکہ میں ایسے وقت میں داخل ہونے کی کوشش کی جب اہل مکہ دوسرے عربوں کے ساتھ حج کے مناسک ادا کرنے میں معروف ہوتے ہیں۔

۳۔ اس نے خاص طور پر قیام منیٰ کے دنوں میں حملہ کرنا چاہا کہ عرب یا تو منیٰ میں قربانی میں مصروف ہوں گے یا تھکے ماندے گھروں کو واپس آ رہے ہوں گے۔"

اس کی ان چالوں کو ناکام کر دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو انتظام فرمایا اس کا خلاصہ، واقعات سے مستنبط کر کے، مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"۱۔ ان کی فوج کو وادی محسر ہی میں روک دیا۔

۲۔ محسر کے پتھروں سے سنگریزوں نے اسلحہ کا کام لیا اور ان پر سنگ باری کی جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

۳۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کے ان دشمنوں پر سنگ باری کرنے والی ہوا (حاصب) بھی بھیجی جس نے ان کو بالکل پامال کر دیا۔"

اس 'حاصب' کا ذکر واقعہ کے بعض عینی شاہدوں نے کیا ہے اور ابن ہشام وغیرہ نے اپنی کتابوں میں ان شہادتوں کو نقل کیا ہے۔ مولانا فراہیؒ نے اس پر پوری تفصیل سے بحث کی ہے۔ ہم بقصد اختصار صرف دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔ مشہور شاعر ابو قیس اس واقعہ کے سلسلہ میں قدرتِ الٰہی کی بعض شانوں کا ذکر کرتے ہوئے 'حاصب' کا ذکر یوں کرتا ہے:

فارسل من ربهم حاصب یلفهم مثل لف القزم

(پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر حاصب (سنگ ریزے برسانے والی آندھی) چلی جو خس و خاشاک کی طرح ان کو لپیٹ لیتی)۔

اسی طرح صیفی بن عامر نے بھی 'ساف' اور 'حاصب' کا ذکر کیا ہے[۱]۔ وہ کہتا ہے:

فلما اجازوا بطن نعمان ردهم جنود الاله بین ساف وحاصب

(جونہی وہ بطن نعمان سے آگے بڑھے، خدا کی فوجوں نے ساف اور حاصب کے درمیان نمودار ہو کر ان کو پسپا کر دیا)۔

وَاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ (۳)

ابرہہ کی فوجوں کی بربادی کی تعبیر لطیف کنایہ

یہ ابرہہ کی فوجوں کی بربادی، پامالی اور بے کسی و بے بسی سے کنایہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے اس طرح ان کو پامال کیا کہ کوئی ان کی لاشوں کو اٹھانے والا نہ رہا۔ وہ میدان میں پڑی رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر گوشت خوار چڑیاں بھیجیں جنھوں نے ان کا گوشت نوچا، کھایا اور وادیٔ مکہ کو ان کے تعفن سے پاک کیا۔ دشمن پر چڑیوں کو مسلط کرنا اس کی شکست و پامالی کی تعبیر کے لیے معروف کنایہ ہے۔ عرب شعراء نے اپنے فخریوں میں یہاں تک کہا ہے کہ جب ہماری فوجیں دشمن پر حملہ آور ہوتی ہیں تو گوشت خوار چڑیاں ہمارے ہم رکاب ہوتی ہیں، انھیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہمارے حملہ سے دشمن پامال ہوں گے اور ان کو پیٹ بھر ان کا گوشت کھانے کا موقع ملے گا۔ تورات میں حضرت داؤدؑ اور جالوت کا جو واقعہ بیان ہوا ہے اس میں بھی ہے کہ جب حضرت داؤدؑ اس سے مقابلہ کرنے پر بضد ہوئے اور اس کی مغرورانہ باتوں کا جواب ترکی بہ ترکی دیا تو اس نے جھلا کر کہا کہ "اچھا، آج تیرا گوشت چیلوں اور کوؤں

---

[۱] لفظ 'ساف' بھی 'حاصب' کی طرح تند ہوا ہی کے لیے آتا ہے۔ دونوں میں صرف درجے کا فرق ہے۔

کو کھلاتا ہوں"۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو اس پر غلبہ دیا اور خود اسی کے گوشت کو چیلوں اور گدھوں نے کھایا۔

ابابیل

'اَبَابِیْلَ' سے ابابیلیں مراد نہیں ہیں، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے۔ یہ لفظ گھوڑوں کی جماعت اور چڑیوں کے جھنڈ کے لیے آتا ہے۔ اس کے واحد اور جمع ہونے کے باب میں اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ اس کی واحد نہیں ہے۔ بعض اس کو 'اِبَّالَۃ' کی جمع بناتے ہیں۔ یہاں یہ ان چڑیوں کے لیے آیا ہے جو مقتولوں کی لاشیں کھانے کے لیے جمع ہو جاتی ہیں۔

'اَرْسَلَ عَلَیْہِمْ' میں مسلّط کر دینے کا مضمون ہے جس سے اصحابِ فیل کی کس مپرسی کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ کوئی ان کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے والا نہیں تھا۔ اس وجہ سے چڑیوں کو پوری آزادی سے ان پر تصرّف کرنے کا موقع ملا۔

تَرْمِیْہِمْ بِحِجَارَۃٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ ۝ فَجَعَلَہُمْ کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ (۴-۵)

مفسرین کی ایک عام غلط فہمی

اب آخر میں بتایا کہ اس لشکرِ جرّار کے تباہ کرنے میں کتنا حصہ عربوں کا ہے اور کتنا قدرت کا۔ فرمایا کہ تم ان کو پتھروں اور کنکروں سے مار رہے تھے، پس خدا نے ان کو کھائے ہوئے بھس کی طرح پامال کر دیا یعنی اس لشکرِ جرّار کے مقابلے میں تمہاری یہ مدافعت نہایت کمزور تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی تائیدِ غیبی سے تمہاری یہی کمزور مدافعت اتنی مؤثر بنا دی کہ وہ کھائے ہوئے بھس کی طرح پامال ہو کر رہ گئے۔

ہمارے مفسرین تو عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ قریش نے ابرہہ کا کوئی مقابلہ نہیں کیا بلکہ ان کے سردار عبدالمطلب قوم کو لے کر پہاڑوں میں جا چھپے اور خانہ کعبہ کو خدا کے سپرد کر دیا کہ جس کا یہ گھر ہے وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔ ان کے نزدیک 'تَرْمِیْ' کا فاعل 'طَیْرًا اَبَابِیْلَ' ہے یعنی چڑیوں نے ابرہہ کی فوجوں پر سنگباری کر کے ان کو پامال کر دیا۔ اگرچہ اس قول پر تمام مفسرین متفق ہیں لیکن گوناگوں وجوہ سے یہ بالکل غلط ہے جن میں سے بعض کی طرف ہم اشارہ کریں گے:

۱- اس میں شبہ نہیں کہ اس موقع پر قریش پہاڑوں میں چلے گئے تھے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ مدافعت سے کلیتہً دست بردار ہو کر پہاڑوں میں جا چھپے تھے، بلکہ ابرہہ کی عظیم فوج کے مقابل میں مدافعت کی واحد ممکن شکل جو وہ اختیار کر سکتے تھے یہی تھی اس وجہ سے انھوں نے یہی اختیار کی اور اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق کہ بندہ جب اپنے امکان کے حد تک اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اس کی مدد فرماتا ہے، اس نے قریش کی مدد فرمائی۔

اوپر آپ پڑھ آئے ہیں کہ ابرہہ کا لشکر ساٹھ ہزار تھا اور اس کے ساتھ ہاتھیوں کا ایک دستہ بھی تھا۔ اتنی بڑی فوج کا مقابلہ میدان میں نکل کر اور صف بندی کر کے تلواروں کے ذریعہ سے کرنا قریش کے لیے ناممکن تھا۔ وہ اگر اپنا پورا زور و اثر استعمال کرتے تو بھی شاید دس بیس ہزار سے زیادہ آدمی

اکٹھے نہ کر پاتے، اس وجہ سے انھوں نے اپنے لیے بہترین جنگی پالیسی یہی خیال کی کہ میدان میں نکل کر مقابلہ کرنے کے بجائے پہاڑوں میں محفوظ ہو جائیں اور وہاں سے گوریلوں کے طریقہ پر، جس حد تک ان کے اقدام میں مزاحمت پیدا کر سکتے ہیں، کریں۔ یہ اسی طرح کی ایک تدبیر تھی جس طرح کی تدبیر مسلمانوں نے غزوۂ احزاب کے موقع پر اختیار کی۔ یعنی مدینہ کے اردگرد خندق کھودی اور اس کے اندر محفوظ ہو کر دشمن کا مقابلہ کیا۔

۲۔ جن لوگوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ قریش نے کوئی مزاحمت نہیں کی ان کا دعویٰ واقعات کے بھی خلاف ہے اور قریش کی حمیّت و غیرت کے بھی۔ تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ ابرہہ کی فوجیں جن راستوں سے گزریں ان کے عرب قبائل نے ان کو مزاحمت کے بغیر گزرنے نہیں دیا بلکہ یہ جانتے ہوئے کہ اس دل بادل فوج سے ان کے لیے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں ہے انھوں نے مزاحمت کر کے شکست کھانا تو گوارا کیا لیکن یہ ننگ نہیں گوارا کیا کہ دشمن خانۂ کعبہ پر حملہ کرنے کے لیے ان کے حدود کے اندر سے آسانی سے گزر جائے۔ صرف ایک قبیلہ، بنو ثقیف نے اہل عرب کی اس عام حمیّت کے خلاف روش اختیار کی۔ اس کے بعد ایک فرد، ابو رغال نے ابرہہ کی فوج کو مکّہ کا راستہ بتایا لیکن اس قبیلہ کو اس بے حمیّتی کی سزا یہ ملی کہ پورے عرب میں اس کی آبرو مٹ گئی اور ابو رغال کا حشر یہ ہوا کہ اس کی قبر پر اہل عرب ایک مدت تک لعنت کے طور پر سنگ باری کرتے رہے۔ غور کیجیے کہ جب چھوٹے چھوٹے قبائل نے اس بے جگری سے دشمن کا مقابلہ کیا تو قریش اس کے آگے اس بے حمیّتی کا اظہار کس طرح کرتے کہ اس کو بے روک ٹوک اللہ کے گھر پر قابض ہو جانے دیتے۔ اور اگر انھوں نے واقعی بغیر کسی مزاحمت کے اس کو راہ دے دی تھی تو ابو رغال نے کیا گناہ کیا تھا کہ اس کی قبر پر وہ سنگ باری کرتے رہے۔ بہرحال یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ وہ بغیر کوئی مزاحمت کیے پہاڑوں میں جا چھپے۔ قریش کی غیرت و حمیّت ہمیشہ مشہور رہی ہے۔ انھوں نے کبھی معمولی باتوں میں بھی کوئی ایسی کمزوری نہیں دکھائی جس سے ان کی غیرت و حمیّت پر حرف آئے، تو وہ بیت اللہ کے معاملہ میں ایسی بے حمیّتی کا ثبوت کیونکر دے سکتے تھے جس پر ان کی دینی و دنیوی دونوں سیادتوں کا انحصار تھا۔ بیت اللہ کے بعد ان کے پاس بچ کیا رہتا تھا جس کے لیے وہ پہاڑوں میں چھپ کر زندگی بچانے کی تمنا کرتے!

۳۔ جن لوگوں نے قریش پر اس بے حمیّتی کا الزام لگایا ہے ان کے نزدیک اس سورہ کا درس گویا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس گھر کا محافظ خود ہے۔ اس کے پاسبان، دشمن سے ڈر کر، اگر اس کو چھوڑ کے بھاگ جائیں جب بھی خدا اس کی حفاظت کرے گا۔ چنانچہ جب قریش ابرہہ کی فوجوں سے ڈر کر پہاڑوں میں جا چھپے تو اللہ تعالیٰ نے ابابیلوں کے ذریعہ سے ان پر پتھراؤ کر کے ان کو بھُس کی طرح پامال کر دیا۔ اگر فی الواقع اس سورہ کا درس یہی ہے تو یہ درس اللہ تعالیٰ کی سنت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ

یہ نہیں ہے کہ بندے اپنے گھروں میں بیٹھے بیٹھے بنی اسرائیل کی طرح یہ کہیں کہ فَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ (المآئدۃ - ۵: ۲۴) (تم اور تمھارا خداوند جاؤ لڑو، ہم یہاں بیٹھتے ہیں) اور خدا ان کے بے میدان جیتے کر ان کے لیے تخت بچھا دے اور یہ اس پر براجمان ہو جائیں۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسا کرنے والا ہوتا تو بنی اسرائیل کے ساتھ اس نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ ان کو تو اس نے اس کی سزا یہ دی کہ چالیس سال کے لیے ان کو صحرا ہی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت جو قرآن سے واضح ہوتی ہے وہ تو یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کی مدد فرماتا ہے جو اپنا فرض ادا کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اگرچہ ان کی تعداد کتنی ہی کم اور ان کے وسائل کتنے ہی محدود ہوں۔ چنانچہ قرآن نے بیت اللہ سے متعلق سورۂ بقرہ، سورۂ توبہ، سورۂ حج وغیرہ میں ہماری جو ذمہ داریاں بتائی ہیں وہ یہی ہیں کہ ہم اس کی آزادی و حفاظت کے لیے جو کچھ ہمارے بس میں ہے وہ کریں، اللہ ہماری مدد کرے گا۔ یہ کہیں نہیں کہا ہے کہ تم کچھ کرو یا نہ کرو ہماری ابابیلیں اس کی حفاظت کر لیں گی۔ بہرحال قریش نے جو کچھ ان کے امکان میں تھا وہ کیا۔ اگرچہ ان کی مدافعت، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، کمزور تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی حاصب کے ذریعہ سے ان کی اس کمزور مدافعت کے اندر اتنی قوت پیدا کر دی کہ دشمن کھائے کے بھس کی طرح پامال ہو گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے موقع پر صرف مٹھی بھر خاک قریش کے لشکر کی طرف پھینکی تھی لیکن وہی مٹھی بھر خاک ان کے لیے طوفان بن گئی اور اللہ تعالیٰ نے اس کی اہمیت یوں واضح فرمائی کہ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (الانفال - ۸: ۱۷) (اور وہ کنکریاں دشمنوں پر تم نے نہیں پھینکیں تھیں بلکہ اللہ نے پھینکیں)۔

عبدالمطلب کا اپنے رب سے استغاثہ

۴۔ عبدالمطلب نے جبلِ حرا پر چڑھ کر ربِ کعبہ سے جو استغاثہ کیا اس سے یہ بات نہیں نکلتی کہ وہ بیت اللہ کی مدافعت سے بالکل دست بردار ہو کر اور سارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر کے، خود الگ ہو رہے ہیں بلکہ اس میں انھوں نے بعض فقرے تو ایسے کہے ہیں جن کے اندر ناز اور اعتماد کی وہ شان پائی جاتی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا میں ہے جو آپ نے غزوۂ بدر کے موقع پر عین میدانِ جنگ میں فرمائی ہے۔ اس طرح کی دعا میدانِ جنگ چھوڑ کر بھاگنے والا نہیں کرتا بلکہ وہ شخص کرتا ہے جو اگرچہ حالات کی نزاکت سے پریشان تو ہوتا ہے لیکن اپنے رب کی قدرت سے مایوس نہیں ہوتا۔ اس دعا کو جن لوگوں نے فرار کے مفہوم میں لیا ہے انھوں نے نہایت بدذوقی کا ثبوت دیا ہے۔ میں تو جب اس کو پڑھتا ہوں مجھے اس کے اندر ایک رجز کی شان معلوم ہوتی ہے اور اس سے ایمان کی مہک آتی ہے۔ آپ بھی ذرا اپنے ذوق کو بیدار کر کے یہ اشعار پڑھیے۔ ان میں کتنی حرارت اور اللہ تعالیٰ کی غیرت کو جوش میں لانے والی کتنی مؤثر اپیل ہے!

لاهم ان المرء يمنع رحله فامنع رحالك

(اے خدا، آدمی اپنے اہل وعیال کی حفاظت کرتا ہے تو بھی اپنے لوگوں کی حفاظت کر)

لا یغلبن صلیبھم ومحالھم ابدا محالک

(ان کی صلیب اور ان کی قوت تیری قوت پر ہرگز غالب نہ ہونے پائے)

ان کنت تارکھم وقبلتنا فامر ما بدا لک

(اگر تو ہمارے قبلہ کو ان کے رحم وکرم پر چھوڑنا چاہتا ہے تو کر جو تیری مرضی ہو)

کیا اس غیرت وحمیت کے شخص کے بارے میں یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔

بہرحال یہ رائے ہمارے نزدیک بالکل بے بنیاد ہے کہ قریش میدان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ چڑیوں نے سنگ باری کر کے ابرہہ کی فوجوں کو پامال کیا۔ 'تَرْمِیْ' کے فاعل، ہمارے نزدیک قریش ہیں جو 'اَلَمْ تَرَ' کے مخاطب ہیں۔ فعل 'تَرْمِیْ' چڑیوں کے لیے کسی طرح موزوں ہے بھی نہیں۔ چڑیاں اپنی چونچوں اور چنگلوں سے سنگ ریزے گرا تو سکتی ہیں لیکن اس کو 'رمی' نہیں کہہ سکتے۔ 'رمی' صرف اسی صورت میں ہو گی جب پھینکنے میں بازو یا فلاخن کا زور استعمال ہو یا ہوا کے تند و تیز تھپیڑے اس کے ساتھ ہوں۔ چنانچہ جو لوگ چڑیوں کی رمی کے قائل ہوئے ہیں انھیں بھی لفظ 'رمی' کھٹکا ہے۔ انھوں نے تکلف کر کے اس کی شکل یہ بیان کی ہے کہ چڑیاں مٹر کے دانوں کے برابر سنگ ریزے گراتی تھیں جو ہاتھیوں کے سواروں کے جسموں میں سے گزر کر ہاتھیوں کے جسموں میں گھس جاتے تھے۔ اس طرح انھوں نے چڑیوں کی چونچوں سے گرے ہوئے سنگ ریزوں کا مؤثر ہونا تو دکھا دیا لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس صورت کو 'رمی' سے تعبیر کرنا کسی طرح موزوں نہیں ہے۔

'بِحِجَارَۃٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ' لفظ 'سِجِّیْلٍ' کی تحقیق اس کے محل میں ہو چکی ہے[1]۔ یہ فارسی کے سنگِ گل سے معرّب ہے۔ اس کا ترجمہ اگر کنکر کیجیے تو میرے نزدیک یہ صحیح ہو گا۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ عربوں کی یہ مدافعت ایک کمزور مدافعت تھی۔ اصل مقابلہ تو اس صورت میں ہوتا جب کھلے میدان میں صف بندی کر کے تلواروں، نیزوں اور تیروں سے دو بدو جنگ ہوتی۔ اگر حریف کے پاس ہاتھی تھے تو ان کے پاس بھی کم از کم گھوڑے ہوتے لیکن اس طرح کی جنگ کا، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، امکان نہیں تھا اس وجہ سے قریش نے آخری چارۂ کار کے طور پر یہ راہ اختیار کی کہ جہاں دا ؤ لگ گیا پہاڑوں سے پتھر اڑ کر کے دشمن کی راہ روکنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے کہ یہ مدافعت ایک کمزور مدافعت تھی اور اس کی اسی کمزوری ہی کو واضح کرنے کے لیے قرآن نے 'بِحِجَارَۃٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ' کے الفاظ سے اس کی نوعیت واضح کر دی۔ 'سجّیل'

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُوْلٍ (۵)

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت بیان فرمائی ہے کہ اگرچہ تمھاری مدافعت کمزور مدافعت تھی لیکن جب تم حوصلہ کر کے مدافعت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی سنت کے مطابق تمھاری مدد کے لیے اپنی نشان دکھائی اور ان کو کھائے کے بھس کی طرح پامال کر دیا۔ کسی شے کا نام اس کے انجام کے اعتبار سے

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن، جلد سوم، صفحہ: ۷۰۴

رکھنا عربی زبان کا ایک معروف اسلوب ہے۔ 'کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ' اسی نوع کی ترکیب ہے۔

یہاں یہ بات نگاہ میں رہے کہ 'رمی' کی نسبت تو مخاطب کی طرف کی ہے لیکن ان کو کھانے کے بھس کی طرح کر دینا اللہ تعالیٰ نے اپنی شان بتائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابرہہ کے لشکر کو پامال کر دینا تنہا عربوں کی سنگ باری کے بس کی بات نہ تھی اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی شان دکھائی اور یہ شان ان کی سنگ باری کے پردے میں دکھائی۔ ہم پیچھے بعض عینی شاہدوں کا یہ بیان نقل کر آئے ہیں کہ ابرہہ کی فوجوں پر حاصب بھی چلی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حاصب اسی وقت چلی ہے جب عربوں نے وادیٔ محسّر کے کنکروں سے ان پر پتھراؤ کیا۔ یاد ہوگا کہ غزوۂ خندق کے موقع پر بھی ہوا نے مسلمانوں کی مدد کی تھی اسی طرح کی مدد اس موقع پر بھی نمودار ہوئی۔ ہم پیچھے یہ اشارہ کر آئے ہیں کہ ابرہہ کی فوجوں کے مقابل میں قریش نے اس سے ملتی جلتی تدبیر اختیار کی جو مسلمانوں نے احزاب کے مقابل میں اختیار کی۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اب صرف ایک سوال قابل غور رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر واقعہ یہ ہے کہ ابرہہ کی فوجوں کی پامالی چڑیوں کی سنگ باری سے نہیں بلکہ عربوں کی سنگ باری اور حاصب کے ذریعہ سے ہوئی، چڑیاں صرف لاشوں کو کھانے آئی تھیں، تو ترتیب کلام یوں ہونی چاہیے تھی کہ 'تَرْمِیْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝ وَاَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ ۝' یہ سوال جن لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوا ہے ہمارے نزدیک وہ عربیت کے ایک خاص اسلوب بلاغت سے ناآشنا ہیں۔ وہ یہ کہ بعض مرتبہ کسی نتیجۂ خیر یا شر کی مبادرت ظاہر کرنے کے لیے اس کو فعل کی پوری تفصیل سے پہلے ہی ظاہر کر دیتے ہیں۔ دعاؤں کی قبولیت کی مبادرت ظاہر کرنے کے لیے قرآن نے یہ اسلوب جگہ جگہ اختیار کیا ہے اور ہم اس کی وضاحت کرتے آ رہے ہیں۔ یہاں سورۂ نوح سے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں:

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ	نوح نے فریاد کی، اے میرے رب! انھوں نے
وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ	میری نافرمانی کر دی اور ان لوگوں کی پیروی کی
وَوَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ۚ وَمَكَرُوْا	جن کے مال اور اولاد نے ان کے خسارے ہی
مَكْرًا كُبَّارًا ۚ وَقَالُوْا	میں اضافہ کیا اور انھوں نے بڑی بڑی چالیں
لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَ	چلیں اور اپنی قوم کو ورغلایا کہ اپنے معبودوں کو
لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ	ہرگز نہ چھوڑیو اور نہ چھوڑیو وَدّ کو اور نہ سُواع
وَّلَا یَغُوْثَ وَیَعُوْقَ	کو اور نہ یغوث، یعوق اور نسر کو (اور اے
وَنَسْرًا ۚ وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِیْرًا ۚ	میرے رب) انھوں نے ایک خلق کثیر کو گمراہ کر
وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ۝	رکھا ہے اور تو ان ظالموں کی گمراہی ہی میں اب
مِمَّا خَطِیْٓــٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا	اضافہ کر، پس وہ اپنے گناہوں کی پاداش میں

فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۵ فَلَمْ یَجِدُوْا
لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ۵ وَقَالَ
نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ
الْكٰفِرِیْنَ دَیَّارًا ۵ اِنَّكَ
اِنْ تَذَرْهُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَكَ
وَلَا یَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۵
(نوح - ۷۱ : ۲۱ - ۲۷)

پانی میں غرق اور آگ میں داخل کیے گئے اور اللہ کے مقابل میں وہ اپنے لیے کوئی مددگار نہ پا سکے اور نوحؑ نے کہا، اے میرے رب! تو ان کافروں میں سے زمین پر ایک متنفس بھی نہ چھوڑ۔ اگر تو ان کو چھوڑے رکھے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور صرف نابکاروں اور ناشکروں ہی کو جنم دیں گے۔

ان آیات پر تدبر کی نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کے پہلے ہی فقرے کے بعد ان کی قوم کا انجام رکھ دیا گیا ہے اور ان کی باقی دعا مؤخر کر دی گئی ہے حالانکہ انجام بہرحال پوری دعا کے بعد ہی سامنے آیا ہوگا۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ قبولیتِ دعا کی مبادرت ظاہر کرنے کے لیے ترتیبِ کلام میں تقدیم یا تاخیر کر دی گئی! بالکل اسی طرح اس سورہ میں ابرہہ کی فوجوں کا انجام ظاہر کرنے کے لیے ان پر چڑیوں کے بھیجے جانے کا ذکر پہلے کیا اور ان کے پامال ہونے کا ذکر اس کے بعد کیا۔ سورہ کا مزاج چونکہ قریش پر امتنان و احسان کا تھا اس وجہ سے بلاغت کا تقاضا یہی تھا کہ دشمن کی بدانجامی کی تصویر پہلے سامنے آئے۔

استاذ امام حمید الدین فراہی علیہ الرحمۃ نے اس سورہ کی تفسیر نہایت مفصل لکھی ہے۔ میں نے بقصدِ اختصار ان کی کتاب کی بعض باتیں اس میں نہیں لی ہیں حالانکہ وہ تفسیر کے پہلو سے نہایت اہمیت رکھنے والی ہیں۔ مولاناؒ نے حج کے سلسلہ میں 'رمی جمرات' کی سنت کو اسی 'رمی' کی یادگار قرار دیا ہے اور بعض دوسری تحقیقات بھی نہایت اہم بیان فرمائی ہیں۔ اس کتاب کے قارئین کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ مولاناؒ کی تفسیر بھی ضرور پڑھیں۔ اس سے ان کے زاویۂ نگاہ میں وسعت بھی ہوگی اور وہ فرق بھی سامنے آئے گا جو ان کے اور میرے نقطۂ نظر میں بہت باریک سا ہے۔

ان سطور پر اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ حمدًا کثیرًا۔

لاہور
۱۵- مئی ۱۹۸۰ء
۲۹- جمادی الثانی ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

١٠٦

القریش

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلق اور ترتیبِ بیان

یہ سورہ سابق سورہ ——— الفیل ——— کی توام ہے۔ اس کی تفسیر میں ہم دونوں سورتوں کے عمود کی طرف ایک جامع اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں مختصر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ قریش بیت اللہ کے ساتھ جس نوعیت کی وابستگی رکھتے تھے وہ ان پر واضح کر کے اس کے فطری تقاضا کا ان سے مطالبہ کیا گیا ہے۔

سابق سورہ میں یہ دکھایا ہے کہ اس سرزمین میں ان کو جو امن حاصل ہے وہ اسی گھر کی بدولت حاصل ہے۔ اس سورہ میں یہ دکھایا ہے کہ اس سرزمین میں ان کو رزق کے جو وسائل حاصل ہیں ان کی راہیں بھی اسی گھر کی بدولت کھلی ہیں۔ اس وجہ سے حق ہے کہ وہ اس گھر کے خداوند کی عبادت کریں، اس کے اس حق میں بلا دلیل، دوسروں کو شریک نہ کریں۔

ایک اچھی حکومت سے شہریوں کو جو برکتیں حاصل ہوتی ہیں ان میں سرفہرست یہی دو چیزیں ہیں: امن اور رزق۔ سرزمینِ مکہ میں یہ دونوں برکتیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بدولت قریش کو بیت اللہ ہی کے طفیل حاصل ہوئیں۔ اس کا فطری حق یہی تھا کہ ان کی وابستگی کلیتہً اللہ وحدہٗ لا شریک کے ساتھ ہوتی لیکن قریش نے شرک میں مبتلا ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بنائے ہوئے گھر میں دوسرے فرضی دیویوں دیوتاؤں کو لا بٹھایا۔ ان کو بتایا جا رہا ہے کہ اس گھر کے ساتھ اپنی وابستگی کی نوعیت کو نہ بھولیں۔ یہ گھر انھیں خدا ہی نے امانت میں دیا تھا۔ اسی کی بدولت انھیں امن بھی حاصل ہوا اور اسی کے فیض سے رزق کی راہیں بھی کشادہ ہوئیں۔ اگر انھوں نے اس گھر کے رب کی ناشکری کی تو یاد رکھیں کہ اس گھر کی پاسبانی کا شرف بھی کھو بیٹھیں گے اور ساتھ ہی وہ تمام روحانی و مادی برکتیں بھی جو اس گھر کی بدولت انھیں حاصل ہیں۔

سورہ میں پہلے اس وابستگی کی خاص نوعیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو قریش کو سرزمینِ مکہ اور بیت اللہ کے ساتھ حاصل ہوئی۔ پھر ان کے ان تجارتی سفروں سے ساتھ ان کی وابستگی کا حوالہ دیا ہے جو سردیوں اور گرمیوں میں بالالتزام وہ کرتے اور جن پر ان کی تمام معاشی آسودگی کا انحصار

تھا۔ ان کی معاشی زندگی میں خون کی گردش انہی تجارتی سفروں سے تھی اور ان کی کامیابی کی ضمانت ان کو بیت اللہ کے متولّی ہونے کی بدولت حاصل تھی۔ اس شرف سے محروم ہو کر وہ یہ درجہ نہیں حاصل کر سکتے تھے کہ جو راستے دوسروں کے لیے غیر محفوظ تھے ان میں ان کے تجارتی قافلوں کی حفاظت کے لیے راہ کے قبائل بدرقہ فراہم کریں۔

سُورَةُ قُرَيْشٍ

مَكِّيَّةٌ ——————— آیات: ۴

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۴ لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ﴿۱﴾ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ﴿۲﴾
فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ﴿۳﴾ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ
جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿۴﴾ ع ۴ ۲۱

ترجمۂ آیات ۱-۴ بوجہ اس وابستگی کے جو قریش کو ہے۔ اس وابستگی کے سبب سے جو سردی اور گرمی کے سفر کے ساتھ ان کو ہے۔ پس چاہیے کہ وہ اس گھر کے خداوند کی عبادت کریں جس نے انھیں قحط کے سبب سے کھلایا اور خوف کے سبب سے امن بخشا۔ ۱-۴

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ (۱)

ایلاف کا مفہوم 'الف المکان والفہ ایلافا' کے معنی ہوں گے 'تعودہ واستانس بہ' وہ اس جگہ کا عادی اور اس سے مانوس ہے۔

'الفتہ مکان کذا ایلافا' کے معنی ہوں گے 'جعلتہ یالفہ' میں نے اس جگہ سے اس کو مانوس کر لیا۔

'الفہ مؤالفۃ والافا' کے معنی ہیں 'انسہ وعاشرہ' وہ اس سے مانوس ہوا اس کے ساتھ رہا سہا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ 'ایلاف' ہو یا 'الاف' دونوں ہی صورتوں میں معنی کے لحاظ سے کوئی خاص فرق نہیں ہوگا۔ اس کا اصل مفہوم اُنس، تعلق اور وابستگی ہے۔ اگرچہ 'لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ' کے مجمل الفاظ سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ قریش کی کس چیز کے ساتھ وابستگی زیر بحث ہے لیکن آگے 'رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ' اور 'فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ' کے الفاظ سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں ان مفادات کے ساتھ ان کی وابستگی زیر بحث ہے جو انھیں بیت اللہ کے تعلق اور اس کی خدمت و تولیت کی بدولت حاصل ہوئے۔

گویا اس سورہ میں قریش کو یہ یاد دہانی کی جا رہی ہے کہ انھیں مکہ میں یا پورے ملک عرب میں جو عظمت و وقار اور اس کے نتیجہ میں جو غیر معمولی دنیوی مفادات حاصل ہیں ان میں اصلی دخل ان کی ذہانت و قابلیت اور ان کے حسن تدبیر و تدبر کو نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس گھر کے ساتھ تعلق و وابستگی کو ہے۔ اس وجہ سے ان پر واجب ہے کہ وہ اس گھر اور اس کے مالک کے ساتھ اپنے تعلق کی نوعیت کو ہمیشہ یاد رکھیں، اپنی دنیوی کامیابیوں کے نشہ میں ان حقوق و فرائض کو نہ بھول بیٹھیں جو اس گھر اور اس کے خداوند سے متعلق ان پر عائد ہوتے ہیں۔

اِیْلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ (۲)

ابہام کے بعد تفصیل یہ سابق 'اِیْلٰف' سے بدل ہے۔ پہلے بات مجمل طور پر کہہ کر ناتمام چھوڑ دی ہے تاکہ سننے والوں میں سوال پیدا ہو جائے کہ قریش کی کون سی وابستگی کس پہلو سے زیر بحث ہے؟ یہ اسلوب کلام قرآن میں بعض دوسرے مقامات میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ اس کا پہلا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کا

کو سننے کے لیے بیدار ہو جاتا ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی نوعیت اجمال کے بعد گویا تفصیل کی ہوتی ہے اس وجہ سے بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے۔

قریش کے تجارتی سفروں کی نوعیت

فرمایا کہ یہاں خاص طور پر قریش کی جس وابستگی کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے وہ ان کی وہ وابستگی ہے جو ان کو اپنے گرمی و سردی کے دونوں تجارتی سفروں کے ساتھ ہے۔ یہ واضح رہے کہ سردیوں میں قریش کے تجارتی قافلے یمن کا سفر کرتے اور گرمیوں میں شام و فلسطین کا۔ ان تجارتی قافلوں کے ساتھ پوری قوم کا مال، اور سرمایہ ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں بہت سے تاجر ایسے ہوتے جو دوسروں کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتے اور ان کے واسطہ سے وہ لوگ بھی اس نفع بخش تجارت میں حصہ دار بن جاتے جو خود یہ کام نہیں کر سکتے تھے۔ یہی سفر درحقیقت اہلِ مکہ کی تمام دولت و ثروت کا ذریعہ تھے۔ اس طرح ان کی تمام قابلِ فروخت اشیاء دوسری منڈیوں میں پہنچتیں اور دوسرے بازاروں کی ضروری اشیاء ان کے صارفین کو حاصل ہوتیں۔ یہ تجارتی گزرگاہیں قریش کے لیے رگِ جان کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اگرچہ یہ بین الاقوامی گزرگاہیں تھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ صحیح معنوں میں محفوظ صرف قریش کے لیے تھیں، دوسروں کو ان میں وہ تحفظ نہیں حاصل تھا جو قریش کو حاصل تھا۔ دوسروں کے قافلے ان میں علانیہ لُٹ جاتے، ان کو قدم قدم پر راہ میں واقع قبیلوں سے اجازت حاصل کرنی پڑتی اور اس کے لیے بھاری بھاری معاوضے ادا کرنے پڑتے، لیکن قریش کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ اپنے تمام سامانِ تجارت کے ساتھ بے خطر گزرتے اور کسی کا ان سے تعرض کرنا تو درکنار، راہ کے قبائل اپنے اپنے حدود میں ان کے لیے بدرقہ فراہم کرتے کہ یہ لوگ بیت اللہ کے خادم، اس کے متولی اور حاجیوں کی خدمت کرنے والے ہیں۔ اسی نسبت کو قرآن نے یہاں یاد دلایا ہے کہ اپنی دنیوی کامیابیوں کے نشہ میں اس گھر کے رب کو نہ بھولو، تمہاری دنیوی کامیابیاں بھی اسی گھر کے طفیل سے ہیں اور اسی وقت تک تم ان کے حقدار ہو جب تک تم اس گھر کے وفادار ہو۔

بیت اللہ کے ساتھ قریش کے تعلق کی تاریخ

قریش کے متعلق یہ بات یاد رکھیے کہ بیت اللہ کے ساتھ ان کے تعلق کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ باہر سے کوئی قبیلہ آیا ہو، وہ مکہ میں بسا ہو اور پھر اس گھر کا متولی بن بیٹھا ہو بلکہ جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس گھر کو تعمیر کیا اسی وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی ذریت کو اس گھر کے پاس بسایا تاکہ یہ اس مشن کو پورا کریں جو اس گھر کے ساتھ وابستہ ہے اور اسی وقت ان کے لیے امن اور رزق کی دعا کی جس کی برکات کا ذکر سابق سورہ میں بھی ہوا اور اس سورہ میں بھی آ رہا ہے۔ گویا قریش کو ان کی تاریخ یاد دلائی جا رہی ہے کہ اس گھر کے ساتھ ان کا تعلق اتفاقی نہیں بلکہ ایک خاص مشن اور مقصد پر مبنی اور شرائط کے ساتھ مشروط ہے جس کو وفاداری کے ساتھ نباہنے ہی میں ان کی دنیا اور آخرت کی فلاح ہے۔ اگر وہ اس کو بھول بیٹھے تو سب کچھ کھو بیٹھیں گے۔ سورۂ ابراہیم میں اس حقیقت

کی یاددہانی یوں فرمائی گئی ہے :

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۞ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۞ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۞ (ابراہیم - ۱۴: ۳۵-۳۷)	اور یاد کرو جب کہ ابراہیمؑ نے دعا کی: اے میرے رب! اس سرزمین کو امن کی سرزمین بنا اور مجھ کو اور میرے بیٹوں کو اس بات سے محفوظ رکھ کہ ہم بتوں کو پوجیں: اے میرے رب! ان بتوں نے لوگوں میں سے ایک خلقِ کثیر کو گمراہ کر رکھا ہے۔ پس جو میری پیروی کریں وہ تو مجھ سے ہیں اور جو میری نافرمانی کریں تو تو غفور رّحیم ہے۔ اے ہمارے رب! میں نے اپنی ذرّیت میں سے کچھ کو ایک بن کھیتی کی وادی میں، تیرے محترم گھر کے پاس، لبسایا ہے تاکہ وہ نماز کا اہتمام کریں تو تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر اور ان کو پھلوں کی روزی دے تاکہ وہ تیرے شکرگزار رہیں۔

ان آیات سے واضح ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی ذرّیت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کے جوار میں جو لبسایا تو ان مقاصد کی تکمیل کے لیے لبسایا جو اس گھر کی تعمیر سے مدنظر تھے۔ اسی مقصد کی خاطر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے امن و رزق اور مرجعیتِ خلق کی دعا فرمائی جو قبول ہوئی اور ہر دور میں ان کو یہ نعمتیں حاصل رہیں۔ اسی چیز کی یہاں قریش کو یاددہانی فرمائی ہے کہ اس گھر کے ساتھ اپنے اس تعلق کو نہ بھولو، آج بھی تمہیں جو مرجعیتِ خلق حاصل ہے اور جس سے اپنے تجارتی سفروں میں فائدہ اٹھا رہے ہو اسی گھر کی برکت سے ہے۔ یہ انتہائی ناسپاسی ہوگی کہ اس کے تعلق سے تمہیں جو دنیوی فوائد حاصل ہیں ان سے تو بہرہ مند رہو اور اس کے جو حقوق و فرائض تم پر عائد ہوتے ہیں ان کو یکسر فراموش کر دو۔ یہ گھر خدائے واحد کی بندگی کے لیے تعمیر ہوا۔ اس کے مقصدِ تعمیر میں یہ بات شامل ہے کہ بتوں کی پرستش کی لعنت سے خلق کو بچایا جائے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی وجہ سے اس کو الگ تھلگ ایک وادی غیر ذی زرع میں بنایا لیکن تم نے اس کے کونے کونے میں بتوں کو لابسایا یہاں تک کہ اب خدا تو اس گھر میں بالکل اجنبی ہو کے رہ گیا ہے البتہ اصنام کی خدائی اس کے ہر گوشہ پر قائم ہے۔

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۙ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ (۳-۴)

نعمتوں کا حق

اب یہ حق بیان فرمایا ہے اس رزق اور امن کا جو اس گھر سے وابستگی کی بدولت ان کو حاصل ہوا۔ فرمایا کہ جب ان کو رزق اور امن دونوں اسی گھر کے خداوند نے بخشے تو اس کا حق یہ ہے کہ وہ اس گھر کے خداوند ہی کی بندگی کریں۔ یہ امر واضح رہے کہ شرک کی تمام آلودگیوں کے باوجود قریش اس گھر کے خداوند سے ناآشنا نہیں ہوئے تھے۔ اپنے بتوں میں سے کسی کو بھی وہ اس گھر کا خداوند نہیں سمجھتے تھے۔ عبدالمطلب نے جو دعا ابرہہ کے حملہ کے موقع پر، جبلِ حرا پر کی اور جو سابق سورہ کی تفسیر میں مذکور ہوئی ہے، اس کو پڑھیے۔ اس میں اس گھر کی حفاظت کے لیے جو استغاثہ انھوں نے کیا ہے وہ تمام تر اس گھر کے خداوند ہی سے کیا ہے۔ اس میں کوئی ادنیٰ اشارہ بھی بتوں میں سے کسی کی طرف نہیں ہے۔ ان بتوں کی حیثیت ان کے نزدیک، جیسا کہ ہم جگہ جگہ اشارہ کرتے آرہے ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں تھی کہ ان کو وہ خدا کے تقرب کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اپنا خالق و مالک اور بیت اللہ کا رب وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے۔ ان کے اس عقیدے میں کوئی فرق کبھی نہیں آیا۔

'جوع' اور 'خوف' کا خاص مفہوم

'اَلَّذِیْۤ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ'۔ اس ٹکڑے میں 'مِنْ' میرے نزدیک سببیہ ہے اور 'جوع' اور 'خوف' کے الفاظ خاص مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں۔ 'جوع' سے مراد کسی علاقہ کی وہ خاص حالت ہے جو غذائی اشیاء و اجناس کی قلت یا نایابی سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح 'خوف' سے کسی علاقہ کی وہ حالت مراد ہے جو امن و امان کے فقدان اور جان و مال کے عدم تحفظ سے رونما ہوتی ہے۔ یہ دونوں لفظ قرآن مجید میں اس خاص مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ (البقرۃ - ۲ : ۱۵۵)

اور ہم تمھارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف، بھوک اور مالوں، جانوروں اور پھلوں کی کمی سے۔

یہ علاقہ، جس میں حرم واقع ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آمد اور بیت اللہ کی تعمیر سے پہلے امن سے بھی، جیسا کہ تفصیل گزری، محروم تھا اور غذائی وسائل سے بھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں نعمتوں سے اس علاقہ کو بیت اللہ کی برکت سے بہرہ ور کیا۔ قرآن میں اس کا ذکر جگہ جگہ قریش پر احسان کے طور پر ہوا ہے، مثلاً فرمایا ہے:

اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰۤى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَیْءٍ (القصص - ۲۸ : ۵۷)

کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لیے تو ایک مامون حرم برپا نہیں کیا جس کی طرف ہر قسم کی پیداواریں کھنچی چلی آرہی ہیں۔

سورۂ عنکبوت میں فرمایا ہے:

وَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (العنکبوت - ۲۹ : ۶۷)	کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لیے تو ایک مامون حرم بنایا اور لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ان کے اردگرد سے اچک لیے جاتے ہیں۔

یہی بات جامع الفاظ میں اس سورہ میں فرمائی ہے کہ وہ اس گھر کے خداوند کی عبادت کریں جس نے غذائی اجناس کی نایابی کے سبب سے ان کے لیے غذائی ضروریات کا سامان کیا اور جان و مال کے عدم تحفظ کے سبب سے ان کے لیے امن وامان فراہم کیا ـــــ مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں ان کو اس سرزمین میں حاصل ہیں تو اللہ تعالیٰ کی عنایت ہی سے حاصل ہیں۔ ان کے سبب سے استکبار میں مبتلا ہونے کے بجائے ان پر اپنے رب کا شکر واجب ہے اور شکر کا تقاضا رب کی بندگی اور اطاعت ہے نہ کہ نافرمانی و سرکشی۔

اللہ تعالیٰ کی مدد سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ حمدًا کثیرًا۔

لاہور

۲۱ - مئی ۱۹۸۰ء

۶ - رجب ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

۱۰۷

الماعون

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورہ کا عمود، سابق ولاحق سے تعلّق اور ترتیب بیان

اوپر کی دونوں توام سورتوں ——— الفیل اور قریش ——— میں یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ قریش کو رزق وامن کی تمام نعمتیں بیت اللہ کی بدولت حاصل ہوئیں، اس کا حق یہ تھا کہ یہ لوگ اس گھر کے خداوند کی بندگی کرتے اور جس مقصد کے لیے یہ تعمیر ہوا تھا اور ان کی تولیت میں دیا گیا تھا اس کو کامل وفاداری کے ساتھ پورا کرتے۔ اب آگے کی دونوں توام سورتوں ——— الماعون اور الکوثر ——— میں پہلے تو قریش کے ان لیڈروں کا کردار دکھایا جا رہا ہے جو سورہ کے زمانۂ نزول میں بیت اللہ کے منتظم ومتولی تھے، پھر یہ بتایا گیا ہے کہ اب یہ لوگ اس بات کے اہل نہیں رہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس محترم گھر کے متولی بنے رہیں، انھوں نے اس کے تمام مقاصد برباد کر دیے ہیں اس وجہ سے سزاوار ہیں کہ معزول ہوں اور یہ امانت ان لوگوں کے سپرد کی جائے جو اس کے اہل ہیں۔

سورۂ زیر بحث میں ترتیب بیان اس طرح ہے کہ پہلے قریش کے ایک لیڈر کے کردار کی طرف نہایت تعجب انگیز بلکہ نفرت انگیز انداز میں توجہ دلائی ہے کہ یہ شخص جس قساوتِ قلب کے ساتھ یتیموں کو دھکے دیتا ہے وہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ اس کا سینہ جزا و سزا کے عقیدے سے خالی ہے۔ اگرچہ اس کا نام نہیں لیا گیا ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اشارہ ابولہب کی طرف ہے جو سورہ کے زمانۂ نزول میں بیت اللہ کے تمام مالی وسائل پر تنہا قابض ومتصرف تھا۔ اس کے بعد ان لوگوں کے کردار پر روشنی ڈالی ہے جو بیت اللہ میں آکر بظاہر نماز کی رسم تو ادا کرتے لیکن ان کی نماز بالکل بے روح، محض ایک قسم کی ایکٹنگ، ہوتی چنانچہ ان کی خست کا یہ حال تھا کہ اتفاق تو درکنار روزمرہ ضروریاتِ زندگی کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ان سے کوئی مانگ بیٹھے تو وہ بھی دینے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ بیت اللہ کے بنیادی مقصد دو تھے۔ ایک یہ کہ وہ اللہ واحد کی عبادت کا مرکز ہو۔ دوسرا یہ کہ وہ فقرا اور یتامیٰ کی ہمدردی و خدمت کا ایک مؤثر ادارہ ہو۔ اس کے

متولیوں کا فریضہ یہ تھا کہ وہ ان دونوں مقاصد کے پورے کرنے کا اہتمام کرتے لیکن جن متولیوں کا کردار بیان ہوا ہے ان سے ان دونوں میں سے کسی مقصد کے پورے ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس وجہ سے آگے کی سورہ میں ان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا گیا۔

سُورَةُ الْمَاعُونِ

مَكِّيَّةٌ ـــــــــ آيات: ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۷

أَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ① فَذٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ
الْيَتِيمَ ② وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِينِ ③ فَوَيْلٌ
لِّلْمُصَلِّينَ ④ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ⑤
الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ⑥ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ⑦ ع ۳۲

ترجمۂ آیات ۱-۷

دیکھا تم نے اس کو جو جزاء و سزا کو جھٹلاتا ہے! وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکینوں کو کھلانے پر نہیں اُبھارتا۔ ۱-۳

پس ہلاکی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے بے خبر ہیں۔ جو ریاکاری کرتے ہیں اور ادنیٰ چیزوں میں بھی بخالت کرتے ہیں۔ ۴-۷

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ (۱)

مکہ کا قارون

'اَرَءَیْتَ' کے اسلوبِ خطاب پر اس کے محل میں گفتگو ہو چکی ہے۔ یہ اسلوب کسی کی طرف تعجب اور نفرت کے ساتھ متوجہ کرنے کے لیے آتا ہے۔ لفظ 'دِیْن' یہاں جزا و سزا کے معنی میں ہے جس طرح 'مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ' (الفاتحۃ) میں ہے۔

'اَلَّذِیْ' سے کون مراد ہے؟ اس کی وضاحت یہاں نہیں ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اشارہ ابولہب کی طرف ہے۔ یہ ایک نہایت مالدار بخیل تھا جو حرم کے بیت المال (رفادہ) پر سورہ کے زمانۂ نزول میں، قابض تھا۔ آگے اس کے ذلیل کردار اور اس کی تباہی کا ذکر ایک مستقل سورہ ــــــ اللّھب ــــــ میں آ رہا ہے۔ اس سورہ کی تفسیر سے واضح ہو جائے گا کہ اس نے رفادہ کو اپنی ذاتی جائداد بنا لیا تھا۔ اس کی آمدنی اپنے ذاتی مقاصد میں اس نے استعمال کی اور اس کی بدولت مکّہ کا قارون بن گیا۔

یہاں اصل مقصودِ کلام تو اس کی شقاوت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ جو شخص اتنا قسی القلب ہے کہ وہ یتیموں کو دھکے دیتا ہے اس سے کسی خیر کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے کہ وہ بیت اللہ کے کسی شعبہ کا ذمہ دار بن سکے لیکن بات ایسے اسلوب میں فرمائی ہے جس سے اس کا وہ باطن بھی سامنے آ گیا ہے جو اس کی اس قساوت کا اصل سبب ہے۔

آخرت کا منکر بے غرض انفاق نہیں کر سکتا

'یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ' کی صفت اس کے باطن پر عکس ڈال رہی ہے کہ وہ آخرت اور جزا و سزا کا جھٹلانے والا ہے۔ جو شخص آخرت کا منکر ہو گا اس کے اندر اس انفاق کا کوئی محرک سرے سے باقی رہ ہی نہیں جاتا جو خدا کی خوشنودی اور خالصۃً خدمتِ خلق اور ہمدردیٔ غرباء کے لیے ہو۔ ایسا شخص اگر کچھ خرچ کرتا ہے تو اپنی کسی ذاتی غرض یا ریا و نمائش کے لیے کرتا ہے۔ بے غرض فیاضی صرف اسی شخص کے اندر پیدا ہوتی ہے جو آخرت کی جزا و سزا پر صدقِ دل سے ایمان رکھتا ہے۔ سورۂ لیل میں اس حقیقت پر یوں روشنی ڈالی گئی ہے:

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ۵ وَصَدَّقَ	پس جس نے دیا اور ڈرا اور اچھے انجام کی اس
بِالْحُسْنٰی ۵ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی ۵ وَ	نے تصدیق کی تو ہم اس کے لیے آسان راہ ہموار
اَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی ۵ وَکَذَّبَ	کریں گے اور جس نے بخل کیا اور بے پروا ہوا

بِالْحُسْنٰى ۙ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۙ اور اس نے اچھے انجام کی تکذیب کی تو ہم اس کو دشوار راہ پر ڈالیں گے۔
(اللیل - ۹۲ : ۵ - ۱۰)

فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ (۲)

اسلامی معاشرہ میں یتیم کا مرتبہ

فرمایا کہ یہی شخص ہے جو یتیموں کو دھکے دیتا ہے۔ 'دَعٌّ' کے معنی دھکے دینے کے ہیں۔ فرمایا ہے، 'يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا' (الطور-۵۲: ۱۳) (جس دن وہ دھکے دے دے کر جہنم کی طرف لے جائے جائیں گے)۔ یتیموں کے ساتھ صحیح رویہ جس کی تعلیم دی گئی ہے 'اکرام' کا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ' (الفجر-۸۹: ۱۷) (ہرگز نہیں، بلکہ تم لوگ یتیموں کی عزت نہیں کرتے)۔ اسلامی معاشرہ میں، جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے، ضعیف اس وقت تک سب سے زیادہ قوی اور با اثر ہے جب تک اس کا حق اس کو مل نہ جائے۔ اس چیز کا تقاضا یہ ہے کہ معاشرہ کا ہر فرد ان لوگوں کی دل سے عزت کرے جن کے حقوق ابھی ملنے ہیں۔ ان کے حقوق کی حمایت کرنا، ان کو ادا کرنے کی تلقین کرنا اور ان کو حاصل کرنے کے لیے سینہ سپر ہونا ہر باحمیت مسلمان کا فرض ہے۔

وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۳)

یہ وہی بات منفی پہلو سے فرمائی ہے کہ بھلا جو شخص یتیموں کو دھکے دے گا وہ مسکینوں کی پرورش اور ان کی خدمت و اعانت پر لوگوں کو کیا ابھارے گا! اس حقیقت کی طرف جگہ جگہ اشارہ کیا جا چکا ہے کہ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں وہ اپنی بخیلی پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے یہ بھی چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی بخیل بنے رہیں تاکہ کوئی شخص ان کو بخیل کہنے والا نہ رہے۔ ان کی خواہش کے خلاف اگر کوئی کچھ خرچ کرتا ہے تو وہ، جیسا کہ سورۂ ہمزہ کی تفسیر میں ہم بیان کر چکے ہیں، اس کو اپنے ہمز و لمز اور طعن و تشنیع کا ہدف بنا لیتے ہیں تاکہ شروع ہی میں اس کا حوصلہ پست کر دیں اور وہ اس راہ میں آگے نہ بڑھے۔

یہ امر واضح رہے کہ یہ اس شخص کا کردار بیان ہو رہا ہے جو اس زمانے میں بیت اللہ کے خاص اس شعبہ پر مسلط تھا جس کا تعلق غربا، و یتامیٰ کی خدمت سے تھا۔ مطلب یہ ہوا کہ جب چور ہی کو توال بنا بیٹھا ہے تو اس کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے وہ معلوم ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (۴ - ۵)

بیت اللہ کے پروہتوں کی نمازیں

یہ بیت اللہ کے ان پروہتوں کی نمازوں کی بے حقیقتی کی طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ یہ بیت اللہ کے متولی ہونے کے تعلق سے اپنے عوام کو دکھانے کے لیے نماز کی رسم بھی ادا کرتے ہیں لیکن ان کی نماز محض دکھاوے کی ہوتی ہے اس وجہ سے روح سے بالکل خالی، نری ریاکاری ہوتی ہے۔

یہ امر واضح رہے کہ بیت اللہ کا اصل مقصد تعمیر نماز کا قیام تھا اور اس کے جوار میں حضرت اسمٰعیلؑ

کو حضرت ابراہیمؑ نے خاص اسی مقصد سے بسایا تھا کہ وہ اور ان کی ذریت نماز کا اہتمام رکھیں۔ اسی کی خاطر انھوں نے ان کے لیے امن اور رزق کی دعا بھی فرمائی تھی۔ سورۂ ابراہیم میں یہ دعا یوں مذکور ہے:

رَبَّنَآ اِنِّیۡٓ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ (ابراہیم - ۱۴ : ۳۷)

اے ہمارے رب، میں نے اپنی ذریت میں سے بعض کو ایک بن کھیتی کی وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے، اے ہمارے رب، تاکہ یہ نماز کا اہتمام کریں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے نماز کے قیام و اہتمام کا فریضہ جس طرح ادا فرمایا اس کی شہادت قرآن میں موجود ہے کہ "وَکَانَ یَاۡمُرُ اَهۡلَهٗ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ" (مریم - ۱۹ : ۵۵) (اور وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا) اگرچہ بعد کے ادوار میں مبتدعین اور خائنوں کے تسلط کے سبب سے نماز اور زکوٰۃ دونوں کا حلیہ بالکل بگڑ گیا۔ زکوٰۃ کا جو حشر ہوا اس کی تفصیل اوپر گزری۔ نماز کا جو حال ہوا اس کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ سورۂ انفال کی آیت ۳۵ میں موجود ہے: "وَمَا کَانَ صَلَاتُهُمۡ عِنۡدَ الۡبَیۡتِ اِلَّا مُکَآءً وَّتَصۡدِیَةً" (الانفال - ۸ : ۳۵) (بیت اللہ کے پاس ان کی نماز سیٹی اور تالی بجانا رہ گئی ہے) تاہم اپنی بگڑی ہوئی صورت میں سہی یہ چیزیں باقی رہیں اور جس طرح ہر دور کے لیڈر اپنے عوام کو بے وقوف بنائے رکھنے کے لیے مذہبی رسوم کی نمائش کرتے رہتے ہیں اسی طرح قریش کے لیڈر بھی خاص خاص مواقع پر ان رسوم کی نمائش کرتے رہتے تھے۔ ان کی اسی نماز پر فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے لیے تباہی ہے جو اپنی نمازوں کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔

اَلَّذِیۡنَ هُمۡ یُرَآءُوۡنَ وَیَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ (۶-۷)

نمازوں کی بے حقیقتی کی وضاحت

یہ ان کی نمازوں کی بے حقیقتی کی وضاحت ہے کہ یہ محض دکھاوے کی نمازیں پڑھتے ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں بھی نہایت بخیل ہیں۔ یہاں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کی نمازوں کے بے روح و بے جان ہونے پر دو چیزوں سے دلیل قائم کی ہے۔ ایک ان کی ریاکاری سے دوسرے ان کی خست سے۔

نماز کی اصل حقیقت اخلاص ہے۔ یعنی وہ صرف اللہ وحدہٗ لا شریک کی خوشنودی اور رضا طلبی کے لیے پڑھی جائے۔ اس کے سوا اگر کوئی اور غرض اس میں شامل ہو جائے تو نماز بالکل باطل اور اپنے اصل مقصد کے اعتبار سے نہ صرف بے نتیجہ بلکہ نہایت مہلک ہوتی ہے۔ ان لوگوں کی نمازیں اول تو ان کے فساد عقیدہ کے سبب سے اخلاص سے محروم تھیں ثانیاً وہ پڑھتے بھی، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، محض دکھاوے ہی کے لیے تھے تاکہ ان کے عوام ان کو مذہبی سمجھیں۔ اس طرح کی نماز ظاہر ہے کہ محض

ایکٹنگ ہوتی ہے جس کا زندگی کے حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہوا کرتا۔ جس طرح کسی ڈرامے میں مجنوں کا پارٹ ادا کر دینے سے کوئی مجنوں نہیں بن جاتا اسی طرح اس قسم کے لوگ مسجد میں آجانے اور رکوع سجود اور قیام و قعود کی نمائش کر دینے سے نمازی نہیں بن جاتے۔

علاوہ ازیں ان لوگوں کی خسّت بھی اس بات کی دلیل تھی کہ ان کی نمازیں بالکل بے روح و بے جان ہیں۔ نماز کی اصل روح اپنے رب کی شکر گزاری ہے۔ جو بندہ اپنے رب کا شکر گزار ہوتا ہے وہ خسیس و لئیم نہیں ہوتا بلکہ فیاض و کریم ہوتا ہے۔ وہ اپنے رب کی نعمتوں میں دوسروں کو شریک کرتا اور اس کو ان کا حق سمجھتا ہے۔ اس کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ جب میرے رب نے مجھے بخشا ہے تو اس کی شکر گزاری کا تقاضا یہ ہے کہ میں اس میں ان لوگوں کو شریک کروں جو اس سے محروم ہیں اور یہ جذبہ اس پر اس قدر غالب ہوتا ہے کہ بسا اوقات وہ اپنی ضرورت کو نظر انداز کر کے دوسروں کی مدد کرنے میں لذت و حلاوت محسوس کرتا ہے۔ نماز اور انفاق کے باہمی تعلق پر اس کتاب میں جگہ جگہ بحث ہو چکی ہے۔ فلسفۂ دین کے اعتبار سے جذبۂ شکر کی تحریک سے سب سے پہلے نماز وجود میں آتی ہے اور پھر نماز انفاق کے لیے محرک بنتی ہے اور پھر انہی دو چیزوں پر شریعت کا پورا نظام قائم ہے۔

ماعون کا مفہوم

وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ۔ لفظ 'مَاعُوْن' روزمرہ استعمال کی ان چیزوں کے لیے آتا ہے جن کے عاریت لین دین میں کوئی قباحت خیال نہیں کی جاتی بلکہ ہر پڑوسی اپنے پڑوسی سے ان کو بعض اوقات مانگنے پر مجبور ہوتا ہے اور ان کا مانگنا اور دینا دونوں اچھے معاشرہ میں حسنِ معاشرت کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی پڑوسی کو آپ سے کسی ضرورت سے ایک چارپائی یا بستر، یا کوئی برتن یا چھری یا دیا سلائی یا اسی طرح کی کوئی اور چیز مانگنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے تو ہر شریف پڑوسی اس کی ضرورت نہایت خوش دلی سے پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ صرف وہی لوگ اس طرح کے موقع پر تنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں جو نہایت لئیم ہوتے ہیں۔ اس طرح کے لئیم اگر نماز پڑھتے ہیں تو ان کی نماز محض نمائش ہوتی ہے۔ اس نماز کے لیے نہ کوئی محرّک ان کے دل کے اندر ہوتا اور نہ یہ نماز کسی پہلو سے ان کے دل پر اثر انداز ہوتی۔ بلکہ نمائش ہونے کے سبب سے یہ ان کی قساوت میں مزید اضافہ کرتی ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

بعض لوگوں نے اسی 'فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ...... الآیۃ' والے ٹکڑے کی بنا پر اس سورہ کو مدنی قرار دیا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اس قسم کی ریاکارانہ نماز پڑھنے والے تو مدنی دور میں پیدا ہوئے ہیں مکی دور میں اس قسم کے لوگ کہاں تھے؟ اس غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ اس سے انھوں نے وہ نماز مراد لی ہے جس کا حکم اسلام نے دیا ہے۔ حالانکہ اس سے مراد، جیسا کہ ہم نے وضاحت کی،

وہ نماز ہے جس کے قیام کا حکم حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی ذریت کو بیت اللہ کی تعمیر کے ساتھ ہی دیا گیا تھا اور جس کی روایت بعد کے ادوار میں بھی باقی رہی اگرچہ اس کا حلیہ بدعات کے غلبہ کے سبب سے بہت بگڑ گیا تھا۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ حمدًا کثیرًا۔

لاہور
۲۶۔ مئی سنہ ۱۹۸۰ء
۱۱۔ رجب سنہ ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

١٠٨

الکوثر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلق اور پیغمبرؐ کو بشارت

سابق سورہ ـــــ الماعون ـــــ میں آپ نے دیکھا کہ قریش کے لیڈروں پر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ بیت اللہ کے جوار میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی ذریت کو جس مقصد کے لیے بسایا اور جس کی خاطر ان کے لیے امن اور رزق کی دعا فرمائی وہ مقصد انھوں نے بالکل برباد کر دیا۔ یہ گھر خدائے واحد کی عبادت اور فقراء و یتامیٰ کے حقوق کی حفاظت کے مرکز کی حیثیت سے قائم کیا گیا لیکن اب جو لوگ اس پر قابض ہیں ان کو نہ نماز کی خبر ہے نہ یتیموں اور مسکینوں کے حقوق کا کوئی لحاظ ہے۔ اس بات کے بیان سے مقصود ظاہر ہے کہ قریش کے اس فخر و ناز پر ضرب لگانا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس گھر کا متولی جو سمجھے بیٹھے ہیں اور یہ گمان جو رکھتے ہیں کہ وہ خدا کے منظورِ نظر ہیں ان کو یہاں سے کوئی ہلا نہیں سکتا، یہ محض ایک زعمِ باطل ہے۔ لیکن اس سورہ میں صرف فردِ قرار دادِ جرم بیان کر کے بات ختم کر دی۔ یہ نہیں بتایا کہ اس جرم پر یہ لوگ کس سزا کے مستحق ہیں؟ یہ بات مستقلاً سورۂ زیر بحث میں بتائی ہے۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو براہِ راست خطاب کر کے بشارت دی ہے کہ اب خیرِ کثیر کے اس خزانہ یعنی بیت اللہ کو ان خائنوں سے لے کر ہم نے تمھاری تحویل میں دیا تو تم اپنے رب ہی کی نماز پڑھنا اور اسی کے لیے قربانی کرنا، ان مشرکوں کی طرح اس کو شرک سے آلودہ نہ ہونے دینا۔ ساتھ ہی مخالفین کو یہ وعید بھی سنا دی کہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی جو رحمتیں اور برکتیں حاصل ہوئیں وہ اس گھر کی بدولت ہی حاصل ہوئیں، اس سے منقطع ہو جانے کے بعد وہ تمام برکتوں سے محروم ہو جائیں گے جس کا نتیجہ بالآخر یہ ہو گا کہ ان کی جڑ ہی کٹ جائے گی۔ ان برکتوں سے اب اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو نوازے گا جو اس کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور اس کے حقوق ادا کریں گے۔ وہ اس سرزمین میں تمکن و اقتدار حاصل کر کے اس گھر کو اس کے اصل ابراہیمی جمال سے منور کریں گے۔

یہ سورہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، بشارت کی سورہ ہے اور 'اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ' میں حرفِ تاکید اور صیغۂ ماضی وعدے کی قطعیت کے اظہار کے لیے ہے جس کی مثالیں قرآن میں جگہ جگہ موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں جو بات طے ہو جاتی ہے اس کو کوئی دوسرا بدل سکنے پر قادر نہیں اس وجہ سے اگرچہ وہ مستقبل کے متعلق ہو لیکن قطعیت کے اظہار کے لیے ماضی کے صیغہ میں کی جاتی ہے بالخصوص بشارت کے مواقع میں۔

مکی زندگی کے آخری دور میں، جب مسلمانوں پر مکہ میں عرصۂ حیات تنگ ہو رہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کو مخاطب کر کے فتح و غلبہ کی بشارت مختلف سورتوں میں دی گئی ہے۔ یہ بشارت بھی اسی نوعیت کی ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اس بشارت ہی کے سبب سے اس سورہ کو واقعۂ حدیبیہ کے دور سے متعلق مانا ہے، استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے، لیکن میرے نزدیک اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ قربِ ہجرت کی سورتوں میں مسلمانوں کی تسلی کے لیے اس قسم کی بشارتیں دی گئی ہیں اور وہ ہر گروپ کی آخری مکی سورتوں میں موجود ہیں۔ ان کے حوالے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

قریش پر روزِ اول ہی سے یہ بات واضح تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کا جھگڑا یہ ہے کہ ملت ابراہیم پر کون ہے، وہ یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؛ پھر اسی جھگڑے کا لازمی نتیجہ یہ بھی وہ سمجھتے تھے کہ بیت اللہ کی تولیت کا اصلی حقدار وہی ہے جو اصل ملت ابراہیم کا وارث ہے۔ قریش اپنے موروثی پندار کی بنا پر اپنے آپ کو ملتِ ابراہیم کا وارث اور بیت اللہ کی تولیت کا حق دار سمجھتے تھے اور یہ رعونت ان کے اندر اس حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ وہ حرم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے نماز پڑھنے کے بھی روادار نہ تھے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے ذہن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے یہ حقیقت اچھی طرح راسخ ہو چکی تھی کہ بیت اللہ پر قریش کا قبضہ غاصبانہ ہے اور ایک دن اس کو ان کے قبضہ سے آزاد کرانا بعثتِ محمدی کی اصل غایت ہے۔

یہ بات بھی فریقین پر واضح تھی کہ جو اس گھر سے کٹا وہ ایک شاخِ بریدہ ہو کے رہ جائے گا اور اس کی جڑ سارے عرب سے کٹ جائے گی۔ یہ چیز بھی مقتضی تھی کہ ہجرت کے موقع ہی پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو اطمینان دلا دیا جائے کہ بیت اللہ کی خدمت و تولیت کا شرف ان کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔ جو کشمکش اس وقت قریش کے ساتھ برپا ہے وہ اللہ کے رسول کے غلبہ پر منتہی ہوگی اور جڑ اللہ کے رسول کی نہیں کٹے گی، جیسا کہ قریش گمان رکھتے ہیں، بلکہ اعدائے رسول کی کٹے گی۔ درحقیقت نصرتِ الٰہی کی یہی بشارت تھی جس نے مسلمانوں کے لیے ہجرت جیسے کٹھن امتحان کو آسان بنا دیا ورنہ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ کوئی آسان بازی نہیں تھی۔

سُوْرَةُ الْكَوْثَرِ

مَكِّيَّة ــــــــــــ آيات : ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۳ إِنَّآ أَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ﴿١﴾ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ﴿٢﴾

ع ۱ ۳ ۳۴ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ﴿٣﴾

ترجمۂ آیات ۱-۳ ہم نے تم کو بخشا کوثر تو اپنے خداوند ہی کی نماز پڑھو اور اسی کے لیے قربانی کرو۔ تمہارا دشمن ہی منقطع ہونے والا ہے۔ ۱-۳

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ (۱)

لفظ کوثر کی تحقیق — 'کَوْثَر' مبالغہ ہے 'کَثْرَۃ' کا۔ 'کَثْرَۃ' کے معنی دولت و ثروت کے ہیں۔ اس وجہ سے 'کَوْثَر' کے معنی ہوں گے بڑی کثرت اور بڑی برکت و ثروت والا۔ یہ تسمیہ کے لیے بھی مستعمل ہے اور بطریق صفت بھی اس کا استعمال عام ہے۔

ازروئے عربیت یہاں کوثر کی تین تاویلیں ممکن ہیں:

۱- یہ اسمیت کی طرف منتقل ہو کر کسی خاص چیز کے لیے مخصوص ہو گیا ہو جس کا نام اللہ تعالیٰ نے 'کوثر' رکھا ہو۔

۲- اس کو کسی ایسے موصوفِ محذوف کی صفت مانیے جس کے ساتھ اس کو خصوصیت ہو۔ مثلاً کہتے ہیں 'مرد علیٰ جرد' یعنی رجال مرد علیٰ خیل جرد (نوخیز جوان اصیل گھوڑوں پر) قرآن مجید میں ہے: 'والذّٰرِیٰتِ' (الذّٰریٰت - ۵۱: ۱) یعنی والریاح الذّٰریٰت (غبار اڑانے والی ہواؤں کی قسم)۔ ..... لیکن یہ اسی صورت میں جائز ہے جب صفت اس موصوف کے لیے اس طرح مخصوص ہو کہ یا تو صفت کا ذکر کرتے ہی موصوف ذہن میں آجائے یا کوئی واضح قرینہ اس کی طرف اشارہ کر دے۔

۳- تیسری شکل یہ ہے کہ اس کو اسمائے صفت کی طرح اس کے عموم ہی پر باقی رکھیے۔ اس صورت میں اس سے ہر وہ چیز مراد لی جا سکے گی جس میں خیر کثیر ہو۔ البتہ قرائن کے اشارہ سے بعض افرادِ صفت پر اس کی دلالت زیادہ واضح ہو گی۔

کوثر کے باب میں سلف کے اقوال — لفظ کی لغوی تحقیق کے بعد اب یہ دیکھیے کہ سلف نے اس کے کیا معنی لیے ہیں۔

ابن جریرؒ نے کوثر کی تاویل میں تین قول نقل کیے ہیں:

۱- 'کوثر' جنت میں ایک نہر ہے۔ یہ حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت انسؓ، مجاہدؒ اور ابوالعالیہؒ سے مروی ہے۔

۲- 'کوثر' سے مراد خیر کثیر ہے۔ یہ حضرت ابن عباسؓ، حضرت سعید بن جبیرؓ، عکرمہؓ، قتادہؒ، اور مجاہدؒ سے مروی ہے۔

۳- 'کوثر' جنت میں ایک حوض ہے۔ یہ عطاؒ سے مروی ہے۔

ان میں سے پہلے اور تیسرے قول میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ حوض اسی نہر جاری کا ہو جس کا ذکر پہلے قول میں ہے۔ اس کے بعد صرف دو قول رہ جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے خاص چیز مراد لی جائے، مثلاً 'حوضِ محشر' یا 'نہرِ جنت'۔ دوسرا یہ کہ اس کو عام رکھا جائے تاکہ ہر وہ چیز مراد لی جا سکے جس میں خیرِ کثیر ہو۔

استاذ امام مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے حسنِ تدبر سے ان دونوں قولوں میں نہایت خوبی سے تطبیق پیدا کر کے دونوں کو ایک کر دیا ہے۔ انھوں نے سورہ کے موقع و محل اور اس کی اندرونی شہادتوں سے 'کوثر' سے مراد خانۂ کعبہ کو لیا ہے جو گوناگوں پہلوؤں سے خیرِ کثیر کا خزانہ بھی ہے اور اس دنیا میں اس نہرِ کوثر کا مجاز بھی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت میں ملنے والی ہے۔ انھوں نے جن قرائن اور شہادتوں کی روشنی میں یہ بات فرمائی ہے اس کی وضاحت اپنی تفسیر سورۂ کوثر میں فرمائی ہے۔ وہ کوثر کے باب میں اقوالِ سلف کے درمیان تطبیق دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"پچھلی فصلوں میں معلوم ہو چکا ہے کہ سلف نے کوثر آخرت کے بارے میں اختلاف نہیں کیا ہے بلکہ لفظ کی عمومیت اور صیغۂ ماضی کی رعایت سے وہ چیزیں بھی اس کے دائرہ میں داخل کر دی ہیں جو داخل ہو سکتی تھیں تاکہ لفظ عام، وسیع اور اپنی دلالت میں اسم بامسمّٰی (کوثر) ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے مفسرین نے اس میں جستجو اور کاوش جائز سمجھی۔[1] اگر اس کے متعلق کچھ کہنا بدعت و ضلالت ہوتا تو وہ خاموش رہتے اور سلف بھی اس میں کسی قسم کا اختلاف نہ کرتے۔ اس وجہ سے میں اگر کسی ایسی تاویل کا سراغ لگاؤں جو زمین کے کوثر (خانۂ کعبہ) اور آسمان کے کوثر کو ایک کر دے تو جس طرح میں سلف کو اس کی تاویل میں ایک دوسرے کے خلاف نہیں پاتا اسی طرح اپنے کو بھی ان کے خلاف نہ سمجھوں گا البتہ یہ فرق ہو گا کہ انھوں نے اس کو عام قرار دے کر اس سے حوض یا نہرِ جنت سمجھی اور ان کے ماسوا ہر وہ چیز جس میں خیر کثیر ہو، مثلاً قرآن، حکمت، اسلام، نبوت جن کو حوض یا نہر سے کوئی مناسبت نہیں ہے، مگر میں اس سے وہ چیز مراد لوں گا جس کو حوض یا نہر سے نہایت واضح مشابہت ہے، جس کی کیفیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں اور جس کی حقیقت و روحانیت شبِ معراج میں آپ کے سامنے بے نقاب ہوئی۔"

اس تمہید کے بعد مولانا علیہ الرحمۃ ان اشارات کی تفصیل کرتے ہیں جن سے ان کے قیاس کی تائید ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

---

[1] یہ اشارہ امام رازیؒ وغیرہ کے اقوال کی طرف ہے جن کا حوالہ مولانا فراہیؒ نے اپنی تفسیر میں دیا ہے۔

۱۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے نفوس کے اندر خدا کی طرف ایک فطری شوق و رغبت موجود ہے۔ نفس انسانی اس چیز سے محروم رہ کر تسلی نہیں پا سکتا۔ انسان کی یہی فطرت مذاہب و ادیان کے وجود کا باعث ہوئی ہے۔ ...... اب سوچو کہ اس فطری اشتیاق اور چاہ کی موزوں تعبیر پیاس کے سوا کس چیز سے ہو سکتی ہے؟ زبور میں یہی تعبیر بار بار استعمال ہوئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کو پیش نظر رکھ کر ان عاشقانِ الٰہی کے حال پر غور کرو جو حج کے ایام میں سراپا شوق و آرزو بن کر بیت اللہ کے اردگرد جمع ہوتے ہیں۔ کیا ان کی مثال ان خشک لب پیاسوں کی نہیں ہے جو شدید تشنگی سے مضطر ہو کر کسی حوض کے پاس جمع ہو گئے ہوں؟ اگر یہ مشابہت واضح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خانۂ کعبہ ان کے لیے اس دنیا میں اس حوض کوثر کی مثال ہے جس پر میدانِ حشر میں وہ یکجا ہوں گے۔

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری مسجدوں کو نہر سے تشبیہ دی ہے۔ صحیح بخاری میں ہے:

ارءیتم لو ان نهرا بباب	بھلا بتاؤ اگر تم میں سے کسی کے دروازہ پر
احدکم یغتسل فیه کل	ایک نہر ہو جس میں وہ روزانہ پانچ مرتبہ نہاتا ہو
یوم خمسا (الحدیث)	تو کیا اس کے اوپر کچھ میل کچیل باقی رہے گا۔

یہ تمثیل بھی اصلاً پانی ہی کی ہے۔ پانی جس طرح سیرابی کا ذریعہ ہے اسی طرح طہارت کا بھی ذریعہ ہے اور یہ معلوم ہے کہ ہماری تمام نمازوں کا سرچشمہ بیت اللہ ہے۔ اس اعتبار سے ہماری تمام مسجدیں گویا اس سرچشمہ کی نہریں ہیں جن سے ہم سیرابی اور پاکی حاصل کرتے ہیں۔

۳۔ خانہ کعبہ کے اجتماع سے جس طرح دوسری امتوں کے مقابل میں امت مسلمہ کی کثرت کا اظہار ہوتا ہے اسی طرح حوضِ کوثر پر اس کے اجتماع سے بھی، جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے، اس کی کثرت کا اظہار ہوگا۔ اس کثرت کے ظاہر کرنے کی بہترین شکل یہی تھی کہ کسی ایک مخصوص مقام پر اس کا اجتماع ہو۔ اس اجتماع سے دوسری امتیں اندازہ کرتی ہیں کہ زائرینِ بیت اللہ کا یہ متلاطم سمندر اس بحرِ بیکراں کا صرف ایک قطرہ ہے جو پورے کرۂ ارض پر پھیلا ہوا ہے۔ پس جس طرح حوض کوثر پر اس کے اجتماع سے دوسرے انبیاء علیہم السلام کی امتوں پر اس کی کثرت واضح ہوگی اسی طرح موسمِ حج میں خانہ کعبہ کے پاس اس کا اجتماع اظہارِ کثرت کا ایک جلوہ ہے۔ غور کرو، لفظ 'کوثر' ان دونوں کی مطابقت کس خوبی سے واضح کر رہا ہے۔

۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آپ اپنی امت کو حوضِ کوثر پر وضو کے

آثار سے پہچانیں گے۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ خلوصِ قلب کے ساتھ اس گھر کی زیارت کریں گے وہی لوگ آخرت میں اس حوض پر آئیں گے جو اس گھر کی حقیقت ہے۔

۵۔ فتح مکہ کو اللہ تعالیٰ نے امت کی کثرت کا سبب بنایا چنانچہ حج اکبر کے بعد لوگ گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہوئے۔

۶۔ مسجدِ حرام کو اللہ تعالیٰ نے مبارک (سرچشمۂ خیر و برکت) کہا ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ	بلاشبہ خدا کا پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت
لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا	کے لیے تعمیر ہوا وہی ہے جو مکہ میں
وَّ ھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ۔	ہے، سرچشمۂ خیر و برکت اور لوگوں
(آل عمران - ۳: ۹۶)	کے لیے نشانِ ہدایت۔"

ہم نے اختصار کے خیال سے صرف چند اہم اشارات یہاں نقل کیے ہیں۔ جن لوگوں کو تفصیل مطلوب ہو وہ مولانا علیہ الرحمۃ کی تفسیر سورۂ کوثر کی مراجعت کریں۔

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے آگے چل کر اپنی تفسیر میں یہ بھی واضح فرمایا ہے کہ نہر کوثر درحقیقت کعبہ اور اس کے ماحول کی روحانی حقیقت ہے۔ ایک ضروری اقتباس اس سلسلے کا بھی ملاحظہ فرمائیے:

"معراج میں جو نہر کوثر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مشاہدہ کرائی گئی اس کی صفات پر جو شخص بھی غور کرے گا اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ نہر کوثر درحقیقت کعبہ اور اس کے ماحول کی روحانی حقیقت ہے۔ اس کے متعلق مختلف طریقوں سے جو روایات منقول ہیں ان کی قدرِ مشترک یہ ہے کہ کوثر ایک نہر ہے، اس کے کناروں پر مجوّف موتیوں کے محل ہیں۔ اس کی زمین یاقوت و مرجان اور زبرجد کی ہے۔ اس میں ظروف ہیں جو آسمان کے ستاروں کے مانند ہیں، اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ شیریں اور برف سے زیادہ ٹھنڈا ہے۔ اس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار ہے۔ اس پر چڑیاں اترتی ہیں جن کی گردنیں قربانی کے جانوروں کی طرح ہیں۔"

آگے مولانا علیہ الرحمۃ ان مشاہدات پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہوئے زمین کے حوضِ کوثر اور آسمان کے حوضِ کوثر کی مشابہت یوں واضح فرماتے ہیں:

"اب ایک لمحہ توقف کر کے کعبہ اور اس کے ماحول کے مشاہدات پر غور کرو جب تمام اکنافِ عالم سے عشاقِ الٰہی کے قافلے، عشق و محبتِ الٰہی کی پیاس بجھانے کے لیے اس چشمۂ خیر و برکت کے پاس اکٹھے ہوتے ہیں۔ کیا ان کے احساسِ روحانی میں اس مقدس وادی کے سنگ ریزے یاقوت و زمرد سے زیادہ خوش جمال، اس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار اور اس کے اردگرد

حجاج کے خیمے مجوف موتیوں کے قبوں سے زیادہ حسین و خوبصورت نہیں ہوتے! پھر حجاج اور ان کے ساتھ قربانی کے اونٹوں کی قطاروں پر بھی نظر ڈالو۔ کیا یہ ایک چشمہ کے کنارے لمبی گردن والی چڑیوں کا جھنڈ نہیں ہے!!"

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ جنت کے حوضِ کوثر اور خانۂ کعبہ میں نسبت حقیقت اور مجاز کی ہے۔ یہی خانۂ کعبہ جنت میں حوضِ کوثر کی صورت میں ان لوگوں کو ملے گا جو اس پر پہنچنے کے شوق میں بیت اللہ کے حج کرتے رہے۔ سورہ کے زمانۂ نزول تک چونکہ حالات پردے میں تھے اس وجہ سے بات اشاروں میں فرمائی گئی ہے لیکن مقصد یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ بشارت دی جائے کہ اگرچہ آپ کے اعداء آپ کو اس گھر سے نکالنے کے درپے ہیں لیکن ہم نے یہ آپ کو بخش دیا اور یہ اس دنیا میں بھی آپ کے لیے خیرِ کثیر کا ضامن ہے اور آخرت کی نہر کوثر کا بھی ضامن ہے۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (۲)

اس ذمہ داری کا بیان جس کے ساتھ یہ عطیہ مشروط ہے

یہ اس ذمہ داری کا بیان ہے جس کے ساتھ یہ عطیہ مشروط ہے۔ ہر حق کے ساتھ ذمہ داری کا ہونا لازمی اور اس کے ادا کرنے ہی پر اس حق کے قیام و بقاء کا انحصار ہوتا ہے۔ کوئی حق بھی ذمہ داری کے بغیر حاصل نہیں ہوتا! اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ قریش کو اللہ تعالیٰ نے اس گھر کی تولیت نہایت اہم ذمہ داریوں کے ساتھ سونپی تھی جن میں سے اہتمامِ نماز اور انفاق (جس کی ایک معروف شکل بیت اللہ کے تعلق سے قربانی بھی ہے) کو خاص اہمیت حاصل تھی لیکن انھوں نے نماز اور قربانی دونوں ضائع کر دی۔ نماز کے ضائع کرنے کی جو شکل ہوئی اس کی تفصیل اوپر گزر چکی۔ قربانی انھوں نے یوں ضائع کی کہ شرک میں مبتلا ہو جانے کے سبب سے ان کی قربانی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں رہ گئی بلکہ اس میں ان کے شرکاء و اصنام بھی شریک ہو گئے۔ یہاں جب اس عطیۂ گرامی کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بخشے جانے کا اعلان فرمایا تو ساتھ ہی اس گھر سے متعلق ان دو بڑی ذمہ داریوں کی یاد دہانی بھی فرما دی جو اس کے مدعی متولیوں نے ضائع کر دی تھیں اور جن کے ضائع کرنے کے جرم ہی میں وہ اس منصب سے معزول کیے جانے کے مستحق قرار پائے۔

قربانی کے لیے یہاں 'نَحْر' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو اونٹ کی قربانی کے لیے معروف ہے لیکن یہ اپنے عام استعمال میں دوسرے بہائم کی قربانی کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں خاص طور پر اس لفظ کے استعمال سے مقصود ابراہیمی قربانی کی طرف اشارہ کرنا ہے اس لیے کہ اونٹ کی قربانی ملتِ ابراہیمؑ میں ایک محبوب قربانی تھی جس کو یہود نے اپنی بدعتوں کے تحت حرام قرار دے رکھا تھا۔ بعض لوگوں نے 'نَحْر' کے معنی نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کے لیے ہیں لیکن لفظ کے معنی اختیار کرنے میں موقع و محل کا لحاظ نہایت ضروری ہے۔ یہاں یہ معنی لینے کا کوئی محل نہیں ہے۔ نماز اور قربانی کے حکم

کے لیے موزوں موقع اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ لفظ 'کوثر' جیساکہ وضاحت ہو چکی ہے، یہاں اپنے مجازی مفہوم یعنی خانۂ کعبہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔

نماز کے ساتھ قرآن میں بالعموم انفاق یا زکوٰۃ کا حکم آیا ہے لیکن یہاں قربانی کا ذکر آیا ہے' اس کی وجہ ظاہر ہے کہ بیت اللہ جس طرح نماز کا مرکز ہے اسی طرح قربانی کا بھی مرکز ہے اور اس قربانی کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے غرباء و مساکین اور ضیوفِ الٰہی کی خدمت ہوتی ہے یعنی دوسرے روحانی مقاصد کے ساتھ ساتھ قربانی سے وہ مقصد بھی پورا ہوتا ہے جو انفاق کا ہے'

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ (۳)

قریش کے طعنوں کا جواب

یہ قریش کے لیڈروں کی ان طعن آمیز پیشین گوئیوں کا جواب ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقبل سے متعلق وہ کرتے رہتے تھے۔ آپ کو کوثر دنیا اور کوثرِ آخرت کی بشارت دینے اور اس کی ذمہ داریاں بتانے کے بعد فرمایا کہ تمھارے دشمن کہتے ہیں کہ تمھارا کوئی مستقبل نہیں ہے' تمھاری جڑ عنقریب کٹ جائے گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم کو دنیا اور آخرت دونوں کی نہایت شاندار فیروزمندیاں حاصل ہونے والی ہیں البتہ تمھارے ان دشمنوں کی جڑ کٹ کے رہے گی۔ 'شَانِئٌ' کے معنی مخالف اور عدو کے ہیں اور 'ابتر' اس کو کہتے ہیں جس کے اخلاف میں کوئی اس کا نام لیوا نہ رہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی راہ میں قریش نے اپنے جبر و ظلم کے زور سے مکہ میں تو کچھ رکاوٹیں پیدا کر رکھی تھیں لیکن اطراف بالخصوص مدینہ میں بالتدریج دعوت کو فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ اس سے قدرتی طور پر انھوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ ان کے عوام اس صورتِ حال سے متاثر ہوں گے اور وہ ان وعیدوں کو سچ باور کرنے لگیں گے جو قرآن قریش کے لیڈروں بالخصوص حرم کے پروہتوں کو سنا رہا تھا۔ انھیں اندیشہ ہوا کہ اگر عوام کا اعتماد ان کی قیادت پر متزلزل ہو گیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہو گا کہ ان کا حسنِ ظن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بڑھے گا اور وہ آپ کو مستقبل کے متوقع لیڈر کی حیثیت سے دیکھنے لگیں گے جس سے دعوت کی کامیابی کے امکانات بہت بڑھ جائیں گے۔ اس خطرے کے سدِّ باب کے لیے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقبل سے متعلق مایوسی پیدا کرنے والی پیشین گوئیاں پھیلانی شروع کر دیں تاکہ لوگوں کے اندر یہ خیال زور نہ پکڑنے پائے کہ آپ کا اثر روز افزوں ترقی پذیر ہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے مختلف قسم کی باتیں بنائیں؛ از انجملہ دعوت کی طرف انصار کے میلان کو دیکھ کر انھوں نے یہ بات بھی پھیلانی شروع کی کہ یہ شخص اپنے نئے دین کے سبب سے اپنی قوم اور اپنے مرکزِ دینی (بیت اللہ) سے کٹ چکا ہے اور اب اگر اس نے ہم سے کٹ کر اجنبیوں کے اندر یعنی انصار کے اندر پناہ لی تو اس کی مثال ایک شاخِ بریدہ کی ہو گی جو درخت سے جدا ہو چکی ہے'

اور جس کا سوکھ جانا لازمی ہے۔ ہجرت سے متصل زمانہ میں یہ قیاس لوگ کرنے لگے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر اپنی قوم اور سرزمینِ مکہ کو چھوڑا تو آپؐ انصار کے پاس جائیں گے اس لیے کہ وہی اس پوزیشن میں تھے کہ آپ کی حمایت و نصرت کر سکیں۔ چنانچہ اسی بنیاد پر قریش نے انصار کے بعض قبائل کو، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرنے آئے تھے، یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر آپ لوگ ان کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں تو یہ سوچ کر بیعت کیجیے کہ یہ بیعت اسود و احمر سے جنگ کے لیے کر رہے ہیں۔ لیکن ان دھمکیوں کا انصار پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی عقیدت اور اسلام کے ساتھ ان کی محبت برابر بڑھتی گئی۔ یہ رنگ دیکھ کر اگرچہ قریش کو اپنے پروپیگنڈے میں کامیابی کی کوئی توقع باقی نہیں رہی لیکن وہ اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ وہ ہجرت سے پہلے بھی اپنے عوام کو یہی باور کراتے رہے کہ انصار کی حمایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مبارک ثابت نہیں ہوگی اور ہجرت کے بعد بھی یہی باور کراتے رہے کہ اب ایک اجنبی ماحول میں العیاذ باللہ داعی اور دعوت دونوں کا خاتمہ ہو جائے گا لیکن پیشین گوئی سچی قرآن کی ثابت ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعداء کی جڑ کٹ کے رہی اور حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا کے کوثر سے بھی فیضیاب ہوئے اور جنت کے کوثر پر بھی آپ سب سے پہلے پہنچیں گے اور اپنی امت کی کثرت کا مشاہدہ فرمائیں گے۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر اتمام کو پہنچی۔ فالحمد للہ حمداً کثیراً۔

لاہور

۸ - جون ۱۹۸۰ء

۲۴ - رجب ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

۱۰۹

الکٰفرون

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلق اور مدعا کی ترتیب

اس سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قریش کے ائمۂ کفر سے براءت کا اعلان ہے پچھلی سورتوں میں بھی تمام تر بحث قریش کے لیڈروں ہی سے رہی ہے لیکن خطاب ان سے قومی اور انسانی بنیاد پر ہوا ہے، کہیں بھی 'یٰۤاَیُّھَا الۡکٰفِرُوۡنَ' کے الفاظ سے ان کو خطاب نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن اس سورہ میں ان کو صاف صاف 'اے کافرو!' کے الفاظ سے مخاطب کر کے ان سے بالکل حتمی طور پر قطع تعلق اور براءت کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ یہ اعلانِ براءت رسولوں کی اس سنت کے مطابق ہوا ہے جس کی وضاحت پچھلی سورتوں میں ہو چکی ہے کہ اللہ کے رسول اپنی قوم کو پہلے دین کی بنیادی باتوں ـــــ توحید اور قیامت ـــــ کی دعوت دیتے ہیں۔ اس دعوت میں وہ قوم کو اپنی قوم ہی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہیں اور اس پر اس وقت تک پوری استقامت سے جمے رہتے ہیں جب تک قوم کے اعیان و اکابر اپنے رویہ سے ان کو مایوس نہیں کر دیتے۔ جب وہ مایوس کر دیتے ہیں اور بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ہٹ دھرم اپنی ضد سے باز آنے والے نہیں ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول کو ہجرت کا حکم ہوتا ہے اور وہ قوم سے اعلانِ براءت کر کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہجرت کر جاتا ہے۔ رسول کی ہجرت قوم کے لیے گویا آخری تنبیہ ہوتی ہے۔ اس کے بعد اگر اس کے رویہ میں کوئی اچھی تبدیلی نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ ایک محدود مہلت دینے کے بعد قوم کے تمام مکذبین کو تباہ کر دیتا ہے، خواہ یہ تباہی رسول کی زندگی ہی میں واقع ہو یا اس کے بعد اور خواہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کوئی قہر آسمانی نازل کرے یا رسول کے ساتھیوں کی تلوار اس کے لیے بے نیام ہو۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام و حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام رسولوں کی جو تاریخ قرآن میں بیان ہوئی ہے اس میں یہ مشترک حقیقت موجود ہے اور ہم اس کے تمام پہلوؤں کی وضاحت برابر کرتے آ رہے ہیں۔

یہاں 'یٰۤاَیُّھَا الۡکٰفِرُوۡنَ' سے خطاب، ظاہر ہے کہ انہی ائمۂ کفر سے ہے جو اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ ان کی مسلسل مخالفت نے یہ حقیقت واضح کر

دی تھی کہ یہ چیز کسی شبہ پر مبنی نہیں ہے بلکہ یہ موروثی قیادت کا پندار ہے جس نے ان کو بالکل اندھا بہرا دشمن بنا دیا ہے اور اب خدا کے تازیانۂ عذاب کے سوا کوئی اور چیز ان پر کارگر نہیں ہو سکتی۔ مخاطب کی اس ذہنیت کی بنا پر اس سورہ میں جو باتیں فرمائی گئی ہیں وہ بالکل دوٹوک الفاظ میں فرمائی گئی ہیں اور ہر بات بالکل مبنی بر حقیقت ہے۔ جن لوگوں نے اس خطاب کو مذمت یا غضب پر محمول کیا ہے ان کی رائے صحیح نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ کسی جماعت کا کفر اس وقت تک واضح ہوتا ہی نہیں جب تک اہلِ حق اس پر اتمامِ حجت نہ کر دیں۔ اتمامِ حجت کے بعد ہی اس کا کفر واضح ہوتا ہے اور اس کے بعد ہی یہ بات جائز ہوتی ہے کہ اہلِ حق اس سے علیحدگی کا اعلان کر دیں بلکہ ضرورت داعی ہو تو اس سے جہاد کریں۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے ہجرت اور جہاد کے لیے اقدام اتمامِ حجت کے بعد ہی کیا ہے اور یہی حق و عدل کا تقاضا ہے۔

اس سورہ نے قریش کے لیڈروں کے ساتھ دین کے معاملے میں کسی سمجھوتے کے تمام امکانات کا قطعی سدِّ باب کر دیا ہے اس وجہ سے یہ صرف ہجرت ہی کی سورہ نہیں بلکہ یہ معناً اعلانِ جنگ کی سورہ بھی ہے۔ سورۂ یونس میں وضاحت سے یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ قریش کے لیڈروں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ اگر تم سے اپنے دین کو منوانا ہے تو اس کی واحد شکل یہ ہے کہ یا تو اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں ایسی مناسب ترمیم کرو کہ یہ ہمارے لیے قابلِ قبول ہو سکے: 'اِئْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ' (یونس - ۱۰ : ۱۵) (اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں ترمیم کرو)۔ اس آیت کی تفسیر کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں[1] کہ قرآن کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو سب سے زیادہ اصرار قرآن کی دعوتِ توحید کی ترمیم پر تھا، وہ اس کو اپنے آباء کے عقیدے کے بھی خلاف سمجھتے تھے اور یہ اندیشہ بھی رکھتے تھے کہ اگر اللہ کے سوا انھوں نے تمام معبودوں کو ہی باطل ٹھہرا دیا، جیسا کہ قرآن مطالبہ کر رہا ہے تو اس سے ان کی سیاسی ہستی ہی سرے سے ختم ہو جائے گی۔ ان کے اس مطالبہ کا جواب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ دیا گیا کہ 'قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ' (یونس - ۱۰ : ۱۵) (ان سے کہہ دو کہ مجھے کیا حق ہے کہ میں بطور خود اس میں کوئی ترمیم کر دوں)۔ اگرچہ یہ جواب قریش کے لیے مایوس کن تھا لیکن فیصلہ کن نہیں تھا۔ لیکن اس سورہ میں اس کا ایسا حتمی اور فیصلہ کن جواب دیا گیا ہے کہ ہمیشہ کے لیے اس بحث کا دروازہ ہی بند کر دیا گیا۔ جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ اس معاملے میں اب کسی سمجھوتے کی گنجائش نہیں ہے، اگر قریش اپنی ضد پر قائم رہے تو بالآخر

---

[1] ملاحظہ ہو تدبرِ قرآن۔ جلد سوم صفحہ: ۲۸۲

اس کا فیصلہ تلوار سے ہوگا۔

ترتیب میں اس سورہ کا سورۂ کوثر کے بعد جگہ پانا بھی اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے۔ سورۂ کوثر میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ یہ فتح مکہ کی بشارت ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ ہجرت اور اعلانِ جہاد کی سورہ سے پہلے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح و نصرت کی بشارت دے دی گئی تاکہ حضورؐ اور آپ کے صحابہؓ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اگرچہ آگے ہجرت اور جنگ کے کٹھن مرحلے آنے والے ہیں لیکن انجام ان کا نہایت شاندار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اپنے رسول کو فتح سے نوازے گا اور وہ دنیا و آخرت دونوں کے کوثر سے شادکام ہوں گے۔ اسی طرح کی بشارت حضورؐ کو ہجرت کی اس دعا میں دی گئی ہے جو سورہ بنی اسرائیل میں مذکور ہے:

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ (بنی اسرائیل - ۱۷ : ۸۰)

(اور دعا کرو کہ اے میرے رب، مجھے داخل کر عزت کا داخل کرنا اور نکال عزت کا نکالنا) اس دعا پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے دعا کے پیرائے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بشارت دے دی ہے کہ اگرچہ آپ کے مکہ سے نکلنے کا وقت اب قریب آ رہا ہے لیکن اس نکلنے سے پہلے ہی اللہ نے دار الہجرت میں آپ کے شاندار داخلہ کا انتظام کر لیا ہے۔

مختصر الفاظ میں اس سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قریش کے لیڈروں کے سامنے یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان دین کے بنیادی مسئلہ ــــ معبود ــــ کے باب میں کوئی قدرِ مشترک نہ حاضر میں ہے، نہ ماضی میں رہی ہے اور نہ مستقبل میں اب اس کے پائے جانے کا امکان ہے اس وجہ سے ہمارے مابین کسی مفاہمت کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اب تم اپنے دین پر چلو، ہم اپنے دین پر چلیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ صادر ہو جائے۔

سُورَةُ الْكٰفِرُوْنَ

مَكِّيَّةٌ ______ آيات: ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۶ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱﴾ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲﴾ وَلَآ
اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ﴿۳﴾ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ﴿۴﴾
وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ﴿۵﴾ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ﴿۶﴾ ع

ترجمۂ آیات ۱-۶ کہہ دو، اے کافرو! نہ میں پوجوں گا جن چیزوں کو تم پوجتے ہو اور نہ تم پوجنے
کے جسے میں پوجتا ہوں اور نہ میں پوجنے والا ہوا جن کو تم نے پوجا اور نہ تم پوجنے
والے ہوئے جسے میں پوجتا آ رہا ہوں۔ ۱-۵
تمھیں تمھارا دین اور مجھے میرا دین! ۶

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ (۱)

'قُلْ' اعلان کے مفہوم میں

'قُلْ' یہاں اعلان کر دینے کے معنی میں ہے۔ اس معنی میں یہ قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ اس سورہ کا مضمون اعلان کا مقتضی تھا تاکہ جو مفسدین کفر اور اسلام کے درمیان سمجھوتے کے خبط میں مبتلا تھے وہ بھی اپنی اس سعیِ نامراد سے مایوس ہو جائیں اور جو سادہ لوح اس طرح کی تجویزیں پیش کرنے والوں کو امن پسند اور صلح جو گمان کر رہے تھے ان پر بھی اصل حقیقت واضح ہو جائے کہ یہ صلح و امن کی راہ نہیں بلکہ فساد کی مستقل پرورش کی راہ ہے۔

ائمۂ کفر سے خطاب

'یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ' کا خطاب ظاہر ہے کہ قریش کے ان ائمۂ کفر سے ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مخاطب اول تھے لیکن آپ کی برسوں کی جدوجہد کے بعد ان کے رویہ میں کوئی تبدیلی ہوئی تو یہ ہوئی کہ انھوں نے کفر اور اسلام دونوں کا ایک ملغوبہ تیار کرنے کا مطالبہ کیا۔ رسول اتمام حجت کا کامل ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر اس کی محنت بھی ان کو متاثر نہ کر سکی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ پھر کوئی بھی دوسرا ایسی چیز نہیں رہ گئی تھی جو ان کی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکے۔ چنانچہ ان لوگوں کے بارے میں آگے اس سورہ میں جس مایوسی کا اظہار فرمایا گیا ہے وہ بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ ان میں سے کوئی بھی اسلام لانے والا نہیں بنا بلکہ ہر ایک اپنے غرور اور انانیت کا شکار ہوا۔

دو سوال اور ان کے جواب

یہاں اس خطاب سے متعلق دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن میں عام طور پر قریش کے لیڈروں کو اس طرح کے سخت خطاب سے کہیں مخاطب نہیں کیا گیا ہے، پھر اسی سورہ کی کیا خصوصیت ہے کہ اس میں ان کو 'یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ' سے خطاب کیا گیا۔ دوسرا یہ کہ قریش بلکہ اہل عرب بالعموم خدا کے منکر نہیں بلکہ اس کے شریک ٹھہرانے والے تھے تو قرآن نے ان کو 'اے کافرو' کیوں کہا 'اے مشرکو' سے کیوں نہیں خطاب کیا؟

ان دونوں سوالوں کے جواب اگرچہ اس کتاب میں جگہ جگہ دیے جا چکے ہیں اور تمہید میں بھی اس کی طرف اشارہ ہو چکا ہے لیکن ہم یہاں پھر ان کو صاف کیے دیتے ہیں۔

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے اس کا جواب یہ ہے کہ حضورؐ نے یہ اندازِ خطاب اس وقت اختیار فرمایا ہے جب اچھی طرح اتمامِ حجت کر دینے کے بعد، قوم کے رویہ سے بالکل مایوس ہو کر، اللہ تعالیٰ کے اذن سے، آپ نے ہجرت کا فیصلہ فرما لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ رسول کو ہجرت کا حکم اسی

وقت دیتا ہے جب قوم کے رویہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر ایمان قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے اور اس کی مکابرت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اگر اس کا مزید تعاقب کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ خدانخواستہ وہ رسول کو قتل کر دے۔ اس مرحلے میں رسول کے لیے یہ بات بالکل معقول ہوتی ہے کہ وہ قوم اور قوم کے معبودوں سے اپنی کامل بیزاری کا اعلان کر کے ان سے الگ ہو جائے اور چونکہ رسول کی دعوت سے کفر اور اسلام دونوں کی اچھی طرح وضاحت ہو چکی ہے اس وجہ سے جو بھی ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرتا ہے، اس کے متعلق اس شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ اس نے کفر یا اسلام میں سے کسی کو بے سمجھے بوجھے اختیار کیا ہے اس وجہ سے اگر اس دور میں رسول کفر پر اڑے رہنے والوں کو اے کافرو! سے خطاب کرتا ہے تو یہ خطاب بالکل برمحل، جائز اور معقول ہوتا ہے۔

اس سے ہمارے لیے یہ تعلیم نکلتی ہے کہ جو چیز کفر یا شرک ہے اس کو کفر یا شرک بتانا اور اس سے لوگوں کو بچانے کی کوشش کرنا تو ہر مسلمان کی ہر لمحہ ذمہ داری ہے لیکن کسی فرد یا گروہ کو کافر قرار دے کر اس سے اعلانِ برارت کرنا یا اپنے جملہ روابط اس سے کاٹ لینا یا اس سے اعلانِ جنگ کر دینا بڑی احتیاط کا متقاضی ہے۔ خاص طور پر ان لوگوں کا مسئلہ بڑا مشکل ہے جو اپنی ہر گمراہی کو اسلام بنائے ہوئے ہوں اور صحیح اسلام ان کے آگے پیش کرنے کا کوئی شرعی نظام موجود نہ ہو۔ اس طرح کے حالات میں صحیح راستہ یہی ہو سکتا ہے کہ آدمی غلطیوں اور گمراہیوں پر تنقید تو کرے اور لوگوں کے ان افعال میں شرکت سے اجتناب بھی کرے جو شرک و بدعت کی نوعیت کے ہوں لیکن ان کو کافر قرار دے کر ان سے کلیۃً علیحدگی کا اعلان اس وقت تک نہ کرے جب تک اس کے لیے مجبور نہ ہو جائے یا یہ باور کرنے کے لیے اس کے سامنے معقول وجوہ نہ آ جائیں کہ اس نے لوگوں پر حق واضح کر دیا اور یہ دوسری چیز نہایت مشکل ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ شرک حقیقت میں کفر ہی ہے۔ دین میں ایمان صرف وہی معتبر ہے جو کامل توحید کے ساتھ ہو یعنی آدمی خدا کی ذات، اس کی صفات اور اس کے حقوق میں کسی دوسرے کو کسی پہلو سے بھی شریک نہ ٹھہرائے۔ اللہ تعالیٰ کسی کے ایمان اور اس کی بندگی کا محتاج نہیں ہے کہ وہ ہر قسم کا ایمان اور ہر قسم کی بندگی قبول ہی کرے اگرچہ اس میں شرک کی ملاوٹ بھی ہو۔ وہ اپنی بندگی اپنی شرائط پر چاہتا ہے، نہ کہ دوسروں کی شرائط پر، اس وجہ سے ہر وہ عمل خدا کے ہاں غیر مقبول ہے جو صرف اسی کے لیے نہ کیا گیا ہو بلکہ اس میں دوسروں کو بھی شریک کر دیا گیا ہو۔ قرآن کے فلسفہ کی رو سے اس شخص میں جو خدا کا منکر ہے اور اس شخص میں جو اس کو مانتا ہے لیکن خدائے واحد کی حیثیت سے نہیں بلکہ بہت سے دیوتاؤں میں سے ایک دیوتا یا سب سے بڑے دیوتا

کی حیثیت سے مانتا ہے، کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ دونوں ہی خدا کے منکر یا دوسرے الفاظ میں کافر ہیں۔ اس لیے کہ شرک کے ساتھ خدا کو ماننا اس کی تمام اعلیٰ صفات کی نفی ہے اور صفات کی نفی کے ساتھ اس کو ماننا اس کے نہ ماننے کے ہم معنی ہے۔ قرآن نے یہاں ان مشرکوں کو کافر کہہ کر اسی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ شرک درحقیقت کفر ہی ہے، کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ یہ کسی درجے میں بھی کفر کے مقابلے میں اہون یا قابلِ لحاظ ہے۔

لَآ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ (۲)

سمجھوتے کی پیشکش کا جواب

کفر کے سرغنوں کو خطاب کر کے یہ ان کی اس پیش کش کا جواب ہے جو وہ باہمی سمجھوتے کے لیے کر رہے تھے۔ فرمایا کہ میں ان چیزوں کو نہیں پوجوں گا جن کو تم پوجتے ہو۔ گویا پہلے ہی فقرے میں ان کی توقع کا خاتمہ کر دیا۔

عام طور پر لوگوں نے 'لَآ اَعۡبُدُ' کو حال کے مفہوم میں لیا ہے لیکن اس کو حال کے مفہوم میں لینا صاحبِ کشّاف کے نزدیک عربیّت کے خلاف ہے اور میرے نزدیک ان کی رائے صائب ہے۔ مضارع پر جب اس طرح 'لَا' آئے گا تو وہ مضارع کو لازماً مستقبل کے مفہوم میں کر دے گا۔ حال کے مفہوم کے لیے 'لَا' نہیں بلکہ 'مَا' کا استعمال موزوں ہے۔

علاوہ ازیں حال سے متعلق کسی نفی یا اثبات کا کوئی خاص فائدہ بھی نہیں۔ قریش میں سے ہر شخص کو علم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان بتوں میں سے کسی کو نہیں پوجتے۔ پھر ان کو یہ بتانے سے کیا فائدہ کہ میں ان کو نہیں پوجتا جن کو تم پوجتے ہو؟ سمجھوتے کی تجویزیں پیش کرنے سے ان کا اصلی مقصد تو یہی تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اس رویے میں کچھ لچک پیدا کریں جس میں دوسرے معبودوں کے لیے سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں رہی ہے۔ ان کی اس توقع پر ضرب لگ سکتی تھی تو اسی صورت میں لگ سکتی تھی جب ان کو آئندہ کے لیے یہ یقین دلا دیا جائے کہ خدا کی توحید کے باب میں آپ کوئی لچک قبول کرنے والے نہیں ہیں۔

سورۂ قلم کی آیت 'وَدُّوۡا لَوۡ تُدۡهِنُ فَیُدۡهِنُوۡنَ' (القلم - ۶۸: ۹) (وہ چاہتے ہیں کہ تم کچھ نرم پڑو تو وہ بھی کچھ نرم پڑ جائیں گے) کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں[۱] کہ قریش اپنے جبر و ظلم کے تمام حربے آزما کر ہجرت سے کچھ پہلے پہلے یہ اندازہ کر چکے تھے کہ اسلام کی روزافزوں ترقی کو روکنا ان کے امکان میں نہیں رہا۔ اب اگر کچھ امکان ہے تو صرف یہ ہے کہ دباؤ ڈال کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ 'کچھ دو اور کچھ لو' کے اصول پر معاملہ کرنے کی طرف مائل ہوں یعنی جس

---

[۱] ملاحظہ ہو تدبر قرآن - جلد ہفتم، صفحات ۵۱۶ - ۵۱۷۔

طرح ہم اللہ تعالیٰ کے لیے ایک مقام تسلیم کرتے ہیں اسی طرح آپ ہمارے بتوں کے لیے بھی عبادت میں ایک حق تسلیم کرلیں تو یہ جھگڑا ختم ہو جائے۔ ان کو توقع تھی کہ دباؤ ڈال کر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا موقف تسلیم کرالیں گے چنانچہ انھوں نے اپنا پورا زور صرف کر دیا یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو حالات سے مجبور ہو کر ہجرت کی راہ اختیار کرنی پڑی لیکن دین کی بنیاد چونکہ توحید ہی پر ہے اس وجہ سے ہجرت کے امتحان سے گزرنا گوارا کر لیا گیا لیکن اس معاملے میں کوئی لچک گوارا نہیں کی گئی بلکہ صاف صاف 'لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ' کا اعلان کر دیا گیا۔

وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ (۳)

ایک حقیقت نفس الامری کا اظہار — ساتھ ہی ان کو اس حقیقت نفس الامری سے بھی حضورؐ نے آگاہ فرما دیا کہ تم جو یہ گمان کیے بیٹھے ہو کہ تم اس خدا کو پوجنے والے ہو یا بن جاؤ گے جس کو میں پوجتا ہوں تو تمھارا یہ گمان محض گمان ہے۔ میرے پروردگار کی بندگی کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ بندگی صرف اسی کا حق ہے، اس میں کوئی دوسرا اس کا ساجھی نہیں ہے۔ تم اگر اپنے دیویوں دیوتاؤں سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہو تو اس کے پرستار بھی نہیں بن سکتے۔ یہ تمھارا محض مغالطہ ہے کہ تم اپنے کو خدا کی عبادت کرنے والا سمجھتے ہو۔ خدا کی عبادت کے ساتھ کوئی اور عبادت جمع نہیں ہو سکتی۔ اس کی بندگی میں داخل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ تم اپنے تمام معبودوں کو باہر چھوڑ کر آؤ۔ اگر اس کی بندگی کے ساتھ تم نے ان کی بندگی بھی جمع کرنے کی کوشش کی تو اپنے معبودوں کے پرستار تو بے شک رہو گے لیکن خدا کی بندگی میں تمھارا کوئی حصہ نہیں ہو گا۔

مشرکین کے معبودوں کے لیے 'مَا تَعْبُدُونَ' کا استعمال بالکل ٹھیک ہے اس لیے کہ وہ فرضی اور وہمی چیزوں کی پوجا کرتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے 'مَا أَعْبُدُ' کا استعمال کچھ کھٹکتا ہے۔ یہ مجانست کے اسی اصول پر استعمال ہوا ہے جس کی مثالیں عربی زبان اور قرآن دونوں میں معروف ہیں، مثلاً 'دِنَّاهُم كَمَا دَانُوا' 'جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا' (الشوریٰ ۴۲: ۴۰) وغیرہ۔ اس اسلوب پر اس کے محل میں مفصل گفتگو ہو چکی ہے۔[1]

وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدتُّمْ (۴)

ماضی سے متعلق موقف کا اظہار — اوپر کا اعلان تو، جیسا کہ واضح ہوا مستقبل سے متعلق ہے۔ اب یہ ماضی سے متعلق بھی آپ نے اپنا موقف واضح فرما دیا کہ ماضی میں بھی کبھی میں ان چیزوں کا پرستار نہیں رہا ہوں جن کی تم نے پرستش

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن۔ جلد ششم، صفحہ ۱۸۱

کی۔ صاحبِ کشاف نے اس آیت کی یہی تاویل کی ہے اور مجھے زبان اور نظم دونوں پہلوؤں سے یہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

'وَلَآ اَنَا عَابِدٌ' کا جملہ اسمیہ ہے اس وجہ سے اس کے حاضر، ماضی اور مستقبل میں سے کسی کے ساتھ مقید ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تینوں زمانوں کے ساتھ یکساں مربوط ہو سکتا ہے بشرطیکہ قرینہ ان میں سے کسی کو ترجیح نہ دے۔ یہاں 'مَا عَبَدْتُّمْ' چونکہ ماضی ہے اس وجہ سے یہ واضح قرینہ ہے کہ 'وَلَآ اَنَا عَابِدٌ' کی نفی ماضی ہی سے متعلق ہے یعنی میں پہلے بھی کبھی ان چیزوں کا پوجنے والا نہیں رہا ہوں جن چیزوں کو تم نے پوجا۔

کلام کا فائدہ — اس کلام کا فائدہ یہ ہوگا کہ اس اعلانِ براءت کی شدت میں اس سے بڑا اضافہ ہو جائے گا جو اوپر کی آیت میں کیا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہو گا کہ جب میں تمہارے ان بتوں کو اپنی زندگی کے اس دور میں بھی کبھی خاطر میں نہیں لایا جب میں شرفِ نبوت سے مشرف اور نورِ وحی سے منور نہیں ہوا تھا تو اب جب کہ میں براہِ راست اپنے رب سے ہدایت حاصل کر رہا ہوں تمہاری اس ضلالت میں کس طرح مبتلا ہو سکتا ہوں۔ مطلب یہ ہوا کہ کوئی دور بھی میری اور تمہاری زندگی میں اگر ایسا گزرا ہوتا جب میں تمہارے اس دینِ شرک میں شریک رہا ہوتا تو تم مجھ سے یہ توقع کر سکتے تھے کہ شاید میں سابق دین پھر اختیار کرنے پر آمادہ ہو جاؤں گا لیکن جب میرا دامن جاہلیت میں بھی شرک سے داغدار نہ ہوا تو اب مجھ سے اس کی توقع تم کیسے کر رہے ہو!

وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (۵)

آیت کا تعلق دورِ ماضی سے ہے — یہ آیت لفظاً تو آیت ۳ کا اعادہ ہے اس وجہ سے تکرار کا شبہ پیدا ہوتا ہے لیکن معناً یہ اس سے مختلف ہے۔ اس کا تعلق آیت ۴ کی طرح دورِ ماضی سے ہے جب کہ آیت ۳ کا تعلق، جیساکہ واضح ہوا مستقبل سے ہے۔ یعنی قریش کے لیڈروں کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ تم اگر اس مغالطے میں مبتلا ہو کہ ماضی میں تم بھی اسی معبود کی پوجا کرتے رہے ہو جس کی میں پوجا کر رہا ہوں تو یہ محض تمہاری خام خیالی ہے۔ شرک کے ساتھ میرے معبود کی پرستش کا، جیسا کہ اوپر واضح ہوا، کوئی امکان ہی نہیں ہے اور تم شرک سے کبھی پاک نہیں ہوئے اس وجہ سے نہ میں کبھی تمہارا دینی بھائی بنا نہ تم میرے دینی بھائی بنے تو یہ توقع تم کس طرح کرتے ہو کہ اپنی اس گندگی میں لتھڑے ہوئے تم مجھے اپنا دینی بھائی بنانے میں کامیاب ہو جاؤ گے!

یہاں باوّلِ وہلہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مطلب آیت کا یہ ہے، جو ہم نے اختیار کیا ہے تو 'مَآ اَعْبُدُ' کی جگہ 'مَا عَبَدْتُّ' کیوں نہیں فرمایا؟ اس کا جواب صاحبِ کشاف نے یہ دیا ہے کہ 'مَا عَبَدْتُّ' اس لیے نہیں فرمایا کہ اس دور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی بندگی نہیں کی

اس وجہ سے آپ نے اس کا حوالہ نہیں دیا بلکہ صرف حال کا حوالہ دیا لیکن یہ جواب بالکل غلط ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام بعثت سے پہلے بھی فطرتِ سلیم پر تھے اور توحید چونکہ دینِ فطرت ہے اس وجہ سے وہ کبھی فطرت کے خلاف شرک میں مبتلا نہیں ہوئے۔ ساتھ ہی وہ لازماً اپنے رب کی کسی نہ کسی شکل میں عبادت بھی کرتے رہے ہیں اگرچہ وہ طریقہ انھوں نے اپنے اجتہاد سے اختیار کیا ہو یا دین کی سابق روایات سے اخذ کیا ہو۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے پہلے بھی عبادت کرتے تھے۔ اگرچہ اس کا طریقہ واضح طور پر ہمارے سامنے نہیں ہے تاہم اتنی بات معلوم ہے کہ اس کی بنیاد حنیفیت پر تھی جس کی روایت حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے زمانے سے کسی نہ کسی شکل میں چلی آرہی تھی۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک 'مَا عَبَدْتُّمْ' نہ کہنے کی وہ وجہ صحیح نہیں ہے جو صاحبِ کشاف نے بیان کی ہے بلکہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ آپ کا تعلق صرف ماضی ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ آپ نے جس طرح ماضی میں اپنے رب ہی کی عبادت کی اسی طرح آپ حاضر میں بھی اسی کی عبادت پر قائم تھے اس وجہ سے آپ نے 'مَا اَعْبُدُ' فرمایا جس سے تسلسل اور استمرار کا اظہار ہو رہا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ تم اس خدا کے پوجنے والے ماضی میں بھی نہ بنے جس کی بندگی میں نے ماضی میں بھی کی اور اب بھی اس پر قائم و دائم ہوں۔

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (۶)

آشکارا اعلانِ براءت

یعنی جب میرے دین اور تمھارے دین میں کوئی اشتراک ماضی میں نہ ہوا، نہ حاضر میں ہے تو آئندہ کس طرح توقع کرتے ہو کہ ہم کسی ایک نقطہ پر مجتمع ہو سکیں گے۔ اس وجہ سے سمجھوتے کی توقع بالکل لاحاصل ہے۔ میرے لیے میرا دین ہے اور تمھارے لیے تمھارا دین۔ میں اپنے طریقہ پر کام کرتا ہوں اور تم اپنے طریقہ پر کام کرو اور دیکھو کہ انجام کار میری بات سچی ثابت ہوتی ہے یا تمھاری۔ یہی بات سورۂ انعام میں یوں ارشاد ہوئی ہے: 'قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ' (الانعام - ۶: ۱۳۵) (کہہ دو، اے میری قوم کے لوگو، تم اپنی جگہ پر کام کرو، میں اپنی جگہ پر کام کرتا ہوں) سورۂ ہود آیت ۹۳ اور سورۂ زمر آیت ۳۹ میں بھی دوسرے رسولوں سے یہی کلمات نقل ہوئے ہیں اور مقصود اس سے صرف اس بحث و جدال کے دروازے کو بند کرنا ہے جو مخالفین اس مقصد سے کر رہے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے موقف کو بھی تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں۔ اس اعلان سے آپ نے ان کو آخری آگاہی دے دی کہ نہ آپ اپنے دین سے ذرہ برابر ہٹنے کے لیے تیار ہیں اور نہ ان کے دین کے لیے ہی کوئی مقام تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے اعلان کا اعادہ

عام طور پر لوگوں نے اس آیت کو رواداری کے مفہوم میں لیا ہے حالانکہ یہ کفار کے رویہ سے بیزاری بلکہ انجام کار کے اعتبار سے ان سے ابدی مفارقت اور اعلانِ جنگ کے مفہوم میں ہے۔

مختصر الفاظ میں بہ وہی اعلان ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے کیا تھا جس کا حوالہ قرآن نے ان الفاظ میں دیا ہے:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيٓ إِبْرَٰهِيمَ وَٱلَّذِينَ مَعَهُۥٓ إِذْ قَالُوا۟ لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءَٰٓؤُا۟ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ٱلْعَدَٰوَةُ وَٱلْبَغْضَآءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَحْدَهُۥٓ (الممتحنۃ - ۶۰: ۴)

تمھارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ یاد کرو جب کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور ان چیزوں سے جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو بالکل بری ہیں، ہم نے تمھارے عقیدے کا انکار کیا اور ہمارے اور تمھارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت اور نفرت آشکارا ہو گئی تا آنکہ تم اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ پر ایمان لاؤ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے اصحاب کا یہ اسوۂ حسنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے سامنے رکھا ہی اس لیے گیا تھا کہ اسی طرح کا اعلانِ برارت آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ اپنی قوم سے کریں چنانچہ اسی کی پیروی میں یہ اعلان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو اس کے اندر رواداری کی گنجائش کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔ کلام کے سیاق و سباق اور نظم کی رعایت ملحوظ نہ رکھنے سے ایک بہت بڑا نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ بیزاری اور رواداری کے کلمہ میں امتیاز سے بھی قاصر رہ جاتے ہیں اور یہ آیت اس کی ایک نہایت عبرت انگیز مثال ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر اتمام کو پہنچی۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

لاہور

۲۴- جون ۱۹۸۰ء

۱۰- شعبان ۱۴۰۰ھ

تدبّرِ قرآن

١١٠

النّصر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلّق اور مطالب کا خلاصہ

سابق سورہ ـــــــ الکٰفرون ـــــــ سے متعلق وضاحت ہو چکی ہے کہ یہ براءت، ہجرت اور ضمناً اعلانِ جنگ کی سورہ ہے۔ اب اس سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت دی گئی ہے کہ وہ وقت قریب ہے کہ آپؐ کے لیے خاص نصرتِ غیبی ظاہر ہو گی، مکہ فتح ہو گا اور جس مشن پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مامور فرمایا آپ اس سے سرخ روئی کے ساتھ فارغ ہو کر اپنے رب کی خوشنودی و رضامندی سے سرفراز ہوں گے۔ سورۂ فتح کی ابتدائی آیات میں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ وہاں ہم نے وضاحت سے اس کے ہر پہلو پر بحث کی ہے۔ تفصیل کے طالب اس پر ایک نظر ڈال لیں۔

ہجرت، جہاد اور فتح و نصرت میں جو گہرا ربط ہے اس کی طرف ہم سابق سورہ ـــــــ الکٰفرون ـــــــ میں بھی اشارہ کر چکے ہیں اور اس کتاب کے دوسرے مقامات میں بھی اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ رسولوں کی دعوت میں ہجرت کا مرحلہ ہی وہ مرحلہ ہے جب ان کی قوم پر اللہ کی حجّت تمام ہوئی ہے، جب انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ، قوم سے الگ ہو کر، اپنی ایک خاص ہیئتِ تنظیمی بنائی ہے، جب قوم تمام صالح عناصر سے خالی ہو جانے کے سبب سے بالکل ایک جسدِ بے روح ہو کر رہ گئی ہے اور اہلِ ایمان اپنے عقائد و تصوّرات کی آزاد فضا میں پہنچ کر ایک ایسی ناقابلِ تسخیر قوت بن گئے ہیں کہ جو ان سے ٹکرایا اس نے شکست کھائی اور جس پردہ گرے اس کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ رسولوں نے اپنے دشمنوں سے جو جنگ کی ہے وہ ہمیشہ ہجرت کے بعد ہی کی ہے اور اس جنگ میں اگرچہ جماعت کی تربیت کے پہلو سے بعض اوقات آزمائشیں بھی ان کو پیش آئی ہیں لیکن بالآخر اللہ تعالیٰ کی نصرت سے ان کو وہ فتح حاصل ہوئی ہے جس کو چیلنج کرنے کی جرأت کسی کو نہیں ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات اس حقیقت پر شاہد ہیں۔

ہجرت اور فتح و نصرت کے درمیان یہی وہ رشتہ ہے جس کے سبب سے یہ سورہ جو بالاتفاق مدنی ہے، ایک مکی سورہ کی مثنّیٰ قرار پائی۔ اس سورہ کے زمانۂ نزول سے متعلق دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ فتحِ مکہ کے بعد

نازل ہونے والی سورتوں میں یہ سب سے آخری سورہ ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ فتح مکہ سے پہلے اس کی بشارت کے طور پر نازل ہوئی ہے۔ میرے نزدیک اسی دوسرے قول کو ترجیح حاصل ہے۔

اس کی اول وجہ یہ ہے کہ قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے یہ بات واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ملتِ ابراہیمؑ پر ہوئی تھی اور ملتِ ابراہیمؑ کا اصل مرکز چونکہ بیت اللہ ہی تھا اس وجہ سے اس کو خائنوں کے تسلط سے آزاد اور ملتِ ابراہیمی کی خصوصیات سے معمور و آباد کرنا آپ کے مشن کا اصلی اور تکمیلی کام تھا۔ چنانچہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدۃ - ۵ : ۳) میں اسی کام کو آپ کا تکمیلی کام قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد جو کام ہوئے وہ سب اسی کے توابع و مقتضیات تھے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ عرب میں اصل طاقت قریش ہی کی تھی جو مکہ پر قابض تھے اور بیت اللہ کے متولی ہونے کے سبب سے تمام عرب پر اپنی دھاک جمائے ہوئے تھے۔ ان کی طاقت کو توڑ دینا ہی اصل فتح تھی۔ ان کی طاقت توڑے بغیر کوئی فتح نہ حقیقی معنوں میں فتح ہو سکتی تھی اور نہ ان کی طاقت کے ٹوٹ جانے کے بعد کسی اور کے لیے یہ امکان باقی رہ جاتا تھا کہ وہ مسلمانوں کی کسی درجہ میں بھی کوئی مزاحمت کر سکے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ یہاں جس نصرت اور جس فتح کا ذکر ہے اور وہ جس انداز سے آیا ہے وہ عام نصرت اور فتح نہیں ہے بلکہ یہ اس نصرت اور فتح کا ذکر ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے وعدوں اور سنتِ الٰہی کے تقاضوں کی روشنی میں ہجرت کے بعد ہر مسلمان کے دل میں رچی بسی ہوئی تھی اور جس کے ظہور کا ہر مسلمان دل سے متمنی تھا۔ یہ وہ نصرت ہے جس کا ذکر سورۂ مجادلہ کی آیت ۲۱ کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ (اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں غالب رہوں گا اور میرے رسول) میں آیا ہے۔ اور یہ اس فتح و نصرت کا حوالہ ہے جس کا ذکر سورۂ صف آیت ۱۳ میں بدیں الفاظ وارد ہوا ہے: وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَھَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ (اور ایک اور عظیم فیروز مندی بھی ہے جس کی تم تمنا رکھتے ہو، وہ ہے اللہ کی نصرت اور عنقریب ظہور میں آنے والی فتح) ان آیات میں جس نصرت اور فتح کی طرف اشارہ ہے ظاہر ہے کہ اس کا تعلق فتح مکہ سے ہے اس کے سوا کسی اور فتح و نصرت کو یہاں مراد لینے کی گنجائش نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اس سورہ کا نزول فتح مکہ کے بعد مانا ہے انھیں ایک روایت کے سمجھنے میں غلط فہمی پیش آئی ہے لیکن اس پر نہ یہاں بحث کی گنجائش ہے اور نہ غالباً ہماری ساری بحث غور سے پڑھ لینے کے بعد اس کی کوئی خاص ضرورت ہی باقی رہے گی۔

یہ سورہ اپنے مزاج کے اعتبار سے یکسر بشارت ہے۔ فیصلہ کن نصرت کی بشارت، مکہ کی آزادی کی بشارت، اللہ کے دین میں لوگوں کے جوق در جوق داخل ہونے کی بشارت اور آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کو اپنے مفوّضہ مشن سے سرخ روئی کے ساتھ فارغ ہونے کی بشارت۔ اس آخری بشارت سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ اب دنیا سے آپ کے رخصت ہونے کا وقت قریب آرہا ہے۔ اس وجہ سے آپ کو اپنے رب کی حمد و تسبیح میں مزید اضافہ کر دینا چاہیے تاکہ اس عظیم انعام کا حق بھی ادا ہو جو تکمیلِ دین کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے آپ پر فرمایا اور عطائے ثواب کی مزید عنایت بھی آپ کو حاصل ہو تاکہ آپ اپنی سعی کا بڑے سے بڑا اجر اپنے رب کے پاس پائیں۔ اسی ٹکڑے سے قرآن کے سب سے بڑے نکتہ دان حضرت ابن عباسؓ نے یہ نکتہ نکالا کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ نکتہ دقیق ہے، جس کے دقیق ہونے کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کی تحسین و تصویب فرمائی ہے۔ لیکن یہ نکتہ بھی اپنے اندر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک بہت بڑی بشارت رکھتا ہے جس کی وضاحت ان شاء اللہ ہم متعلق آیت کی تفسیر کے تحت کریں گے۔

سُوْرَةُ النَّصْرِ (۱۱۰)

مَدَنِيَّةٌ ——— آیات: ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۳

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝۱ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ
فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝۲ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ
اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝۳

[illegible] ع ۲۵

ترجمۂ آیات ۱-۳

جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے اور لوگوں کو دیکھو کہ وہ فوج در فوج خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے خداوند کی تسبیح پڑھو اس کی حمد کے ساتھ، اور اس سے مغفرت مانگو۔ بے شک وہ بڑا ہی معاف کرنے والا ہے۔ ۱-۳

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ (۱)

اللہ تعالیٰ کی خاص مدد — یہاں اللہ تعالیٰ کی مدد اور فتح کا جس اہتمام خاص کے ساتھ ذکر ہوا ہے اور اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حمد و تسبیح کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے عام مدد اور عام فتح مراد نہیں ہے بلکہ وہ مدد اور فتح مراد ہے جو سنتِ الٰہی کے مطابق اللہ کے رسولوں کو ان کے مخالفوں کے مقابل میں اس وقت حاصل ہوتی ہے جب رسولوں نے اللہ کا پیغام پہنچانے میں اپنی ساری طاقت نچوڑ دی اور قوم رسول کی تکذیب اور اس کی دشمنی پر اس طرح اڑ گئی ہے کہ یہ توقع کرنے کی گنجائش باقی ہی نہیں رہ گئی ہے کہ اس کے رویے میں کوئی تبدیلی واقع ہو سکے گی۔

اس مدد کے ظہور کا وقت — سورۂ یوسف میں اس نصرتِ الٰہی کے ظہور کے لیے یہ ضابطہ بیان ہوا ہے کہ جب اللہ کے رسول اپنی قوم کے ایمان سے مایوس ہو گئے ہیں اور قوم نے اپنے رویہ سے ثابت کر دیا ہے کہ العیاذ باللہ وہ رسول کے انذار کو بالکل جھوٹ اور لاف زنی خیال کرتی ہے تب اللہ کی یہ مدد ظہور میں آئی۔

حَتّٰٓی اِذَا اسْتَیْئَسَ الرُّسُلُ	یہاں تک کہ جب رسول قوم کے ایمان سے مایوس
وَظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ قَدْ کُذِبُوْا	ہو گئے ہیں اور قوم کے لوگوں نے گمان کر لیا ہے کہ
جَآءَھُمْ نَصْرُنَا لا	ان کو جھوٹ موٹ عذاب سے ڈرایا گیا ہے تب
(یوسف - ۱۲ : ۱۱۰)	ہماری مدد رسولوں کے پاس آگئی۔

یہی بات دوسرے الفاظ میں یوں ارشاد ہوئی ہے۔

فَصَبَرُوْا عَلٰی مَا کُذِّبُوْا	پس وہ (رسول) ثابت قدم رہے قوم کی طرف سے
وَاُوْذُوْا حَتّٰٓی اَتٰھُمْ نَصْرُنَا ج	تکذیب اور ایذا رسانیوں کے باوجود یہاں تک کہ
(الانعام - ۶ : ۳۴)	ان کے پاس ہماری مدد آگئی۔

موعود و منتظر فتح — اسی طرح اَلْفَتْحُ پر الف لام اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس سے مراد موعود و منتظر فتح ہے جو اللہ کے رسولوں اور ان کے ساتھیوں کے لیے سنتِ الٰہی کا تقاضا ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا اور جس کے وہ اپنی زندگی کے سخت سے سخت مرحلے میں بھی منتظر و متوقع رہے ہیں۔ اسی فتح کی طرف سورۂ صف کی اس آیت میں اشارہ ہے جس کا حوالہ ہم اوپر دے چکے ہیں: وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَھَا ط نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ (الصف - ۶۱ : ۱۳) اور ایک دوسری فیروز مندی بھی

ہے جس کو تم عزیز رکھتے ہو یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد اور جلد ظاہر ہونے والی فتح) قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں بھی اس کا ذکر اسی اجمال کے ساتھ ہوا ہے جس طرح یہاں ہوا ہے لیکن یہ چیز پہلے سے ذہنوں میں موجود تھی اس وجہ سے، اجمال کے باوجود، اس کے سمجھنے میں لوگوں کو کوئی تردد پیش نہیں آیا۔ مثلاً فرمایا ہے، لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ (الحدید - ۵۷ : ۱۰) (تم میں سے وہ لوگ جو فتح سے پہلے انفاق اور جہاد کریں گے اور جو بعد میں کریں گے دونوں درجے میں یکساں نہیں ہوں گے) یہاں دیکھیے اس بات کی وضاحت نہیں ہے کہ کون سی فتح مراد ہے لیکن ہر شخص سمجھتا ہے کہ اس سے فتح مکہ مراد ہے اس لیے کہ وہی فتح تھی جو جد وجہد کرنے والوں کے اعمال کی قدر و قیمت کے گھٹانے اور بڑھانے کے معاملے میں ایک میزان کا کام دے سکتی تھی۔ اس سے پہلے متعدد غزوات میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہو چکی تھی اور اس کے بعد بھی فتوحات حاصل ہوئیں لیکن نہ ان میں سے کسی کا یہ درجہ تھا کہ نام لیے بغیر اس کی طرف ذہن منتقل ہو سکیں اور نہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر ان کا یہ اثر پڑا کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد کی نیکیوں کی قدر و قیمت میں ان کے سبب سے وہ تفاوت واقع ہوا ہو جو اس فتح کے سبب سے واقع ہوا۔ اس فتح کے بعد عرب میں کفر نے اسلام کے آگے اس طرح گھٹنے ٹیک دیے کہ اس کے لیے پھر سر اٹھانے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اس سے بعثت محمدی کا اصل مقصد گویا پورا ہو گیا چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فتح کے بعد خانہ کعبہ کے دروازے پر جو خطبہ دیا اس میں آپ نے فرمایا کہ:

لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ صدق — اللہ واحد کے سوا کوئی معبود نہیں، اس نے
وعدہٗ ونصر عبدہٗ وھزم — اپنا وعدہ پورا کیا اور اس نے یکہ و تنہا دشمنوں
الاحزاب وحدہٗ۔ — کی تمام جماعتوں کو شکست دی۔

اس خطبہ کے بعد ہی آپ نے قریش کے ان سرغنوں کی طرف توجہ فرمائی جو اس سے پہلے تو پورے جما جما کر آپ سے لڑتے رہے تھے لیکن اس وقت محکومانہ حاضر اور تقدیر کے فیصلہ کے منتظر تھے۔ آپ نے ان کو مخاطب کر کے سوال کیا کہ کیا تم جانتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟ سب نے بیک زبان جواب دیا کہ آپ شریف بھائی اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں! آپ نے ان کا یہ جواب سن کر فرمایا کہ جاؤ، میں نے تم سب کی جان بخشی کی!

فتح و نصرت تائید الٰہی سے حاصل ہوتی ہے

یہاں نصرت اور فتح دونوں کا ذکر جس طرح ساتھ ساتھ ہوا ہے اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی کہ کسی کو کوئی فتح اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر حاصل نہیں ہوتی اس وجہ سے کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی فتح پر اترائے اور اس گھمنڈ میں مبتلا ہو کہ یہ اس کی اپنی تدبیر جنگ ہے اور مہارت و بسالت کا کرشمہ ہے بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ ہی کی تدبیر و حکمت کا کرشمہ سمجھنا چاہیے۔ چنانچہ اوپر ہم نے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ کا جو حوالہ دیا ہے اس سے بھی یہ بات نکلتی ہے کہ آپ نے دشمنوں کی تمام پارٹیوں کی ہزیمت کو تنہا اپنے رب ہی کی قدرت کا کرشمہ قرار دیا، اس کا کریڈٹ نہ خود لینے کی کوشش کی نہ اس میں کسی اور کو حصہ دار بنایا۔ اس سورہ میں آپ کو حمد و تسبیح کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے اس سے بھی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس فضل و انعام پر شکر کا اصل حق دار اللہ تعالیٰ ہی ہے اس وجہ سے زیادہ سے زیادہ اس کی حمد و تسبیح ہونی چاہیے۔

وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا (۲)

اس عظیم بشارت کا سب سے نمایاں پہلو

یہ اس عظیم بشارت کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی قوم سے جو جھگڑا تھا وہ دنیا کی کسی غرض کے لیے نہیں تھا، صرف اللہ کے دین کے لیے تھا۔ آپ چاہتے تھے کہ قریش کے لیڈر اس امانت کا حق ادا کریں جو بیت اللہ کی صورت میں ان کی تحویل میں ہے۔ اگر وہ اس کے لیے تیار نہیں ہیں تو پھر ان کو اس پر قابض رہنے اور اللہ کے بندوں کو اللہ کے دین سے بجبر و ظلم روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس مذہبی جبر کو (جس کو قرآن نے فتنہ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے) ختم کرنے کے لیے آپ نے قریش کو مکہ سے بے دخل کیا اور چونکہ دین کی راہ میں جو رکاوٹ تھی وہ صرف لیڈروں کے جبر و استبداد ہی کے سبب سے تھی، عوام کے دلوں میں اس کے خلاف کوئی بدگمانی نہیں تھی اس وجہ سے اس استبداد کے بند کے ٹوٹتے ہی لوگ رکے ہوئے سیلاب کی طرح قبولِ اسلام کے لیے ٹوٹ پڑے۔ فتح مکہ سے پہلے جو لوگ قبولِ اسلام کے لیے حضورؐ کی خدمت میں آتے وہ ڈرتے ڈرتے آتے۔ اس وقت تک اسلام قبول کرنا تو درکنار اسلام اور مسلمانوں کے حق میں ہمدردی کا کوئی کلمہ کہنا بھی عام لوگوں کے لیے ایک خطرہ مول لینے کے حکم میں تھا۔ اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں کہ اس دور میں انصار کے بعض وفود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کرنے آئے تو قریش کے لیڈروں نے ان کو ڈرایا کہ آپ لوگ ان سے بیعت کر رہے ہیں تو یاد رکھیں کہ یہ بیعت اسود و احمر سے جنگ کے ہم معنی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے استبداد کی موجودگی میں وہی لوگ اسلام لانے کا حوصلہ کر سکتے تھے جو پہاڑوں سے لڑ جانے کا حوصلہ رکھتے ہوں لیکن جب یہ استبداد پاش پاش ہو گیا تو پھر کوئی مزاحمت باقی نہیں رہ گئی۔ لوگ ہر طرف سے اس طرح مدینہ کی طرف بڑھے گویا اس چشمۂ حیواں پر پہنچنے کے لیے پیاس سے تڑپ رہے تھے۔

یہی فتح ہے جس نے ملک کے حالات میں وہ تبدیلی پیدا کی کہ لوگ اپنے دین کے انتخاب کے معاملے میں بالکل آزاد ہو گئے اور سرزمینِ عرب سے اس فتنہ کا بالکلیہ خاتمہ ہو گیا جس کے بل پر قریش کے لیڈر لوگوں کے دین و ایمان کے مالک بنے بیٹھے تھے۔ اس بشارت کے پردے میں گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتا دیا گیا کہ اب جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ لوگ قریش کے ظلم و استبداد سے بالکل آزاد ہو کر اللہ کے دین

کی طرف دوڑیں گے اور کسی کی مجال نہ ہو گی کہ ان کی راہ میں کوئی مزاحمت پیدا کر سکے۔ یہ چیز اس بات کی نہایت محکم دلیل ہے کہ اس سے مراد فتح مکہ ہی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور فتح نہیں ہے جس سے یہ اثرات نمایاں ہوئے ہوں۔ جن لوگوں نے اس سے کوئی اور فتح مراد لی ہے انھوں نے اس سورہ کے مضمرات اور فتح مکہ کے اثرات دونوں کا اندازہ کرنے میں غلطی کی۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا (۳)

اس آیت کے دو خاص پہلو

یہ آیت اپنے اندر یوں تو کئی پہلو رکھتی ہے لیکن دو پہلو خاص اہمیت والے ہیں۔

اول یہ اس فرض کی طرف رہنمائی کرتی ہے جو اس فتح و نصرت کے حاصل ہونے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت پر عائد ہوا۔ یعنی یہ کہ اس پر اترانے اور فخر کرنے کے بجائے لوگ اپنے رب کی حمد و تسبیح کریں، اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگیں اور یہ توقع رکھیں کہ اللہ تعالیٰ بڑا ہی مہربان و کریم ہے اس کے جو بندے اپنی کوتاہیوں کی معافی کے لیے اس سے رجوع کرتے ہیں وہ ان کی طرف رحمت کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے۔ سورۂ کوثر میں جس طرح فرمایا ہے: إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (الکوثر - ۱۰۸: ۱-۲) (ہم نے تم کو بخشا کوثر تو اپنے خداوند ہی کی نماز پڑھو اور اسی کے لیے قربانی کرو) اسی طرح یہاں یہ آیت اس ذمہ داری کے بیان کے لیے بھی آئی ہے جو اس فتح و نصرت کا لازمی تقاضا ہے اور اس چیز کی بھی یہ تعلیم دے رہی ہے جو اس کے بقاء کی ضامن ہے۔ بندوں کو جو نعمت بھی حاصل ہوتی ہے اس کے ساتھ کچھ ذمہ داریاں بھی لازماً وابستہ ہوتی ہیں۔ جب تک بندے ان ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہیں وہ نعمت ان کو حاصل رہتی ہے، جب وہ ان کو بھلا بیٹھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کچھ مہلت دینے کے بعد وہ ان سے یا تو چھین لیتا ہے یا وہ اس کے سبب سے نہایت سخت آزمائشوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

دوسرا پہلو اس کے اندر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بشارت کا ہے کہ اس فتح کے بعد آپ کے لیے اس عظیم فریضہ سے باعزت طور پر سبک دوش ہونے کا وقت آ جائے گا جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر ڈالا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا جو بوجھ ڈالا گیا اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں آپ نے اپنی ساری طاقت جس طرح نچوڑی اور جس طرح اپنے آپ کو اس میں مصروف رکھا اس کی تفصیلات پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے آپ کو مخاطب کر کے نہایت محبت آمیز انداز میں عتاب فرمایا کہ: مَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ (طٰہٰ - ۲۰: ۲) (ہم نے تم پر یہ قرآن اس لیے نہیں اتارا ہے کہ اس کی خاطر تم اپنی زندگی اجیرن بنا لو) اس حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سب سے بڑی بشارت کوئی ہو سکتی تھی تو یہی ہو سکتی تھی کہ وہ دن آئے کہ آپ اس بار عظیم سے سبک دوش ہوں اور باعزت طریقے سے سبک دوش ہوں۔

چنانچہ اس سورہ نے آپ کو یہ بشارت دے دی اور فحوائے کلام سے یہ بات بھی نکلی کہ آپ اپنی ذمہ داری سے عزت و سرخروئی کے ساتھ فارغ ہوں گے۔ اس لیے کہ آیت میں آپ کو استغفار کی ہدایت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے توّاب ہونے کی بشارت بھی دی گئی ہے۔ لفظ 'تَوَّابٌ' جب اللہ تعالیٰ کے لیے آتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنے بندوں پر بڑا ہی مہربان اور ان کی لغزشوں سے درگزر کرنے والا ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام سے صادر ہونے والی لغزشوں کی نوعیت

یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو استغفار کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے اس کا تعلق اسی طرح کی باتوں سے ہے جن کی وضاحت ہم برابر کرتے آ رہے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے اتباعِ ھوا کے قسم کے گناہ تو صادر نہیں ہوتے لیکن بعض اوقات کوئی نیک محرک ان کو کسی نیکی میں حدِ مطلوب سے متجاوز کر دیتا ہے جس کی ایک مثال سورۂ طٰہٰ کی اس آیت میں بھی موجود ہے جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں آپ کو جس بات پر ٹوکا گیا ہے وہ اتباعِ ھوا کے قسم کی کوئی چیز نہیں بلکہ دین میں مفرط انہماک اور ان سرکشوں کے پیچھے اپنے کو کھپانے پر ٹوکا گیا ہے جو اس بار برداری کے اہل نہیں تھے۔

یہ بشارت اس سے زیادہ واضح لفظوں میں سورۂ فتح میں گزر چکی ہے اور ہم ہر پہلو سے اس کی وضاحت بھی کر چکے ہیں۔ آیت کا حوالہ ہم یہاں دیے دیتے ہیں جن کو تفصیل مطلوب ہو وہ تدبر قرآن میں اس کی تفسیر پڑھ لیں[1]۔

اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا ۙ﴿۱﴾ لِّیَغۡفِرَ لَکَ	ہم نے تمھیں ایک کھلی ہوئی فتح عطا فرمائی تاکہ
اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِکَ وَ مَا تَاَخَّرَ	اللہ تمھاری اگلی اور پچھلی لغزشیں معاف فرمائے
وَ یُتِمَّ نِعۡمَتَہٗ عَلَیۡکَ وَ یَہۡدِیَکَ صِرَاطًا	اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے اور تمھیں ایک سیدھی
مُّسۡتَقِیۡمًا ۙ﴿۲﴾ (الفتح - ۴۸: ۱-۲)	راہ کی ہدایت بخشے۔

'فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ' کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے کہ جب تسبیح اور حمد کے الفاظ ساتھ ساتھ آئیں تو تسبیح کے اندر تنزیہہ کا پہلو غالب ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو ان باتوں سے پاک قرار دینا جو اس کی شانِ الوہیت کے منافی ہیں اور حمد کے اندر ان صفات کا اثبات ہوتا ہے جن سے وہ فی الحقیقت موصوف ہے۔ ان دونوں کے صحیح امتزاج ہی سے حقیقی توحید وجود میں آتی ہے جو ایمان کی بنیاد ہے۔

ربِ کریم کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ حمداً کثیراً۔

لاہور

۴- جولائی ۱۹۸۰ء

۲۰- شعبان ۱۴۰۰ھ

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن - جلد ششم - صفحات: ۴۳۶-۴۴۰

تدبرِ قرآن

١١١

اللّھب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق و لاحق سے تعلق

اس سورہ کے عمود اور سابق و لاحق سے اس کے تعلق پر استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں ایسی جامع اور حکیمانہ بحث کی ہے کہ ہم اپنی طرف سے کچھ لکھنے کے بجائے اسی کے بعض اہم اقتباسات پیش کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔ مولانا علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

"سورۂ نصر کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت فتح مکہ پر تمام کی، اسی طرح آپ کے لائے ہوئے صحیفہ کو اس فتح عظیم کے ذکر پر ختم کیا۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ حق اپنے مرکز پر پہنچ گیا۔ خانۂ کعبہ کے مرکزِ توحید و اسلام اور سرچشمۂ ملتِ ابراہیمؑ ہونے کے سبب سے فتح مکہ ہی آپ کی بعثت کا گویا آخری اور تکمیلی کام تھا۔ اس کے بعد صرف ثابت قدمی اور استقامت کی ضرورت رہتی تھی جس کے لیے تین سورتیں اس کے بعد لگا دی گئیں۔ سورۂ اخلاص، جو تمام معارفِ توحید کا خزانہ اور دین کی بنیاد ہے اور سورۂ فلق و سورۂ ناس دعائے استقامت کی تعلیم اور شیاطینِ جن و انس کی تاخت سے اس خزانہ کی حفاظت کے لیے۔"

اس کے بعد مولانا علیہ الرحمۃ سورۂ نصر، سورۂ اخلاص اور معوذتین (سورۂ فلق اور سورۂ ناس) کے اس جھرمٹ میں سورۂ لہب کے رکھے جانے کی حکمت یہ بیان فرماتے ہیں:

"اس تمہید سے واضح ہوا کہ یہ تمام سورتیں ــــ سورۂ نصر، سورۂ اخلاص اور معوذتین ــــ باہم دگر مربوط ہیں اس وجہ سے سورۂ لہب کا ان کے درمیان رکھا جانا بھی لازماً کسی حکمت پر مبنی ہوگا ورنہ یہ پورا سلسلۂ نظم درہم برہم ہو جائے گا۔ چنانچہ غور و فکر سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سورۂ نصر میں جس فتح و غلبہ کا ذکر ہے سورۂ لہب میں اسی کی وضاحت و بشارت۔ گویا یوں فرمایا گیا کہ اللہ نے اپنے پیغمبرؐ کو غلبہ دیا اور اس کے دشمن کو برباد کیا۔ چنانچہ دوسرے مقام میں یہ بات یوں واضح فرمائی گئی:

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ　　　　حق نمودار ہو گیا اور باطل برباد

اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ٥	ہوا۔ بلاشبہ باطل مٹنے ہی کی
(بنی اسرآءیل - ۱۷ : ۸۱)	چیز ہے

اس نظم کی نہایت خوب صورت مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خطبہ میں بھی ہے جو آپ نے فتح مکہ کے دن، خانہ کعبہ کے دروازے پر دیا۔ آپ نے فرمایا:

لا الٰه الا الله وحده	خدائے واحد کے سوا کوئی معبود نہیں۔
وصدق وعده ونصر	اس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے بندے
عبده وهزم الاحزاب	کی مدد فرمائی اور دشمنوں کی تمام پارٹیوں
وحده۔	کو یکہ و تنہا شکست دی۔

بظاہر تو یہ تین الگ الگ فقرے ہیں لیکن ایک صاحب نظر کے لیے ان تینوں کے اندر علی الترتیب تین سورتوں کے مضمون پنہاں ہیں۔ پہلا فقرہ 'لا الٰه الا الله وحده' سورۂ کافرون کے ہم معنی ہے۔ دوسرا فقرہ 'وصدق وعده ونصر عبده' سورۂ نصر کا ہم مضمون ہے۔ تیسرا جملہ 'وهزم الاحزاب وحده' اور سورۂ لہب ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ معلوم ہوا کہ جس طرح یہ تینوں فقرے ایک صاحب نظر کے لیے بالکل مربوط و منظم ہیں اسی طرح جو لوگ ان سورتوں کے مضامین پر غور کریں گے وہ ان سب کو ایک ہی زنجیر کی مربوط کڑیوں کی شکل میں پائیں گے۔'

ب۔ اس امر کا بیان کہ یہ سورہ مدنی اور فتح مکہ کی بشارت ہے

ایک اہم سوال اس سورہ سے متعلق یہ بھی ہے کہ یہ مکی ہے یا مدنی؟ ہمارے مفسرین نے عام طور پر اس کو مکی قرار دیا ہے لیکن یہ رائے کچھ قوی نہیں معلوم ہوتی۔ اس کے حق میں واحد دلیل جو ان کی طرف سے پیش کی گئی ہے یہ ہے کہ یہ جواب ہے ابولہب کی اس گستاخی کا جو اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کی تھی۔ روایات میں آتا ہے کہ جب آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت ہوئی کہ اپنے قریبی اعزہ کو خدا کے عذاب سے ڈرائیں تو ایک دن آپ علی الصباح کوہ صفا پر چڑھ گئے اور وہاں 'واصباحا' کا نعرہ لگایا۔ عرب میں یہ نعرہ خطرہ کا الارم سمجھا جاتا۔ یہ نعرہ سن کر قریش کے تمام خاندان آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر گراں تمہارے اوپر حملہ کے لیے گھات لگائے ہوئے ہے تو کیا تم باور کرو گے؟ سب نے جواب دیا کہ ہاں ہم ضرور باور کریں گے، ہم نے آپ کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں پایا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر یہ بات ہے تو میں ایک سخت عذاب سے آگاہ کر رہا ہوں جو تم پر آنے والا ہے۔ یہ سن کر ابولہب نے سبقت کر کے کہا: 'تَبًّا لَّكَ اَلِهٰذَا دَعَوْتَنَا!

(تیرا ناس ہو، کیا اسی لیے تم نے ہم سب کو دعوت دی!)

مفسرین اسی واقعہ کو اس سورہ کا شانِ نزول قرار دیتے ہیں کہ جب 'تَبًّا لَّکَ' کے الفاظ سے ابولہب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی تسلی کے لیے اس کی اور اس کی بیوی کی مذمت میں یہ سورہ اتاری۔ یہ واقعہ ظاہر ہے کہ مکہ کے بالکل ابتدائی دور میں پیش آیا اس وجہ سے مفسرین کے نزدیک سورہ کا نزول بھی اسی دور میں ہوا ہے۔ جہاں تک اس واقعہ کا تعلق ہے اس سے تو انکار کی گنجائش نہیں ہے لیکن یہ بات مختلف وجوہ سے محلِ نظر ہے کہ یہ سورہ ابولہب کے جواب اور اس کی اور اس کی بیوی کی مذمت میں نازل ہوئی ہے۔

اول تو یہی بات کھٹکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفوں میں سے کسی کی گستاخی کا اس طرح ترکی بہ ترکی جواب دیا جائے۔ جہاں تک مخالفت، اور توہین و دل آزاری کا تعلق ہے ابولہب کی کچھ خصوصیت نہیں ہے۔ مکہ اور طائف، کے اکثر لیڈر اس جرم میں شریک رہے ہیں لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تمام زیادتیوں کے جواب میں خود بھی صبر و حلم کا رویہ اختیار فرمایا، اپنے صحابہؓ کو بھی اسی کی تاکید فرمائی اور اسی رویہ کی تاکید آپ کو بار بار اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی فرمائی گئی۔ ان میں سے کسی کے جواب میں بھی، خواہ اس کی گستاخی کی نوعیت کتنی ہی سنگین رہی ہو، آپ کی زبانِ مبارک سے کوئی ایسا کلمہ نہیں نکلا جس میں مذمت کا کوئی پہلو ہو۔ آپ کو حکمت اور دل پذیر موعظت کے ساتھ دعوت کی ہدایت فرمائی گئی تھی اور آپ نے اس ہدایت پر ہمیشہ عمل فرمایا۔ مذمت اور سبّ و شتم تو درکنار آپ نے اپنی قوم کے کفار کو کفار کے لفظ سے بھی، جیسا کہ سورۂ کافرون کی تفسیر میں وضاحت ہو چکی ہے، اس وقت خطاب فرمایا ہے، جب ان پر اتمامِ حجت ہو چکا ہے اور وقت آگیا ہے کہ آپ قوم سے اعلانِ براءت کر کے ہجرت کر جائیں۔ یہی طریقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دوسرے انبیاء علیہم السلام کا بھی رہا ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دعوت کے بالکل آغاز ہی میں اپنے چچا کے ایک فقرہ سے اس درجہ آزردہ ہو جائیں کہ اس کی مذمت کے جواب میں، آپ کی تسکینِ قلب کے لیے ایک ایسی سورہ نازل کی جائے جس میں مفسرین کے بقول صرف اسی کی نہیں بلکہ اس کی بیوی کی بھی خبر لی گئی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ 'تَبًّا لَّکَ' کے الفاظ اور 'تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ' کے الفاظ میں باعتبار مفہوم بڑا فرق ہے۔ 'تَبًّا لَّکَ' کے الفاظ تو بے شک بددعا، مذمت اور تحقیر کے لیے آتے ہیں لیکن یہ بات نہیں ہے کہ 'تبّ' سے جو دوسرے محاورات پیدا ہوئے ہیں ان کے اندر بھی لازماً ہجو و مذمت کا مفہوم پایا جائے۔ اگر 'تَبًّا لِاَبِیْ لَهَبٍ' کے الفاظ ہوتے تب تو اس گمان کے لیے گنجائش تھی کہ اس کو ابولہب کی بات کا ترکی بہ ترکی جواب سمجھا جائے لیکن الفاظ 'تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ'

کے ہیں۔ اس محاورے کے اندر ہجو و مذمت اور بد دعا کا مضمون نہیں بلکہ، جیسا کہ آیت کی تفسیر کے تحت ہم واضح کریں گے، ابولہب کے اقتدار کے ڈھے جانے، اس کے انصار و اعوان کے ٹوٹ جانے اور اس کی دولت و حشمت کے برباد ہو جانے کا مضمون پایا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ یہ جملہ انشائیہ نہیں بلکہ خبریہ ہے اور یہ خبر ماضی کے صیغہ میں ابولہب کی بربادی کی پیشین گوئی ہے جو اس وقت کی گئی ہے جب اس پر حجت تمام کی جا چکی ہے۔ پس یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ یہ بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے بلکہ اس کا نزول اس وقت ہوا ہے جب ابولہب کی تباہی کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں۔ اس کی موت غزوۂ بدر کے کچھ بعد واقع ہوئی ہے اس وجہ سے اس کا نزول بھی اسی کے لگ بھگ ہوا ہے۔ اسلوبِ کلام سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ سورہ اس کی موت سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اگر موت کے بعد نازل ہوتی تو اس کا اسلوبِ کلام اس سے مختلف 'اَلَمْ تَرَ کَیْفَ' یا اس سے ملتا جلتا ہوتا۔ ماضی کا یہ اسلوبِ بیان مستقبل میں ہونے والے واقعات کی قطعیت کے اظہار کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ اس کی بکثرت مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں۔

سُورَةُ اللَّهَبِ

مَدَنِيَّةٌ ———— آیات: ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۵ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝۱ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا
كَسَبَ ۝۲ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝۳ وَّامْرَاَتُهٗ ۚ حَمَّالَةَ
الْحَطَبِ ۝۴ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝۵ ع ۵ ۳۶

ترجمۂ آیات ۱-۵ ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ خود بھی ڈھے گا۔ نہ اس کا مال اس کے کام آیا اور نہ اس کی کمائی۔ وہ بھڑکتی آگ میں پڑے گا۔ اس کی بیوی بھی ایندھن ڈھوتی ہوئی۔ اس کی گردن میں بٹی ہوئی رسّی ہو گی۔ ۱ - ۵

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

تَبَّتْ يَدَآ أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ (۱)

'تبت یداہ' کا مفہوم

'تَبَّ' کے معنی ہلاک ہونے اور خسارہ میں پڑنے کے ہیں۔ اسی سے 'تبت یداہ فلان' کا محاورہ نکلا ہے جس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ فلاں کے دونوں ہاتھ حصولِ مقصد میں ناکام و عاجز رہے۔ دونوں ہاتھوں کی ناکامی اور بے بسی کامل بے بسی کی تعبیر ہے۔ اگر کہیں کہ 'تبت یداہ' تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ مقابلہ کرنے سے بالکل عاجز ہو گیا۔ اسی طرح 'کسر یدہ' (ہاتھ توڑ دینا) کسی کا زور توڑ دینے کی تعبیر ہے۔ فند الزمانی کا شعر ہے:

وتركنا ديار تغلب قفرا　　وكسرنا من الغواة الجناحا

(ہم نے تغلب کے علاقہ کو چٹیل بنا کے چھوڑ دیا اور ان کے سرکشوں کے بازو توڑ دیے)

عبرانی زبان میں بھی، جو عربی کی بہن ہے، یہ محاورہ استعمال ہوا ہے۔ صحیفہ ذی الکفل کے باب ۳۰ آیات ۲۰-۲۲ کے فقرے ملاحظہ ہوں:

"گیارھویں برس کے پہلے مہینہ کی ساتویں تاریخ کو یوں ہوا کہ خداوند کا کلام مجھے پہنچا اور اس نے کہا کہ اے آدم زاد! میں نے مصر کے بادشاہ، فرعون کا بازو توڑا اور دیکھ وہ باندھا نہیں جائے گا اور دوا کی تدبیر کر کے اس پر پٹیاں کسی نہیں جائیں گی کہ تلوار پکڑنے کے لیے مضبوط ہو۔ اس لیے خداوند یہوہ یوں فرماتا ہے کہ دیکھ میں مصر کے بادشاہ، فرعون کا مخالف ہوں اور اس کے بازوؤں کو، اسے جو پر زور ہے اور اسے جو ٹوٹا تھا، توڑوں گا اور اس کے ہاتھ سے تلوار گرا دوں گا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ اس لفظ کے اندر ہجو و مذمت کا کوئی پہلو نہیں ہے بلکہ یہ صرف ابولہب کے اقتدار کے زوال اور اس کی تباہی کی پیشین گوئی ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہاں اس کا ذکر کنیت کے ساتھ ہوا ہے اور اہل عرب جب کسی کا ذکر کنیت کے ساتھ کرتے ہیں تو اس میں فی الجملہ احترام مدِ نظر ہوتا ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ پورے قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں میں سے کسی کا ذکر بھی اس کے نام کی تصریح کے ساتھ نہیں ہوا پھر ابولہب ہی کی کیا خصوصیت تھی کہ اس کا ذکر اس کے نام سے ہوا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ خاص اہتمام کے ساتھ اس کا ذکر کرنے کی یوں تو کئی وجہیں ہو سکتی ہیں لیکن دو باتیں خاص اہمیت رکھتی ہیں جن کا ہم ذکر کریں گے۔

ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابولہب کی عداوت کی نوعیت دوسرے مخالفوں کی عداوتوں سے بہت مختلف تھی۔ قریش کے دوسرے لیڈروں کو آپ سے جو اختلاف تھا اس کی بڑی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ آپ کی دعوت کو دینِ آبائی کے خلاف سمجھتے تھے، یہ وجہ نہیں تھی کہ وہ اس میں اپنے ذاتی اغراض و مفادات کے لیے کوئی خطرہ محسوس کرتے ہوں۔ آپ جن مکارمِ اخلاق کی دعوت دیتے تھے ان کی عزت ان کے دلوں میں بھی تھی۔ آپ یتیموں اور مسکینوں اور غلاموں کے ساتھ جس حسنِ اخلاق پر لوگوں کو ابھارتے تھے قریش کے بہت سے شریفوں کے اندر اس کے لیے بھی بڑا احترام تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ سارے کام ہوں۔ اور اس معاملہ میں ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حسنِ ظن بھی تھا اس لیے کہ وہ آپ کو تمام اعلیٰ اوصاف سے عملاً متصف پاتے تھے۔ ان کو غصہ تھا تو اس بات پر تھا کہ اپنی دعوت میں آپ ان کے بتوں کی تحقیر کرتے ہیں۔ سورۂ کافرون کی تفسیر میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ وہ اس بات پر آمادہ تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بتوں کے معاملے میں اپنا لب و لہجہ کچھ نرم کر دیں تو وہ بھی آپ کی دعوت کے معاملہ میں اپنی روش تبدیل کر دیں گے۔

اس کے برعکس ابولہب کی مخالفت تمام تر اپنے ذاتی مفادات کے تحفظ کے لیے تھی۔ وہ بیت اللہ کے بیت المال (رفادہ) کا نگران تھا اور اپنے زمانے میں اس نے اس طرح اس پر قبضہ کر رکھا تھا کہ اس کا بڑا حصہ یتیموں، مسکینوں اور حاجیوں کے بجائے اس کے اپنے جیب میں جاتا جس کی بدولت وہ اپنے زمانے کا قارون بن گیا۔ اس نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکارمِ اخلاق کی دعوت اور بیت اللہ کے مقصدِ تعمیر کی آیتیں سنیں[1] تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے احتساب کا وقت قریب آ رہا ہے۔ اگر جلد سے جلد آپ کی دعوت کو دبانے کی اس نے تدبیر نہ کی تو ان تمام مفادات سے اسے دست بردار ہونا پڑے گا جن سے وہ اس وقت بے روک ٹوک بہرہ مند ہو رہا ہے۔ چنانچہ وہ کمر باندھ کے آپ کی دعوت کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے کردار کی تصویر سورۂ ہمزہ اور بعض دوسری سورتوں میں کھینچی گئی ہے۔ جن لوگوں کی مخالفت یا موافقت ذاتی اغراض سے بالا تر کسی مقصد کے لیے ہوتی ہے، اگرچہ وہ مقصد غلط ہی ہو، ان کے اندر فی الجملہ

ابولہب کا ذکر نام کے ساتھ کیے جانے کی وجہ

---

[1] اس گروپ کی سورتوں میں سے بھی متعدد سورتوں میں یہ مضمون بیان ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ بلد، سورۂ فیل اور سورۂ قریش وغیرہ میں۔

شرافت ہوتی ہے برعکس اس کے جس کی مخالفت و موافقت محض اس کی ذات کے مفاد کے ارد گرد گھومتی ہے وہ شرافت سے بالکل تہی ہوتی ہے۔ یہی رمز ہے کہ ابوجہل اور ابوسفیان کی مخالفت اور ابولہب کے اندازِ مخالفت میں نمایاں فرق نظر آتا ہے اور یہی فرق ہے جو سبب ہوا اس بات کا کہ اس عدو کا ذکر خاص طور پر نام لے کر کیا جائے تاکہ لوگوں پر یہ حقیقت واضح ہو کہ کس کردار کے لوگ حق کے اصلی دشمن ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے حضرات انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا مزاج ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں وصل اور فصل کی بنیاد صرف اللہ کا دین ہے۔ وہ لوگ نبی کے ساتھی اور محبوب و محب بن جاتے ہیں جو اللہ کے دین کو اختیار کر لیتے ہیں اگرچہ وہ کتنے ہی دور کے ہوں اور وہ لوگ کاٹ پھینکے جاتے ہیں جو اللہ کے دین کے مخالف ہوتے ہیں، اگرچہ باعتبار نسب و رشتہ وہ نبی کے کتنے ہی قریبی ہوں۔ اسی حقیقت کے اظہار کے لیے قرآن مجید میں حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کے واقعات نہایت خاص اہتمام کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ اسی مقصد سے یہاں ابولہب کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ ہوا تاکہ یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک خاندان اور نسب کوئی چیز نہیں ہے۔ ایک گڈریا رسول کا محب اور محبوب بن سکتا ہے اگر وہ اس کی دعوت قبول کر لیتا ہے اور اگر اس کا چچا بھی اس کی دعوت رد کر دے تو اس کا تعلق بھی اللہ اور رسول سے یک قلم ختم ہو جاتا ہے۔ سورۂ کافرون میں اہل کفر سے براءت کا جو اعلان ہے یہ گویا اس کی عملی شہادت ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال یہ بھی سامنے آتا ہے کہ ابولہب کے اقتدار کے زوال کی پیشین گوئی کے لیے تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ کے الفاظ بظاہر بالکل کافی ہیں، پھر اس کے بعد 'وَّتَبَّ' کا لفظ لانے کا کیا خاص فائدہ ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے ٹکڑے میں اس کی سیاسی قوت کے ٹوٹ جانے کی پیشین گوئی ہے اور اس دوسرے میں اس کی اپنی ذات کے خاتمہ کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ یہ پیشین گوئی ٹھیک اسی طرح پوری بھی ہوئی۔ غزوۂ بدر میں قریش کے جو سردار مارے گئے ان میں سے اس کے بہت سے خاص حامی تھے جن کی موت سے اس کی سیاسی ساکھ کو بہت نقصان پہنچا۔ پھر غزوۂ بدر کے کچھ ہی بعد وہ خود چیچک میں مبتلا ہوا۔ اس بیماری کے دوران چھوت کے اندیشہ سے، نہ اس کے ساتھیوں نے اس کی خبر گیری کی نہ اس کے بیٹوں اور خاندان کے عزیزوں نے۔ اسی بے کسی کے حال میں اس نے جان دی اور لاش کئی دن تک گھر ہی میں پڑی سڑتی رہی۔ بالآخر لوگوں کے طعنوں سے تنگ آکر اس کے بیٹوں نے کرایہ کے کچھ حبشیوں کی مدد سے لاش مکہ کے بالائی حصہ میں پھنکوائی اور دور دور ہی سے اس پر پتھر وغیرہ ڈال کر ڈھانک دی۔ یہ

امر یہاں ملحوظ رہے کہ کسی پر پتھر پھینکنا اس پر لعنت کرنے کے ہم معنی ہے۔

علاوہ ازیں یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ غزوۂ بدر میں، قریش کے تمام سردار پورے جوش و خروش سے شریک ہوئے، لیکن ابولہب نے بزدلی کے سبب سے شرکت نہیں کی بلکہ ایک دوسرے شخص کو، جس پر اس کا کچھ قرض آتا تھا، جس کی وصولی کی توقع باقی نہیں رہی تھی، اس نے مجبور کیا کہ وہ اس قرض کے عوض میں اس کی طرف سے جنگ میں شریک ہو۔ چنانچہ وہ شریک ہوا اور غالباً مارا بھی گیا اور یہ بزدل گھر میں بیٹھا رہا لیکن یہ تدبیر بھی اس کو موت سے بچانے میں کارگر نہ ہو سکی۔ اس جنگ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہ چیچک میں مبتلا ہو کر نہایت ذلت کی موت مرا۔ ہمارے نزدیک 'وَتَبَّ' کا لفظ اس کے اسی انجام کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ (۲)

روپیہ کی بڑی سے بڑی مقدار بھی خدا کی پکڑ سے نہیں بچا سکتی

روپیہ کے حریص روپیہ ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے ذہن کے اندر یہ خناس سما جاتا ہے کہ اگر روپیہ ہے تو وہ خدا کی گرفت سے بھی محفوظ ہیں۔ سورۂ ھمزہ میں زر پرست بخیلوں کی ذہنیت سے یوں پردہ اٹھایا گیا ہے:

الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۚ	جس نے مال جمع کیا اور اس کو گن گن کر رکھا گمان کرتے ہوئے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ رکھے گا۔
(الھمزۃ - ۱۰۴ : ۲ - ۳)	

ہم نے اس آیت کی تفسیر کے تحت لکھا ہے کہ یہ درحقیقت ابولہب اور اس کے ہم مشربوں کی تصویر ہے۔ اس طرح کے لوگ کبھی یہ نہیں سوچتے کہ انھیں خدا سے بھی سابقہ پیش آنے والا ہے اور وہ ان کو کسی ایسی آزمائش میں ڈال سکتا ہے جس سے روپیہ کی بے حقیقتی بالکل واضح ہو جائے گی۔ ابولہب اسی خبط میں عمر بھر پڑا رہا بالآخر اس پر وہ گردش آئی کہ اس نے اپنی آنکھوں دیکھ لیا کہ روپیہ کی بڑی سے بڑی مقدار بھی خدا کی پکڑ سے انسان کو نہیں بچا سکتی۔

'مَا كَسَبَ' کی تاویل

'وَمَا كَسَبَ' کی تاویل میں مفسرین سے کئی قول منقول ہیں۔ بعض لوگوں نے اس سے اس کے بیٹوں کو مراد لیا ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ آخر میں، جیسا کہ اوپر ہم نے اشارہ کیا، اس کے بیٹے بھی اس کے کچھ کام نہ آئے لیکن اس تاویل میں تکلف ہے۔ بعض لوگوں نے اس سے اس کی وہ کمائی مراد لی ہے جو اس نے حرام راستوں سے حاصل کی، لیکن اس مفہوم کے لیے اول تو یہ لفظ کچھ موزوں نہیں ہے ثانیاً 'مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ' کے بعد اس کی کچھ ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ہمارے نزدیک اس سے اس کے وہ اعمال مراد ہیں جو اس نے اپنی دانست میں نیکی کے سمجھ کر کیے لیکن اس کے خبث باطن اور شرک کے سبب سے وہ بھی رائگاں ہو گئے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ وہ بیت اللہ کے

شعبۂ مالیات کا انچارج تھا اس وجہ سے اسے غریبوں، مسکینوں اور حاجیوں کی خدمت کے کچھ کام کرنے ہی پڑتے تھے۔ لیکن یہ محض نمائش کے لیے مجبورانہ صرف اس غرض سے کیے جاتے کہ اس کی خیانتوں پر پردہ پڑا رہے۔ اس طرح کے کام خدا کے ہاں درخورِ اعتنا نہیں ٹھہرتے۔

سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (۳)

آخرت میں جس انجام سے وہ دوچار ہوگا

پچھلی دونوں آیتوں میں اس کا وہ حشر بیان ہوا ہے جو اس دنیا میں اس کے سامنے آیا۔ اب یہ اس کا وہ انجام بیان ہو رہا ہے جس سے وہ آخرت میں دوچار ہوگا۔ فرمایا کہ وہ بھڑکتی آگ میں پڑے گا۔ یہاں آگ کی صفت 'ذَاتَ لَهَبٍ' پر نظر رہے۔ اس کی کنیت 'ابولہب' تھی، اس کی رعایت سے اس کے لیے آگ "ذَاتَ لَهَبٍ" ہوگی۔ 'لَهَبٌ' کے معنی شعلہ کے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے وہ سرخ و سپید شعلہ رُو تھا اس وجہ سے اس نے یا تو خود یہ کنیت اختیار کی یا اس کے خوشامدیوں نے اس سے اس کو پکارا اور یہ اتنی مشہور ہوئی کہ اس کا اصل نام ــــــ عبدالعزّٰی ــــــ غائب ہو گیا۔ قرآن نے یہاں اس کا یہ انجام بیان کر کے یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ اس دنیا میں اس کو اپنی جس شعلہ روئی پر ناز رہا آخرت میں یہ اس کے لیے وبال بنے گی۔ وہ شعلوں والی آگ میں جھونکا جائے گا جس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ظاہر کا حُسن کوئی فخر کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ آدمی کے لیے وبال بن سکتا ہے اگر اس کے ساتھ باطن کا حسن نہ ہو۔

وَّامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (۴)

فرمایا کہ اس کی بیوی بھی ایندھن ڈھوتی ہوئی اس کے ساتھ جہنم میں پڑے گی۔ عذاب میں اس کی بیوی کی یہ شرکت اسی صورت میں مطابقِ عدل ہے جب وہ بھی اس کے ان جرائم میں شریک رہی ہو جو اس کو جہنم میں لے جانے والے بنے۔ آدمی کے بیوی بچے بسا اوقات اس کے لیے ایسے جرائم کا سبب بن جاتے ہیں جو اس کی تباہی کا بھی سبب بنتے ہیں اور بیوی بچوں کی بھی۔ اسی بنا پر قرآن میں اہل ایمان کو خبردار کیا گیا ہے کہ

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ	اے ایمان والو تمہاری بیویوں اور تمہاری
اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ	اولاد میں بعض تمہارے دشمن بھی ہیں تو ان
فَاحْذَرُوْهُمْ (التغابن - ۶۴: ۱۴)	سے بچ کے رہو۔

بیوی بچوں کے دشمن ہونے کی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ ان کی بے جا خواہشوں اور فرمائشوں کی تعمیل اور ان کی غلط ناز برداری کے فتنہ میں مبتلا ہو کر آدمی خدا کے احکام و حدود کی پاسداری سے غافل اور بخل و خیانت کا مرتکب ہو جائے۔ بیوی بچوں کو اسی پہلو سے فتنہ قرار دیا گیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متنبہ فرمایا ہے کہ آدمی کی اولاد اس کو بخل اور بزدلی میں مبتلا کرنے والی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابولہب کی بیوی بگڑی ہوئی بیگمات کی طرح فیشن کی دلدادہ، زیورات کی شوقین، دولت کی حریص اور نمائش کی رسیا تھی۔ اس نے ابولہب کے بگڑے ہوئے مزاج کو اور بگاڑا۔ یہاں تک کہ وہ بھی اسی عذاب کی مستحق ٹھہری جس میں اس کا شوہر داخل ہوا۔

'حمالۃ الحطب' کی تاویل

'حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ' کی تاویل میں بڑا اختلاف منقول ہے۔ اکثر مفسرین کی رائے تو یہ ہے کہ یہ بطور ہجو و تحقیر اس کی وہ حالت بیان ہوئی ہے جو اس کی اس دنیا میں تھی۔ وہ لونڈیوں کی طرح گلے میں رسی ڈال کر جنگل جاتی اور سر پر ایندھن کا گٹھر لاد کر لاتی۔ یہ قول سب سے زیادہ مشہور ہے لیکن یہ جتنا ہی مشہور ہے اتنا ہی خلافِ عقل و قیاس ہے۔

یہ امر یاد رکھیے کہ عرب کی عنانِ حکومت قریش کے ہاتھ میں تھی۔ خاص طور پر بنی ہاشم تو پورے عرب کے سرتاج تھے۔ ابولہب یوں تو خاندانی صاحبِ ثروت و دولت تھا پھر اس زمانے میں، جس کا ذکر ہے، اس کو قریش کی مذہبی حکومت میں اتنا اونچا مقام حاصل ہو گیا تھا کہ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ پوری حکومت عملاً اس کے انگوٹھے کے نیچے آ گئی تھی۔ کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اتنے بڑے دولت مند لیڈر کی بیگم لونڈیوں کی طرح ایندھن ڈھونے کا کام کرے گی! ان لوگوں کا حال تو یہ تھا کہ ایک ایک خوش حال کے پاس درجنوں لونڈیاں اور غلام ہوتے اور ان کی بیگمات کی نازک مزاجی اس حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ وہ اپنے بچوں کو دودھ پلانا بھی کسرِ شان سمجھتی تھیں۔ ان کے عام آدمی بھی اپنے بچوں کو دوسرے قبیلوں کی دائیوں سے دودھ پلواتے۔

پھر ابولہب کی بیوی بھی کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ یہ ام جمیل بنت حرب، خاندانِ بنی عبدالشمس کی ایک نہایت باعزت خاتون تھی جو ہاشمی خاندان میں بیاہی گئی۔ اس کے شوہر کا جو مرتبہ حکومت میں تھا اس کا اعتبار کیجیے تو یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ اس کو اس وقت قریش میں وہی درجہ حاصل تھا جو اس زمانے میں کسی قوم کے اندر ان بیگم صاحبہ کو حاصل ہوتا ہے جو خاتونِ اول کہلاتی ہیں۔

غالباً انہی اعتراضات سے بچنے کے لیے بعض لوگوں نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ وہ خاردار جھاڑیاں لا لا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر ڈالتی تھی اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس کے اندر لگانے بجھانے کی عادت تھی جس کی تعبیر 'حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ' سے کی گئی ہے۔ یہ اقوال اس قدر کمزور اور عربیت سے اس درجہ بعید ہیں کہ ان پر تنقید کرنا محض اپنا اور قارئین کا وقت ضائع کرنا ہے۔ اس وجہ سے ہم ان سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ اگر کسی کو تفصیل مطلوب ہو تو وہ مولانا فراہی علیہ الرحمۃ کی تفسیر میں ان پر تنقید پڑھ لے۔

ہمارے نزدیک 'حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ' ترکیب میں حال پڑا ہوا ہے اور اس کی یہ حالت اس

وقت کی بیان ہوئی ہے جب وہ اپنے شوہر کے ساتھ دوزخ میں پڑے گی۔ اس وقت اس کا حال اس مجرم کا سا ہو گا جو اپنی سولی کا تختہ اور اپنے جلانے کا ایندھن خود اٹھائے ہوئے ہو۔ حال کے سوا کوئی اور ترکیب اس کی از روئے عربیت صحیح نہیں ہو سکتی اور اس صورت میں وہ تمام اقوال از خود بے معنی ہو جاتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئے اس لیے کہ حالیت کی صورت میں ان کو قبول کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

قیامت کے دن مجرموں کا جو حال ہو گا اس کی تصویر قرآن میں جگہ جگہ کھینچی گئی ہے اس پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کے الفاظ سے جو تصویر ابولہب کی بیوی کی سامنے آتی ہے وہ ٹھیک ٹھیک اسی کے مطابق ہے۔ مثلاً فرمایا ہے:

وَهُمْ يَحْمِلُونَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ط اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ (الانعام-۶: ۳۱)	اور وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے اور سن لو کہ نہایت ہی بری چیز ہو گی جو وہ اٹھائے ہوئے ہوں گے۔

اس سے زیادہ وضاحت سورۂ نحل میں ہے:

لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ لا وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (النحل-۱۶: ۲۵)	تاکہ وہ اٹھائیں اپنے بوجھ قیامت کے دن پورے پورے اور ساتھ ہی ان لوگوں کے بوجھ کا بھی کچھ حصہ جن کو وہ بغیر کسی علم کے گمراہ کر رہے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھائے ہوئے ہو گی اور ابولہب کے جن گناہوں کی وہ محرک بنی ہو گی کچھ بوجھ ان کا بھی اس کو اٹھانا پڑے گا اور یہ بوجھ اس کے جلانے کے ایندھن کی صورت میں ہو گا۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت بھی اچھی طرح واضح ہو گئی کہ ابولہب کی بیوی کے ذکر سے مقصود یہاں اس کی مذمت اور ہجو کر کے دل کو تسلی دینا نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے گمان کیا ہے، بلکہ اصل مقصود لوگوں، بالخصوص طبقۂ نسواں کو، اس کے انجام سے عبرت دلانا ہے کہ ایک بگڑی ہوئی عورت کس طرح اپنی تباہی کا بھی سامان کرتی ہے اور اپنے شوہر اور اپنی اولاد کی تباہی کا بھی۔ قرآن نے مردوں کے پہلو بہ پہلو عورتوں کا ذکر اسی لیے کیا ہے کہ ہر طبقہ اپنے طبقہ کے لوگوں کے حال اور انجام سے زیادہ بہتر طریقہ پر سبق حاصل کر سکتا ہے۔ یہ عورت دنیوی اعتبار سے چونکہ اونچے طبقہ سے تعلق رکھنے والی تھی اس وجہ سے اس کے انجام سے لونڈیاں اور بیگمات دونوں عبرت حاصل کر سکتی ہیں۔

فِیْ جِیْدِھَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ (۵)

یہ اسی تصویر کی تکمیل ہے جو اس سے پہلے والی آیت میں کھینچی گئی ہے۔ یعنی اس کی گردن میں اس طرح کی موٹی رسی پڑی ہوگی جس طرح کی رسی ایندھن ڈھونے والی لونڈیوں کی گردن میں ہوتی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس آیت میں جو حالت اس کی بیان ہوئی ہے اس کو مفسرین آخرت کے متعلق مانتے ہیں، پھر تعجب ہے کہ اس سے پہلے والے ٹکڑے کو انھوں نے آخرت سے متعلق کیوں نہیں مانا جب کہ عربیت کے قاعدے سے ان دونوں کے درمیان ایسا اتصال ہے کہ ان کو کسی طرح الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ — ابولہب کی بیوی کے گلے کا ہار قیامت کے دن

لفظ 'مَسَدٌ' کھجور کے اس ریشے یا پتے یا چھلکے کے لیے بولا جاتا ہے جس سے مضبوط رسیاں بٹی جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے یہ لفظ عام طور پر مضبوط اور موٹی رسی کے لیے بھی آتا ہے، خواہ وہ کھجور کے ریشے کی ہو یا چمڑے کی یا اس قسم کی کسی اور چیز کی۔ چرخی کی رسی کے لیے اس کا استعمال عام ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مضبوط اور موٹی رسی کے معنی میں معروف ہے۔

آیت کی ظاہر تاویل یہ ہے کہ جب وہ قیامت کے دن اٹھے گی تو اس کی گردن میں ایک مضبوط رسی پڑی ہوگی جو ایندھن ڈھونے والی لونڈیوں کی گردن میں پڑی ہوئی رسی کی طرح موٹی ہوگی۔

اب غور کیجیے کہ اس صفت کے اضافے سے کیا نئے حقائق روشنی میں آتے ہیں:

۱ - اس میں ابولہب کی بیوی کی اس حالت کی وضاحت ہے جو لفظ 'حَمَّالَةَ الْحَطَبِ' میں بیان ہوئی ہے۔

۲ - اس میں اس ذلت کی تصویر ہے جس میں وہ قیامت کے دن گرفتار ہوگی۔

۳ - اس میں عمل اور نتیجۂ عمل کی موافقت کی طرف اشارہ ہے کہ جس ہار کو پہن کر وہ دنیا میں اتراتی تھی قیامت کے دن وہ موٹی رسی کی شکل میں بدل جائے گا جس کے سبب سے اس کی مثال اس لونڈی کی ہو جائے گی جو گلے میں رسی ڈال کر لکڑیاں چننے جا رہی ہو۔

۴ - مغرور عورتیں آرائش کے ساتھ ساتھ نمائش کی بھی دلدادہ ہوتی ہیں اس وجہ سے سامانِ آرائش کے حجم اور وزن کا خاص خیال رکھتی ہیں، اس وجہ سے ضروری ہوا کہ رسی موٹی ہو۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ حمداً کثیراً۔

لاہور

۱۷ - جولائی ۱۹۸۰ء

۴ - رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

۱۱۲

الاخلاص

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورہ کا عمود، ترتیب میں اس کا مقام، زمانۂ نزول و سابق ولاحق سے تعلق

سورہ ان سورتوں میں سے ہے جن کے نام ہی سے ان کے مضمون (عمود) کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا نام 'اخلاص' ہے اور یہ اخلاص ہی اس کا عمود ہے۔ اخلاص کا مطلب اللہ واحد پر اس طرح ایمان لانا ہے کہ اس کی ذات یا صفات یا ان صفات کے لازمی تقاضوں میں کسی پہلو سے کسی دوسرے کی شرکت کا کوئی شائبہ نہ پایا جائے۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کو ماننے کا تعلق ہے دنیا نے اس کو ہمیشہ مانا ہے۔ یہ چیز انسانی فطرت کا بدیہی تقاضا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شیطان توحید کا ابدی دشمن ہے اس وجہ سے وہ انسان کو فریب دے دے کر اس ماننے میں ایسی ملاوٹیں کرتا رہا ہے کہ ماننا اور نہ ماننا دونوں یکساں ہو کے رہ گیا ہے۔ توحید کی اصل حقیقت کو اجاگر کرتے رہنے ہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے برابر اپنے رسول بھیجے لیکن انسان بار بار اس حقیقت کو پا پا کر کھوتا رہا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توحید ہی کی خاطر اپنی قوم سے ہجرت کی اور اپنی اولاد کو ایک وادیٔ غیر ذی زرع میں بسایا کہ وہ مشرکانہ ماحول سے بالکل محفوظ رہ کر صرف اللہ واحد کی عبادت کرے لیکن پچھلی سورتوں میں آپ نے دیکھا کہ آپ ہی کی ذرّیت نے آپ ہی کے بنائے ہوئے مرکزِ توحید (بیت اللہ) کو ایک بت خانے کی شکل میں تبدیل کر دیا اور وہ اپنے خود تراشیدہ بتوں کی عصبیت میں اتنی سخت ہو گئی کہ خدا کے آخری رسول سے وہ اس بات پر لڑتی رہی کہ جب تک ان کے بتوں کا مقام تسلیم نہ کر لیا جائے گا وہ خدا کا حق بھی تسلیم نہیں کرے گی یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے جواب میں وہ فیصلہ کن اعلانِ براءت کرنا پڑا جو سورۂ کافرون میں آپ نے پڑھا۔

یہ اعلان اگرچہ کافی تھا لیکن اس کا تعلّق اصلاً قریش اور مشرکینِ مکّہ سے تھا۔ عرب میں اہل کتاب کے بھی مختلف قبائل تھے۔ یہ لوگ اگرچہ حامل کتاب ہونے کے مدّعی تھے لیکن شیطان نے ان کو بھی ورغلا کر شرک کی نہایت گھنونی قسموں میں مبتلا کر رکھا تھا۔ مدینہ اور اس کے اطراف میں ان کا خاصا اثر تھا یہاں تک کہ دینی معاملات میں اہل عرب بھی ان کی برتری علانیہ تسلیم

کرتے تھے۔

جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں رہے اس وقت تک تو ان کی مخالفت در پردہ رہی لیکن جب آپ نے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو ان کی مخالفت بھی علانیہ ہو گئی۔ یہ لوگ چونکہ اہل کتاب تھے اس وجہ سے اس پندار میں مبتلا رہے کہ قرآن ان کے عقائد و اعمال کو بہر حال مشرکین کے مقابل میں کچھ اونچا درجہ دے گا لیکن قرآن نے ان پر واضح کر دیا کہ عقائد ہوں یا اعمال، ہر پہلو سے وہ نہایت گہرے کھڈ میں گر چکے ہیں۔ خاص طور پر نصاریٰ کے شرک پر قرآن نے جو تنقید کی اس کا اثر ان پر یہ پڑا کہ وہ بھی یہود کی طرح علانیہ میدانِ مخالفت میں اتر آئے اور مخالفین کے تینوں گروہوں ——— مشرکین، یہود اور نصاریٰ ——— نے مل کر ایک متحدہ محاذ اسلام کے خلاف قائم کر لیا۔ یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ اخلاص کی حقیقت واضح کرنے کے لیے آخری سورہ ایسی جامع ہو کہ وہ شرک کے تمام رخنوں کو یک قلم بند اور مشرکین اور اہل کتاب دونوں پر حجّت تمام کر دے۔ چنانچہ یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوئی۔ اگرچہ ایک گروہ نے اس کو مکی قرار دیا ہے لیکن اس سورہ کی جامعیّت، جیسا کہ آگے وضاحت ہو گی، دلیل ہے کہ یہ مکہ میں نہیں بلکہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے جب اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ کی مخالفت بالکل آشکارا ہو گئی ہے۔

قرآن میں اس سورہ کو سورۂ لہب کے بعد جگہ ملی ہے اور ہم پیچھے واضح کر چکے ہیں کہ یہ اشارہ ہے اس حقیقت کی طرف کہ اب حق کا سب سے بڑا دشمن ختم ہوا اور وقت آ گیا کہ اس حقیقی توحید کی منادی اس سرزمین سے پھر بلند ہو جس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں حرم تعمیر فرمایا۔ سورۂ لہب سے پہلے سورۂ نصر میں فتح کی بشارت تھی۔ اس کے بعد سورۂ لہب میں اسلام کے سب سے بڑے عدو کی ہلاکت کی خبر ہے۔ پھر اس سورہ ——— الاخلاص ——— میں اسلام کے بنیادی پتھر ——— توحید ——— کے اس کے اصلی مقام میں نصب کرنے کا اعلان ہے۔ یہ اعلان پیش نظر رکھیے کہ قریش اور اہل کتاب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کشمکش ملک و مال کے لیے نہیں تھی بلکہ اس لیے تھی کہ غیر اللہ کی خدائی کے ہر نقش کو مٹا کر اس کی جگہ خدائے وحدہٗ لاشریک کی خدائی کے نقش کو اس طرح اجاگر کر دیا جائے کہ کسی کے لیے بھی اس میں کسی اشتباہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ چنانچہ اس سورہ میں توحید و اخلاص کا ہر پہلو نمایاں کر دیا گیا اور اس کو قرآن کے سب سے آخر میں جگہ دی گئی۔ اس کے بعد جو دو سورتیں ہیں وہ، جیسا کہ ہم نے پیچھے اشارہ کیا، اسی خزانۂ توحید کے پاسبان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ شیطان کی رخنہ اندازیوں سے حفاظت کے لیے وہ اس کے ساتھ لگا دی گئی ہیں۔

قرآن مجید کی ترتیب اس طرح ہے کہ اس میں سب سے پہلے توحید و اخلاص کی سورہ

ـــــ الفاتحۃ ـــــ کو جگہ دی گئی ہے اور پھر سب سے آخر میں بھی توحید و اخلاص ہی کی سورہ ـــــ الاخلاص ـــــ کو جگہ ملی ہے۔ اس سے اس دین میں توحید کی اہمیت و عظمت ظاہر ہوتی ہے کہ وہی اس میں اوّل بھی ہے اور آخر بھی۔ سورۂ فاتحہ میں خدا کی شکر گزاری کا حق اس پہلو سے واضح فرمایا گیا ہے کہ وہی 'رب العٰلمین' بھی ہے اور وہی 'مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ' بھی۔ پھر اس سورہ میں مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے، اللہ تعالیٰ کی وہ صفات بیان کی گئی ہیں جو ہر اس رخنہ کو بند کر دینے والی ہیں جن سے شرک کوئی راہ پا سکتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان ہوئی ہیں وہ توحید کی تعلیم میں مبادی کی حیثیت رکھتی ہیں اور مقدمۂ کتاب میں ہم اس آخری گروپ کی اس خصوصیت پر ایک جامع تبصرہ کر چکے ہیں کہ اس میں ان سورتوں کو جگہ ملی ہے جو دین کی تعلیم میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

سُوْرَةُ الْاِخْلَاصِ

مَدَنِيَّةٌ ———— اٰيات: ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اٰيات ۱-۴ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴿۱﴾ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ﴿۲﴾ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ

۱ع ۴۷ يُوْلَدْ ﴿۳﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴿۴﴾

ترجمۂ آیات ۱-۴ کہہ دو، وہ اللہ سب سے الگ ہے، اللہ سب کے ساتھ ہے۔ نہ

وہ کسی کا باپ اور نہ کسی کا بیٹا اور نہ کوئی اس کا کفو۔ ۱-۴

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (۱)

'قُلْ' منادی کرنے کے مفہوم میں

یہ 'قُلْ' اسی مفہوم میں ہے جس میں قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ (الکٰفرون - ۱۰۹ : ۱) میں ہے یعنی اعلان کر دو، برملا کہہ دو اور اس طرح منادی کر دو کہ ہر شخص سن اور جان لے، نہ کسی کو کوئی اشتباہ باقی رہے، نہ کسی مزید سوال و جواب کی گنجائش رہ جائے۔

اعلان کا موقع و محل

اس طرح کے اعلان کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب بحث و مناظرہ کا پورا دور گزر چکتا ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سمجھانے کا حق ادا ہو چکا ہے، اب جو لوگ مزید بحثیں اٹھا رہے ہیں وہ سمجھنے کے لیے نہیں بلکہ بات کو الجھانے اور طول دینے کے لیے اٹھا رہے ہیں۔ اس طرح کے موقع پر یہ مناسب ہوتا ہے کہ بات دو ٹوک اور فیصلہ کن انداز میں اس طرح کہہ دی جائے کہ مخاطب اندازہ کر لے کہ متکلم نے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا، اب وہ نہ اپنا مزید وقت ضائع کرنے کے لیے تیار ہے اور نہ اس کے موقف میں کسی تبدیلی یا لچک کی گنجائش ہے۔

'هُوَ' کا مفہوم

'هُوَ' میرے نزدیک ضمیر شان ہے۔ یہ اس معہودِ ذہنی یا صورتِ حال کے لیے آتی ہے جو مخاطب اور متکلم میں اس طرح مشترک ہو کہ اس کے بولتے ہی بے تکلف ذہن اس کی طرف منتقل ہو جائے۔ اسلام کی دعوت شروع ہونے کے بعد سے اہلِ عرب کی ہر مجلس میں سب سے زیادہ گرم موضوع یہی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا موضوع تھا۔ دعوت کے دوسرے عنوانات ـــــــ معاد اور رسالت ـــــــ بھی زیرِ بحث آتے لیکن ان کی حیثیت ضمنی مباحث کی تھی۔ توحید کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم تھا۔ قریش اس کو اپنی اور اپنے آبا و اجداد کی شان کا مسئلہ بنا بیٹھے تھے اور کسی قیمت پر بھی اپنے معبودوں اور اپنے ان اجداد کی توہین گوارا کرنے کے لیے تیار نہ تھے جو ان کو پوجتے رہے تھے۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی توحید کا ذکر آتا ہے تو وہ دعوت دینے والوں پر ان کا منہ نوچنے کے لیے جھپٹ پڑتے ہیں۔ ایک طرف قریش کی یہ انانیت دوسری طرف قرآن اور رسول کا وہ بے لچک موقف جو سورۂ کافرون میں بیان ہوا کہ پوری قوم کو کاٹ پھینکنا منظور لیکن شرک کے ساتھ کوئی سمجھوتہ منظور نہیں۔

جب تک بحث صرف مشرکین قریش سے تھی اس وقت تک تو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے مسئلہ میں کچھ زیادہ الجھنیں نہیں پیدا ہوئی تھیں۔ انھوں نے تقلیدِ آبا میں بت پرستی اختیار تو کر

لی تھی لیکن اس کی تائید میں انھوں نے نہ متکلمانہ قسم کی موشگافیاں پیدا کی تھیں اور نہ اپنی امیّت کے سبب سے یہ چیز وہ پیدا کر ہی سکتے تھے لیکن مدینہ میں کھلم کھلا اہل کتاب سے بھی سابقہ پیش آیا جو اہل کتاب ہونے کے باوجود نہ صرف شرک کی نہایت گھنونی قسموں میں مبتلا تھے بلکہ انھوں نے اپنے شرک کی حمایت میں ایک پورا علمِ کلام تیار کر رکھا تھا۔ خصوصاً نصاریٰ کی میتھالوجی (MYTHOLOGY) تو اپنی اُلجھنوں کے اعتبار سے دنیا میں شاید ایک ہی ہے۔ قرآن نے ان سب کو چیلنج کیا، ان سے مباحثے کیے اور ان کی گمراہیاں ان پر واضح کیں۔ ان میں سے جن کو ایمان کی توفیق ہوئی وہ ایمان لائے۔ جو ایمان نہیں لائے ان کو قرآن نے اپنے دلائل سے اس طرح لپا کر دیا کہ ان کے اہل کتاب ہونے کا رعب کم از کم عربوں کے دلوں پر سے تو بالکل ہی اٹھ گیا۔

توحید کی شان میں ایک مختصر اور جامع سورہ

یہ نئی صورت مقتضی ہوئی کہ توحید کے باب میں ایک مختصر سورہ بھی نازل ہو جو مشرکین اور اہل کتاب دونوں کے پیدا کردہ شرک کے ہر رخنہ کو اس طرح بند کر دے کہ شیطان کے لیے دراندازی کی کوئی راہ کھلی نہ رہ جائے اور جو جامع ہونے کے ساتھ ساتھ اتنی مختصر بھی ہو کہ اس کو ہر شخص یاد کر کے تعویذ کی طرح حرزِ جان بنا سکے۔ چنانچہ یہ سورہ نازل ہوئی جو نہایت چھوٹی چھوٹی کل چار آیتوں پر مشتمل ہے لیکن 'معانی' کے اعتبار سے اس کو بعض عارفینِ قرآن نے ثُلث قرآن کے برابر قرار دیا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہ بات بالکل مبنی بر حقیقت ہے۔ قرآن کے مباحث اگر اپنے مطالب کے اعتبار سے جمع کیے جائیں تو وہ تین جامع عنوانات کے تحت جمع ہو سکتے ہیں: توحید، معاد اور رسالت۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ توحید کا حصّہ قرآن میں بقدر ایک ثُلث کے ہے۔ یہ مباحث قرآن کی مختلف سورتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان پھیلے ہوئے مباحث کو اگر اچھی طرح چھانیے تو ان کے اندر سے خدا کی ذات و صفات سے متعلق وہ جواہر ریزے نکلیں گے جو اس مختصر سورہ میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ گویا قرآن میں ردِّ شرک کی ساری بحث انہی چند نکتوں پر مبنی ہے جن کا اس سورہ میں اجمال کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اصل صفات جن کا علم ضروری ہے

'قُلْ هُوَ اللّٰهُ' کے الفاظ سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ کسی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا ہو کہ آپ اپنے اللہ کی صفات بیان کریں تب ہی آپ نے یہ سورہ سنائی ہو۔ بلکہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، فضا میں اس سوال پر گرما گرمی کا پایا جانا اس بات کے لیے کافی تھا کہ یہ سورہ نازل ہو اور لوگوں کو سنا دی جائے۔ 'هُوَ اللّٰهُ' کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ اللہ جس کے بارے میں تم سوال و جواب اور بحث و جدال کر رہے ہو اس کی صفات جاننی چاہتے ہو تو مجھ سے سنو، وہ یہ ہیں۔ اس کے بعد وہ صفات بیان ہوئی ہیں جو شرک کے تمام رخنوں کو بند کر دینے والی ہیں۔ مخاطبوں کی گمراہی دور کرنے کے لیے اصلاً انہی صفات کا جاننا ضروری تھا۔ ان کو جان لینے کے بعد دوسری صفات کے

جاننے کے لیے راہ خود باز ہو جاتی ہے۔

'اللّٰہ' 'اَللّٰہُ' اسم ذات ہے۔ اس کے مفہوم پر اس کے محل میں ہم گفتگو کر چکے ہیں[۱]۔ مشرکینِ عرب اس نام کو اسم ذات ہی کی حیثیت سے استعمال کرتے تھے۔ قرآن نے تمام صفاتِ حُسنیٰ کا موصوف اسی اسم کو قرار دیا ہے۔ فرمایا کہ وہ 'اللّٰہُ اَحَدٌ' ہے۔ اہلِ لغت نے 'وَاحِدٌ' اور 'اَحَدٌ' میں یہ فرق کیا ہے کہ 'اَحَدٌ' وہ ہے جس کی ذات میں کوئی شریک نہ ہو اور 'وَاحِدٌ' وہ ہے جس کی صفات میں کوئی اس کا شریک نہ ہو۔ غالباً اسی وجہ سے لفظ 'اَحَدٌ' اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے لیے صفت کے طور پر نہیں آیا۔ اس سے یکتائی و بے ہمگی من کل الوجوہ سمجھی جاتی ہے۔ ہر رشتہ و قرابت سے پاکی و برتری اس کا لازمہ ہے۔ اس سے یہ بات بھی نکلی کہ وہ قدیم ہے اور باقی سب حادث و مخلوق۔ ظاہر ہے کہ جو سب سے پہلے خود بخود تھا وہ ہمیشہ سے تھا کیونکہ جو کبھی نیست رہا ہو وہ خود ہرگز ہست نہیں ہو سکتا۔ اس وجہ سے دو باتیں ماننی ضروری ہوئیں۔ ایک یہ کہ وہ ہمیشہ سے ہے۔ دوسری یہ کہ اس کے سوا جو بھی ہیں وہ سب اس کی مخلوق ہیں۔ بے ہمگی کے یہ لازمی نتیجے ہیں جن کا انکار عقل کے خلاف ہے۔ پس یہ کہنا کہ وہ 'اَحَدٌ' ہے دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ وہ قدیم لم یزل اور خالقِ کل ہے۔

اَللّٰہُ الصَّمَدُ (۲)

'صمد' کا مفہوم لفظ 'صَمَدٌ' اصل میں اس بڑی چٹان کے لیے آتا ہے جس کی دشمن کے حملہ کے وقت پناہ پکڑتے ہیں، یہیں سے قوم کے سردار کو جو قوم کا پشت پناہ اور سب کا مرجع ہو 'صَمَدٌ' کہنے لگے۔ زبور اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں اللہ تعالیٰ کو بکثرت چٹان اور مدد کی چٹان کہا گیا ہے۔

جس طرح 'غَنِیٌّ' کے بعد قرآن میں 'حَمِیْدٌ' کی صفت اللہ تعالیٰ کے لیے بطور بدرقہ آئی ہے اسی طرح یہاں 'اَحَدٌ' کے بعد 'صَمَدٌ' کی صفت بطور بدرقہ ہے۔ 'غَنِیٌّ' اور 'حَمِیْدٌ' کی وضاحت کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں کہ لفظ 'غَنِیٌّ' سے خدا کی بے نیازی کا جو تصور ذہن میں آتا ہے اس سے بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے بالکل بے تعلق ہے۔ اس کا اثر ان پر یہ پڑتا ہے کہ وہ اس کو اپنی رسائی سے بالاتر سمجھ کر دوسروں کے سہارے پکڑتے ہیں۔ لوگوں کو اس غلط فہمی سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت 'غَنِیٌّ' کے ساتھ 'حَمِیْدٌ' کا بھی ذکر فرمایا جس سے مقصود یہ رہنمائی دینا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب سے بے نیاز ہونے کے ساتھ ساتھ تمام سزاوارِ حمد کاموں کا منبع بھی ہے۔ اس وجہ سے اس

---

[۱] ملاحظہ ہو تدبرِ قرآن۔ جلد اوّل، صفحات: ۵-۶

کے بندوں کو چاہیے کہ ہمیشہ اسی سے لو لگائیں، کبھی اس سے مایوس ہو کر دوسروں کا سہارا نہ پکڑیں۔

ٹھیک اسی طرح 'اَحَدٌ' کے بعد یہاں صفت 'صَمَدٌ' کی یاددہانی فرمائی تاکہ لفظ 'اَحَدٌ' سے خدا کی یکتائی و بے ہمگی کا جو تصور سامنے آتا ہے اس سے مغلوب ہو کر کوئی اللہ تعالیٰ کو ایک بالکل الگ تھلگ اور خاموش علۃ العلل نہ سمجھ بیٹھے ورنہ یہ غلط فہمی بھی دوسرے سہاروں کی تلاش کا سبب بن سکتی ہے۔ اس غلط فہمی سے بچانے کے لیے 'اَللّٰہُ الصَّمَدُ' کہہ کر وضاحت فرما دی کہ بے شک اللہ ہے تو سب سے الگ، بے نیاز، بے ہمہ، مگر وہ سب کی خبرگیری اور دست گیری بھی کرتا ہے، سب کے لیے پناہ کی چٹان بھی ہے، سب کا ماویٰ و مرجع بھی ہے۔ اس کے بندے جب اس سے فریاد کرتے ہیں وہ ان کی فریاد سنتا اور ان کی فریاد رسی کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی متقابل صفات میں صحیح توازن قائم نہ رکھنے سے قوموں کو جو گمراہیاں پیش آئی ہیں اور ان سے شرک کے جو دروازے کھلے ہیں ان کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے بس اتنی بات یاد رکھیے کہ مذاہب کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کی اکثر گمراہیوں کی تہ میں ان کا یہی عدم توازن مضمر ہے۔ اس قبیل کی جو گمراہیاں مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ کے ہاں پائی جاتی تھیں ان کا ذکر اس کتاب میں ان کے محل میں ہوا ہے۔ ان کو نگاہ میں رکھیے تو اس کی ہلاکت انگیزیوں کی پوری تصویر ذہن کے سامنے آجائے گی۔

لَمْ یَلِدْ ۙ وَلَمْ یُوْلَدْ (۳)

نصاریٰ کی گمراہی اور ان کا اعتراف

نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ کسی کا جنا ہوا۔ یہ بات اگرچہ لفظ 'اَحَدٌ' کے اندر بھی، جیسا کہ ہم نے اس کی وضاحت کی ہے، موجود تھی اور وہ عاقلوں کے لیے کافی ہے لیکن جو چیزیں قوموں کے لیے مزلۂ قدم ہوتی ہیں ان کو قرآن نے مختلف اسلوبوں سے اس طرح واضح کر دیا ہے کہ کسی کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ یہ مسئلہ بھی انہی مسائل میں سے ہے۔ دیویوں اور دیوتاؤں کی شادیوں اور ان کے اولاد و احفاد کی جو تفصیلات ہمیں یونانیوں اور ہندوؤں کی دیومالا (MYTHOLOGY) میں ملتی ہیں اسی سے ملتی جلتی مزعومات ہمیں ان قوموں کے اندر بھی ملتی ہیں جو قرآن کی اوّل مخاطب تھیں۔ مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مانتے تھے۔ یہود نے بھی تورات کے حامل ہونے کے مدعی ہوتے ہوئے عزیر کو خدا کا بیٹا بنا لیا۔ نصاریٰ نے باپ، بیٹے اور روح القدس کی ایک تثلیث قائم کی اور اس کے تعصب میں اس طرح گرفتار رہے کہ ان کے پادری ایک زمانہ میں جب کسی کو اپنے دین میں داخل کرتے تو اس سے پہلے اس شخص سے وہ نعوذ باللہ اس خدا پر لعنت کرواتے جس کی صفات 'قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ' میں بیان ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سورہ پر ان کا یہ غصہ اسی وجہ سے تھا کہ اس میں توحید کا جو تصور دیا گیا ہے اس کے ہوتے نہ خدا کو

باپ فرض کرنے کی گنجائش باقی رہتی تھی نہ بیٹا اور نہ کسی کو اس کی ماں بنایا جا سکتا تھا۔

قرآن نے لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُولَدْ کے الفاظ سے خدا کی یکتائی اور بے ہمگی کی حقیقت اس طرح بے نقاب کر دی ہے کہ اس کے بعد اس باب میں کسی اشتباہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے اور دنیا کو یہ روشنی سب سے پہلے قرآن ہی کے ذریعے سے ملی ہے جس کا اعتراف اب وہ لوگ بھی کرنے لگے ہیں جو اپنے قومی و مذہبی تعصبات کے خول سے باہر نکل کر حقائق کا مواجہہ کرنے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ جو عیسائی اس خدا کو کبھی نعوذ باللہ گالیاں دیتے تھے جس کا ذکر سورۂ اخلاص میں ہوا ہے، اب انہی عیسائیوں کے اندر ایسے لوگ بھی پیدا ہو رہے ہیں جو علانیہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ توحید کی حقیقت سے دنیا سب سے پہلے قرآن کے ذریعہ سے آشنا ہوئی ہے۔

وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ (۴)

خدا کا صحیح تصور

'کُفُوٌ' کے معنی ہم سر، ذات، برادری کے ہیں۔ یعنی کوئی اس کے جوڑ کا نہیں۔ سب مخلوق وہ خالق، سب محتاج وہ غنی، سب فانی اور وہ تنہا باقی۔

اس سورہ میں جو مثبت و منفی صفات اللہ تعالیٰ کی مذکور ہوئی ہیں ان سب کو سامنے رکھ کر اللہ تعالیٰ کا تصور ذہن میں آراستہ کیجیے تو بالاجمال وہ تصور یہ ہو گا کہ وہ ازلی و ابدی ہے۔ جب کچھ نہیں تو وہ تھا اور جب کچھ نہیں ہو گا تب بھی وہ ہو گا۔ وہ اپنی ذات میں کامل اور بالکل بے نیاز ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے، سب اس کے محتاج ہیں۔ وہ سب کے لیے سہارا اور سب کے لیے پناہ ہے۔ ہر چیز اس کے حکم سے وجود میں آتی ہے اور اسی کے حکم سے فنا ہوتی ہے۔ نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا بلکہ سب کا خالق اور سب کا پروردگار ہے۔ کوئی چیز اس کی ذات یا اس کے جوہر سے نہیں ہے بلکہ ہر چیز اس کی مخلوق و مربوب ہے اور کوئی اس کا ہم سر یا اس کی برابری کا نہیں ہے بلکہ سب اس کے بندے، غلام اور محکوم ہیں۔

خدائے یکتا و بے ہمتا کی نوازش سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ أَوَّلًا وَّآخِرًا۔

لاہور

۲۵- جولائی ۱۹۸۰ء

۱۱- رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

۱۱۳

الفلق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورہ کا مضمون اور سابق و لاحق سے تعلق

سابق سورہ ——— الاخلاص ——— کی تمہید میں ہم نے یہ واضح کیا ہے کہ توحید کو دین کی اساس کی حیثیت حاصل ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کا آغاز بھی توحید ہی سے فرمایا اور پھر اس کا اتمام بھی اسی پر کیا۔ گویا اصلاً قرآن کی آخری سورۃ الاخلاص ہوئی۔ اس کے بعد دو سورتیں، جو معوّذتین کے نام سے موسوم ہیں، اس خزانۂ توحید کے پاسبان اور محافظ کی حیثیت سے اس کے ساتھ لگا دی گئی ہیں جن میں ان تمام آفتوں سے بندوں کو اپنے رب کی پناہ مانگنے کی دعا تلقین فرمائی گئی ہے جو درباب توحید ان کے لیے مزلّۂ قدم ہو سکتی ہیں۔

توحید کے لیے اس اہتمام خاص کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ یہی، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، تمام دین کی بنیاد ہے۔ اگر بندے کا قدم توحید میں استوار رہے تو وہ دین پر استوار ہے۔ اگر وقتی طور پر اس سے کوئی لغزش صادر بھی ہو گی تو اساسِ دین سے وابستہ ہونے کے سبب سے امید ہے کہ اس کو اصلاح کی توفیق ملے اور وہ راہ راست پر آ جائے۔ برعکس اس کے اگر درباب توحید اس کو کوئی گمراہی پیش آ گئی تو اندیشہ ہے کہ وہ ہر قدم پر دین سے دور ہی ہوتا جائے گا اور درجہ بدرجہ اتنا دور ہو جائے گا کہ اس کے لیے دین کی طرف بازگشت کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جائے گا۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان جس امتحان میں ڈالا گیا ہے اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مرتے دم تک شیطان کا مقابلہ کرے اور اس کو شکست دے۔ شیطان کے مقابل میں اس کی اسی متحندی پر اس کی اخروی فوز و فلاح کا انحصار ہے۔ شیطان کا خاص داؤ جس پر اس نے انسان کو شکست دینے کی قسم کھا رکھی ہے یہی توحید ہے۔ اس نے اللہ تعالیٰ کو چیلنج دے رکھا ہے کہ وہ انسان کی گھات میں توحید کی راہ پر بیٹھے گا اور اس کو اس راہ سے ہٹا کر شرک کی راہ پر ڈال دے گا۔ سورۂ اعراف میں اس کے اس چیلنج کا ذکر یوں ہوا ہے:

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝ (الاعراف - ۷ : ۱۶ - ۱۷)

شیطان نے کہا، بوجہ اس کے کہ تونے مجھے گمراہی میں ڈالا، میں بھی ان کی (بنی آدم کی) گھات میں تیری سیدھی راہ (توحید) پر بیٹھوں گا۔ پھر میں ان کے آگے سے، ان کے پیچھے سے، ان کے داہنے سے اور ان کے بائیں سے ان پر تاخت کروں گا۔ پس تو ان سے اکثر کو اپنا شکرگزار (موحّد) نہیں پائے گا۔

شیطان کے ان ہتھکنڈوں کی تفصیل جو وہ انسان کو شرک کے جال میں پھنسانے کے لیے اختیار کرے گا خود شیطان کی زبان سے سورۂ نساء میں یوں بیان ہوئی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ۙ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۙ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ۝ (النساء - ۴ : ۱۱۶ - ۱۱۹)

اللہ اس جرم کو ہرگز نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے سوا جو گناہ ہیں ان کو جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا۔ اور جو اللہ کا شریک ٹھہرائے گا تو وہ نہایت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔ یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے بھی ہیں تو دیویوں کو، اور پکارتے بھی ہیں تو شیطان سرکش کو، اس پر اللہ کی لعنت۔ اور اس نے کہہ رکھا ہے کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک مقرر حصہ ہتھیا کر رہوں گا۔ ان کو گمراہ کر ڈالوں گا، ان کو آرزوؤں کے جال میں پھنساؤں گا اور ان کو سجھاؤں گا تو وہ چوپایوں کے کان کاٹیں گے اور ان کو سجھاؤں گا تو وہ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو بدلیں گے اور جو اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو کارساز بنائے گا تو وہ نہایت کھلی نامرادی میں پڑا۔

اس سے بھی زیادہ جامعیت سے یہی مضمون سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۶۱ - ۶۵ میں بھی

آیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ ان آیات کی تفسیر تدبر قرآن میں پڑھ لیجیے[۱] تاکہ ان کے مضمرات اچھی طرح آپ کے سامنے آجائیں اور واضح ہو جائے کہ شیطان کی سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ وہ انسان کو شرک کے کسی پھندے میں پھنسائے تاکہ وہ اس گناہ کا ارتکاب کر کے خدا کی رحمت سے بالکل محروم ہو جائے جس کے لیے مغفرت نہیں ہے۔ شیطان کے دل میں بنی آدم کے خلاف جو حسد و غصہ ہے وہ اسی انتقام سے تسکین پاتا ہے۔

یہ چیز مقتضی ہوئی کہ آخر میں توحید کی جامع تعلیم کے ساتھ ساتھ شیطان کے فتنوں سے محفوظ رہنے کا وہ طریقہ بھی بتا دیا جائے جو سب سے زیادہ کامیاب طریقہ ہے اور جس کو اختیار کر کے اللہ کا ہر بندہ شیطان کے حملوں سے اپنے خزانۂ توحید کی حفاظت کر سکتا ہے۔

اسی طریقہ کو واضح کرنے کے لیے آگے کی دونوں سورتوں میں پہلی بات تو یہ بتائی گئی کہ شیطان جیسے شاطر دشمن کے حملوں سے اپنے کو محفوظ رکھنے کا واحد طریق یہ ہے کہ انسان صرف اپنے رب کی پناہ ڈھونڈھے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا اس کی شاطرانہ چالوں اور کیّا دلیوں سے بچانے والا نہیں ہے۔ اگر انسان اس کے لیے ہر لمحہ چوکنا نہیں رہے گا تو اندیشہ ہے کہ وہ شیطان سے مار کھا جائے اور پھر اس کے لیے اس کے دام سے نکلنا مشکل ہو جائے۔

دوسری چیز یہ بتائی گئی ہے کہ خدا کی وہ کیا صفات ہیں جن کے واسطہ سے بندے کو خدا کی وہ پناہ حاصل ہوتی ہے جو اس کو شیطان کے فتنوں سے بالکل مامون کر دیتی ہے۔ یہ چیز اللہ تعالیٰ ہی کے بتانے کی تھی اور یہ اس کا اپنے بندوں پر عظیم احسان ہے کہ اس نے ان سورتوں میں اپنی ان صفات سے پردہ اٹھا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کا صحیح تعلق اس کی اعلیٰ صفات ہی کے ذریعہ سے قائم ہوتا ہے اور یہ اسی کو معلوم ہے کہ اس کے بندے اپنے کس دشمن سے مقابلہ کے لیے اپنے رب کی کس صفت کو سپر بنائیں۔ یہ چیز ہر شخص نہیں جان سکتا اور اس میں معمولی غلطی بھی انسان کی جدوجہد کو بے اثر بنا سکتی ہے۔

تیسری چیز اس میں یہ بتائی گئی ہے کہ انسان کو گمراہ کرنے کے معاملے میں شیطان کی جدوجہد کی رسائی کہاں تک ہے اور اس کے سب سے زیادہ مؤثر حربے کیا ہیں۔ اس سے مقصود انسان کو اس کے دشمن کی طاقت کا اندازہ کرا دینا ہے تاکہ وہ اس کی قوت سے نہ مرعوب ہو اور نہ اس سے بے پروا رہے بلکہ وہ اچھی طرح آگاہ رہے کہ دشمن کن راستوں سے اس پر وار کر سکتا ہے اور

---

[۱] ملاحظہ ہو تدبر قرآن - جلد سوم - صفحات : ۶۶۳ - ۶۶۵

اس کے مقابلہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود اسے کن طاقتور اسلحہ سے مسلح کر رکھا ہے۔
ان اشارات کی روشنی میں پہلے سورۂ فلق کی تلاوت فرمائیے۔

سُوْرَةُ الْفَلَقِ

مَدَنِيَّةٌ ______ اٰيات : ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱ - ۵ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝۱ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝۲ وَ
مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝۳ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ
ع ۵ / ۳۸ فِي الْعُقَدِ ۝۴ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝۵

ترجمہ آیات ۱ - ۵ کہہ، میں پناہ مانگتا ہوں نمودار کرنے والے خدا کی، ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہے اور اندھیرے کی آفت سے جب وہ چھا جائے اور گرہوں میں پھونک مارنے والوں کی آفت سے اور حسد کرنے والے کی آفت سے جب وہ حسد کرے۔ ۱ - ۵

الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱)

'فلق' کا وسیع مفہوم

'الفلق' کا ترجمہ عام طور پر لوگوں نے صبح کیا ہے لیکن اس کے اصل معنی پھاڑنے کے ہیں۔ صبح چونکہ شب کے پردے کو چاک کر کے نمودار ہوتی ہے اس وجہ سے اس پر بھی اس کا اطلاق ہوا لیکن پھاڑ کر نمودار ہونے والی چیز صرف صبح ہی نہیں ہے۔ ہر چیز کسی نہ کسی چیز کے اندر سے اس کو چاک کر کے ہی نمودار ہوتی ہے۔ گٹھلی سے پودا نمودار ہوتا ہے، دانے کو پھاڑ کر انکھوے نکلتے ہیں، زمین کو پھاڑ کر نباتات اُگتی ہے، پہاڑوں کا سینہ چاک کر کے چشمے اور دریا ابلتے ہیں، اسی طرح انڈے کو پھاڑ کر بچے نکلتے ہیں اور رحم کے منہ کو کھول کر دوسری تمام زندہ مخلوقات وجود پذیر ہوتی ہیں۔ پھر لفظ 'فلق' کو اس قدر محدود کر دینے کے لیے کیا جواز ہے؟ ہمارے نزدیک اس کو اس کے وسیع معنی میں رکھنا ہی موقع و محل کے اعتبار سے زیادہ موزوں ہے۔ لغت میں یہ لفظ وسیع معنی میں آیا بھی ہے۔ قرآن میں جس طرح 'فَالِقُ الْاِصْبَاحِ' (الانعام - ۶: ۹۶) کی ترکیب استعمال ہوئی ہے اسی طرح 'فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی' (الانعام - ۶: ۹۵) کی ترکیب بھی وارد ہوئی ہے۔ اسی طرح زمین اور آسمان سے متعلق ارشاد ہے کہ 'کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا' (الانبیآء - ۲۱: ۳۰) وہ دونوں بند ہوتے ہیں تو ہم ان کو پھاڑتے ہیں۔ یعنی آسمان کو کھول کر اس سے پانی برساتے اور زمین کو پھاڑ کر اس سے نباتات اگاتے ہیں۔

میں نے لفظ کی اس وسعت کو پیش نظر رکھ کر 'رَبِّ الْفَلَق' کا ترجمہ 'نمودار کرنے والے خداوند' کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ ترجمہ زیادہ جامع اور معنی خیز ہے۔ آگے کے مضمون سے بھی اس کو، جیسا کہ وضاحت آرہی ہے، زیادہ مناسبت ہے۔

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ (۲)

مخلوقات کے شر سے پناہ خالق ہی دے سکتا ہے

یہ اس مقصد کا حوالہ ہے جس کے لیے تمام عالم کے نمودار کرنے والے خداوند کی دہائی کی تلقین کی گئی ہے۔ فرمایا کہ جس خداوند نے تمام عالم کو نمودار کیا ہے اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے شر سے پناہ ان کے پیدا کرنے والے ہی سے مانگو، کسی دوسرے سے نہ مانگو۔ کوئی دوسرا ان کے شر سے پناہ اسی صورت میں دے سکتا ہے کہ جب وہ ان کے پیدا کرنے والے سے زیادہ طاقتور ہو اور یہ بات بالکل خلافِ عقل ہے کہ کوئی چیز خالقِ کائنات سے زیادہ قدرت و اختیار والی ہو یا ہو سکے

اس وجہ سے خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے شر سے کسی غیر خدا کی پناہ ڈھونڈنا سراسر سفاہت ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ چیزیں جتنی بھی ہیں سب خدا ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ خالق اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔

اللہ نے چیزیں مقصدِ خیر سے پیدا کی ہیں لیکن وہ اس کے حکم سے شر بھی بن جاتی ہیں

اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں پیدا کی ہیں وہ اصلاً مقصدِ خیر سے پیدا کی ہیں لیکن وہ جب چاہے ان کو شر میں بھی تبدیل کر سکتا ہے۔ بارش اس دنیا کے لیے سراسر رحمت ہے لیکن اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو اس کو عذاب بھی بنا دیتا ہے۔ اسی طرح خود انسان اپنی بے خبری اور سوءِ استعمال سے ایک چیز کو جو اصلاً نافع ہے، مضر بنا لیتا ہے۔ اشیاء کے ان برے پہلوؤں سے اپنے کو محفوظ رکھنے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ آدمی خدا ہی سے استعاذہ کرے۔ نہ ان اشیاء میں سے کسی چیز کو مؤثر بالذّات سمجھ کر ان کی دہائی دینی شروع کر دے جس طرح مشرک قومیں کرتی ہیں اور نہ خدا کے سوا کسی 'غوث' یا 'قطب' کو پکارنا شروع کر دے کہ وہ آکر خدا کی اس پکڑ سے اس کو بچائیں۔ خدا کی پکڑ سے خدا کے سوا کوئی دوسرا رہائی نہیں دے سکتا۔ آفتوں سے اپنے کو بچانے کی جو جائز تدبیریں انسان اختیار کرتا ہے، مثلاً کسی بیماری میں ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہے، تو یہ چیز اس کے منافی نہیں ہے بشرطیکہ وہ یہ عقیدہ رکھے کہ طبیبِ حقیقی صرف اللہ ہے، شفا صرف اسی کے اختیار میں ہے، اگر وہ شفا نہ دے تو کسی دوسری طاقت کے بس میں نہیں ہے کہ وہ کسی معمولی سے معمولی بیماری سے بھی نجات دے سکے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ یہ ایک ہی کلمہ شرک کے بہت سے دروازوں کے بند کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اس سے ثنویت اور خیر و شر کی الگ الگ خدائی کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ مشرک قومیں ہر آفت کو بجائے خود ایک مستقل نافع و ضار وجود سمجھ کر اس کی دہائی پکارنی شروع کر دیتی ہیں۔ حالانکہ کوئی آفت اپنا خود کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں ہی کے ظلال و آثار میں سے ہیں جو اللہ ہی کے اذن سے وجود میں آتی ہیں، اسی کے حکم سے اثر انداز ہوتی ہیں اور تنہا اسی کی مدد سے ان کے شر سے نجات ملتی ہے اس وجہ سے حقیقی پناہ اور ماویٰ و ملجا وہی ہے۔

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ (۳)

شر کا وجود مستقل بالذات نہیں ہے

'غَاسِقٍ' رات کو کہتے ہیں جب شفق غائب ہو جانے کے بعد اس کی تاریکی بڑھ جائے۔ 'وَقَبَ' کے معنی تاریکی چھا جانے کے ہیں۔ اہلِ لغت نے 'غَاسِقٍ' کے معنی چاند کے بھی لکھے ہیں، لیکن یہاں 'إِذَا وَقَبَ' کا قرینہ اشارہ کر رہا ہے کہ اس سے مراد رات ہی ہے۔ اس لیے کہ اس کی تاریکی جب بڑھتی ہے تو اپنے دامن میں آفتیں لیے ہوئے بڑھتی ہے۔

یہ ٹکڑا بہترین مثال ہے اس بات کی کہ اس دنیا میں شر کا وجود مستقل بالذات نہیں ہے کہ خیر و شر کے خالق الگ الگ مانے جائیں اور دونوں کی دہائی دی جائے بلکہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ چیز اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں ہی کے متعلقات و حواشی میں سے ہے اس وجہ سے اس سے بچنے کے لیے کسی غیر اللہ کی نہیں بلکہ اللہ ہی کی پناہ ڈھونڈنی اور اسی کی دہائی دینی چاہیے۔

قرآن میں یہ بات جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ اس دنیا کے بقا کے لیے جس طرح دن اور اس کی روشنی و حرارت ضروری ہے اسی طرح رات اور اس کی خنکی و سکون بخشی بھی ضروری ہے، پھر ظاہری تضاد کے باوصف دنیا کے بقا میں ان دونوں کے توافق کو توحید کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہاں اسی رات کے شر سے پناہ مانگنے کی دعا تلقین کر کے گویا یہ درس دیا گیا ہے کہ رات کی جو تاریکی تمہاری راحت کے لیے ناگزیر ہے اسی کے ظلال و آثار میں سے یہ چیز بھی ہے کہ اس میں چور، قاتل، دشمن اور حشرات و ہوام نکلتے ہیں جن سے تمہیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔ شب کے سکون میں ان غیر مطلوب چیزوں کی مداخلت سے یہ نتیجہ نکالنا تو بالکل غلط ہو گا کہ رات کا خالق کوئی اور ہے اور ان کے اندر نمودار ہونے والے ان ناخواندہ مہمانوں کا خالق کوئی اور، پھر دونوں کی دہائی پکاری جائے بلکہ صحیح اور موافق عقل و فطرت بات یہی ہو سکتی ہے کہ ان دونوں کا خالق ایک ہی ہے۔ اسی نے رات کا سکون بخشا ہے اور وہی اس میں خلل انداز ہونے والی آفتوں سے پناہ دے سکتا ہے۔ یعنی جس طرح اس کی برکتیں خدا ہی کے فیض سے ہیں اسی طرح اس کی زحمتیں بھی اسی کے اذن سے ہیں۔ پس ہر حال میں مرجع اسی کو بنانا چاہیے۔

یہاں وہ بات یاد رکھیے جس کی طرف ہم نے پیچھے اشارہ کیا کہ شر کے وجود کی اس نوعیت کو نہ سمجھ سکنے کے سبب ہی سے نادانوں نے شر کو بھی مستقل حیثیت دے دی اور پھر خیر و شر دونوں کے الگ الگ خالق مان کر ثنویت کی بنیاد رکھ دی۔ قرآن نے یہاں بہترین مثال دے کر واضح کر دیا کہ شر کی اصل حیثیت کیا ہے اور اس سے پناہ دینے والا کون ہے۔

وَمِنۡ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الۡعُقَدِ (۴)

مادی اور محسوس آفات سے پناہ مانگنے کے بعد یہ روحانی و اخلاقی آفتوں سے پناہ مانگنے کی تلقین کی ہے۔

روحانی آفات سے پناہ مانگنے کا طریقہ

نَفّٰثٰتِ فِی الۡعُقَدِ کے معنی گرہوں میں پھونک مارنے والوں کے ہیں۔ اگرچہ یہ مؤنث ہے لیکن اس سے عورتوں کو مراد لینا لازم نہیں ہے۔ عربیت کے قاعدہ سے آپ اس سے

ارواحِ خبیثہ اور نفوسِ خبیثہ مراد لے سکتے ہیں، عام اس سے کہ وہ مرد ہوں یا عورتیں اور قطع نظر اس سے کہ ان کا اشارہ یہود و مجوس کی طرف ہو یا عرب کے ساحروں اور کاہنوں کی طرف۔

گرہوں میں پھونک مارنے کا یہ طریقہ ٹونے ٹوٹکے اور گنڈے کا عمل کرنے والے اختیار کرتے ہیں۔ وہ دھاگے یا تانت پر اپنے تصوّر کے مطابق کچھ پڑھ پڑھ کر پھونکتے اور گرہیں لگاتے جاتے ہیں۔ اور ان کے زعم کے مطابق ان کا معمول اس طرح ان کے دام میں اسیر ہو جاتا ہے اور پھر وہ اس کو جو اذیت پہنچانا چاہتے ہیں پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس صفت سے ان کا ذکر کرنے سے مقصود ان کے ڈھکوسلے کی تصویر کھینچنا ہے۔ یہ اسی طرح کی تصویر ہے جس طرح سورۂ شعرآء میں کاہنوں کے مراقبہ کی تصویر یُلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَکْثَرُھُمْ کٰذِبُوْنَ (الشعرآء۔ ۲۶ : ۲۲۳) (اور وہ کان لگا کر بیٹھتے ہیں اور ان میں کے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں) کے الفاظ سے کھینچی گئی ہے۔ میرے نزدیک اس سے مقصود اس چیز کی لغویت کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

رہا یہ سوال کہ یہ اعمالِ سفلیہ کچھ مؤثّر ہوتے ہیں یا نہیں تو اس سوال پر ہم سورۂ بقرہ کی آیت ۱۰۲ کے تحت، بضمن قصۂ ہاروت و ماروت، اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں[1]۔ ہمارے نزدیک اس کا اکثر حصہ، جیسا کہ سورۂ شعرآء کی محولہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے محض ڈھونگ اور ڈھکوسلا ہے لیکن اس کے اندر اگر کچھ حقیقت ہے بھی تو قرآن میں یہ تصریح ہے کہ یہ مؤثر بالذّات نہیں ہیں بلکہ ان سے کسی کو ضرر پہنچایا جا سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے اذن ہی سے پہنچایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ سحر اور اعمالِ سفلیہ ہی سے متعلق فرمایا ہے: وَمَا ھُمْ بِضَآرِّیْنَ بِہٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ (البقرۃ۔ ۲ : ۱۰۲) (اور اس کے ذریعہ سے وہ کسی کو ضرر پہنچانے والے نہیں بن سکتے مگر اللہ کے اذن سے) تو جب ان سے کوئی ضرر اللہ کے اذن ہی سے پہنچ سکتا ہے تو معلوم ہوا کہ اس شر سے بچنے کے لیے بھی اللہ کے سوا کسی اور کی پناہ ڈھونڈھنے کی حاجت باقی نہیں رہی۔

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی حفاظت کرتا ہے جو اس کو یاد رکھتے ہیں

اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ لوگ اپنے ذہن جس طرح کے بناتے ہیں ان کے ساتھ وہ اسی طرح کا معاملہ کرتا ہے۔ ایک شخص اگر اپنا تعلق اپنے رب سے استوار رکھتا ہے؛ لاطائل اوہام سے اپنے کو بچاتا ہے، خدا کی یاد سے اپنے دل کو آباد رکھتا ہے، اگر کوئی افتاد پیش آتی ہے تو اس میں رہنمائی اور استعانت کے لیے اپنے رب ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص پر شیطان کو غلبہ پانے نہیں دیتا۔ اگر اتفاق سے اس کو کوئی چھوت لگتی بھی ہے تو اللہ کی طرف توجہ اس کے شر سے اس کو بچا لیتی ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو تدبرِ قرآن۔ جلد اول، صفحات : ۲۳۸ ۔ ۲۴۴

اس کے برعکس اگر کوئی شخص بالکل منفعل مزاج اور وہمی ہوتا ہے۔ عقل و بصیرت سے کام لینے کے بجائے وساوس میں مبتلا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ پر مضبوط بھروسہ رکھنے کے بجائے اپنے دل کے دروازے شبہات و شکوک کے لیے کھول دیتا ہے تو اس طرح کا آدمی بالعموم کسی شیطان جن و انس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے پھر وہ اس کو ہر وادی میں گردش کراتے ہیں۔ اس گردش سے اپنے کو محفوظ رکھنے کا واحد طریقہ اس سورہ نے یہی بتایا ہے کہ آدمی اپنے کو ہمیشہ اپنے رب کی پناہ میں رکھے، جب کبھی دل میں کوئی دغدغہ محسوس کرے فوراً اس کی امان طلب کرے جس کا بہترین ذریعہ یہ دونوں سورتیں ــــــ معوذتین ــــــ ہیں۔

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ (۵)

حاسدوں کے حسد سے بچنے کی دعا

یہ آخر میں حاسدوں کے حسد کے شر سے بچنے کی دعا سکھائی گئی ہے۔ اگرچہ لفظ 'حَاسِد' یہاں عام ہے اور اس کو عام ہی رکھنا چاہیے بھی، اس لیے کہ جس حاسد کا حسد بھی بحرانی شکل اختیار کر لے وہ قابیل کے حسد کی طرح ہابیل کا خون بہا کر ہی اترتا ہے، اس وجہ سے اس سے پناہ مانگتے رہنا چاہیے۔ لیکن سورہ کی تمہید میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ بنی آدم کا سب سے بڑا حاسد شیطان ہے اور اس کو خاص کد عقیدۂ توحید سے ہے۔ اس عقیدہ سے برگشتہ کرنے کے لیے اس نے اپنے جس عزم بالجزم کا اظہار کیا ہے اس کے شواہد ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔ یہاں سورہ بنی اسرائیل کی آیات بھی نقل کیے دیتے ہیں تاکہ 'إِذَا حَسَدَ' کے الفاظ کا زور اچھی طرح واضح ہو جائے:

قَالَ أَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِي
كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ أَخَّرْتَنِ إِلٰى يَوْمِ
الْقِيٰمَةِ لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ
إِلَّا قَلِيلًا ۝ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ
تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَإِنَّ جَهَنَّمَ
جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُورًا ۝
وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ
بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ
وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ
وَالْأَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۚ وَمَا
يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ إِلَّا غُرُورًا ۝ إِنَّ
عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ

شیطان نے کہا، اچھا یہی ہے وہ جسے تو نے مجھ پر فضیلت بخشی ہے! اگر تو نے مجھے قیامت کے دن تک مہلت بخشی تو میں اس کی ذریت کو چٹ کر جاؤں گا، صرف تھوڑے ہی بچیں گے۔ خدا نے فرمایا، جا، جو ان میں سے تیرے پیرو بنیں گے تو تمہارا بدلہ پورا کرنے کے لیے جہنم کافی ہے تو ان میں سے جن پر تیرا بس چلے ان کو اپنے پراپیگنڈے سے گھبرا لے، ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لے اور ان کے مال و اولاد میں حصہ بٹا لے اور ان سے پرفریب وعدے کر لے اور شیطان کے سارے وعدے محض فریب ہیں

وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝ 　　میرے خاص بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں
(بنی اسرائیل - ۱۷ : ۶۲ - ۶۵) 　　اور تیرا رب اعتماد کے لیے کافی ہے۔

اس آیت سے اس زور، اس ولولہ اور ان اسباب و وسائل کا اظہار ہوتا ہے جو شیطان انسان کو توحید سے ہٹانے کے لیے بروئے کار لانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اسی چیز کی طرف 'اِذَا حَسَدَ' کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں یعنی جب کہ یہ حاسد اپنے حسد کے جوش میں اپنے ترکش کے سارے تیر آزمانے پر آمادہ ہو جائے۔

ایک ضعیف روایت

یہ سورہ کسی شانِ نزول کی محتاج تو نہیں ہے لیکن اس کے تحت لوگوں نے ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر العیاذ باللہ کچھ یہودیوں نے ایک زمانہ میں جادو کر دیا تھا جس سے آپ بیمار ہو گئے تو آپ کو یہ سورہ سکھائی گئی اور آپ اس جادو کے اثراتِ بد سے محفوظ ہوئے۔

اگرچہ دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ اس جادو کا کوئی اثر آپ کے فرائضِ نبوت پر نہیں پڑا لیکن ساتھ ہی نہایت سادہ لوحی سے یہ اعتراف بھی کر لیا گیا ہے کہ اس کا اثر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ پڑا کہ آپ گھلتے جا رہے تھے، کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ کر لیا ہے لیکن نہیں کیا ہوتا، ازواجِ مطہراتؓ کے متعلق خیال فرماتے کہ ان کے پاس گئے ہیں لیکن نہیں گئے ہوتے، بعض اوقات اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا کہ ایک چیز کو دیکھا ہے مگر نہیں دیکھا ہوتا۔ ان حضرات کے بیان کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت گھنٹے دو گھنٹے یا دن دو دن نہیں بلکہ پورے چھ ماہ رہی۔ اب سوال یہ ہے کہ جب پورے چھ ماہ آپ پر العیاذ باللہ تعطلِ دماغ کی یہ کیفیت طاری رہی تو کیا یہ امکان مستبعد قرار دیا جا سکتا ہے کہ، العیاذ باللہ، آپ نے خیال فرمایا ہو کہ نماز پڑھ لی ہے درانحالیکہ نہ پڑھی ہو یا یہ کہ نازل شدہ وحی کاتبینِ وحی کو لکھوا دی ہے حالانکہ نہ لکھوائی ہو یا یہ کہ جبریل امینؑ کو دیکھا ہے حالانکہ نہ دیکھا ہو؟ ان امکانات کو کس دلیل سے آپ رد کر سکتے ہیں؟ اگر کوئی کہے کہ اس طرح کی کوئی بات روایات میں نہیں ملتی تو ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ روایات میں تمام جزئیات کہاں بیان ہو سکتی ہیں، لیکن ایک ایسے شخص سے جس کی ذہنی حالت آپ کے بیان کے مطابق وہ ہے جو مذکور ہوئی تو اس سے ان باتوں کا صادر ہونا تعجب انگیز نہیں بلکہ نہ صادر ہونا تعجب انگیز ہے۔

میرے نزدیک اس شانِ نزول کو رد کرنے کے لیے یہ دلیل کافی ہے کہ یہ اُس مسلّمہ عقیدے کے بالکل منافی ہے جو قرآن نے انبیاء علیہم السلام سے متعلق ہمیں تعلیم کیا ہے۔ عصمت، حضرات انبیاء (علیہم السلام) کی ان خصوصیات میں سے ہے جو کسی وقت بھی ان سے منفک نہیں ہو سکتیں۔ اس عصمت کو اس امر سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا کہ نبی کے دندانِ مبارک شہید ہو گئے یا وہ زخمی

ہوگیا یا وہ قتل کر دیا گیا۔ ان میں سے کوئی چیز بھی اس کی نبوت میں قادح نہیں ہے کہ اس کو آپ اس امر کی دلیل بنائیں کہ جب نبی ان چیزوں میں مبتلا ہو سکتا ہے تو مسحور بھی ہو سکتا ہے یہاں تک کہ اس کو کردہ اور ناکردہ، دیدہ اور نادیدہ میں کوئی امتیاز ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے شیطانی تصرفات سے اپنے نبیوں کو محفوظ رکھا ہے اور ان کی یہ محفوظیت دین کے تحفظ کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ محفوظیت ہی نبی کے ہر قول و فعل کو سند بناتی ہے۔ پورا قرآن انبیاء کی عصمت پر گواہ ہے اور ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ ان کی عصمت پر ایمان رکھے۔

شانِ نزول کے اس واقعے کو اگر روایت کے اصولوں پر جانچا جائے تو اس میں نمایاں ضعف موجود ہے۔ صحاح کی ایک روایت میں رنگ آمیزی کرنے کے لیے تیسرے درجے کی ضعیف و موضوع روایتوں کا سہارا لیا گیا ہے اور اس کو ایک امر واقعہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ روایت صحاح میں سے صرف بخاریؒ، مسلمؒ اور ابن ماجہؒ نے لی ہے اور سند کے تیسرے واسطہ تک یہ خبر واحد ہی رہی ہے۔ حتیٰ کہ بخاری کی ایک روایت میں سفیان بن عیینہؒ یہ اقرار کرتے ہیں کہ میں نے اسے ابن جریج سے بالکل پہلی مرتبہ سنا۔ گویا اس واقعہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے سو سال بعد شہرت پائی، اس سے پہلے اس کا علم صرف بعض افراد تک محدود رہا۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ، العیاذ باللہ، اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم چھ ماہ تک مسحور رہے ہوتے تو یہ واقعہ اتنا غیر معمولی تھا کہ صدرِ اول ہی میں اس کا چرچا ہو جاتا اور یہ روایت ایک متواتر روایت کی حیثیت سے ہم تک پہنچتی۔

صحاح کی کسی روایت میں یہ نہیں بتایا گیا کہ اگر یہ جادو ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا اثر کتنا عرصہ رہا۔ اس کے برعکس ان تینوں کتابوں کی متفق علیہ روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ 'حتّٰی اذا کان ذات یوم او ذات لیلۃ دعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم دعا ثم دعا' (یہاں تک کہ جب ایک دن یا ایک رات گزر گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پے در پے دعا کی) اس سے معلوم ہوا کہ اگر اس کا کوئی اثر آپ کی قوتِ متخیلہ پر پڑا بھی تو وہ چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں رہا۔ پھر آپ نے اللہ تعالیٰ سے بار بار دعا کی اور یہ اثر جاتا رہا۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بالکل اسی قسم کی بات ہوئی جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں کی رسیوں اور لاٹھیوں کو سانپ سمجھ لیا اور وقتی طور پر گھبرا گئے۔ اس طرح کی کیفیات تھوڑی دیر کے لیے طاری ہو جانا ناممکن نہیں ہوتا۔ یہ کیفیات بطور امتحان بھی نبی کو پیش آسکتی ہیں لیکن ہوتی یہ وقتی اور عارضی ہیں تاکہ نبی کی عصمت مجروح نہ ہو۔

یہ حقیقت بھی ملحوظ رہے کہ صحاح میں نہ اس واقعہ کو سورہ کے شانِ نزول کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور نہ یہ بتایا گیا ہے کہ معوذتین کی آیات پڑھ پڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی تانت کی گرہیں کھولیں۔ یہ چیز واضح کرتی ہے کہ محدثین نے اس واقعہ کو سورۂ فلق سے متعلق نہیں مانا۔ یہ بعد والوں کی ذہانت ہے کہ وہ اس روایت کو معوذتین کے ذیل میں لے آئے، حالانکہ، جیسا کہ سورۂ فلق کی تفسیر سے واضح ہوا اور آگے سورۂ ناس کی تفسیر سے واضح ہوگا، ان کا مفہوم اس سے اِبا کرتا ہے کہ ان کے نزول کو کسی مجہول جادوگر کے کسی شیطانی عمل کا نتیجہ قرار دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علی احسانہٖ۔

لاہور

۹۔ اگست ۱۹۸۰ء

۲۶۔ رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ

تدبرِ قرآن

۱۱۴

النّاس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورہ کا عمود، سابق سے تعلق اور اس کے امتیازی پہلو

سابق سورہ ـــــــ الفلق ـــــــ کی تمہید میں ہم اس سورہ کے موقع و محل اور اس کے عمود کی طرف بالاجمال اشارہ کر چکے ہیں۔ یہ سورہ اس کی مثنیٰ ہے اس وجہ سے دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ جس طرح وہ تعوّذ کی سورہ ہے اسی طرح یہ بھی تعوّذ کی سورہ ہے لیکن چند پہلو اس کے خاص ہیں جن کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے تاکہ اس کا امتیازی وصف سامنے رہے۔

ایک یہ کہ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ اس کی ان صفات کے توسّل سے چاہی گئی ہے جن کا تعلق براہِ راست انسان سے ہے۔ اس وجہ سے اس کی اپیل نہایت مؤثر ہے۔ اپیل مؤثر تو سابق سورہ کی بھی ہے لیکن اس پر استدلال کا پہلو غالب ہے۔ اس میں استدلال کا پہلو اگرچہ موجود ہے لیکن زیادہ نمایاں پہلو اس میں استرحام کا ہے۔

دوسرا یہ کہ سابق سورہ میں کئی آفتوں سے پناہ مانگی گئی ہے لیکن اس میں ساری توجہ صرف شیطان پر مرکوز کر دی گئی ہے جو درحقیقت تمام آفتوں کی جڑ اور توحید کا، جیسا کہ سابق سورہ میں واضح ہو چکا ہے، ازلی دشمن ہے۔

تیسرا یہ کہ سابق سورہ میں شیطان کا حوالہ صرف اس کے ایک معروف کردار ـــــــ حسد ـــــــ سے آیا ہے لیکن اس سورہ میں اس کی اصل تکنیک، اس کے دائرۂ نفوذ و اثر، اس کی ذات اور برادری ہر چیز سے پردہ اٹھا دیا گیا ہے تاکہ لوگ اپنے اس شاطر دشمن کو اچھی طرح پہچان لیں اور جن کمین گاہوں سے وہ حملہ آور ہو سکتا ہے ان سے ہوشیار رہیں۔ اس روشنی میں سورہ کی تلاوت کیجیے۔

سُورَةُ النَّاسِ

مَدَنِيَّةٌ ______ آیات : ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ① مَلِكِ النَّاسِ ② اِلٰهِ آیات ۱-۶
النَّاسِ ③ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ④ الَّذِیْ
يُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ⑤ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ⑥ ع ۳۱

ترجمۂ آیات ۱-۶ کہہ، میں پناہ مانگتا ہوں لوگوں کے رب کی، لوگوں کے بادشاہ کی، لوگوں کے معبود کی وسوسہ ڈالنے والے دبک جانے والے کی آفت سے، جو دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے، جنوں میں سے اور انسانوں میں سے۔ ۱-۶

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ مَلِكِ النَّاسِ ۙ اِلٰهِ النَّاسِ (۱ - ۳)

اللہ تعالیٰ کی تین صفتوں کے واسطے سے تعوذ

یہ اللہ تعالیٰ کی پناہ اس کی تین صفتوں کے واسطہ سے چاہی گئی ہے اور یہ تینوں صفتیں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے ان بنیادی حقوق کو بھی معین کرتی ہیں جو بندوں پر عائد ہوتے ہیں اور پھر یہ رہنمائی بھی دیتی ہیں کہ ان صفات سے جو ذات متصف ہے وہی اہل ہے کہ بندے مشکلات میں اس کی پناہ ڈھونڈیں اور وہی اس لائق ہے کہ وہ بڑے سے بڑے دشمن کے مقابل میں بھی ان کو پناہ دے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے حقوق

حقوق کی وضاحت یوں ہوتی ہے کہ جو لوگوں کا پروردگار ہے وہی حق دار ہے کہ لوگوں کا بادشاہِ حقیقی ہو اور جو بادشاہِ حقیقی ہے وہی حق دار ہے کہ لوگوں کا معبود ہو۔ اگر پروردگار کے سوا کوئی دوسرا لوگوں کا بادشاہ بن کر اپنا قانون اور حکم چلائے تو یہ چیز بھی خلافِ عقل و فطرت اور ناجائز ہے اور رب کے سوا اگر کسی اور کو لوگ اپنا معبود بنائیں تو یہ چیز بھی خلافِ عقل و فطرت اور حرام ہے۔

سورۂ فاتحہ میں ربوبیت ہی کی دلیل پر بندوں کی تمام شکرگزاری کا حق دار اللہ تعالیٰ کو ٹھہرایا گیا ہے اور پھر اسی کو تمام عبادت اور استعانت کا مرجع بتایا گیا ہے۔ وہی بات یہاں بھی فرمائی گئی ہے۔ بس الفاظ مختلف ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو ان تین صفتوں سے متصف مان لینے کے بعد غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ شرک کے تمام رخنے بند ہو جاتے ہیں اور ان صفتوں میں ایسا لزوم ہے کہ ایک کو مان لینے کے بعد دوسری صفتوں کو ماننا لازم ہو جاتا ہے۔

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ (۴)

اس چیز کا بیان جس سے پناہ مانگی گئی ہے

یہ اس چیز کا بیان ہے جس کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے۔ فرمایا کہ کہو میں وسوسہ ڈالنے والے، دبک جانے والے کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔ الفاظ میں اگرچہ تصریح نہیں ہے لیکن ان صفات اور آگے کی تصریح سے واضح ہے کہ مراد اس سے شیطان ہی ہے۔

شیطان کی تکنیک

یہ شیطان کے تکنیک کی وضاحت ہے کہ اس کا سارا اعتماد وسوسہ اندازی، پراپیگنڈے اور پرفریب وعدوں پر ہے۔ انہی چیزوں سے وہ لوگوں کو اپنے دامِ فریب میں پھنساتا ہے۔

پھر جب پھنسا لیتا ہے تو اپنے کو بری قرار دے کر ان بے وقوفوں کی بدانجامی کا تماشا دیکھتا ہے جو اس کے دام میں پھنس کر اپنی دنیا اور عاقبت برباد کر لیتے ہیں۔

'وسواس' (وسوسہ ڈالنے والے) اور 'خنّاس' (دبک رہنے والے) کے درمیان حرفِ ربط نہیں ہے اور اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دونوں صفتیں موصوف میں بیک وقت موجود ہیں۔

شیطان کا واحد ہتھیار

اس سے ایک حقیقت تو یہ واضح ہوئی کہ شیطان کے پاس واحد ہتھیار صرف وسوسہ اندازی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور زور و اختیار اللہ تعالیٰ نے اس کو نہیں بخشا ہے کہ لازماً وہ لوگوں کو گمراہ کر ہی ڈالے۔ پرفریب وعدوں، ملمع کی ہوئی باتوں، ناصحانہ تنبیہات اور دھمکیوں سے وہ لوگوں کو ڈرانے کی بھی کوشش کرتا ہے اور پرچانے کی بھی لیکن اللہ کے جو بندے اس کی دھمکیوں سے مرعوب نہ ہوں تو ان کا وہ کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ چنانچہ اس نے جب اللہ تعالیٰ کو یہ دھمکی دی تھی کہ میں اولادِ آدم کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا تو اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں یہ واضح فرما دیا کہ 'اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ' (بنی اسرآءیل - ۱۷: ۶۵) (جا تیرا جو جی چاہے کر دیکھ میرے خاص بندوں پر — جو میری بندگی پر قائم رہنا چاہیں گے — تیرا کوئی زور نہیں چلے گا) ساتھ ہی بندوں کے بارے میں یہ اطمینان بھی دلا دیا تھا کہ 'وَکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیْلًا' (بنی اسرآءیل - ۱۷: ۶۵) (اور تیرا خداوند اعتماد کے لیے بالکل کافی ہے) یعنی اس کے جو بندے اپنے رب پر بھروسہ کر کے شیطان کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے اللہ تعالیٰ ان کے اعتماد کی لاج رکھے گا اور وہ سرخ رو ہوں گے۔

'خنّاس' کا مفہوم

'خنّاس' کے لفظ سے اس کے کردار کا دوسرا رخ واضح کیا گیا ہے۔ عام طور پر لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ وہ چھپ کر وسوسہ اندازی کرتا ہے، خود سامنے نہیں آتا اس وجہ سے اس کو خنّاس کہا گیا۔ لیکن یہ بات اگر صحیح ہو سکتی ہے تو صرف انہی شیاطین کے حد تک صحیح ہو سکتی ہے جو جنات کے زمرے سے تعلق رکھنے والے ہیں درآنحالیکہ اسی سورہ کی آگے والی آیت میں تصریح ہے کہ شیاطین جنوں اور انسانوں دونوں میں سے ہوتے ہیں۔ اس دور کے بعض تلم کاروں نے اس کے معنی بار بار آنے والے کے لکھے ہیں لیکن اس معنی کو عربی لغت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک اس کے معنی وہی ہیں جو ہم نے ترجمہ میں اختیار کیے ہیں یعنی دبک رہنے والا۔ اس سے مقصود شیطان کے کردار کے اس پہلو کو سامنے لانا ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کو ورغلانے کے لیے تو نمودار ہوتا ہے لیکن جب کوئی شخص اس کے چکمہ میں آ کر گناہ کر بیٹھتا ہے تو وہ اس کے نتائج کی ذمہ داری سے اپنے کو بالکل بری قرار دے کر اس کو چھوڑ بیٹھتا ہے۔ چنانچہ شیطان

کی صفت قرآن میں 'خَذُوْل' بھی آئی ہے یعنی اپنے مریدوں کو دغا دینے والا۔ اس کی اس دغا بازی اور بے وفائی کا ذکر قرآن میں مختلف اسلوبوں سے جگہ جگہ آیا ہے۔ سابق سورہ میں ہم سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیت نقل کر آئے ہیں کہ 'وَمَا یَعِدُھُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا' (بنیٓ اسرآءیل - ۱۷ - ۶۴) (اور شیطان کے سارے وعدے محض فریب ہیں)۔

شیطان کا یہ کردار سورۂ حشر میں نہایت واضح لفظوں میں یوں بیان ہوا ہے:

کَمَثَلِ الشَّیْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اکْفُرْ ج فَلَمَّا کَفَرَ قَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ (الحشر - ۵۹ : ۱۶)	ان کی مثال شیطان کی ہے۔ جب کہ وہ انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر تو جب وہ کفر کر بیٹھتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں تجھ سے بری ہوں، میں عالم کے خداوند، اللہ سے ڈرتا ہوں۔

اسی شیطانی کردار کا مظاہرہ یہود نے جنگ بدر کے موقع پر قریش کے ساتھ کیا کہ ان کو بھڑکا دے کر مدینہ پر چڑھا لائے کہ وہ مسلمانوں کو ختم کر دیں، مسلمان ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اگر ضرورت ہوئی تو وہ بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ لیکن جب معرکہ کارزار گرم ہوا اور انھوں نے میدانِ جنگ کا نقشہ دیکھا تو چھپ کر گھروں میں بیٹھ رہے۔ قرآن نے ان کے اس کردار کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

وَاِذْ زَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَھُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْیَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّیْ جَارٌ لَّكُمْ ج فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰی عَقِبَیْهِ وَقَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ [۲] (الانفال - ۸ : ۴۸)	اور جب کہ شیطان (یہود) نے ان کے (قریش کے) اعمال ان کی نگاہوں میں کھبا دیے اور کہا کہ اب آپ لوگوں پر غالب ہونے کا یارا کسی میں نہیں ہے اور میں آپ لوگوں کا پڑوسی ہوں تو جب دونوں گروہ آمنے سامنے ہوئے تو وہ دم دبا کر بھاگا اور بولا کہ میں تم سے بری ہوں میں وہ مشاہدہ کر رہا ہوں جو تم نہیں کر رہے ہو۔

شیطان اور اس کے پیرو‌ؤں کا یہی کردار اس دنیا میں بھی ہے اور اسی کا مظاہرہ وہ آخرت میں بھی کریں گے۔ قرآن میں جگہ جگہ گمراہ لیڈروں اور ان کے پیرو‌ؤں کی اس تو تکار کی تصویر کھینچی گئی

---

[۱] 'وَكَانَ الشَّیْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا' (الفرقان - ۲۵ : ۲۹) (اور شیطان انسان کے ساتھ بڑا ہی بے وفائی کرنے والا ہے)۔

[۲] اس آیت کی تفسیر کے لیے ملاحظہ ہو تدبرِ قرآن - جلد سوم، صفحات: ۸۰ - ۸۳

ہے جو ان کے درمیان جہنم میں برپا ہوگی۔ عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ ہم نے آپ لوگوں کی پیروی کی اور اس کے نتیجہ میں یہاں پہنچے تو کیا آپ لوگ اس عذاب میں سے کچھ حصہ ٹائیں گے جو ہمارے حصہ میں آیا؟ لیڈر جھٹ جواب دیں گے کہ تم خود شامت زدہ تھے کہ تم نے ہماری پیروی کی، ہم کو تمھارے اوپر کوئی زور تو حاصل نہیں تھا، تم جو کچھ بنے خود بنے تو اپنے کیے کی سزا خود بھگتو۔

لفظ 'خَنَّاسُ' یہاں اس کے اسی کردار کی تصویر پیش کر رہا ہے تاکہ لوگ اس کے صرف اس چاؤ اور پیار ہی کو نہ دیکھیں جو وہ اس وقت ظاہر کرتا ہے جب وہ ان کے پاس فریب دینے کے لیے آتا ہے بلکہ اس کی اس غداری اور بے وفائی کو بھی پیش نظر رکھیں جس کا مظاہرہ وہ اس وقت کرتا ہے جب آدمی اس کے دامِ فریب میں پھنس جاتا ہے اور متوقع ہوتا ہے کہ وہ اپنے کیے ہوئے وعدے پورے کرے گا۔

اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ لا مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ (۵-۶)

شیطان کی ذات برادری — شیطان کے مشن کے ساتھ ساتھ یہ اس کی ذات برادری کی بھی نشان دہی کر دی گئی ہے تاکہ لوگ اس کو اچھی طرح پہچان لیں۔ فرمایا کہ اس کا اصل کام لوگوں کے سینوں میں وسوسہ اندازی ہے۔ 'صُدُوْرِ النَّاسِ' ظرف ہے لیکن مراد اس سے مظروف ہے یعنی دلوں میں وسوسہ اندازی۔ 'وسوسہ اندازی' کا مفہوم ظاہر ہے کہ لوگوں کو خدا کی صراطِ مستقیم سے برگشتہ کرنے کے لیے وسوسہ اندازی ہے۔ اس کا اظہار شیطان نے خود کر دیا ہے اور ہم ضروری حوالے اوپر نقل کر آئے ہیں۔ شیطان کو اللہ تعالیٰ نے جیسا کہ اوپر وضاحت ہو چکی ہے، اپنے بندوں پر کوئی اختیار اور تصرف نہیں بخشا ہے۔ وہ صرف وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ لوگوں کو بجبر و زور گمراہ کرنے کا اختیار وہ نہیں رکھتا۔

'مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ'۔ یہ اس کی ذات برادری کی نشاندہی ہے کہ شیطان کوئی مستقل مخلوق نہیں ہے بلکہ جنوں اور انسانوں میں سے جو دلوں میں وسوسہ اندازی کا پیشہ اختیار کر لیں وہ شیطان بن جاتے ہیں۔ جس شیطان نے بابا آدمؑ کو دھوکا دیا، قرآن میں تصریح ہے کہ 'وہ جنوں میں سے تھا۔ جو لوگ اس کو ایک مستقل مخلوق اور زندہ جاوید ہستی سمجھتے ہیں ان کا خیال غلط ہے۔ البتہ اس نے بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لیے جس مشن کا اعلان کیا تھا وہ مشن اس کے ان مریدوں کے ذریعہ سے قیامت تک قائم رہے گا جو انسانوں اور جنوں میں سے اپنی خدمات اس کے لیے پیش کریں گے۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ تدبر قرآن کی بھی آخری سطریں آج سپردِ قرطاس ہوئیں۔ میں نہیں جانتا کہ کن لفظوں میں اپنے اس رب کا شکر ادا کروں

جس نے مجھ جیسے حقیر اور بے مایہ کو اس خدمت کی توفیق بخشی۔ بس یہ دعا ہے کہ رب کریم اس ناچیز خدمت کو اپنے اس غلام کی نجات کا ذریعہ بنائے۔ جو باتیں قلم سے صحیح نکلی ہیں ان سے خلق کو فائدہ پہنچے اور اگر کہیں کوئی لغزش ہوئی ہے تو اس کے وبال سے اپنے اس غلام کو بھی محفوظ رکھے اور کتاب کے قارئین کو بھی۔ اللّٰھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

لاہور

۲۹۔ رمضان المبارک سنہ ۱۴۰۰ھ

۱۲ اگست سنہ ۱۹۸۰ء

فہرست مضامین

تفسیر سُورۃ القیٰمۃ - ۷۵

تفسیر سُورۃ الدّھر - ۷۶

تفسیر سُورۃ المُرسلٰت - ۷۷

تفسیر سورۃ المطففین - ۸۳

تفسیر سورۃ الانشقاق - ۸۴

تفسیر سورۃ البروج - ۸۵

تفسیر سورۃ الطارق - ۸۶

تفسیر سورۃ الاعلیٰ - ۸۷

تفسیر سورۃ الغاشیۃ - ۸۸

تفسیر سورۃ الفجر - ۸۹

تفسیر سورۃ البلد - ۹۰

تفسیر سورۃ الشمس - ۹۱

تفسیر سورۃ اللیل - ۹۲

تفسیر سورۃ الضحیٰ - ۹۳

تفسیر سورۃ الم نشرح - ۹۴

تفسیر سورۃ التین - ۹۵

تفسیر سورۃ العلق - ۹۶

تفسیر سورۃ القدر - ۹۷

تفسیر سورۃ البیّنۃ - ۹۸

تفسیر سورۃ الزلزال - ۹۹

تفسیر سورۃ العٰدیٰت - ۱۰۰

تفسیرِ سورۃ القارعۃ - ۱۰۱

تفسیرِ سورۃ التکاثر - ۱۰۲

تفسیرِ سورۃ العصر - ۱۰۳

تفسیرِ سورۃ الھمزۃ - ۱۰۴

تفسیرِ سورۃ الفیل - ۱۰۵

تفسیر سورۃ القریش - ۱۰۶

تفسیر سورۃ الماعون - ۱۰۷

تفسیر سورۃ الکوثر - ۱۰۸

تفسیر سورۃ الکفرون - ۱۰۹

تفسیر سورۃ النصر - ۱۱۰

تفسیر سورۃ اللہب - ۱۱۱

تفسیر سورۃ الاخلاص - ۱۱۲

تفسیر سورۃ الفلق - ۱۱۳

تَفْسِیرُ سُوْرَۃُ النَّاس - ۱۱۴

خطاطی ـــــ عبدالغفور کیلانی